جنگل میں منگل

مصنفہ

هنری ڈیوڈ تھورو

مترجمہ

بال کرشن

پبلشرز:- انڈین اکیڈمی ۲۹ نریندرا پلیس نئی دہلی

بار اوّل

قیمت تین روپے پچاس نئے پیسے

کفایت شعاری

یہ صفحات یا یوں سمجھ لیجئے کہ ان میں سے بیشتر صفحات لکھنے کے زمانہ میں میرا قیام کنکارڈ میسا چیوسیٹس میں والڈن تالاب کے کنارے واقع جنگل کے ایک مکان میں تھا جسے میں نے خود تعمیر کیا تھا۔ اور جس سے میرا نزدیکی پڑوسی ایک میل سے کم فاصلہ پر نہیں رہتا تھا۔ میں صرف اپنے ہاتھوں کی محنت سے روزی پیدا کیا کرتا تھا میں وہاں دو سال اور دو مہینے تک رہا۔ اس وقت پھر مہذب دنیا میں عارضی طور پر مقیم ہوں۔

اگر میری طرزِ زندگی کے بارے میں میرے قصبہ والوں نے مفصل پوچھ کچھ نہ کی ہوتی تو میں قارئین کی خلوت میں اپنے نجی معاملات پیش کر کے اتنا مخل ہرگز نہ ہوتا۔ مجھ سے جو سوالات کئے گئے ہیں ان کو بعض لوگ بے جا کہہ سکتے ہیں لیکن وہ مجھے قطعاً بے جا معلوم نہیں ہوتے بلکہ حالات کے پیشِ نظر میں ان کو قدرتی اور معقول اور بجا خیال کرتا ہوں۔ بعض لوگوں نے پوچھا ہے میں کیا کھاتا تھا؟ کیا میں تنہائی تو محسوس نہیں کرتا تھا؟ کیا میں ڈرتا تو نہیں تھا؟ وغیرہ وغیرہ۔ کچھ لوگ یہ جاننے کے لئے مشتاق ہیں کہ میں اپنی آمدنی کا کتنا حصہ خیرات میں دیا کرتا تھا۔ اور کچھ لوگوں نے جن کے بڑے بڑے کنبے ہیں یہ سوال کیا ہے

کر میں نے کتنے مفلس بچوں کی پرورش کی۔ اس لئے میں ان قارئین سے جو میری
ذات سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔ یہ کہوں گا کہ اگر میں اس کتاب میں ان سوالات
میں سے بعض کا جواب دوں تو وہ مجھے معاف کر دیں۔ بیشتر کتابوں میں "میں" یا
یا ضمیر واحد متکلم اڑا دیا جاتا ہے۔ لیکن اس کتاب میں اسے برقرار رکھا جائے گا۔
خودستائی کے اعتبار سے میری اور دوسروں کی کتابوں میں یہی ایک اہم فرق
ہے۔ ہم عام طور سے یہ بھول جاتے ہیں کہ آخر کار ہمیشہ "میں" ہی بولتا ہے۔
میں اپنے بارے میں اتنی باتیں ہرگز نہ کرتا اگر میں کسی اور کو اتنی اچھی طرح جانتا
ہوتا جتنا خود اپنے آپ کو جانتا ہوں۔ بدقسمتی سے میں اپنے تنگ و محدود تجربہ
کے باعث اپنے آپ کو اسی موضوع تک محدود رکھنے پر مجبور ہوں۔ علاوہ
ازیں میں اپنی جانب سے ہر مصنف سے یہی تقاضا کرتا ہوں کہ وہ کلی طور پر سادگی
اور خلوص سے اپنی زندگی کی روداد پیش کرے۔ اور محض دوسروں کی زندگیوں
کے بارے میں سنی سنائی باتیں لکھنے کی بجائے ایسی روداد لکھے جیسی وہ کسی دور
افتادہ ملک میں اپنے احباب و اقربا کو لکھنی چاہے گا۔ اگر اس نے خلوص سے
زندگی بسر کی ہے۔ تو مجھے بھی واقعی ایک دور افتادہ دیس کی زندگی معلوم ہوگی۔ شاید
ان صفحات میں مفلس طالب علموں کو خاص طور سے مخاطب کیا گیا ہے۔ جہاں
تک باقی قارئین کا تعلق ہے۔ وہ میرے خیال میں اس کتاب کے ایسے حصوں کو
قبول کر لیں گے جن کا اطلاق ان پر ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ کوئی شخص اس
کوٹ کو اس کی سیونیں کھینچ تان کر زبردستی نہیں پہنے گا کیونکہ یہ کوٹ اسی شخص
کی اچھی خدمت انجام دے گا جس پر یہ فٹ بیٹھے گا۔

میں بہ مجبوری چینیوں اور سینڈوچ جزیرہ کے لوگوں کے بارے میں اتنی باتیں
نہیں کہوں گا جتنی ان صفحات کے پڑھنے والوں کے بارے میں کہوں گا یعنی آپ

کے بارے میں جو نیو انگلینڈ کے باشندے کہلاتے ہیں۔ میں آپ کے
حالات اور خصوصاً اس دنیا میں، اس شہر میں آپ کی بیرونی صورتِ حال سے
متعلق کچھ باتیں کہوں گا۔ مثلاً آپ کے حالات کیسے ہیں؟ کیا یہ ضروری ہے کہ وہ
بدستور ایسے ہی رہیں۔ کیا ان کو بہتر بنایا جا سکتا ہے یا نہیں۔ میں کنکارڈ میں بہت
گھوما پھرا ہوں۔ مجھے ہر جگہ دکانوں میں، دفتروں میں اور کھیتوں میں ایسے لوگ
دکھائی دیتے ہیں جو ہزاروں انوکھے طریقوں سے کفارہ کے لیے ریاضت کر
رہے ہیں۔ میں نے برہمنوں کے بارے میں سنا ہے کہ وہ الاؤ کے آگے بیٹھے
سورج کی طرف دیکھتے رہتے ہیں یا شعلوں پر سر کے بل الٹے لٹکے رہتے ہیں یا
اپنے کندھوں پر سے آسمان کی طرف گردن موڑ کر اتنی مدت تک دیکھتے رہتے ہیں کہ ان
کے لیے اپنی قدرتی حالت پر لوٹنا ناممکن ہو جاتا ہے اور گردن ٹیڑھی رکھنے کے باعث
ان کے حلق سے مشروب کے سوا اور کوئی چیز معدے میں نہیں اتر سکتی یا کبھی
پیڑ کے نیچے عمر بسر کرنے کے لیے یا زنجیروں میں پڑے رہتے ہیں یا کسی پتنگے کے بچے
کی طرح پیٹ کے بل رینگ کر وسیع سلطنتوں کے طول و عرض ناپتے رہتے ہیں،
یا ستونوں کی چوٹی پر ایک ٹانگ کے بل کھڑے رہتے ہیں۔ شعوری کفارہ کی یہ ساری
صورتیں اتنی ناقابلِ یقین اور حیرت ناک نہیں جتنے وہ مناظر ہیں جو ہر روز میری نظر
سے گزرتے ہیں۔ میرے پڑوسی جو مشقت کر رہے ہیں اس کے مقابلے میں "ہرکیولیس"
(ہراقلیس) کی وہ جوکھوں میں ڈال دینے والی بارہ مہمات کچھ بھی نہیں اور حقیر ہیں کیونکہ
وہ صرف بارہ مہمات تھیں اور ان کا اختتام بھی تھا مگر میں نے یہ کبھی نہیں دیکھا کہ
کہ میرے پڑوسیوں نے کسی دیو کو قتل کیا یا پکڑا ہو۔ ان کا آیولاس جیسا دوست
بھی نہیں جو جلتے ہوئے لوہے سے ہائی ڈرا (بہت سے سروں والا سانپ) کا سر جلا
سکے۔ میرے پڑوسیوں کے معاملہ میں تو جونہی ہائی ڈرا کا ایک سر کچلا جاتا ہے

زد نئے سبز اور نکل آتے ہیں۔

میں ایسے نوجوانوں یعنی اپنے قصبہ کے لوگوں کو دیکھتا ہوں جن کی بدقسمتی یہ ہے کہ ان کو ورثہ میں کھیت، مکان، کھلیان، مویشی اور زرعی آلات ملے ہیں۔ یہ چیزیں مل تو آسانی سے جاتی ہیں مگر ان سے چھٹکارا پانا بہت دشوار ہوتا ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر یہ کھلی چراگاہوں میں پیدا ہوئے ہوتے اور کسی بھیڑیے نے دودھ پلا کر ان کی پرورش کی ہوتی تاکہ وہ اپنی آنکھوں سے صاف طور پر یہ دیکھ سکتے کہ ان کو کس قسم کے میدان میں محنت کرنی ہے۔ ان کو زمین کا غلام کس نے بنایا؟ وہ اپنی ساٹھ ایکڑ زمین کیوں کھا جائیں جبکہ اس کے مقدر میں اس کے حق کا مٹی کا صرف ایک ہی دورہ بھر رکھا ہے؟ وہ پیدا ہوتے ہی اپنی قبریں کھودنا کیوں شروع کر دیں؟ ان کو اپنے سامنے کی تمام چیزیں دھکیل کر انسان کی زندگی بسر کرنا ہے اور جہاں تک ممکن ہو اچھی زندگی بسر کرنا ہے میں نے کتنے ہی بیچارے لافانی روح رکھنے والے لوگ دیکھے ہیں جو زندگی کے بوجھ تلے کچلے اور دبے ہوئے شاہراہ حیات پر رینگ رہے ہیں اور اپنے آگے آگے پچھتر فٹ لمبا اور چالیس فٹ چوڑا غلہ دان دھکیل رہے ہیں۔ ان کو زندگی کی تکالیف سے کبھی نجات نہیں ملتی۔ وہی ایک سو ایکڑ زمین۔ اس کی گوڑائی اور کٹائی۔ چراگاہ اور چھوٹا جنگل۔ وہ بے جائداد اور بے مقدور شخص بھی جسے ورثہ میں ملے ہوئے ایسے غیر ضروری بوجھ نہیں ڈھونے پڑتے۔ اپنے چند مکعب فٹ جسم کو قابو میں رکھنے اور اس کی پرورش کرنے کو سخت مشقت کا کام سمجھتا ہے۔

لیکن انسان ایک غلط فہمی میں مبتلا ہو کر محنت کرتا ہے۔ انسان کا بیشتر حصہ خاک میں مل کر کھاد کی شکل میں دفن ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ ایک قدیم کتاب میں لکھا ہے۔ ظاہری تقدیر جسے عام طور پر ضرورت کہا جا سکتا ہے انسان کو ایسے خزانے جمع کرنے میں مصروف رکھتی ہے۔ جسے کیڑے اور زنگ چاٹ جائیں گے اور جسے چور اندر گھس کر چرا لے

جائیں گے۔ انسان کو زندگی ختم ہونے سے پہلے نہیں تو اس کے آخری ایام میں پتہ چل جائے گا کہ یہ احمقانہ زندگی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ڈیوکیلین اور پائی رہا نے اپنے سروں کے اوپر سے پیچھے کی طرف پتھر پھینک کر انسان پیدا کئے تھے۔

یا جیسا کہ ریلے نے اپنے پرشکوہ انداز میں اس خیال کو یوں نظم کیا ہے۔

"اس وقت سے ہماری نسل سنگدل چلی آرہی ہے۔ تکلیف اور پریشانی برداشت کر رہی ہے اور اس بات کو تسلیم کر رہی ہے کہ ہمارے اجسام پتھریلی نوعیت کے ہیں۔"

ڈیوکیلین اور پائی رہا نے اپنے سروں کے اوپر سے پیچھے کی طرف پتھر پھینکے اور یہ نہ دیکھا کہ وہ کہاں گرے۔ ایسا غلط اقدام کرنے والوں کی اندھا دھند اطاعت کرنے کے خلاف اتنا ہی کہنا کافی ہے۔

بہت سے لوگ اس متقابلتہً آزاد ملک میں لاعلمی اور غلطی کے باعث زندگی کے بے جا تفکرات اور فضول قسم کی کڑی مشقتوں میں کچھ اس طرح پھنسے رہتے ہیں کہ زندگی کے لطیف ترین پھل کبھی نہیں توڑ سکتے۔ کثرتِ مشقت کے باعث اُن کی انگلیاں کھونڈی اور بھدی ہو جاتی ہیں۔ اور ایسے پھل توڑتے ہوئے کانپتی ہیں۔ یہ امر واقعہ ہے کہ اب آئے دن محنت کش انسان کو سچی ایمانداری کے لئے اتنی فرصت ہی میسر نہیں ہے۔ وہ انسانوں سے انسانیت کے شایانِ شان تعلقات برقرار رکھنے کی گنجائش ہی نہیں نکال سکتا۔ اگر وہ ایسا کرنے لگے تو منڈی میں اسکی محنت کا بھاؤ ہی گر جائے۔ اس کے پاس اتنا وقت ہی نہیں کہ وہ مشین بننے کے سوا کچھ اور بھی بن سکے۔ اُسے اپنی جہالت جو اسکی نشوونما کے لئے بہت ضروری ہے۔ کیونکہ یاد رہ سکتی ہے جبکہ اس کو اپنے علم کا استعمال اکثر کرنا پڑتا ہے؟ اس کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنے سے پہلے ہمیں چاہیئے کہ ہم کبھی کبھی اس کو مفت خوراک اور لباس مہیا کریں اور مشروبات اور مقویات سے اُسے تازہ دم کریں۔

قسمت کا فیصلہ کرتی ہے یا یُوں سمجھ لیجیے کہ اس کے مقدر کے لکھے کو آشکار کر دیتی ہے۔ تخیّل و تصوّر کے مالک ویسٹ انڈین صُوبوں میں بھی اپنے نفس کی غلامی سے نجات عنقا ہے وہاں کون وبسرفورس ہے جو اُن کو نجات دلا سکے؟ ذرا اُس سرزمین کی خواتین کے بارے میں بھی سوچئے جو اپنی عمر کے آخری دن تک آرائشی گُڈے بنتی رہتی ہیں اور اپنے مقدروں سے کبھی دلچسپی کا اظہار نہیں کرتیں یہ ایسی بات ہے جیسے آپ ابدیت کو فنا کئے بغیر وقت ضائع کر سکتے ہوں۔

انسانوں کی اکثریت خموشی سے اِس ایک زندگی بسر کرتی ہے۔ ہم جسے قناعت اور تیاگ کہتے ہیں وہ دراصل مسلمہ مایوسی ہے آپ ایک یاس انگیز شہر سے نکل کر اُداس دیہات میں چلے جاتے ہیں۔ اور نیولوں اور چھچھوندروں کی بہادری دیکھکر اپنے دل کو تسلّی دیتے ہیں۔ ہم جسے بنی آدم کا کھیل اور تفریح کہتے ہیں اس کے اندر بھی ایک غیر سمی اور غیر ضروری یاسیت اور افسردگی چھپی ہوتی ہے۔ ان میں تفریح کہاں ہوتی ہے۔ تفریح تو کام کے بعد ہی ہُوا کرتی ہے۔ لیکن دانشمندی کا تقاضا یہ ہے کہ اُمید شکن کارروائیاں نہ کی جائیں۔

جب ہم سوال و جواب نامہ کے الفاظ میں اس بات پر غور کرتے ہیں کہ انسان کا خاص انجام کیا ہے اور زندگی کے حقیقی ذرائع اور ضروریات کیا ہیں تو ایسا دکھائی دیتا ہے جیسے انسانوں نے جان بوجھ کر عام طرزِ حیات کا انتخاب کیا ہو۔ کیونکہ انہوں نے اسے کسی دوسرے طریقہ زندگی پر ترجیح دی ہے۔ پھر بھی وہ ایمانداری سے سوچتے ہیں کہ اس راستہ کے سوا دوسرا کوئی راستہ نہ تھا۔ لیکن باہوش اور صحت مند فطرت رکھنے والے انسان یہ بات یاد رکھتے ہیں کہ جب سُورج نکلا تھا اُس وقت مطلع صاف تھا۔ ہمیں اپنے تعصبات ترک کر دینے میں کبھی تاخیر نہیں ہوتی۔ کوئی اندازِ فکر یا طرزِ عمل چاہے وہ کتنا ہی پُرانا کیوں نہ ہو مدت موجود ہونے پر ہی قابلِ اعتماد ہوتا ہے۔ آج جس بات کو ہر شخص درست اور سچی سمجھتا ہے یا جو سچی معلوم ہوتی ہوئی بیت رہی ہے۔ وہی کل غلط ثابت ہو سکتی ہے۔ جیسے محض کسی رائے کا دھواں

جیسے کچھ لوگوں نے ایک بادل سمجھ کر یہ خیال کر لیا تھا کہ وہ اُن کے کھیتوں پر زرخیز مینہ برسا دے گا۔ بزرگ لوگ جن کاموں کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ آپ ان کو نہیں کر سکتے اگر آپ ذرا کوشش کر کے دیکھیں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ آپ وہ کام کر سکتے ہیں پرانے لوگوں کی باتیں پرانی تھیں اور نئے لوگوں کی نئی ہیں۔ ایک زمانہ میں پرانے لوگ یہ نہیں جانتے تھے کہ آگ کو جلتا رکھنے کے لئے تازہ ایندھن لایا جا سکتا ہے۔ نئے لوگ ہنڈیا گرم رکھنے کیلئے اِس کے نیچے سوکھی لکڑیاں رکھ دیتے ہیں اور پرندوں کی رفتار سے دُنیا کے گرد چکر لگاتے ہیں۔ ایک قول کے مطابق بوڑھے لوگوں کو ہلاک کرنے کے لئے۔ بڑھاپا اس بات کا اہل نہیں ہے کہ وہ جوانوں کو ہدایت دے کیونکہ بڑھاپے نے جتنا پایا ہے اُس سے زیادہ کھویا ہے۔ بعض اوقات تو شک گزرتا ہے کہ کیا سب سے عقلمند انسان نے زندہ رہ کر واقعی حقیقی اقدار کا علم حاصل کیا ہے۔ عملی طور پر بوڑھوں کے پاس ایسی کوئی اہم نصیحت نہیں ہے جو وہ نوجوانوں کو دے سکیں۔ اُن کا اپنا تجربہ اتنا جانبدارانہ رہا ہے۔ اور اُن کی زندگیاں اُن کے خیال کے مطابق نجی اسباب کی بنا پر اتنی بُری طرح ناکام رہی ہیں کہ اُن کا بچا کھچا عقیدہ ان کے تجربہ کو جھٹلاتا ہے کیونکہ اب وہ پہلے سے کم جوان ہیں۔ مَیں اس دنیا میں تقریباً تیس برس سے مقیم ہوں لیکن مَیں نے بزرگوں سے ایک لفظ بھی ایسا نہیں سُنا جسے بیش قیمت اور سنجیدہ نصیحت کہا جا سکے۔ انہوں نے مجھے کچھ نہیں بتایا اور غالباً وہ کام کی کوئی بات بتا بھی نہیں سکتے تھے۔ یہ رہی زندگی جس کا میں نے بڑی حد تک کوئی تجربہ ہی نہیں کیا ہے۔ مجھے اس بات کا بھی کوئی فائدہ نہیں کہ میرے بزرگوں نے اسے آزما رکھا ہے۔ اگر مَیں نے کوئی ایسا تجربہ کیا ہے جو میرے خیال میں بیش قیمت ہے تو مَیں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میرے ہادیوں نے مجھے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔

ایک کسان مجھ سے کہتا ہے "آپ صرف سبزیوں کی خوراک کھا کر ہی زندہ نہیں رہ سکتے کیونکہ ان میں ہڈیوں کو مضبوط بنانے والا کوئی عنصر نہیں ہوتا۔" اور اسی لئے وہ مذہبی

عقیدت مندی کے ساتھ اپنے دن کا ایک حصہ اپنے جسم کی ہڈیوں کے لئے کچا مال فراہم
کرنے میں صرف کرتا ہے لیکن مجھے یہ بات بتلاتے ہوئے اپنے بیلوں کے پیچھے کھڑا ہوتا ہے
جن کی ہڈیاں سبزی سے بنی ہیں اور جو ہر طرح کی رکاوٹ کے باوجود اس کسان کو اور اس
کے کاٹھی کے بھاری ہل کو جھٹکا دے کر آگے بڑھاتے ہیں۔ بعض چیزیں جو مجبوروں اور
بیماروں کے حلقوں میں حقیقتاً ضروریاتِ زندگی ہوتی ہیں وہی چیزیں دوسرے حلقوں
میں محض عیش و عشرت کی چیزیں ہیں اور تیسرے حلقوں میں ان کو کوئی جانتا تک نہیں

کچھ لوگوں کا ایسا خیال ہوتا ہے جیسے ان کے پیش رو انسانی زندگی کی ساری منزلیں
طے کر چکے ہیں۔ بلندیاں اور پستیاں۔ ان کو یہ بھی نظر آتا ہے کہ بزرگوں نے ہر دکھ کا مداوا ڈھونڈ
لیا تھا۔ ان لوگوں کے خیال کے مطابق دانشمند سلیمان نے درخت لگانے کے درمیانی فاصلوں
تک کے بارے میں قوانین بنا رکھے تھے اور روم کے کونسلوں نے یہ فیصلہ بھی کر دیا تھا کہ
آپ بلا اجازت کتنی بار ہمسائے کی زمین پر جا کر شاہ بلوط کے پکے ہوئے پھل کتنی
بار اٹھا سکتے ہیں۔ انہوں نے یہ بھی طے کر دیا تھا کہ اس میں پڑوسی کا کتنا حصہ ہے
ہپوکریٹس نے یہ بتلا رکھا ہے کہ ہمیں اپنے ناخن کیسے کاٹنے چاہئیں یعنی انگلیوں
کی پوروں کے برابر ہونا چاہئے نہ ان سے کم نہ ان سے زیادہ آگے بڑھے ہوئے۔ بلاشک
یہ وہی اکتا دینے والا اور بیزار کن رویہ ہے جنہوں نے زندگی کے تنوع اور اس کی مسرتوں کا ذخیرہ
ختم کر دیا ہے آدم جتنا ہی پرانا ہے۔ لیکن انسان کی صلاحیتوں کو کبھی ناپا نہیں گیا ہے نہ ہم
کسی مثال کے ذریعہ یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ انسان کیا کچھ کر سکتا ہے۔ بہت کم باتوں کا تجربہ
کیا گیا ہے اب تک۔ مجھے جو ناکامیاں ہوتی ہیں ان کے باعث اے میرے بچے دکھی نہ
ہو اس لئے کہ اب تک تو نے جو کچھ نہیں کیا ہے وہ کرنے کے لئے تجھے کون کہے گا!

ہم اپنی زندگی کی ہزاروں آسان طریقوں سے جانچ کر سکتے ہیں۔ مثلاً وہ سورج جو
میری لوبیے کی پھلی پکا دیتا ہے ایک وقت ہماری زمین جیسی بہت سی زمینوں کے نظام

کو بھی روشن کر دیتا ہے۔ اگر میں نے یہ بات یاد رکھی ہوتی تو میں نے بعض غلطیاں نہ کی ہوتیں۔ میں نے غلطیوں کا ارتکاب اس روشنی میں نہیں کیا تھا ستارے کتنی ہی حیرت انگیز مثلثوں کے رس ہیں۔ اس کائنات کے مختلف مرکزوں میں کیسی کیسی دور افتادہ اور جدا گانہ مخلوق اسی لمحہ میں ایک ہی ستارے پر اپنی توجہ مرکوز کئے ہوئے ہے! قدرت اور انسانی زندگی اتنی ہی متنوع ہے جتنے ہمارے کئی آئین۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ایک زندگی دوسری زندگی کے لئے کیا امکانات پیش کرتی ہے۔ کیا ہمارے لئے اس سے بڑا کوئی اور معجزہ ہو سکتا تھا کہ ہم ایک لمحہ کے لئے ایک دوسرے کی آنکھ میں جھانک کر دیکھتے ؟ ہم ایک گھنٹے میں دنیا کے سارے زمانوں کی دنیاؤں میں زندگی بسر کر لیتے۔ میں تاریخ شاعری اور دیو مالا میں دوسروں کے تجربات کے مطالعہ کرنے کا ان سے زیادہ حیرت انگیز اور پر از معلومات کوئی اور ذریعہ نہیں جانتا۔

میرے پڑوسی جن باتوں کو اچھا کہتے ہیں میرا دل کہتا ہے کہ ان میں سے باتیں بری ہیں اگر مجھے کسی بات پر تاسف ہوگا تو وہ یہ ہوگی کہ میں نے اچھا برتاؤ کیوں اختیار کیا۔ کس شیطان نے مجھے بہکایا تھا۔ میں نے اتنا اچھا برتاؤ کیوں کیا۔ اے لڑنے تو ستی الامکان کوئی دانشمند بات کہہ سکتا ہے کیونکہ تو نے ستر برس تک باعزت زندگی بسر کی ہے۔ لیکن میں ایک ناقابل مزاحمت آواز سن رہا ہوں۔ جو مجھے ان تمام باتوں سے دور رہنے کی دعوت دیتی ہے ایک نسل دوسری نسل کی مہمات کو اس طرح ترک کر دیتی ہے جس طرح پایاب پانی میں پھنسے ہوئے جہازوں کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ ہم جتنا اعتماد کرتے ہیں بڑے اطمینان کے ساتھ اس سے زیادہ اعتماد کر سکتے ہیں۔ ہم ایمانداری سے جتنی توجہ دوسروں پر صرف کرتے ہیں اس کے اعتبار سے اپنی ذات پر اتنی ہی توجہ کم کر سکتے ہیں۔ فطرت ہماری کمزوریوں کو اتنا ہی

گوارا کرتی ہے جتنی ہماری طاقت کو۔ بعض لوگوں کو مسلسل فکر و تشویش قریب
ایک لاعلاج مرض ہوتی ہے۔ ہمارا خمیر کچھ اس طرح اٹھایا گیا ہے۔ کہ ہم جو کام کرتے ہیں۔
اس کے بارے میں مبالغہ آرائی کریں لیکن کتنے ہی کام ایسے ہیں جو ہم نہیں کرتے۔ کیا ہم نے
کبھی یہ سوچا ہے کہ ہم بیمار ہو جاتے تو وہ کام کون کرتا۔ ہم کس قدر چوکنے ہیں؟ گویا ہم نے
تہیہ کر رکھا ہے کہ حتی الامکان اعتقاد کے ساتھ زندگی بسر نہیں کریں گے دن بھر چوکس
رہتے ہیں رات کو دل پر جبر کر کے دعا مانگتے ہیں۔ اور اس طرح اپنے آپ کو غیر یقینی باتوں
کے رحم و کرم پہ چھوڑ دیتے ہیں۔ ہمیں بڑے خلوص کے ساتھ اور مکمل طور سے زندگی کا احترام
کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ اور تغیر و تبدل کے امکان سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ ہم کہتے
ہیں کہ زندگی بسر کرنے کا بس یہی ایک طریقہ ہے۔ لیکن زندگی بسر کرنے کے اتنے ہی طریقے
ہیں جتنے ایک مرکز کے نصف قطر کھینچے جا سکتے ہیں۔ تمام تبدیلیاں معجزہ ہیں جن پر غور
کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ ایک ایسا معجزہ ہے جو ہر لمحہ ظہور میں آ رہا ہے۔ کنفیوشس
نے کہا تھا "یہ جاننا کہ ہم جو کچھ جانتے ہیں اسے جانتے ہیں اور جو کچھ نہیں جانتے
ہیں اسے نہیں جانتے حقیقی علم ہے" جب کوئی آدمی تخیلی حقیقت کو عقلی حقیقت
بنا دیتا ہے تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سارے انسان وسیع پیمانہ پر اپنی زندگیاں اس اصول
پر مبنی کر لیں گے۔

آئیے ہم تھوڑی دیر کے لئے اس بات پر غور کریں کہ میں نے جس دکھ اور تشویش کا ذکر
کیا ہے وہ زیادہ تر کس کے بارے میں ہے۔ اور ہمیں اسکی خاطر کتنا پریشان یا کم سے کم
کتنا محتاط ہونا چاہیئے۔ ہمارے لئے کسی حد تک یہ مفید ہو گا کہ ہم ظاہری تہذیب کے
بارے میں قدیم وضع کی سرحدی زندگی بسر کریں تاکہ یہ جان سکیں کہ زندگی کی بنیادی
ضروریات کیا اور ان کو حاصل کرنے کے کیا کیا طریقے اختیار کئے گئے ہیں۔ یا یہ بھی مفید
ہو گا اگر تم تاجروں کا پرانا روزنامہ بہی کھاتہ یہ معلوم کرنے کے لئے دیکھیں کہ لوگ عام طور پر

ان کی دوکانوں سے کون کون سی چیزیں خریدتے ہیں ان کی دوکانوں پر کون کون سی چیزیں رکھی جاتی ہیں اور بنیادی اشیائے خوردنی کیا ہیں کتنے زمانوں کی ترقیوں اور بہتریوں نے انسانی زندگی کے بنیادی قوانین پر کوئی اثر نہیں ڈالا جس طرح ہماری اور ہمارے آباؤاجداد کی ہڈیوں کے ڈھانچوں میں غالباً کوئی فرق نہیں پڑا۔

"زندگی کی ضرورت" کے الفاظ سے میری مراد وہ تمام چیزیں ہیں جن کو انسان اپنی محنت و کاوش سے حاصل کرتا ہے اور جو ابتدا ہی سے یا ایک مدت مدید کے استعمال سے انسانی زندگی کے لئے اتنی اہم ہو چکی ہیں کہ بہت ہی کم اشخاص بربریت یا افلاس یا تکلفات کے باعث اُن کے بغیر زندگی بسر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان معنوں اکثر مخلوقات کے نزدیک صرف ایک ہی زندگی کی ضرورت ہے۔ اور وہ ہے غذا ۔۔۔ گیا ہستان کے ادنے بھینسے کے لئے یہ لذت بخش گھاس کے چند انچ لمبے تنکے اور پینے کا پانی ہے لیکن اس کے لئے اُسے کسی جنگل میں یا پہاڑ کے سایہ میں پناہ لینی پڑتی ہے۔ جانوروں کو غذا اور جائے پناہ کے علاوہ اور کسی چیز کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اس آب و ہوا میں ہم انسان کی ضروریات کو غذا، مکان، لباس اور ایندھن کی مد میں بڑی صحت کے ساتھ تقسیم کر سکتے ہیں۔ جب تک ہمیں یہ میسر نہیں آ جاتیں تب تک ہم آزادانہ طور پر اور کامیابی کے ساتھ زندگی کے مسائل پر غور کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ آدمی نے نہ صرف مکان ہی ایجاد کیے ہیں۔ بلکہ ملبوسات اور پکا ہوا کھانا بھی۔ غالباً آگ کی گرمی کی اتفاقیہ دریافت سے اور اس کے لگاتار استعمال سے اس کے پاس بیٹھنے کی موجودہ ضرورت بھی پیدا ہو گئی جبکہ آگ کے پاس بیٹھنا ابتدا میں ایک تعیش رہا ہوگا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بلیاں اور کتے بھی اسی قسم کی فطرتِ ثانی اختیار کر رہے ہیں۔ ہم پناہ گاہ اور لباس کے مناسب استعمال سے بجا طور پر اپنے جسم کی اندرونی حرارت کو برقرار رکھتے ہیں۔ لیکن ان کی کثرت یا ایندھن کی کثرت یعنی اندرونی حرارت سے زیادہ مقدار میں ملنے والی بیرونی حرارت

کو مدِنظر رکھتے ہوئے کیا ہم درست طور پر یہ نہیں کہہ سکتے کہ انہوں نے کھانا پکانے
کی ضرورت کا آغاز کیا؟ ماہرِ فطرت ڈارون نے ٹیرا ڈیل فیوگو کے باشندوں کے
بارے میں کہا تھا کہ میری جماعت کے لوگ جنہوں نے خوب کپڑے پہن رکھے تھے۔
اور آگ کے قریب بیٹھے تھے۔ سردی محسوس کر رہے تھے اور تعجب کی بات
ہے کہ وہاں کے ننگے اور وحشی باشندے جو آگ سے بہت دور تھے پسینے میں
نہائے ہوئے تھے" ہمیں نیوہالینڈر کے باشندوں کے بارے میں بتایا جاتا
ہے کہ وہ بالکل ننگے گھومتے ہیں۔ اور یورپ کے باشندے اپنے کپڑوں
میں بھی کانپتے رہتے ہیں کیا ان وحشیوں کی سخت جانی اور مہذب کسانوں کی نزاکت
کو کلّی کر دینا ناممکن ہے؟ لی بگ کے قول کے مطابق انسان کا جسم اسٹوو
(چولھا) ہے۔ اور غذا دہکنے والا ایندھن ہے جو پھیپھڑوں کی امداد سے حرارت کو قائم رکھتا ہے
موسم سرما میں ہم زیادہ کھاتے ہیں اور گرمیوں میں کم۔ یہ حرارت غریزی دہکتی آگ
کا نتیجہ ہوتی ہے۔ یہ آگ جب بہت تیز ہو جاتی ہے تو بیماری پیدا ہو کر موت
واقع ہو جاتی ہے۔ کیونکہ ایندھن کی کمی یا ہوائی رو میں نقص سے آگ بجھ جاتی ہے
[illegible] حرارت غریزی کو آگ نہیں سمجھ لینا چاہیے۔ یہ بات تو محض مثال کے
لئے ملتی جلتی کہی گئی تھی مندرجہ بالا فہرست سے ظاہر ہے کہ حیوانی زندگی کا انحصار
حرارت غریزی کے تقریباً تمام تر ہی ہے۔ کیونکہ غذا کو وہ ایندھن سمجھ لینا چاہیے جو ہمارے
جسم میں آگ روشن رکھتا ہے۔ دوسرا ایندھن کھانا پکانے [illegible] بیرونی اضافہ کے ساتھ
ہمارے اجسام کی [illegible] ہے۔ اسی طرح پناہ گاہ اور لباس کا یہ مقصد ہے
کہ وہ اس طرح پیدا اور جذب کی ہوئی حرارت کو برقرار رکھے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمارے جسموں کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ وہ گرم
[illegible] تاکہ ہم حرارت برقرار رہے۔ یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ ہم صرف

اپنی غذا اپنے کپڑوں اور اپنی پناہ گاہ پر ہی قناعت نہیں کرتے۔ بلکہ اپنے لیے بستر بھی بناتے ہیں جو ہماری شب خوابی کے لباس ہوتے ہیں۔ ہم یہ بستر پرندوں کے گھونسلے چھین کر اور ان کے سینے کے پر لوچ کر بناتے ہیں۔ یہ بستر پناہ گاہ کے اندر ایک اور پناہ گاہ ہوتا ہے۔ جیسے جھینگا اپنے بل کے سرے پر گھاس اور پتیوں کا بستر بنا لیتی ہے۔ ایک غریب آدمی یہ شکایت کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتا ہے کہ یہ دنیا بہت سرد ہے۔ ہم اس سردی کو جو معاشرتی سردی سے زیادہ ہے اپنے دکھوں کا براہ راست ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ بعض آب و ہوا ؤں میں موسم گرما ایک طرح سے انسان کے لئے فردوس کی زندگی ہوتا ہے اس موسم میں ایندھن کھانا پکانے کے سوا بالکل غیر ضروری ہو جاتا ہے۔ سورج ہی انسان کے لئے آگ کا کام دیتا ہے۔ بہت سے پھل اس کی کرنوں سے پک جاتے ہیں۔ غذا عام طور سے کئی اقسام کی ہوتی ہے۔ اور آسانی سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ لیکن کپڑے اور پناہ گاہ بالکل غیر ضروری یا نیم ضروری ہو جاتے ہیں۔ یہ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ آج کل اور اس ملک میں چند اوزار مثلاً چاقو، کلہاڑی، کدال، ہتھ گاڑی وغیرہ، پڑھنے کے لیے لیمپ کی روشنی، کاغذ قلم اور چند کتابیں دوسرے درجہ کی ضروریات ہیں اور بہت سستے داموں حاصل کی جا سکتی ہیں۔ اس کے باوجود چند احمق لوگ ایسے بھی ہیں جو دنیا کے دوسرے سرے پر واقع وحشی اور غیر صحت مند علاقوں میں جا کر دس یا بیس برس تک اس لیے تجارت کرتے ہیں کہ وہ زندہ رہ سکیں۔ یعنی اپنے آپ کو بڑے آرام سے گرم رکھ سکیں اور آخر کار نیو انگلینڈ میں واپس آکر مر جائیں۔ بہت زیادہ امیر آدمی صرف آرام ہی سے گرم نہیں رکھے جاتے بلکہ ان کو غیر قدرتی طور پر گرم رکھا جاتا ہے۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں۔ ان کو مروجہ طریقے سے پکایا جاتا ہے

۔ زندگی کی بیشتر عشرتیں اور بہت سی نام نہاد آسائشیں نہ صرف ناگزیر نہیں ہیں بلکہ

بنی نوع آدم کے ارتقا میں واقعی رکاوٹیں ہیں۔ جہاں تک زندگی کی عشرتوں اور آسائشوں
کا تعلق ہے۔ دانشمند انسان ہمیشہ غریبوں سے بھی زیادہ سادہ اور حقیر زندگی بسر
کرتے رہے ہیں۔ چین، ہندوستان، ایران اور یونان کے قدیم فلسفیوں کا ایک ایسا
طبقہ تھا جس سے ظاہری دولت میں کوئی زیادہ غریب اور اندرونی دولت میں کوئی زیادہ
امیر نہیں تھا۔ گو ہم ان کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتے ہیں۔ لیکن اتنی ہی بات
کافی حیرت انگیز ہے کہ ہم ان کے بارے میں اتنا تو جانتے ہیں۔ یہ بات جدید ترین
اصلاح پسندوں اور بنی نوع انسان کے محسنوں پر بھی صادق آتی ہے۔ جب تک کوئی اپنی
مرضی سے اپنے اوپر افلاس عائد کرنے کی بلندی پر کھڑا نہیں ہوتا تب تک وہ انسانی
زندگی کا غیر جانبدار اور ذہین نظارگی نہیں ہو سکتا عشرت پسندانہ زندگی کا ثمر عشرت
ہے۔ چاہے وہ عشرت زراعت سے متعلق ہو یا تجارت یا ادب یا آرٹ سے۔ آج
کل فلسفہ پڑھانے والے استاد تو موجود ہیں لیکن فلسفی نہیں ہیں بہرکیف فلسفی ہونے
کا دعوے کرنا بھی قابل تعریف ہے کیونکہ ایک وقت ایسا تھا جب فلسفی کی سی زندگی
بسر کرنا قابل تعریف سمجھا جاتا تھا فلسفی بننے کے لئے صرف اتنا ہی کافی نہیں ہے کہ کوئی
نازک اور گہرے خیالات رکھتا ہو یا کسی اسکول کا بانی ہو بلکہ فلسفی بننے کے لئے یہ ضروری
ہے کہ وہ عقل و دانش سے محبت کرتا ہو اور عقل کے احکام کے مطابق زندگی بسر کرتا ہو
جو سادگی، آزادی، فیاضی اور اعتماد پر مبنی ہو۔

فلسفی کا کام یہ ہے کہ وہ زندگی کے بعض مسائل نہ صرف نظریاتی طور پر بلکہ عملاً
حل کرے۔ عظیم دانشوروں اور مفکروں کی کامیابی عام طور سے درباریوں کی کامیابی کی مانند
ہوتی ہے جو نہ شاہانہ ہوتی ہے اور نہ مردانہ۔ وہ عملاً اپنے آباؤ اجداد کی ڈگر پر چلتے
رہتے ہیں اور کسی لحاظ سے انسانوں کی عظیم الشان نسل کے موسس نہیں ہوتے۔ لیکن
انسانوں میں آخر اختلاط کیوں آ جاتا ہے؟ خاندان پست و نابود کیوں ہو جاتے ہیں؟ اس

عشرت پسندی کی نوعیت کیا ہے؟ جو قوموں کو کمزور اور تباہ کر دیتی ہے؟ کیا ہمیں یقین ہے کہ ہماری زندگیوں میں اس قسم کی کوئی عشرت موجود نہیں ہے؟ فلسفی زندگی کی ظاہری صورت میں بھی اپنے زمانہ سے آگے ہوتا ہے۔ اُسے اپنے ہمعصروں کی طرح غذا، مکان، لباس اور حرارت میسر نہیں آتی۔ کوئی شخص دوسرے لوگوں سے بہتر طریقے اختیار کر کے اپنی اہم حرارت کو برقرار رکھے بغیر کیونکر فلسفی بن سکتا ہے؟

جب کوئی آدمی اپنے آپ کو ان طریقوں سے گرم رکھتا ہے جن کا میں نے ذکر کیا ہے۔ تو پھر وہ اس کے بعد کیا چاہتا ہے؟ یقیناً اس کو اسی قسم کی حرارت کی ضرورت نہیں ہوتی یعنی نہ زیادہ اور مقوی غذا کی۔ نہ زیادہ وسیع و عریض اور شاندار مکانوں کی، نہ عمدہ اور کثیر کپڑوں کی اور نہ زیادہ مقدار میں مسلسل اور زیادہ تیز آگ وغیرہ کی۔ جب وہ ضروریاتِ زندگی حاصل کر لیتا ہے تو پھر فضول چیزیں حاصل کرنے کی خواہش کا ایک اور بدل پیدا ہو جاتا ہے یعنی اب وہ زندگی کی نئی مہم شروع کر دیتا ہے۔ کیونکہ حقیر مشقت سے نجات کی ابتدا ہو جاتی ہے اُسے مٹی بیج کے لئے موزوں دکھائی دیتی ہے کیونکہ وہ اپنی جڑ زمین کے اندر پہنچا چکا ہے۔ اور اب وہ بڑے اعتماد کے ساتھ کونپلیں اوپر کھینچ سکتا ہے۔ انسان نے اپنی جڑیں اتنی مضبوطی سے زمین میں کیوں گاڑی ہیں؟ کیا اس لئے کہ وہ اسی تناسب سے اوپر آسمان میں اُٹھ سکے؟ اچھے درختوں کی قیمت اُن کے پھلوں سے لگائی جاتی ہے۔ کیونکہ وہ اپنے پھل زمین سے دور اوپر ہوا اور روشنی میں دیتے ہیں۔ ان کے ساتھ حقیر غذائی پودوں جیسا سلوک نہیں کیا جاتا جو دو سالہ ہوتے ہیں۔ مگر ان کی کاشت اس وقت تک کی جاتی ہے جب تک ان کی جڑیں مضبوط نہیں ہو جاتیں۔ اس مقصد کے لئے اکثر اوقات انہیں اوپر سے اسطرح کاٹ دیا جاتا ہے کہ بیشتر لوگ ان کے کھِلنے کے موسم میں بھی ان کو پہچان نہیں سکتے

میں طاقتور اور بہادر لوگوں کے لیے کوئی اصول پیش نہیں کرنا چاہتا وہ جنت ہو یا جہنم ہر جگہ اپنے کام سے واسطہ رکھتے ہیں اور اپنے آپ کو غریب بنائے بغیر انتہائی دولتمند لوگوں سے زیادہ عظیم الشان مکان بنا لیتے ہیں۔ اور اُن سے زیادہ خرچ کرتے ہیں۔ اُن کو یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کیسے جئے جا رہے ہیں۔ انہیں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے واقعی کوئی خواب حقیقت بن گیا ہو؟ میں ان لوگوں کو بھی کوئی ہدایت نہیں دے سکتا جو موجودہ حالات سے واضح طور پر تحریک اور ہمت حاصل کرتے ہیں اور اب دور سے ایک عاشق کی سی شیفتگی اور ذوق و شوق کے ساتھ لطف اندوز ہوتے ہیں۔ میں بھی صرف اپنے آپ کو ان لوگوں کے زمرے میں شامل سمجھتا ہوں۔ میں ان لوگوں سے بھی مخاطب نہیں ہوں جو کیسے ہی حالات کیوں نہ ہوں اچھے روزگار سے لگے ہوں اور جانتے ہیں کہ ان کا روزگار اچھا ہے یا بُرا۔ میں زیادہ تر اُن عوام الناس سے مخاطب ہوں جو قانع نہیں ہیں اور اپنے زمانے یا قسمت کی فضول شکایت کرتے ہیں حالانکہ وہ اپنے حالات کو سدھار سکتے ہیں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو زوردار اور عدم اطمینان کے انداز میں شکوہ کرتے ہیں کیونکہ وہ اپنے قول کے مطابق اپنا فرض ادا کر رہے ہوتے ہیں۔ میرے ذہن میں وہ دکھاوے کے دولت مند ہیں جو دراصل حد سے زیادہ مفلس ترین طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں جنہوں نے کچھ کوڑا کرکٹ تو جمع کر لیا ہے۔ مگر جن کو یہ معلوم نہیں کہ اُسے کیسے استعمال کریں یا اس سے کیسے نجات پائیں اور اس طرح انہوں نے اپنے سونے اور چاندی کی بیڑیاں خود ڈھال لی ہیں۔

میں اگر یہ بتانے کی کوشش کروں کہ میں گذشتہ برسوں میں اپنی زندگی کس طرح گذارنا چاہتا ہوں تو غالباً میرے اُن قارئین کو حیرت ہوگی جو میری زندگی کی اصل تاریخ سے واقف ہیں۔ ان کو تو یقیناً حیرت ہوگی جو اس کے بارے میں

کچھ نہیں جانتے۔ میں صرف ایسی چند مہمات کی طرف اشارہ کروں گا جن کے میں خواب دیکھتا رہا ہوں۔

مجھے ہر موسم میں دن ہو یا رات یہ فکر رہتی تھی کہ میں اپنے وقت کو بہتر بناؤں اور اسے اپنی یادداشت کی تختی پر کندہ بھی کرتا رہوں۔ میں ازل و ابد یعنی ماضی و حال کے سنگم پر جو صاف طور سے لمحۂ حاضر ہو کھڑا رہوں اور یہی رسّی کھینچتا رہوں۔ میری باتوں میں جو ابہام ہے آپ اُسے معاف کر دیجئے۔ کیونکہ میرے کاروبار میں بیشتر لوگوں کے کاروبار کی نسبت زیادہ بھید ہیں۔ میں یہ راز قصداً نہیں چھپا رہا ہوں۔ یہ اس کاروبار کا جزوِ لاینفک ہیں۔ میں اس کاروبار کے بارے میں جو کچھ جانتا ہوں بخوشی بیان کر دوں گا اور اپنے دروازہ پر یہ ہرگز نہیں لکھوں گا کہ "داخلہ ممنوع ہے"۔

مدت ہوئی میرا ایک شکاری کتا، ایک سبز گھوڑا اور ایک فاختہ گم ہو گئے میں ابھی تک اُن کی تلاش میں ہوں۔ میں کئی راہگیروں سے اُن کا اتا پتا پوچھا ہے اور اُن کو بتاتا رہا ہوں کہ وہ کس راستے سے گئے ہیں اور اُن کو بلانے کا طریقہ کیا ہے۔ ایک دو مسافر ایسے بھی ملے جنہوں نے شکاری کتے کے بھونکنے اور گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنی تھی اور فاختہ کو بادل کی اوٹ میں غائب ہوتے دیکھا تھا اور وہ ان کی بازیابی کے اتنے خواہاں تھے جیسے انہوں نے خود وہ جانور کھو دیئے ہوں۔

میرا یہ کاروبار رہا ہے کہ نہ صرف طلوعِ آفتاب اور صبح کاذب دیکھوں بلکہ ممکن ہو تو ساری ہی قدرت کا مشاہدہ کروں۔ سردیوں اور گرمیوں کی کتنی ہی صبحوں کو میں اپنے پڑوسیوں کے کام پر جانے سے پہلے اپنے کام پہ پہنچتا رہا ہوں۔ بلا شک و شبہ میرے بہت سے قصبہ والے اپنے کاموں سے واپس آتے ہوئے مجھ سے ملے ہیں۔ یہ وہ کسان تھے جو چاندنی میں بوسٹن کے لئے روانہ ہوتے تھے۔

یا وہ لکڑ ہارے جو لکڑیاں کاٹنے کے لئے نکل پڑتے تھے۔ یہ درست ہے کہ میں نے آفتاب کو طلوع ہونے میں کبھی مدد نہیں دی۔ لیکن اس میں شک نہ کیجئے کہ آفتاب کے طلوع ہونے کے وقت میرا موجود ہونا بھی کچھ کم اہم نہ تھا۔

میں نے خزاں کے بہت سے ایام اور ہاں جاڑے کے دن بھی۔ وہ آواز سننے کی کوشش میں شہر کے بازار میں گذار دیئے ہیں جو ہوا میں ہے تاکہ اسے سنوں اور دوسروں تک پہنچاؤں۔ میں تقریباً اپنا سارا سرمایہ اس سودے میں لگا چکا ہوں۔ نہ صرف سارا سرمایہ لگا چکا ہوں بلکہ ہوا کی مخالف سمت میں دوڑتے ہوئے اپنا سانس بھی کھو چکا ہوں۔ اگر یہ بات دو سیاسی پارٹیوں میں سے ایک سے متعلق ہوتی تو یقین کیجئے کبھی کی گزٹ میں شائع ہو چکی ہوتی۔ میں دوسرے مواقع پر کسی چٹان یا درخت کو بطور رسدگاہ استعمال کرکے دیکھتا تھا کہ شاید ہوا کسی نئی بات کی آمد کا پتہ دے۔ یا شام کو پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کر اس بات کا منتظر رہتا تھا کہ شاید آسمان گر پڑے اور میں کوئی چیز دبوچ سکوں۔ لیکن میں کچھ زیادہ چیزیں نہ دبوچ سکا۔ آسمان سے اگر کچھ گرتا بھی تو وہ من سلویٰ کی طرح دوبارہ سورج میں جذب ہو جاتا۔

میں ایک مدت تک ایک ایسے اخبار کا نامہ نگار رہا جس کی اشاعت زیادہ نہ تھی۔ اس کے ایڈیٹر نے میرے بیشتر مضامین شائع کرنا مناسب خیال نہیں کیا۔ اور جیسا کہ عموماً ادیبوں کا انجام ہوتا ہے۔ میری محنت کا کوئی معاوضہ نہ ملا۔ بہرکیف اس معاملے میں میری محنت ہی میرا انعام تھی۔

میں نے کئی برسوں تک اپنے آپ کو بارش اور برف کے طوفانوں کا انسپکٹر مقرر کئے رکھا۔ میں نے بڑی وفاداری سے اپنے فرائض سرانجام دیئے۔ میں نے اپنے آپ کو شاہراہوں کا نہیں جنگل کی پگڈنڈیوں اور ان کے کونے کونے تک پہنچنے والے راستوں کی پیمائش کرنے والا بنائے رکھا۔ میں نے ان تمام رہگذاروں کو کھلا رکھا۔

میں نے ہر موسم میں ان گھاٹیوں اور پُلوں کو قابلِ عبور رکھا۔ جن پر چل کر لوگوں نے اُن کے مفید ہونے کی تصدیق کی تھی۔

میں نے قصبے کے اُن وحشی ڈھور ڈنگروں کی دیکھ بھال کی ہے جو باڑھیں باندھ کر وفادار چرواہوں کو بہت پریشان کرتے ہیں جب فارم کے ان گوشوں اور ٹکڑوں پر نگاہ رکھتا تھا جہاں کوئی نہیں جاتا میں یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ جوناس اور سالومن آج کسی خاص کھیت میں کام کر رہے ہیں یا نہیں۔ اس لئے کہ مجھے اُن کے کام سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ میں نے سُرخ ہیکل بری، نیلے تناہ دانے، اچھوا کے درخت، سُرخ صنوبر، سیاہ ریلش، سفید انگور اور زرد بنفشے کی آبیاری کی ہے۔ ورنہ وہ خشک موسم میں مُرجھا جاتے۔

قصّہ کوتاہ میں ایک مدت تک یہ کام کرتا رہا۔ اور میں یہ بات ڈینگ مارے بغیر کہہ سکتا ہوں، اور بڑی ایمانداری سے اپنے فرائض انجام دیتا رہا۔ حتیٰ کہ مجھ پر یہ بات زیادہ سے زیادہ روشن ہوگئی کہ میرے قصبہ والے مجھے قصبہ کے افسروں کی فہرست میں شامل نہیں کریں گے اور نہ مجھے تھوڑا سا الاؤنس دے کر وہ عہدہ دیں گے جس میں کوئی کام نہیں کرنا پڑتا۔ میں نے اپنے حسابات کو جن کے متعلق میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اُنہیں بڑی ایمانداری سے لکھا ہے، کبھی آڈٹ نہیں کیا یا پھر بھی ان کو نہ منظور کیا گیا اور نہ ادا اور بیباق کیا گیا بہرحال مجھے اس کا کوئی ملال نہیں

تھوڑے ہی دنوں کی بات ہے کہ ایک انڈین میرے پڑوس میں مقیم ایک نامور وکیل کے گھر ٹوکریاں بیچنے گیا اس نے پوچھا "کیا آپ ٹوکریاں خریدنا چاہتے ہیں۔؟" جواب ملا "نہیں ہمیں کوئی ٹوکری نہیں چاہیئے۔ انڈین نے پھاٹک سے باہر جاتے ہوئے کہا "کیا آپ ہمیں بھوکوں مارنا چاہتے ہیں!"

اس نے اپنے مختصر سفید فام ہمسایوں کو دیکھا تھا کہ وہ بہت خوشحال ہیں۔ اور وہ وکیل صرف دلائل کے جال بنتا تھا اور اس نے کسی جادو کے اثر سے عزت حاصل کر لی تھی اور دولت کے انبار لگا لئے تھے۔ اس نے اپنے آپ سے کہا۔ "میں بھی کوئی کاروبار شروع کروں گا۔ میں ٹوکریاں بنوں گا۔ یہ کام میں کر سکتا ہوں۔" انڈین نے یہ سوچا تھا کہ جب وہ ٹوکریاں بن لے گا تو اپنے قرض سے سبکدوش ہو جائے گا۔ اس کے بعد سفید فام آدمی کا فرض ہوگا کہ وہ اس کی ٹوکریاں خرید لے۔ انڈین کو یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ دوسروں کے لئے ٹوکریاں خریدنا ضروری بنا دے یا اسے یہ سوچنے پر مجبور کر دے کہ ٹوکریاں خریدنا اس کے لئے ضروری ہے یا پھر وہ کوئی ایسی چیز بنائے جسے خریدنا گورا آدمی اپنے لئے مفید سمجھے۔ میں نے بھی ایک نفیس اور نازک ٹوکری بنی تھی اور میں نے اسے کسی کے لئے اتنا مفید نہیں بنایا تھا کہ وہ اسے خرید لے۔ میں نے اپنے معاملہ میں یہ سوچا تھا کہ اسے بن کر اپنے لئے مفید بناؤں اور میں نے اس بات کا مطالعہ کرنے کی بجائے کہ کیسے اپنی ٹوکریوں کو دوسرے آدمیوں کے لئے اتنا مفید بنا سکتا ہوں کہ وہ انہیں خرید لیں۔ میں نے اس بات کا مطالعہ کیا کہ کیسے ان کو فروخت کرنے کی ضرورت سے گریز کروں جس زندگی کی لوگ تعریف کرتے ہیں اور جسے کامیاب سمجھتے ہیں۔ وہ زندگی کی صرف ایک قسم ہے۔ ہم ایک قسم کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے سے دوسری قسم کی اہمیت کو کیوں گھٹائیں؟

میں نے یہ جان کر کہ میرے ساتھی مجھے شہری عدالت میں کوئی جگہ نہیں دیں گے، کسی نائب پادری کا عہدہ بھی نہیں دینگے یا کہیں اور میرے روزگار کا بندوبست نہیں کریں گے یہ فیصلہ کیا کہ مجھے خود ہی کہیں منتقل ہو جانا چاہیئے

میں نے پہلے سے بھی زیادہ جنگل کی طرف رُخ کیا جس سے میں زیادہ واقف تھا۔ میں نے طے کیا کہ معمول کے مطابق سرمایہ حاصل کرنے کا انتظار کئے بغیر جو تھوڑے سے ذرائع میرے پاس ہیں اُنہیں سے اپنا کاروبار شروع کر دوں والڈن پونڈ پر میرے جانے کا مقصد یہ نہیں تھا کہ وہاں سستی یا مہنگی زندگی بسر کروں بلکہ یہ تھا کہ بہت کم روک ٹوک سے اپنا کچھ نجی کام کروں۔ وہ ایسے کام تھے جن کو پورا کرنے لیے، اگر تھوڑی سی عقل، تھوڑی سی ہمت اور تاجرانہ سوجھ بوجھ سے کام نہ لیا جاتا تو وہ یاس انگیز اور احمقانہ ثابت ہوتے۔

میں نے اس بات کی ہمیشہ کوشش کی ہے کہ سخت قسم کی تاجرانہ عادتیں اختیار کر لوں یہ عادتیں ہر شخص کے لئے ناگزیر ہیں۔ اگر آپ سلطنتِ چین سے تجارت کر رہے ہیں تو آپ کو سیلم بندرگاہ میں ساحل پہ حساب کتاب کا چھوٹا سا گھر رکھنا کافی ہوگا۔ آپ وہ چیزیں برآمد کریں گے جو اس ملک میں ہوتی ہیں خالص دیسی اشیا مثلاً بہت سی برف، صنوبر کی عمارتی لکڑی اور عمارت سازی میں کام آنے والا پتھر۔ آپ یہ ساری اشیا دیسی جہازوں میں بھیجیں گے یہ اچھی مہمات ہوں گی۔ ساری تفاصیل کی خود نگرانی کرنا، خود جہازران اور خود کپتان ہونا، خود مالک اور خود بیمہ کرنے والا ہونا، خود ہی بیچنا اور خریدنا، حساب رکھنا، موصول ہونے والا ہر ایک خط پڑھنا، خود ہی بھیجا جانے والا خط لکھنا اور پڑھنا، رات دن درآمدی اشیا کے اتارے جانے کی نگرانی کرنا اور بیک وقت ساحل کے مختلف حصوں پر موجود رہنا۔ اکثر قیمتی مال جرسی کے ساحل پر اتارا جاتا ہے۔ آپ خود ہی اپنے پیغام رساں ہوتے ہیں۔ اُفق تا اُفق سفر کرتے ہیں۔ ساحل کی طرف جاتے ہوئے تمام جہازوں سے نامہ و پیام جاری رکھتے ہیں۔ آپ باقاعدگی سے دور افتادہ اور مہنگی منڈیوں میں اجناس

بھیجتے رہتے ہیں۔ منڈیوں کے اتار چڑھاؤ اور ہر جگہ امن و جنگ کے حالات سے اپنے آپ کو باخبر رکھتے ہیں تجارت و تہذیب کے رجحانات کا اندازہ لگاتے رہتے ہیں کھوج لگانے والی تمام مہموں کے نتائج سے فائدہ اٹھاتے ہیں ۔ نئے بحری راستے اور جہازرانی سے متعلق تمام ترقیوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ بحری نقشوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ساحلی چٹانوں، روشنی کے میناروں اور سرائے پیپوں کی پوزیشن کے بارے میں اپنا اطمینان کرتے ہیں اور ہمیشہ لوگارتھم کے گوشواروں کو درست کرتے رہتے ہیں کیونکہ اس کے حساب میں ذراسی غلطی سے باعث جہاز جیسے کسی دوست ملک کی گودی میں پہنچ جانا یا چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جانا ہے لا پیروس جہاز کا جو حشر ہوا تھا وہ بیان سے باہر ہے۔ عالمی سائنس کی رفتار ترقی کا ساتھ دینا پڑتا ہے۔ ہنو اور فینیقیوں سے لے کر آج تک جتنے موجد، جہازران عظیم مہم چلانے والے اور تاجر ہوئے ہیں ان کے سوانح حیات کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے اور وقتاً فوقتاً اپنی اشیاء کے تمام اسٹاک کی پڑتال کرنی پڑتی ہے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ آپ کہاں کھڑے ہیں۔ یہ ایک ایسی مشقت ہے جو انسان کو اپنی ساری صلاحیتیں کام میں لانے پر مجبور کرتی ہے۔ مثلاً نفع، نقصان، سود، ظرف و مظروف اور ہر طرح کے ناپ تول کے مسائل جن کو حل کرنے کے لئے دنیا بھر کے علم کی ضرورت ہوتی ہے۔

میں نے یہ خیال کیا کہ والڈن پونڈ کاروبار کرنے کے لئے ایک اچھی جگہ ثابت ہو گا۔ صرف اس لئے نہیں کہ وہاں تک ریلوے لائن ہے اور برف کی تجارت ہوتی ہے۔ بلکہ کچھ اور فائدے بھی ہیں جن کو منکشف کرنا مناسب نہیں۔ یہ ایک اچھی بندرگاہ ہے اور کاروبار کے لئے یہاں ٹھوس بنیاد موجود ہے۔ وہاں نیوا جیسی دلدل بھی نہیں ہے کہ جسے پُر کرنا پڑے۔ ویسے آپ کو ہر جگہ اپنے ہی گاڑے ہوئے ستونوں

یہ عمارت تعمیر کرنی ہو گی۔ کہا جاتا ہے کہ کچھوا کے چلنے سے پیدا ہونے والی طوفانی لہر اور نیوا کی برف سینٹ پیٹرزبرگ کو روئے زمین سے معدوم کر دے گی۔

چونکہ یہ کاروبار سرمایہ کے بغیر شروع کرنا تھا اس لئے یہ سوچنا آسان نہ تھا کہ وہ ذرائع کہاں سے آئیں گے۔ جو اس قسم کے کاروبار کے لئے ناگزیر ہوتے ہیں۔ جہاں تک کپڑوں کا تعلق ہے ہم کپڑے حاصل کرنے میں اُن کے مصرف سے زیادہ اکثر لوگوں کی رائے اور اُن کے الوکھے پن سے متاثر ہو جاتے ہیں جس شخص کو کوئی کام کرنا ہے اُسے یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ لباس کا پہلا مقصد یہ ہے کہ وہ حرارت عزیزی کو قائم رکھے اور دوسرا یہ کہ وہ سماجی تقاضوں کے مطابق عریانی کو ڈھانپے۔ وہ ان عناصر کو مدِ نظر رکھتے ہوئے فیصلہ کر سکتا ہے کہ وہ ملبوسات کے ذخیرہ میں اضافہ کئے بغیر کتنا ضروری اور اہم کام سرانجام دے سکتا ہے۔ بادشاہ اور ملکہ ایک لباس صرف ایک وقت پہنتے ہیں۔ اگرچہ وہ لباس شاہی درزی کا سیا ہوتا ہے۔ وہ اس آسائش کو نہیں جان سکتے۔ جو جسم پر ٹھیک آنے والے سوٹ سے میسر آتی ہے۔ وہ تو لکڑی کے ایسے گھوڑے ہیں۔ جن پر صاف کپڑے لٹکا دیئے جاتے ہیں۔

ہمارے ملبوسات ہر روز ہمارے جسموں سے مانوس ہوتے چلے جاتے ہیں اور ان سے پہننے والے کا کردار ابھر آتا ہے۔ اگر ہم ان کو اتار پھینکنے میں دیر لگا دیتے ہیں۔ اور ان کا اسی طرح علاج کرتے ہیں۔ جس طرح ہم اپنے جسموں کا کرتے ہیں۔ میری نظر میں کسی شخص کی قدر و قیمت اس لئے کم نہیں ہوتی کہ اس کے کپڑوں میں پیوند لگا ہوا تھا۔ پھر بھی میں یہ یقین رکھتا ہوں کہ عام طور سے لوگوں کو صاف ضمیر رکھنے کی بجائے یہ تشویش رہتی ہے کہ وہ صاف ستھرے فیشن کے مطابق پیوندوں کے بغیر لباس پہنیں اگر کوئی شخص اپنا پھٹا ہوا کپڑا نہیں سلواتا تو زیادہ سے زیادہ اس پر یہ الزام آئے گا کہ وہ لاابالی ہے۔ میں

بعض اوقات اپنے شناساؤں کا یوں امتحان لیتا ہوں۔ ذرا دیکھوں تو سہی کہ کون
اپنی پتلون پیوند لگا کر یا دو سے زیادہ سیونیں سلوا کر پہنتا ہے؟ بیشتر لوگ
اس رویہ کا اظہار کرتے ہیں۔ کہ اگر انہوں نے ایسا کیا تو ان کی زندگی کے امکانات
تباہ ہو جائیں گے ان کے لئے قصبہ تک ٹوٹی ہوئی ٹانگ سے لنگڑا کر جانا آسان
ہوتا ہے مگر وہ پھٹی ہوئی پتلون پہن کر نہیں چل سکتے۔ اکثر جب کسی معزز شخص
کی ٹانگوں کو حادثہ پیش آتا ہے۔ تو وہ ان کو درست کر لیتا ہے۔ لیکن جب اس
کی پتلون کی ٹانگوں کو ایسا ہی حادثہ پیش آتا ہے۔ تو وہ ان کو درست نہیں
کرتا کیونکہ وہ اس بات پر دھیان نہیں دیتا۔ جو واقعی قابلِ احترام ہے۔
بلکہ اس بات پر توجہ دیتا ہے جس کی دوسرے عزت کرتے ہیں۔ ہم بہت
کم انسانوں کو جانتے ہیں۔ لیکن بہت سے کوٹوں اور برجسوں سے واقف ہوتے
ہیں۔ آپ اپنا وہ لباس جو ابھی تک آپ پہنے ہوئے تھے کسی بجوکے کو پہنا دیجئے
اور آپ پاس ہی برہنہ کھڑے ہو جائیے۔ کون ہے جو اس بجوکے کو سلام نہیں کریگا؟
اگلے روز میں اناج کے کھیت سے گزرا۔ تو میں نے ایک ڈنڈے پر ٹوپی اور کوٹ
لٹکا ہوا دیکھا تھا میں نے کھیت کے مالک کو پہچان لیا۔ وہ اس وقت سے کچھ
زیادہ ہی طوفان زدہ تھا جب پہلی بار میں نے اسے دیکھا تھا۔ میں نے ایک
کتے کے بارے میں سنا تھا کہ وہ ہر اس اجنبی پر بھونکنے لگتا تھا۔ جو کپڑے پہن کر
اس کے مالک کے مکان میں آتا تھا لیکن ایک ننگے چور کو دیکھ کر وہ خاموش
رہا تھا۔ یہ ایک بڑا دلچسپ سوال ہے کہ اگر لوگوں کے کپڑے اتار کر ان کو ننگا
کر دیا جائے تو کس حد تک ان کے مراتب میں فرق باقی رہ جائے گا؟ کیا آپ
ایسی حالت میں یہ بتا سکیں گے کہ کون سے اشخاص انتہائی قابلِ احترام طبقہ سے
تعلق رکھتے تھے؟ جب مادام فی فر دنیا کے گرد اپنی سیاحتی مہموں کے بعد مشرق

سے مغرب کی طرف اپنے ، وطن کے قریب ایشیائی روس تک پہنچیں تو ان کا کہنا ہے کہ ان کا جی چاہا کہ وہ حکام سے ملنے کے لئے سفری لباس کی بجائے کوئی اور لباس پہن کر جائیں کیونکہ اب وہ ایک مہذب ملک میں تھیں جہاں لوگوں کے بارے میں اُن کے کپڑوں کی بنا پر رائے قائم کی جاتی ہے! ہمارے جمہوری نیو انگلینڈ کے قصبوں میں اس شخص کی ہر طرح سے عزت کی جاتی ہے۔ جس کے پاس اتفاقیہ دولت آ جاتی ہے اور جو لباس اور اپنے ساز و سامان میں اس دولت کی نمائش کرتا ہے۔
لیکن جو لوگ اس قسم کی عزت افزائی کرتے ہیں وہ اگرچہ ان کی تعداد بہت زیادہ ہے ناستک ہیں اور ضرورت اس بات کی ہے کہ کسی مبلغ کو ان کے درمیان بھیجا جائے علاوہ ازیں کپڑوں ہی سے سلائی کا کام شروع ہوا ۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک ایسا کام ہے جو کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ کم سے کم عورت کا لباس تو کبھی مکمل ہی نہیں ہوتا۔
اگر کسی شخص کو کوئی کام مل گیا ہے تو اسے یہ کام انجام کرنے کیلئے نئے سوٹ کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ وہ اپنے پرانے سوٹ ہی سے کام چلائے گا۔ جو ایک کوٹھڑی میں غیر معین عرصہ سے گرد میں اَٹا ہوا پڑا ہے۔ ایک ہیرو کا پرانا جوتا اس کے پیروں میں اس کے خدمت گار کے پیروں کی نسبت زیادہ چلے گا۔ بشرطیکہ اس ہیرو کا کوئی خدمتگار ہو۔ ننگے پاؤں جوتوں سے زیادہ پرانے ہیں اور ہیرو ان ہی سے کام چلا سکتا ہے۔ صرف اُن لوگوں کو نئے کوٹوں کی ضرورت پڑتی ہے جو جلسوں اور قانون ساز مجلس کے ہال میں جاتے ہیں کیونکہ وہاں کوٹ اکثر اوقات یوں بدلے جاتے ہیں جس طرح انسان بدل دیئے جاتے ہیں۔ اگر میں اپنے کوٹ؟ پتلون ، ٹوپی اور جوتے پہن کر خدا کی عبادت کر سکتا ہوں۔ تو دوسرا کوئی کام کیوں نہیں کر سکتا؟ کس نے اپنے پرانے جوتے دیکھے ہیں۔ یعنی کس نے اپنا واقعی گھسا ہوا پرانا کوٹ دیکھا ہے جس کا ایک غریب لڑکے کو دیا جانا کارِ خیر بھی نہیں رہا تھا؟ ہو سکتا تھا کہ اس غریب لڑکے نے وہ کوٹ اپنے سے زیادہ غریب یا امیر لڑکے

کو دے دیا ہوتا جو اس سے بھی کم میں اپنا کام چلا سکتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ان تمام مہموں سے ہوشیار رہیں جن کو سر کرنے میں نئے کپڑے پہننے والوں کی بجائے نئے کپڑوں کی ضرورت ہو۔ اگر آپ کوئی مہم سر کرنا چاہتے ہیں تو اسے پرانے کپڑے پہن کر ہی سر کرنے کی کوشش کیجئے ہر ایک انسان کچھ نہ کچھ ترک کرنے کی بجائے کچھ نہ کچھ کرنا یا کچھ نہ کچھ بننا چاہتا ہے۔

ہمیں چاہیئے کہ ہم اس وقت تک نیا سُوٹ نہ بنوائیں جب تک پرانے سُوٹ میں رہ چاہے وہ کتنا ہی گھسا ہوا اور میلا کیوں نہ ہو۔ ایسے کام ایسی مہمیں اور ایسی سیاحتیں نہ کریں جن سے ہم اپنے آپ کو پرانے آدمی کے روپ میں نیا آدمی محسوس کرنے لگیں اور یہ سمجھنے لگیں کہ پرانے کوٹ کو برقرار رکھنا ایسا ہی ہے جیسے پرانی بوتلوں میں نئی شراب کو۔

ہماری کرنیز کا موسم پرندوں کے پر جھاڑنے کے موسم کی طرح ہماری زندگیوں میں سنکٹ کا زمانہ ہونا چاہیئے۔ مرغابی اس زمانہ کو بتانے کے لئے تنہا کسی تالاب پر چلی جاتی ہے۔ اس طرح اندرونی محنت اور پھیلاؤ سے سانپ اپنی کینچلی اتارتا ہے۔ اور رینگنے والا کیڑا اپنا گرم کوٹ۔ ہم ایسا نہیں کریں گے تو نقلی زندگی بسر کریں گے اور ایک نہ ایک دن خود اپنی رائے میں اور انسانیت کی زندگی میں ذلیل و خوار ہوں گے۔

ہم کپڑوں پر کپڑے پہنتے ہیں۔ گویا ہم ایسے پودے ہیں۔ بیرونی اضافہ ہونے کے ساتھ بڑھتے ہیں۔ ہمارے جسم کا بیرونی حصہ اور اکثر ہمارے نفیس کپڑے ہمارے باہر کی جلد یا مشترکی کھال ہیں جو ہماری زندگی کا جزو نہیں ہیں۔ اور کسی مہلک زخم کے بغیر اتار کر پھینکے جا سکتے ہیں۔ ہمارے موٹے کپڑے جن کو ہم لگاتار پہنے رہتے ہیں۔ ہماری خلیہ دار کھال یا پوست ہیں۔ ہماری قمیصیں جو ہمارا اصل چھال ہے جس کو توڑے مروڑے بغیر الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اس طرح انسان تباہ ہو جاتا ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ تمام نسلیں کسی نہ کسی موسم میں قمیص جیسی کوئی چیز ضرور پہنتی ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ آدمی اتنا سادہ لباس پہنے کہ

وہ اندھیرے میں اپنے جسم پہ ہاتھ رکھ سکے۔ اور اس طرح ہر وقت کربستہ رہے
کہ اگر کوئی دشمن قصبے پر قبضہ کر لے تو وہ بوڑھے فلسفی کی طرح کسی پریشانی کے
بغیر خالی ہاتھ پھاٹک سے باہر جا سکے۔ ایک موٹا کپڑا تین باریک کپڑوں کے
برابر ہوتا ہے۔ اور سستے کپڑے گاہکوں کی جیب کے مطابق حاصل کیے جا سکتے ہیں
ایک موٹا کوٹ پانچ ڈالر میں آتا ہے۔ اور پانچ برس تک چلتا ہے۔ موٹی پتلون دو
ڈالر میں آتی ہے۔ گائے کی کھال کے بوٹ ڈیڑھ ڈالر میں۔ گرمیوں کی ٹوپی ایک
چوتھائی ڈالر میں۔ سردیوں کی ٹوپی ڈھائی سینٹ میں۔ اس سے بہتر ٹوپی برائے
نام لاگت سے گھر پر تیار کی جا سکتی ہے۔ وہ شخص جو اپنی کمائی خرچ کر کے ایسا
سوٹ پہنتا ہے۔ اتنا غریب کہاں رہے گا۔ اور کیا ایسے دانشمند انسان
نہیں مل سکیں گے۔ جو اس کی عزت کریں۔

جب میں ایک خاص طرز کا کپڑا مانگتا ہوں تو میری درزن بڑی سنجیدگی کے
ساتھ مجھے یہ بتاتی ہے "اب لوگ اس قسم کے کپڑے تیار نہیں کرتے"۔ درزن لفظ
"لوگ" پر زیادہ زور نہیں دیتی۔ گویا وہ مقدر جیسی غیر شخصی حاکم کا حکم سنا رہی
ہو۔ اور مجھے اپنی مرضی کا کپڑا حاصل کرنے میں دشواری پیش آتی ہے۔ محض اس
لئے کہ درزن کو اعتبار ہی نہیں آتا۔ کہ میں وہی کپڑا چاہتا ہوں۔ جو میں اپنی زبان
سے کہہ رہا ہوں۔ وہ سمجھتی ہے کہ میں اتنا ناعاقبت اندیش کیسے ہو سکتا ہوں۔
جب میں اس کا الہامی جملہ سنتا ہوں۔ تو ایک لمحہ کے لیے سوچ میں ڈوب جاتا
ہوں اور اپنے دل میں ایک ایک لفظ کی اہمیت پر جدا جدا زور دیتا ہوں تاکہ
میں اس کا مطلب اچھی طرح سمجھ سکوں۔ اور اس بات کا پتہ چلا سکوں کہ کس حد تک
وہ لوگ مجھ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور ان کو میرے نجی معاملہ میں دخل دینے کا کہاں
تک حق ہے۔ آخر کار میں بھی اس کو اسی طرح کا پراسرار جواب دینے پر مجبور ہو جاتا ہوں

اور اس کے "لوگ" پر کوئی زور نہیں دیتا۔ یہ درست ہے کہ لوگ پہلے ایسے کپڑے تیار نہیں کراتے تھے مگر اب کراتے ہیں" وہ اگر میرا کردار نہیں ناپ سکتے تو میرا ناپ لینے سے کیا فائدہ۔ کیا میرے چوڑے شانے کوئی کھونٹی ہیں جن پر کوٹ لٹکایا جائے؟ ہم حسن وجمال اور دلآویزی کی دیویوں کو پوجنے کی بجائے فیشن کی دیوی کو پوجتے ہیں۔ وہ اپنی مرضی سے کاتتی ہے بنتی ہے اور کاٹتی ہے۔ پیرس میں بندروں کا سردار سر پر سفری ٹوپی رکھ لیتا ہے تو امریکہ کے بندر بھی وہ پہنا کرنے لگتے ہیں۔ اس دنیا میں انسانوں کی مدد سے کوئی سادہ اور ایماندارانہ کام کرانے کے بارے میں مجھے بعض اوقات بہت مایوسی ہوتی ہے۔ ان لوگوں کو پہلے ایک مضبوط شکنجے میں جکڑ دینا ہوگا تاکہ ان میں سے ان کے سارے پرانے خیالات پکوڑ لئے جائیں۔ اور وہ جلدا پنے پیروں پہ کھڑے نہ ہونے پائیں۔ مگر ڈر اس بات کا ہے کہ ان کی جماعت میں کوئی نہ کوئی ایسا شخص ضرور ہوگا جس کے سر میں کوئی کیڑا رہ جائے گا۔ جو نہ جانے اس کے دماغ میں کب سے پڑے ہوئے انڈے سے نکلا ہوگا۔ کیونکہ ایسی چیزوں کو آگ بھی نہیں جلا سکتی۔ اور آپ کی ساری محنت پہ پانی پھر جائے گا۔ بہر کیف ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ مصر کا گیہوں ہمیں ایک ممی سے ملا تھا۔

مجموعی طور پہ میرا یہ خیال ہے کہ اس بات کو ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ لباس اس ملک میں یا کسی دوسرے ملک میں ایک آرٹ کا ممتاز مقام حاصل کر چکا ہے۔ اس وقت انسانوں کو جو کچھ مل جاتا ہے۔ وہی پہن لیتے ہیں۔ ان جہازیوں کی طرح جن کا جہاز ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ وہ ساحل پہ جو کچھ پڑا ہوا پاتے ہیں۔ پہن لیتے ہیں۔ اور وقت یا مقام کے تھوڑے سے ہی فاصلہ کے بعد ایک دوسرے کی سلیقہ کذائی پہ ہنسنے لگتے ہیں۔ ہر نسل پرانے فیشنوں کا مذاق اڑاتی ہے۔

اور نہ مذہبی جنوں کے ساتھ نئے فیشن کی پیروی کرتی ہے۔ ہم شاید نہرِ اشتم یا ملکہ ایلزبتھ کا لباس دیکھ کر لوں ہنستے ہیں۔ جیسے وہ آدم خوروں کے جزیروں کے بادشاہ اور ملکہ کے ملبوسات ہوں انسان کا ہر لباس رحم انگیز اور مضحکہ خیز ہے۔ اس لباس میں سے جھانکتی ہوئی سنجیدہ آنکھ اور اس لباس میں بسر کی ہوئی پرخلوص زندگی ہمیں ہنسی سے باز رکھتی ہے۔ اور ہر شخص کے لباس کو مقدس بنا دیتی ہے۔ اگر کسی مسخرے کے پیٹ میں درد قولنج اُٹھے تو اس کے سوانگ کو اس کے موڈ کی ترجمانی کرنی ہی پڑے گی۔ جب کسی فوجی کے توپ کا گولہ لگتا ہے تو اسکے چیتھڑے ارغوانی رنگ کے شاہی لباس کی طرح دلکش ہو جاتے ہیں۔

نئے نئے فیشنوں کے لئے مردوں اور عورتوں کا طفلانہ اور وحشیانہ شوق بہت سے لوگوں کو خوردبینوں میں اپنی آنکھیں جھکنے پر مجبور کرتا ہے تاکہ وہ کوئی ایسی صورت ڈھونڈ سکیں جس کی موجودہ نسل کو ضرورت ہے۔ کارخانہ داروں کو یہ معلوم ہو گیا ہے کہ نئے فیشنوں کا شوق محض ایک وہم ہے کپڑوں کے دو نمونوں میں سے جن میں ایک ہی خاص رنگ کے چند دھاگوں کا فرق ہے۔ ایک نمونہ فوراً بک جائے گا اور ایک شیلف پر پڑا رہے گا۔ اکثر اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ موسم کے گذر جانے پر وہی دوسرا نمونہ بازِ فیشن اپیل بن جاتا ہے۔ مقابلتہً گودنا اتنا کھوکھلا رواج نہیں جتنا اُسے کہا جاتا ہے۔ گودنا اس لئے بھی وحشیانہ نہیں کہ اس کا نقش کھال کے اندر تک گہرا ہوتا ہے اور اسے تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔

میں اس پر یقین نہیں کر سکتا کہ ہمارا فیکٹریوں کا نظام انسانوں کے لئے کپڑے مہیا کرنے کا بہترین طریقہ ہے۔ ان فیکٹریوں میں کام کرنے والوں کی حالت انگریز مزدوروں جیسی ہوتی جا رہی ہے۔ اس پر تعجب بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے کہ جیسا میں نے سنا اور دیکھا ہے ان فیکٹریوں کا اصل مقصد یہ نہیں ہے کہ انسانوں کو ایمانداری سے اچھا کپڑا پہنایا جائے بلکہ بلاشک وشبہ ان کی غرض یہ ہے کہ تجارتی کمپنیاں مالامال ہو جائیں۔ آخر انسان اس چیز پر اپنا نشانہ بٹھاتا ہے جس کی کہ وہ شست لگاتا ہے۔ اس لئے انسان کو چاہیئے جلد ہی ناکامی کا

سامنا کیوں نہ کرنا پڑے اُس کے لئے یہی بہتر ہے کہ وہ کسی بلند چیز کا نشانہ باندھے
جہاں تک پناہ گاہ کا تعلق ہے۔ میں اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ مکان اب
زندگی کی ضرورت بن گیا ہے اگرچہ ایسے انسانوں کی مثالیں بھی ملتی ہیں جنہوں نے اس سے
بھی زیادہ سرد ملک میں مدتوں جائے پناہ کے بغیر گذر بسر کی ہے۔ سموئیل لنگ کہتا ہے۔
کہ۔ لیپ لینڈ کا باشندہ جانور کی کھال میں اور کھال کے اُس تھیلے میں جو وہ سر اور کندھوں
پر ڈال لیتا ہے۔ راتوں کو برف پر سو سکتا ہے۔ اور وہ بھی اس درجہ کی سردی میں
اگر کوئی اونی کپڑے پہن کر وہاں رات بسر کرے تو زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔" اُس
نے لیپ لینڈ کے باشندوں کو یوں سوئے ہوئے دیکھا تھا پھر بھی وہ یہ کہتا ہے کہ۔
"وہ دوسرے لوگوں کی نسبت زیادہ جفاکش نہیں ہیں۔" مگر غالباً انسان نے جلد ہی
معلوم کر لیا۔ گھر میں بڑی آسائش ہوتی ہے۔

"گھریلو آرام" کا جملہ شاید پہلے پہل خاندان کی نسبت مکان میں ملنے والے اطمینان کی
اہمیت کو واضح کرتا ہوگا۔ گھریلو آرام کی صورتیں اُن آب ہواؤں میں انتہائی حد درجہ اور وقتی
ہونگی جہاں ہمارے خیال میں گھر سردی اور بالخصوص برسات سے پناہ لینے سے تعلق رکھتا
ہے۔ وہ سال کے دو تہائی حصہ تک چھتری کا کام دینے کے سوا غیر ضروری ہو جاتا ہے۔
ہماری آب و ہوا میں مکان گذشتہ زمانہ میں موسم گرما میں رات کو تقریباً صرف جائے پناہ ہی
کا کام دیتا تھا۔ انڈینوں کے گزٹوں میں ایک جھونپڑے کی تصویر دن بھر کے سفر کی علامت
ہوتی تھی اور درخت کی چھال پر کھود کر یا رنگ سے بنائی ہوئی ان جھونپڑوں کی قطار کا یہ مطلب
ہوتا تھا کہ اتنی بار انہوں نے ڈیرے ڈالے۔ انسانوں کو اتنا قوی ہیکل اور تنومند اس لئے
نہیں بنایا گیا تھا کہ وہ اپنی دنیا کو تنگ بنا دینے کی کوشش کرے اور جو مقام اُسے موزوں
معلوم ہو وہاں ایک دیوار اٹھا دیوے۔ ابتداء میں وہ کھلے میدانوں میں ننگا گھومتا تھا۔ اگرچہ معتدل
سنہرے موسم میں دن کے وقت گھومنا پھرنا بہت خوشگوار تھا لیکن کڑکتی ہوئی دھوپ کا تو ذکر ہی کیا ہے

اگر برسات اور موسم سرما میں اس نے جلد کسی مکان کی پناہ گاہ کا لبادہ نہ اوڑھا ہوتا تو انہوں نے
اس کی نسل کو پنپنے سے پہلے ہی ختم کر دیا ہوتا۔ پرانی حکایت کے مطابق آدم و
حوا نے کپڑوں سے پہلے مکان کا لباس پہنا تھا۔ انسان کو ایک گھر، گرم یا پُر آسائش
مقام کی ضرورت تھی۔ آسے ابتدا میں جسمانی گرمی اور پھر پیار اور شفقت کی ضرورت تھی

ہم اس زمانے کا تصور کر سکتے ہیں۔ جب انسانی دور کے عہد طفلی میں کوئی
حوصلہ مند غاقی انسان پناہ لینے کے لیے کسی چٹان کے خلا میں جا گھسا ہوگا۔ ہر بچہ
کسی حد تک دنیا کے ابتدائی دور کا دوبارہ آغاز کرتا ہے۔ وہ برسات اور سردی
کے موسم میں باہر کھلی فضا میں رہنا پسند کرتا ہے۔ وہ مکان مکان اور گھوڑا گھوڑا کھیلتا
ہے۔ اس لیے کہ وہ اس سے رغبت رکھتا ہے۔ کون ہے جسے یہ بات یاد نہ ہوگی
کہ وہ بچپن میں آگے کی طرف نکلی ہوئی ہموار چٹانوں یا غار کے دہانے کو بڑی دلچسپی
سے دیکھا کرتا تھا۔ یہ بات ہمارے انتہائی آباؤ اجداد کے اس قدرتی تجسس کا ایک
حصہ ہے۔ جو ہم میں ابھی تک برقرار ہے۔ ہم غاروں کی زندگی سے ترقی کر کے جھونپڑ
کے پتوں کی چھتوں تک پہنچے پھر چھالوں اور تانوں کی چھتوں تک۔ پھر ہم نے کپڑا اپنا
کر اپنے سر پر تان دیا۔ اس کے بعد ہم نے گھاس پھونس کی چھت بنائی پھر تختوں اور
شہتیروں کی۔ اس کے بعد پتھر اور کھپریل کی۔ آخر کار ایک دن ایسا آیا کہ ہم یہ بھول گئے
کہ کھلی فضا میں رہنے کا کیا لطف ہے۔ اور ہماری زندگیاں ہمارے خیال کی نسبت کئی لحاظ سے
گھریلو ہو گئی ہیں۔ گھر کی انگیٹھی سے چھت بہت زیادہ دور ہے۔ اگر ہم زیادہ دن اور زیادہ
راتیں اپنے درمیان کسی چیز کے حائل ہوئے بغیر بسر کر سکتے تو غالباً یہ ایک بہت اچھی
ہوتی۔ کاش شعرا نے چھت کے نیچے بیٹھ کر اتنے شعر نہ کہے ہوتے اور ولی اتنی دیر
تک گھروں میں نہ رہے ہوتے۔ پرندے غاروں میں نہیں چہچہاتے ہیں اور فاختائیں اپنی
معصومیت کے راگ فاختہ خانوں میں نہیں الاپتی ہیں۔

بہرکیف اگر کوئی شخص اپنا مکان تعمیر کرنا چاہتا ہے تو اُسے چاہیئے کہ وہ تھوڑی سے امریکی باشندہ کی سی ہوشیاری سے کام لے تاکہ ایسا نہ ہو کہ وہ گھر کی بجائے کسی کارگاہ میں پہنچ جائے یعنی ایک ایسی بھول بھلیاں میں جس سے نکلنے کا کوئی راستہ ہی نہ ہو یا پھر مکان کی بجائے کہیں عجائب گھر، خیرات خانہ، جیل یا مقبرہ میں نہ پہنچ جائے۔ آپ پہلے یہ سوچیئے کہ کم سے کم کتنی جائے پناہ ضروری ہے۔ میں نے اس قصبہ میں پینوبسکاٹ انڈینوں کو اس وقت پتلے سوتی کپڑے کے خیموں میں رہتے دیکھا ہے۔ جب ان کے گرد ایک فٹ اونچی برف جمی ہوئی تھی اور میں نے سوچا تھا کہ وہ بخوشی چاہتے ہوں گے کہ برف اس سے بھی زیادہ اونچی ہو تاکہ ہوا کو روک سکے۔ میرے لئے یہ سوال اب سے پہلے بہت زیادہ پریشان کن تھا کہ میں ایمانداری سے اپنی روزی کیسے پیدا کروں جس سے اپنے مناسب مشاغل جاری رکھنے کے لئے آزاد رہ سکوں۔ اب میں بدقسمتی سے کچھ بے حس سا ہو گیا ہوں۔ میں اس زمانے میں ریل کی پٹڑی کے پاس ۶ فٹ لمبا اور تین فٹ چوڑا صندوق دیکھا کرتا تھا۔ جس میں مزدور رات کو اپنے اوزار بند کر دیا کرتے تھے۔ اس صندوق نے مجھے یہ خیال سجھایا کہ ہر غریب آدمی ایک ڈالر میں ایسا صندوق خرید سکتا ہے۔ اس میں چند سوراخ بنا سکتا ہے۔ تاکہ اس میں ہوا آتی رہے۔ بارش میں اور رات کو اس بکس میں گھس کر اوپر سے اس کا ڈھکنا بند کر سکتا ہے۔ وہ اس طرح آزادی سے محبت کر سکتا ہے۔ اور روحانی آزادی بھی محسوس کر سکتا ہے۔ مجھے یہ تجویز نہ بدترین دکھائی دیتی تھی۔ نہ نفرت انگیز۔ آپ جتنی دیر تک چاہیں اس میں بیٹھ سکتے ہیں اور جب اُٹھ کر باہر جائیں گے۔ تو کوئی جاگیردار یا مکان دار آپ کا پیچھا نہیں کریگا بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں۔ جو اس سے زیادہ بڑے اور پرآسائش بکس کا کرایہ دینے کی فکر میں مر جاتے ہیں۔ کون ہے جو ایسے بکس میں ٹھٹھر کر نہیں مر جائے گا۔ میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ اقتصادیات ایک ایسا موضوع ہے۔ جس کا مذاق اڑایا جا رہا ہے۔

لیکن اس کو یوں ہی نہیں ٹالا جا سکتا۔ ایک غیر مہذب اور جفاکش نسل کے لئے جو یہ دو
تر ڈھلی فضا میں رہتی تھی۔ آرام دہ مکان اس خام مواد سے بنایا گیا تھا۔ جو قدرت نے اُن
کے قریب ہی مہیا کیا تھا۔ جیسے جیو سیٹس بستی کے انڈینوں کا سپرنٹنڈنٹ گوکن لکھتا ہے
میں لکھتا ہے۔ "اُن کے مکان اچھی طرح ڈھکے ہوئے ہیں تنگ اور گرم ہیں۔ اُن کی چھتیں
درختوں کی چھال کی ہیں۔ چھال درختوں کے تنوں سے اس وقت اتاری جاتی ہے
جب اُن میں دور دورہ ہوتا ہے۔ اور یہ چھال جب ہری بھری ہوتی ہے تو اسے بڑے
بڑے شہتیروں سے دبا کر دو تین ہموار پتلا بنا دیا جاتا ہے۔ کم درجہ کے مکانوں کی چھتیں
چٹائیوں کی ہوتی ہیں۔ یہ چٹائیاں دلدل کی گھاس سے بنائے گئے ہیں۔ اپنے [illegible]
زیادہ کساؤ تھا۔ اور گرم نہیں ہوتے۔ اور پہلے مکانوں جیسا اچھا کچھ نہیں ہیں۔ میں
نے بعض ایسے مکان بھی دیکھے ہیں جو سا ٹھ فٹ لمبے اور [illegible] فٹ چوڑے
تھے۔ میں اکثر ان کے جھونپڑوں میں جا کر رہا ہوں۔ میں نے اکثر ان کو [illegible] انگریزی
مکانوں کی طرح گرم پایا ہے۔" اس نے یہ بھی لکھا تھا۔ "ان مکانوں کی دیواروں پر
لکڑیوں کی [illegible] سوئی چٹائیاں لٹکی اور فرش پر بچھی رہتی تھیں۔ ان کو مختلف اقسام کے
برتنوں سے سجایا جاتا تھا۔ یہ انڈین اتنی ترقی کر گئے ہیں کہ وہ اپنے مکانوں کی
چھتوں کے سوراخ سے چٹائی لٹکا دیتے ہیں۔ اور ایک ڈور سے اسے آگے
پیچھے کھسکا کر ہوا کی آمد و رفت کو قابو میں رکھتے ہیں۔ ایسا مکان پہلے پہل ایک یا دو دن
میں تیار کر لیا جاتا ہے۔ اُسے چند گھنٹوں میں اکھاڑا اور نصب کیا جا سکتا ہے۔
ہر خاندان کے پاس ایسا ایک مکان یا مکان میں ایسا ایک کمرہ ہے۔

جہالت کے دور میں ہر خاندان کے پاس ایسی ایک بہترین پناہ گاہ ہوتی ہے
یہ پناہ گاہ اس خاندان کی موٹی موٹی اور سادہ سادہ ضروریات کے لئے بہت موزوں
ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں اپنی حدود سے متجاوز نہ ہوتے ہوئے کہہ سکتا ہوں۔

دگر پرندے اپنے گھونسلے اور لومڑیاں اپنے بل رکھتی ہیں۔ اور وحشی لوگ اپنی جھونپڑیاں رکھتے ہیں تو مہذب سماج میں نصف سے زیادہ انسان کوئی پناہ گاہ نہیں رکھتے۔ بڑے شہروں اور قصبوں میں جہاں تہذیب کا دور دورہ ہے۔ وہاں جن لوگوں کے پاس اپنے مکان ہیں۔ ان کی تعداد کل آبادی کا ایک چھوٹا سا حصّہ ہے۔ باقی لوگ اپنے اس بیرونی لبادے کے لیے جو سردیوں اور گرمیوں کے لیے ناگزیر ہے۔ اتنا ٹیکس دیتے ہیں کہ اس ٹیکس کی رقم سے انڈینوں کا سارا گاؤں خریدا جا سکتا ہے۔ یہ ٹیکس اُن کو عمر بھر غریب رکھتا ہے۔ میں یہاں مکان کا مالک بننے کے مقابلہ میں مکان کرایہ پر لینے کے نقصانات پر زور نہیں دینا چاہتا۔ لیکن یہ بات بالکل واضح ہے کہ ایک وحشی اپنے جھونپڑے کا اس لیے مالک بن جاتا ہے کہ اس پر بہت کم خرچ آتا ہے۔ برعکس اس کے ایک مہذب شخص مکان عام طور سے کرایہ پر لیتا ہے۔ کیونکہ وہ مکان کا مالک بننے کی استعداد نہیں رکھتا۔ سمجھے گئے حساب کردہ بہتر مکان کرایہ پر لینے کی استطاعت بھی نہیں رکھتا نہ کوئی شخص یہ جواب دے سکتا ہے کہ ایک غریب مہذب شہری یہ ٹیکس ادا کر لے کے بعد ایک ایسا مکان حاصل کر لیتا ہے جو وحشیوں کے جھونپڑے کے مقابل میں محل ہوتا ہے۔ پچیس ڈالر سے لے کر ایک سو ڈالر تک کا سالانہ کرایہ (یہ دیہات کی شرحیں ہیں) کرایہ داروں کی صدیوں کی ترقی کے فوائد کا حقدار بنا دیتا ہے۔ مثلاً وسیع و عریض کمرے، صاف ستھرا رنگ اور کاغذ، مفرد آتش دان، دیواروں کی پشت پر پلستر، وینس کی چلمن، تانبے کے لیمپ۔ اسپرنگ دار تالے، لمبا چوڑا تہہ خانہ اور بہت سی دوسری چیزیں۔ لیکن یہ کیا بات ہے کہ جو شخص ان تمام آسائشوں سے لطف اندوز ہے اُسے غریب مہذب شخص کہا جاتا ہے۔ اور وہ وحشی جو ان آسائشوں سے محروم ہے۔ ایک وحشی کی حیثیت میں دولتمند ہے! اگر اس بات پر زور دیا جائے کہ تہذیب انسان کی حقیقی ترقی کا نام ہے اور میرا بھی یہی خیال ہے کہ عقلمند انسان ہی اپنے فوائد میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ تو یہ

کرنا ہوگا کہ تہذیب نے زیادہ لاگت کے لیے بہتر مکان بنائے ہیں۔ قیمت سے میری مراد زندگی کے اس حصّہ سے ہے جو فوراً یا آگے چل کر ادا کرنا پڑتا ہے۔ اس گرد و نواح میں ایک اوسط درجہ کے مکان کی قیمت ایک سو ڈالر ہے۔ اتنی رقم جمع کرنے میں ایک مزدور کی زندگی کے دس سے لے کر پندرہ برس تک صرف ہوں گے۔ بشرطیکہ اس پر بیوی بچوں کا بوجھ نہ ہو۔ اگر ہر مزدور کے اوسط محنتانہ کی مقدار ایک ڈالر روزانہ سمجھ لی جائے (اس لئے کہ کچھ مزدور زیادہ کماتے ہیں اور کچھ اتنا بھی نہیں کماتے) تو اتنی رقم جمع کرنے میں اس کی آدھی زندگی بیت جائے گی۔ جب کہیں وہ اپنی محنت سے جھونپڑی کا مالک بن سکے گا۔ اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ وہ مکان بنانے کی بجائے کرایہ دیتا ہے تو ان دونوں برائیوں میں سے ایک کا انتخاب بہت مشکل ہوگا۔ کیا وہ وحشی عقلمند سمجھا جاتا جس نے ان شرائط پہ جھونپڑی دے کر محل لے لیا ہوتا؟

اس سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ میرے نزدیک یہ فضول جائداد ایک ایسا فنڈ ہے جو مستقبل کے لئے بچایا جاتا ہے اور یہاں تک ایک فرد کا تعلق ہے یہ فضول جائداد کا فنڈ اس کی تجہیز و تکفین کے اخراجات پورے کرنے کے لئے ہوتا ہے۔ لیکن شاید انسان کے لئے خود اپنے کو دفن نہیں کرنا پڑتا۔ بہرکیف یہ بات مہذب انسان اور وحشی کے درمیان ایک اہم فرق کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ بلاشک وہ ہمارے فائدہ کے لئے مہذب انسان کی زندگی کو ایک ادارہ بنا رہے ہیں جس میں ایک فرد کی زندگی اس لئے جذب ہو جاتی ہے کہ پوری نسل کی زندگی کو محفوظ رکھا جائے اور اس کی تکمیل کی جائے۔ لیکن میں یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ اس وقت یہ فائدہ کیسی بڑی قربانی دے کر حاصل کیا جاتا ہے۔ اور یہ مشورہ دینا چاہتا ہوں کہ ہم نقصان اٹھائے بغیر اس طرح زندہ رہ سکتے ہیں کہ ہمیں سارے فوائد حاصل ہوتے رہیں۔ آپ کا اس بات سے کیا مطلب ہے کہ آپ میں غریب لوگ ہمیشہ رہے ہیں یا یہ کہ آباؤ اجداد نے کھٹے انگور کھائے تھے۔ اس لئے بچوں

کے دانت نکیلے ہو گئے ہیں؟

حضرت مسیح نے کہا تھا کہ "جب تک میں زندہ ہوں آپ کو ہرگز ہرگز اسرائیل میں اس کہاوت کو استعمال کرنے کا موقع نہیں ملے گا۔ دیکھو۔ ساری روحیں میری ہیں۔ جیسے باپ کی روح میری ہے ویسے ہی بیٹے کی روح میری ہے۔ جو روح گناہ کا ارتکاب کرے گی مر جائے گی۔"

جب میں اپنے پڑوسیوں یعنی کنکارڈ کے کاشتکاروں کے بارے میں غور کرتا ہوں۔ جو دیگر طبقات کے لوگوں کی طرح خوشحال ہیں تو میں دیکھتا ہوں کہ یہ کسان زیادہ تر بیس تیس یا چالیس برس تک اس لیے محنت کرتے ہیں کہ وہ کھیتوں کے حقیقی مالک بن جائیں۔ جو ان کو قرضوں کے بوجھ سے لدے ہوئے ورثہ میں ملتے ہیں۔ یا سود پہ لیے ہوئے روپیہ سے خریدے ہوتے ہیں۔ ہم ان کی ایک تہائی محنت کو ان کے مکان کی قیمت سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن عام طور سے انہوں نے یہ رقم ابھی ادا نہیں کی ہوتی۔ یہ سچ ہے کہ بعض اوقات قرضے کھیت کی قیمت سے بھی زیادہ ہوتے ہیں۔ اس لیے کھیت خود ایک بہت بڑا بوجھ بن جاتا ہے اس پہ بھی لوگ بطور ورثہ اسے سنبھالے رکھتے ہیں۔ اور بقول خود اس سے اچھی طرح واقف ہوتے ہیں۔ میں نے قصبے کے اسیسروں (جائیداد کی قیمت لگانے والے) سے دریافت کیا تو مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ وہ قصبے کے ایسے ایک درجن کسانوں کا نام فوراً نہ بتا سکے جو اپنے کھیتوں کے بلا شرکت غیرے اور کسی قرضہ کے بغیر مالک تھے۔ اگر آپ ان مکانوں کی تاریخ جاننا چاہتے ہیں تو ان بنکوں سے جا کر پوچھئے جہاں ان کو رہن رکھا جاتا ہے۔ وہ شخص جو کھیت پر اپنی محنت سے کھیت کی قیمت ادا کر چکا ہے اتنا نایاب ہے کہ ہر ہمسایہ انگلی اٹھا کر اس کی طرف اشارہ کر سکتا ہے۔ مجھے شک ہے کہ کنکارڈ میں ایسے تین آدمی بھی مل سکیں۔ تاجروں کے بارے میں یہ بات کہی گئی ہے کہ ان کی بہت بڑی اکثریت یعنی سو میں سے ستانوے تاجر یقیناً ناکام رہتے ہیں وہ کسانوں کے بارے میں بھی بالکل صحیح ہے

جہاں تک تاجروں کا تعلق ہے ان میں سے ایک نے برجستہ یہ بات کہی ہے کہ ان کی ناکامیاں حقیقتاً ایسی ناکامیاں نہیں ہیں بلکہ اپنے قول کو پورا نہ کر سکنے کی وجہ سے ناکامیاں ہیں۔ قول پورا کرنے میں تکلیف ہوتی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ تاجروں کا اخلاقی کردار پست ہو جاتا ہے۔ یہ بات معاملہ کو اور بھی خراب کر دیتی ہے اور اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ غالباً تاجر کبھی اپنی روحوں کو بچانے میں کامیاب نہیں ہوتے بلکہ ان لوگوں کی نسبت زیادہ بری طرح دیوالیہ ہو جاتے ہیں جو کیا دارانہ پر قائم رہ کر نا کام رہتے ہیں۔ دیوالیہ پن اور یہاں شکستگی وہ تختے ہیں جن پر ہمارا تمدن قلابازیاں لگاتا، گھومتا اور چکراتا رہتا ہے۔ لیکن ایک وحشی قحط کے غیر لچکدار تختے پر کھڑا رہتا ہے۔ اس لئے باوجود ٹل سیکس میں ہر سال مویشیوں کی نمائش لگتی ہے جیسے ہماری زراعتی مشینوں کا سر توڑ کے پھینکا گیا ہے۔

کسان اپنی روزی کا مسئلہ ایسے فارمولہ سے حل کرنے کی کوشش کر رہا ہے جو اصل مسئلہ سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہے۔ وہ اپنے جوتے کے فیتے حاصل کرنے کے لئے مویشیوں کے میلہ میں سٹہ کھیلتا ہے۔ وہ اپنی پختہ ہنرمندی سے کام لے کر آزادی اور آسائش کو پکڑنے کے لئے ایک نازک سا پھندہ لگاتا ہے اور جوں ہی وہ پیچھے مڑتا ہے۔ اس کی اپنی ٹانگ اس پھندے میں پھنس جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ غریب ہے۔ اسی وجہ سے ہم سب ہزاروں وحشیانہ آسائشوں کے مقابلہ میں کچھ نہیں رکھتے گو ہمارے چاروں طرف عشرتیں ہی عشرتیں ہیں۔

جیمپ مین کہتا ہے :-

"انسانوں کا چھوٹا سماج —
دنیاوی عظمت کے لئے
تمام جنتی آسائشوں کو ہوا میں تحلیل کر دیتا ہے"

اور جب کسان اپنے مکان کا مالک بن جاتا ہے تو ہو سکتا ہے کہ وہ اس کی خاطر اسیر نہ رہا ہو اور غریب ہو گیا ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مکان اس کے قبضہ میں نہ ہو بلکہ وہ مکان کے قبضہ میں ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ موس نے منزوا کے بنائے مکان پر جو اعتراض کیا تھا وہ بالکل درست تھا۔ وہ اعتراض یہ تھا کہ منزوا نے "مکان قابلِ انتقال نہیں بنایا جس کا مطلب یہ ہے کہ برے پڑوس سے گریز نہیں کیا جا سکتا"۔ یہ اعتراض آج بھی شد و مد کے ساتھ وارد کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ہمارے مکان ایسی ناقابلِ انتقال جائیداد نہیں کہ ہم ان میں رہنے کی بجائے قید ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اور جس برے پڑوسی سے ہم بچنا چاہتے ہیں وہ ہمارا ذلیل نفس ہے۔ میں اس قصبہ میں کم از کم ایک یا دو ایسے خاندانوں کو جانتا ہوں جو تقریباً ایک پیڑھی سے مضافات میں واقع اپنے مکانوں کو بیچ کر گاؤں میں جانا چاہتے ہیں لیکن ابھی تک ایسا نہیں کر سکے۔ صرف موت ہی ان کو ان مکانوں سے نجات دلائے گی۔

یہ امر مسلمہ ہے کہ آخر کار انسانوں کی بڑی اکثریت جدید مکان کی مالک بن جاتی ہے یا اسے کرایہ پر لے لیتی ہے جس میں ہر قسم کی ترقی یافتہ چیزیں ہوتی ہیں۔ اگرچہ تہذیب ہمارے گھروں کو بہتر بنا رہی ہے لیکن اس نے ان انسانوں کو اتنا بہتر نہیں بنایا جو ان مکانوں میں رہتے ہیں۔ اس نے محل تعمیر کئے ہیں لیکن وہ آسانی سے امراء اور بادشاہوں کو جنم نہیں دے سکی ہے۔ اور اگر مہذب انسان کی سرگرمیاں وحشی کی سرگرمیوں سے زیادہ قابلِ قدر نہیں ہیں اور اگر وہ اپنی زندگی کا بیشتر حصہ محض بنیادی ضروریات اور آسائشیں حاصل کرنے میں صرف کرتا ہے تو اسے وحشی سے بہتر مکان کیوں ملے؟

لیکن اس بیچاری اقلیت پر کیا گزرتی ہے؟ غالباً یہ بات معلوم ہو جائے گی کہ اگر چند لوگ ظاہرا حالات کے اعتبار سے وحشی سے بہتر ہیں تو اس تناسب

سے چند لوگ وحشی سے زیادہ پست ہیں۔ ایک طبقہ کا تعیش دوسرے طبقہ کی غریبی کا باعث ہے۔ ایک طرف محل ہے اور دوسری طرف خیرات خانہ۔ اور "مہر بلب مفلس" ہے۔ "جن کروڑوں انسانوں نے فرعونوں کی قبروں کے لئے اہرام تعمیر کئے۔ انہیں لہسن کھانے کو دیا جاتا تھا اور غالباً ان کو مناسب ڈھنگ سے دفنایا بھی نہیں گیا۔ وہ معمار جو محل کی کارنس بناتا ہے غالباً ایک ایسی جھونپڑی میں رات بسر کرتا ہے جو ایک وحشی کی جھونپڑی سے بدتر ہوتی ہے۔ یہ فرض کرنا ایک بھاری غلطی ہوگا کہ اس ملک میں جہاں تہذیب و تمدن کے تمام آثار موجود ہیں وہاں بیشتر باشندوں کی حالت وحشیوں سے زیادہ پست ہوگی۔ میں اس وقت پست و ذلیل غریبوں کا ذکر کر رہا ہوں پست و ذلیل امیروں کا نہیں۔ اس بات کو جاننے کے لئے مجھے دور تک نظر نہیں ڈالنی ہوگی۔ بلکہ اُن جھونپڑیوں کو دیکھنا ہی کافی ہوگا۔ جو تہذیب کی آخری ترقی یعنی ریل کی پٹڑی کے کنارے واقع ہیں۔ میں روزانہ سیر کو جاتے ہوئے انسانوں کو ان سؤر خانوں میں زندگی بسر کرتا ہُوا دیکھتا ہوں۔ سارے موسم سرما میں ان کے دروازے روشنی کی خاطر کھلے رہتے ہیں۔ ان کے ہاں لکڑی کا ڈھیر دکھائی نہیں دیتا۔ محض فرض ہی کیا جا سکتا ہے کہ ہوگا۔ بوڑھوں اور جوانوں دونوں کے جسم سردی اور تکلیف سے سکڑے رہنے کی دیرینہ عادت کے باعث مستقل طور پر سکڑ گئے ہیں۔ اور اُن کے اعضا اور اُن کی صلاحیتوں کی نشو ونما رُک گئی ہے۔ اُس طبقہ پر غور کرنا حقیقتاً بجا ہے جس کی محنت سے اس نسل کو ممتاز بنانے والے کام پایۂ تکمیل کو پہنچتے ہیں۔ تھوڑی یا بہت حد تک انگلستان کے ہر قسم کے مزدور کی ایسی ہی حالت ہے۔ جو دُنیا کی بہت بڑی کارگاہ ہے۔ یا میں آپ کے سامنے آئرلینڈ کو پیش کر سکتا ہوں جسے نقشے پر سفید یا روشن دھبوں سے دکھایا گیا ہے آئرلینڈ کے باشندوں کا شمالی امریکہ کے انڈینوں یا جنوبی سمندر کے جزیروں کے

باشندوں یا کسی وحشی قوم کی اس زمانہ کی جسمانی حالت کا موازنہ کیجئے جب وہ مہذب انسانوں کے ساتھ سابقہ پڑنے سے پہلے ذلیل نہیں ہوئے تھے۔ مجھے اس میں ذرا سا بھی شک نہیں ہے کہ عوام کے حکمران اوسط درجہ کے مہذب حکمرانوں جتنے ہی عقلمند ہیں۔ ان کی حالت یہ ثابت کرتی ہے کہ غلاظت اور تہذیب کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اب اپنی جنوبی ریاستوں کے مزدوروں کے ذکر کی کوئی ضرورت نہیں جو اس ملک کی دساوری اجناس پیدا کرتے ہیں۔ اور خود جنوب کی دساوری پیداوار بن گئے ہیں۔ میں صرف ان مزدوروں کا ذکر کروں گا جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اوسط درجے کے حالات میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔

بیشتر لوگوں نے اس پر غور ہی نہیں کیا کہ مکان کیا ہوتا ہے اور اسی لئے اکثر پریشان رہتے ہیں کہ وہ اگرچہ ساری عمر غریب رہتے ہیں لیکن یہ سوچتے رہتے ہیں کہ ان کے پاس بھی کوئی ایسا مکان ہونا چاہیئے جیسا ان کے پڑوسیوں کے پاس ہے۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی درزی جس ڈھنگ سے کوٹ کاٹ دے وہ کسی کو پہننا پڑ جائے یا پھر وہ بتدریج کھجور کے پتوں کی ٹوپی یا گلہریوں کی کھال کی ٹوپی پہننا ترک کر دے اور اپنی قسمت پر رونے لگے کہ اس میں تاج خریدنے کی استطاعت نہیں ہے۔ ہمارے پاس جو مکان ہے اس سے زیادہ آرام دہ اور پُر آسائش مکان ایجاد کرنا ممکن ہے۔ لیکن ہر شخص یہ تسلیم کرے گا کہ انسان ایسا مکان تعمیر کرنے کا خرچہ برداشت نہیں کر سکتا۔ کیا ہم ہمیشہ اسی بات کا مطالعہ کرتے رہیں گے کہ کیسے ہمیں یہ چیزیں زیادہ سے زیادہ مقدار میں مل سکتی ہیں اور کبھی تھوڑی سی چیزوں پر قانع نہیں ہوں گے؟ کیا معتبر شہری اسی طرح سنجیدگی سے اپنے قول و فعل کے ذریعہ نوجوانوں کو یہ سکھاتا رہے گا کہ مرنے سے پہلے انہیں فضول چمکتے دمکتے جوتوں، چھتریوں اور خالی الذہن مہمانوں کے لئے خالی مہمان خانے حاصل کر لینے چاہئیں؟ ہمارا فرنیچر ایک عرب یا ایک انڈین کی طرح سادہ کیوں نہ ہو؟ جب میں انسانی

نسل کے محسنوں کے بارے میں سوچتا ہوں جن کو ہم خدا کا پیغامبر مانتے اور انسان
کے لئے خدائی نعمتیں لانے والا تسلیم کرتے ہیں۔ تو میں یہ خیال بھی نہیں کر سکتا کہ
ان کے عقب میں درباریوں کا ایک جلوس چلتا تھا یا ان کے پاس ایک لوری گاڑی
بھر دینے والا فیشن ایبل فرنیچر تھا۔ یا اگر میں یہ مان بھی لوں تو کیا یہ اعتراف اپنی
قسم کا واحد اعتراف نہ ہوگا کہ ہمارا یہ فرنیچر عرب کے فرنیچر کے مقابلہ میں اُسی
تناسب سے متنوع ہونا چاہیئے جس تناسب سے ہم اُس سے ذہنی اور اخلاقی
طور پہ برتر ہیں! فی الحال تو ہمارے مکان اس فرنیچر سے اٹے پڑے ہیں۔ اور اس
کے باعث غلیظ ہیں۔ ایک اچھی گھریلو بیوی اس کا بیشتر حصہ جھاڑ پونچھ کر کوڑے
خانہ میں پھینک دے گی۔ اور اپنے صبح کے کام کو ادھورا نہیں چھوڑے گی۔ صبح کا
کام۔ سحر کی دیوی کی مسکراہٹوں اور کام دیو کے نغمہ دلربا کی قسم! اس دُنیا میں
انسان کا صبح کا کام آخر کیا ہونا چاہیئے؟ میرے ڈیسک پر چونے کے پتھر کے
تین ٹکڑے پڑے ہوئے تھے اور میں یہ معلوم کر کے خوف زدہ ہو گیا کہ ان کو روزانہ
جھاڑنے کی ضرورت ہے جبکہ میرے ذہن کا فرنیچر ابھی تک جھاڑے پونچھے
بغیر پڑا ہوتا تھا۔ میں نے سخت بد دل ہو کر پتھر کے وہ تینوں ٹکڑے کھڑکی کے
باہر پھینک دیئے۔ پھر میرے پاس فرنیچر سے سجا ہوا مکان کیسے ہو سکتا تھا؟
میں تو کھلی فضا میں بیٹھنا زیادہ پسند کروں گا کیونکہ اس وقت تک گھاس پر گرد جمع
نہیں ہوتی جب تک انسان نے زمین پہ ہل نہ چلایا ہو۔ آسائش پسند اور عیاش ہی فیشن
ایجاد کرتے ہیں۔ اور انسانوں کا ریوڑ خون پسینہ ایک کرکے ان کی تقلید کرتا ہے۔ اُس سیاح
کو جو نام نہاد بہترین مکانوں میں ٹھہرتا ہے بہت جلد معلوم ہو جاتا ہے کہ شراب خانوں کے
مالک اُسے سماردانا پولوس سمجھتے ہیں اور اگر وہ اپنے آپ کو اُن کے رحم و کرم پہ چھوڑ
دے گا۔ تو وہ بہت جلد کنگال ہو جائے گا۔ میرا خیال ہے کہ ہم ریل گاڑی میں سفر کرتے

ہوئے حفاظت اور سہولیت پر کم اور آسائش پر زیادہ خرچ کرتے ہیں اور اس بات کا خطرہ بڑھ رہا ہے کہ ریل گاڑی ان آسائشوں کو بہم پہنچانے کی بجائے ایک جدید قسم کا ڈرائنگ روم بنتی جا رہی ہے۔ اس لئے کہ اس میں صوفے ہوتے ہیں، گدے دار کرسیاں ہوتی ہیں۔ دھوپ سے بچنے کی چھتریاں اور دیگر کئی مشرقی چیزیں ہوتی ہیں جن کو ہم مغرب میں لے آئے ہیں۔ ان کو حرم سرا کی بیگمات اور سلطنت چین کے زنانہ خصلت مردوں نے ایجاد کیا تھا جن کا نام جانتے ہیں ہوئے ناقص کو شرم آئے گی۔ میں مخملی گدے پر بھیڑ میں بیٹھنے کی بجائے ایک تو بنی پر اکیلا بیٹھنے کو ترجیح دوں گا۔ میں سیر و سیاحت کی نفیس گاڑی میں جنت کا سفر کرنے اور راستہ بھر ملیریا کے جراثیم میں سانس لینے کی بجائے بیل گاڑی میں سفر کرنا اور آزادی سے سانس لینا پسند کروں گا۔

قدیم زمانہ میں انسان کی زندگی کی سادگی اور عریانی کا کم سے کم یہ فائدہ تو تھا کہ وہ ایک جگہ جم کر بیٹھ جاتا تھا اور قدرتی ماحول میں عارضی طور پر قیام کرتا تھا۔ جب وہ کھانا کھا کر اور سو کر تازہ دم ہو جاتا تھا تو دوبارہ سفر جاری رکھنے کے بارے میں غور کرتا تھا۔ وہ اس دنیا میں ایک خیمہ میں رہتا تھا۔ وادیوں میں گھومتا تھا یا میدانوں کو طے کرتا تھا۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھتا تھا۔ ذرا ملاحظہ کیجیے۔ انسان اپنے ہی آلے کا آلۂ کار بن گیا ہے۔ انسان جو بھوکا ہونے پر آزادانہ طور سے پھل توڑتا تھا کاشتکار بن گیا ہے۔ اور جو شخص درخت کے نیچے پناہ لینے کے لئے کھڑا ہوتا تھا اب خانہ دار بن گیا ہے۔ اب ہم رات کو خیمہ زن نہیں ہوتے بلکہ زمین پر آباد ہو چکے ہیں اور آسمان کو بھول چکے ہیں۔ ہم نے عیسائیت کو زراعت کے ایک بہتر طریقہ کے طور پر قبول کیا ہے۔ ہم نے اس دنیا کے لئے ایک خاندانی حویلی تعمیر کی ہے۔ اور دوسری دنیا کے لئے خاندانی قبر۔ آرٹ کے بہترین تخلیقات وہ ہیں جن میں اس حالت سے نجات حاصل کرنے کے لئے انسان کی جد و جہد کا اظہار ہے۔ لیکن ہمارا آرٹ محض

یہ تاثر چھوڑتا ہے کہ اس پست حالت کو آرام دہ بنائیں اور ارفع و اعلےٰ حالت کو بھول جائیں۔ اس گاؤں میں فنونِ لطیفہ کی کسی تخلیق کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ اور اگر کوئی ایسی تخلیق ہمیں ورثہ میں ملی ہوتی تو ہماری زندگیاں ہمارے گھر اور گلیاں اس کو سجا کر رکھنے کے لئے موزوں ہوتیں۔ یہاں ایک بھی کیل نہیں جس پر تصویر لٹکائی جا سکے اور کوئی شیلف نہیں جس پر کسی ہیرو یا رشی مُنی کا آدھے دھڑ والا مجسمہ رکھا جا سکے۔ جب میں یہ سوچتا ہوں کہ کس طرح ہمارے گھر تعمیر کئے جاتے ہیں اور کس طرح ان کی قیمت ادا کی جاتی یا نہیں ادا کی جاتی ہے اور کس طرح ان کے اندرونی رکھ رکھاؤ کا بندوبست کیا اور اسے برقرار رکھا جاتا ہے تو مجھے حیرت ہوتی ہے کہ اس آتش دان پر رکھی ہوئی آرٹ کی تخلیقات کی تعریف کرنے والے مہمان کے قدموں تلے فرش دھنس کیوں نہیں جاتا تاکہ وہ اس تہہ خانہ کی ٹھوس حقیقی مگر مٹی کی بنیاد تک پہنچ جائے۔ میں یہ خیال کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ نام نہاد متمول اور شائستہ زندگی ایک ایسی چیز ہے جس پر ہر کوئی جھپٹتا ہے اور فنونِ لطیفہ کے اس لطف و سرور کی رَو میں نہیں بہہ جاتا جس سے وہ زندگی مزین ہوتی ہے۔ ہر شخص کی توجہ اس زندگی کے لئے اچھل کود پر مرکوز رہتی ہے۔ کیونکہ اسے یاد آتا ہے کہ سب سے لمبی اور حقیقی چھلانگ جو صرف انسان کے پٹھوں کی مدد سے لگائی گئی تھی اور جس کا تذکرہ بھی ملتا ہے ان آوارہ گرد عربوں سے منسوب ہے جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے ہموار زمین پر پچیس فٹ لمبی چھلانگ لگائی تھی۔ مصنوعی سہارے کے بغیر انسان کو اس حد تک چھلانگ لگانے کے بعد یقیناً دوبارہ زمین پر آنا پڑتا ہے۔ میں اس قسم کی بڑی بڑی بیہودگیاں کرنے والوں سے پہلا سوال یہ پوچھنا چاہوں گا کہ آپ کی ہمت کون بڑھاتا ہے؟ کیا آپ ان ستانوے تاجروں میں سے ہیں جو ناکام رہتے ہیں۔ یا ان تین میں سے ہیں جو کامیاب ہو جاتے ہیں؟ آپ مجھے ان

سوالات کا جواب دیجئے۔ پھر میں آپ کے کھلونوں پر نظر ڈالوں گا اور ان کو زینت افزا سمجھ لوں گا۔ گھوڑے کے آگے گاڑی نہ اچھی نظر آتی ہے اور نہ مفید ہوتی ہے۔ قبل اس کے کہ ہم اپنے مکان کو خوبصورت چیزوں سے سجائیں دیواروں کو ننگا کرنا پڑے گا۔ اور اپنی زندگیوں کو بھی۔ ہمیں دلکش خانہ داری اور حسین طرزِ زندگی کو بنیاد بنانا پڑے گا۔ کھلی فضا میں حسن و جمال کے ذوق کی نشوونما ہوتی ہے جہاں نہ کوئی مکان ہوتا ہے اور نہ کوئی منتظم خانہ۔

بوڑھا جانسن اپنی کتاب "معجزۂ قدرت" میں اپنے ہمعصروں یعنی اس قصبہ کے ابتدائی آباد کاروں کا ذکر کرتے ہوئے ہمیں بتاتا ہے کہ "وہ پناہ گاہ کسی پہاڑ کے دامن میں مٹی کھود کر ایک بل کی طرح بناتے ہیں۔ مٹی کو شہتیروں کے اوپر ڈال دیتے ہیں اور جس طرف بل کی دیوار سب سے اونچی ہوتی ہے اس طرف وہ بہت دھواں دینے والی آگ جلاتے ہیں۔" وہ کہتا ہے کہ "انہوں نے اپنے لئے مکان اس وقت تک نہیں بنائے تھے جب تک وہ خدا کے فضل و کرم سے اپنے کھانے کے لئے روٹی نہیں پیدا کر سکے تھے۔" اور پہلے برس کی فصل "اتنی کم تھی کہ ایک مدت تک اپنی پتلی پتلی روٹیاں کھاتے رہے۔" صوبہ نیو نیدرلینڈ کے سیکرٹری نے ۱۶۵۰ء میں ان لوگوں کی اطلاع کے لئے جو اس صوبہ میں آ کر آباد ہونا چاہتے تھے۔ خاص طور پر یہ لکھا کہ "وہ نیو نیدرلینڈ اور بالخصوص نیو انگلینڈ میں جن لوگوں کے پاس ابتدا میں اپنی مرضی کے مطابق فارم ہاؤس بنانے کے ذرائع نہیں ہیں وہ زمین میں ایک چورس تہہ خانہ نما چھ یا سات فٹ گہرا اور اتنا ہی لمبا اور چوڑا جتنا وہ مناسب سمجھتے ہوں ایک گڑھا کھودیں۔ اندر کی مٹی کی دیواروں پر تختے جڑ دیں اور تختوں کی درزیں درختوں کی چھال یا کسی دوسری چیز سے بھر دیں تاکہ تختوں میں سے مٹی نہ رِس رِس کر نہ گرے۔ فرش پر بھی تختے لگا دیں اور ان ہی تختوں کو اوپر لے جا کر چھت بنا لیں۔ جو سائبان کی طرح

بلیوں سے اسے اوپر اٹھا دیں۔ اس سائبان کو درختوں کی چھال یا سبزہ بھری مٹی سے ڈھک دیں تاکہ وہ دو تین یا چار برس تک اپنے پورے زمانوں کے ساتھ ان مکانوں میں گرم اور خشک رہ سکیں۔ یہ بات سمجھ لینی چاہیئے کہ ان تہ خانوں میں خاندان کے چھوٹا یا بڑا ہونے کے مطابق خانے بنا لئے جائیں۔ نوآبادیات کی ابتدا میں نیو انگلینڈ کے امیر اور برگزیدہ لوگوں نے دو اسباب کی بنا پر اسی انداز کے مکان بنانے شروع کئے تھے۔ پہلی وجہ تو یہ تھی کہ مکان تعمیر کرنے میں وقت ضائع نہ کیا جائے تاکہ اگلے برس کی غذا کی کمی نہ ہو۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ اُن غریب مزدوروں کی حوصلہ شکنی نہیں کرنا چاہتے تھے جن کو وہ اپنے وطن سے بھاری تعداد میں اپنے ساتھ لائے تھے۔ جب تین یا چار برس میں ملک زراعت سے مانوس ہو گیا تو انہوں نے اپنے لئے خوبصورت مکان بنا لئے اور اُن پر کئی ہزار ڈالر صرف کئے۔"

ہمارے آباؤ اجداد نے جو رویہ اختیار کیا تھا اُس میں کم سے کم دانشمندی کی جھلک ضرور تھی۔ گویا ان کا اصول یہ تھا کہ سب سے پہلے شدید ضرورتوں کو پورا کیا جائے۔ لیکن کیا اب زیادہ شدید ضرورتیں پوری کی جا رہی ہیں؟ جب میں اپنے لئے کوئی پُرآسائش مکان حاصل کرنے کی بات سوچتا ہوں تو میں رُک جاتا ہوں کیونکہ ملک ابھی تک انسانی ثقافت سے مانوس نہیں ہُوا ہے۔ اور ہم ابھی تک اپنے آباؤ اجداد کی نسبت اپنی روحانی روٹی کے زیادہ باریک ٹکڑے کاٹنے پر مجبور ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ کرٹے سے کرٹے ایام میں فنِ تعمیر کی زیب و زینت کو نظرانداز کر دینا چاہیئے لیکن پہلے ہمارے مکانوں کی اندرونی آرائش ہماری زندگی کے مطابق اُسی حسن سے ہونی چاہیئے جس حسن سے گھریلو مچھلیوں کے مسکنوں کی ہوتی ہے۔ اور ان پر صرف ایک لیپ سا نہیں پھیر دینا چاہیئے۔ مجھے یہ کہتے ہوئے افسوس ہوتا ہے کہ میں ایسے ایک یا دو مکانوں میں گیا ہوں اور مجھے معلوم ہے کہ ان میں کس قسم کی

استرکاری ہوئی ہے۔

اگرچہ ہم اتنے انحطاط پذیر نہیں ہوئے کہ آج ایک غار یا جھونپڑی میں نہ رہ سکیں یا کھال نہ پہن سکیں۔ لیکن پھر بھی یقینی طور پر یہی بہتر ہے کہ انسانیت کی ایجاد اور محنت نے جو فوائد ہمیں پیش کئے ہیں، اگرچہ ان کو بڑی قربانیاں دے کر ہم نے خریدا ہے۔ انہیں قبول کر لیں۔ اس طرح کے گرد و نواح میں مناسب غاروں اور پورے شہتیروں یا کافی مقدار میں چھالوں یا پکی ہوئی مٹی یا سطح پتھروں کی نسبت تختے، لکڑی کے لٹھے، چونا اور اینٹیں زیادہ آسانی سے سستے داموں حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ میں اس موضوع پر سمجھ بوجھ کر بات کر رہا ہوں کیونکہ میں اس کے نظریاتی اور عملی دونوں پہلوؤں سے واقف ہوں۔ اگر ہم ذرا اور سمجھ سے کام لیں تو ہم اس ساز و سامان کو لوں استعمال کر کے آج کل کے امیر ترین لوگوں سے زیادہ دولت مند بن سکتے ہیں اور اپنے تمدن کو ایک نعمت بنا سکتے ہیں۔ مہذب انسان زیادہ تجربہ کار اور عقلمند وحشی ہے۔ لیکن میں اپنا تجربہ بیان کرنے میں کیوں جلدی نہ کروں۔

میں نے مارچ ۱۸۴۵ء کے آخر میں ایک کلہاڑی مستعار لی اور والڈن پونڈ کے کنارے جنگل میں چلا گیا۔ یعنی اس مقام کے بہت ہی نزدیک جہاں میں اپنا مکان بنانا چاہتا تھا۔ میں نے عمارتی لکڑی حاصل کرنے کے لئے تیر کی طرح سیدھے اور سفید صنوبر کے چند نوخیز درخت کاٹنے شروع کر دیئے۔ کچھ ادھار لئے بغیر کوئی کام کرنا بہت مشکل ہوتا ہے لیکن یہ سب سے زیادہ فراخدلانہ طریقہ ہے کہ آپ اپنے ساتھیوں کو اپنے کام میں دلچسپی لینے کی اجازت دے دیں۔ اس کلہاڑی کے مالک نے اس کلہاڑی پر اپنی گرفت ڈھیلی کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہ کلہاڑی مجھے بہت عزیز ہے۔ لیکن میں نے یہ کلہاڑی جب اسے واپس کی تو وہ پہلے سے زیادہ

تیز تھی۔ میں جہاں کام کرتا تھا وہ ایک خوشنما اور صنوبر کے درختوں سے لدا ہوا
پہاڑی مقام تھا جہاں سے میں تالاب اور چھوٹا سا کھلا میدان دیکھ سکتا تھا۔ جہاں
صنوبر اور ہکوری کے پودے اُگ رہے تھے۔ تالاب میں برف ابھی پگھلی نہیں تھی اگرچہ
کہیں کہیں چند کھلی جگہیں دکھائی دیتی تھیں۔ ساری برف کالے رنگ کی تھی اور
اس میں پانی بھرا ہوا تھا۔ جن دنوں میں وہاں کام کر رہا تھا تھوڑی سی برف پڑی
تھی لیکن زیادہ تر یہ ہوتا تھا کہ گھر لوٹتے ہوئے جب میں ریل کی پٹڑی پہ آتا تھا تو
دھندلی فضا میں اُس میدان کی ریت کے زرد ڈھیر دور تک پھیلے ہوئے
جھلملاتے تھے۔ یہاں کے سورج کی کرنوں میں ریل کی پٹڑی چمکتی تھی۔ اور میں
لوے، چیہے اور دیگر پرندوں کی آوازیں سنتا تھا جو ہمارے ساتھ ایک سال
بتانے کے لیے آپہنچے تھے۔ وہ بہار کے بہت خوشگوار ایام تھے جن میں زمین
کے ساتھ انسان کی بے اطمینانی کا موسم سرما بھی برف کی طرح پگھل رہا تھا اور جو
زندگی اب تک بے حس و حرکت پڑی تھی وہ پھیلنے لگی تھی۔ ایک دن جب میری
کلہاڑی کا پھل دستے میں سے نکل کر گر پڑا تو میں نے ایک ہرے درخت کی
پچر کاٹ کر پھل کے چھید میں پتھر سے ٹھونک دی اور لکڑی کو پھلانے کے لئے
کلہاڑی تالاب کے ایک کھلے حصے میں ڈبو دی۔ میں نے ایک دھاریوں والے
سانپ کو پانی میں جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ سانپ جب تک میں وہاں رہا کسی
قسم کی تکلیف دیئے بغیر ایک چوتھائی گھنٹے سے زیادہ دیر تک تالاب کی تہہ میں
بیٹھا رہا غالباً وہ ابھی تک اپنی بے حسی کے دائرہ سے نکل نہیں پایا تھا۔ مجھے
ایسا دکھائی دیا کہ اسی طرح کے اسباب کی بنا پر انسان بھی اپنی موجودہ پست اور
ابتدائی حالت میں پڑے رہتے ہیں لیکن اگر وہ بہار کے اثر کو محسوس کریں
جو ان کو بیدار کرتا ہے تو وہ ضرور زیادہ بلند اور لطیف زندگی سے ہمکنار

ہو سکتے ہیں۔ میں نے پہلے بھی کہرآلود جسموں کو اپنے راستہ میں سانپ دیکھے تھے جن کے جسموں کے کچھ حصے ٹھٹھرے اور اکڑے پڑے تھے اور وہ اس انتظار میں تھے کہ سورج نکلے اور ان کو گرمادے یکم اپریل کو بارش ہوئی اور برف پگھل گئی اور دن کے ابتدائی حصے میں جو بہت دھندلا تھا میں نے ایک تنہا ہنس کو راستہ ٹٹولتے اور بولتے ہوئے سنا۔ وہ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے راستہ بھول گیا ہو یا کہرے کی کوئی روح ہو۔

میں اس طرح کئی روز تک عمارتی لکڑی کاٹتا اور چیرتا اور بلیاں اور تختے بناتا رہا۔ میں یہ سارے کام اپنی چھوٹی سی کلہاڑی سے کرتا رہا۔ میرے ذہن میں قابلِ اظہار اور عالمانہ خیالات نہیں آئے۔ میں صرف یہ گنگناتا رہتا تھا۔

"لوگ کہتے ہیں کہ وہ بہت سی باتیں جانتے ہیں،
لیکن ذرا دیکھئے۔ وہ ساری باتیں پر لگا کر
اڑ گئی ہیں۔
آرٹ اور سائینس،
ہزاروں وسائل
یہ ہوا جو چل رہی ہے
لوگ بس اُسے ہی جانتے ہیں!

میں نے بڑی عمارتی لکڑی کے چھ چھ انچ چورس ٹکڑے چیرے۔ بیشتر بلیوں کو دو طرف سے چھیلا اور تختوں اور فرش کے شہتیروں کو صرف ایک طرف سے چھیلا۔ باقی چھال ویسے ہی رہنے دی تاکہ اس طرح وہ چیرے ہوئے تختوں سے زیادہ سیدھی اور مضبوط رہیں۔ میں نے ہر لکڑی میں بڑی احتیاط سے سوراخ کیا یا اس کی نوک نکالی کیونکہ اس وقت تک میں نے دیگر اوزار مستعار لے لئے تھے۔ جنگل میں میرے دن

زیادہ طویل نہیں ہوتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود میں عام طور سے روٹی اور مکھن
پر مشتمل اپنا کھانا ساتھ لے جاتا اور دوپہر کو اپنی کاٹی ہوئی صنوبر کی سبز شاخوں پر بیٹھ کر
وہ اخبار پڑھتا تھا جس میں کھانا لپٹا ہوتا تھا۔ میری روٹی میں صنوبر کی شاخوں کی کچھ
خوشبو شامل ہو جاتی تھی۔ اس لئے کہ میرے ہاتھوں پر اس کے دودھ کا ایک موٹا لیپ
چڑھا ہوتا تھا۔ صنوبر کے درخت کاٹنے سے پہلے میں صنوبر کے درختوں کا دوست
زیادہ اور دشمن کم تھا۔ میں نے اگرچہ کچھ پیڑ کاٹ ڈالے تھے لیکن میں ان کو زیادہ جاننے
لگا تھا۔ بعض اوقات جنگل میں گھومنے والا شخص میری کلہاڑی کی آواز سن کر
میرے پاس چلا آتا تھا اور ہم ان چھپٹیوں پر بیٹھ کر جن کو میں نے کاٹا تھا بڑے
مزے سے باتیں کیا کرتے تھے۔

چونکہ میں نے اپنے کام میں جلد بازی سے کام نہیں لیا تھا۔ بلکہ اس سے
اپنا حصہ اٹھایا تھا اس لئے اپریل کے وسط میں میرے مکان کا چوکھٹا تیار ہو گیا اور
اب اسے صرف اٹھانے کی دیر تھی۔ میں نے ایک آئرستانی جیمز کولنس کی جھونپڑی تختوں
کے لئے پہلے ہی خرید لی تھی۔ اس کی جھونپڑی غیر معمولی طور پر عمدہ سمجھی جاتی تھی۔ جب
مجھے اس کو دیکھنے کے لئے بلایا گیا تھا۔ اس وقت وہ وہاں موجود نہ تھا۔ میں باہر ٹہلتا
رہا۔ پہلے تو کسی نے مجھے اندر سے نہ دیکھا کیونکہ کھڑکی بہت گہری اور اونچی تھی۔
جھونپڑی بہت چھوٹی سی اور اس کی چھت نوکدار تھی۔ اس کے علاوہ اور کچھ دکھائی
بھی نہیں دیتا تھا کیونکہ اس کے چاروں طرف پانچ پانچ فٹ اونچی مٹی کھاد کے
ڈھیر کی طرح پڑی تھی۔ چھت اس کا سب سے مضبوط حصہ تھی۔ اگرچہ وہ دھوپ سے
ٹیڑھی ہو کر سوکھ گئی تھی۔ دروازے کی کوئی دہلیز نہ تھی لیکن دروازے کے تختے کے
نیچے مرغیوں کے آنے جانے کے لئے ایک مستقل راستہ بنا ہوا تھا۔ مسز کولنس دروازے
تک آئیں اور انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں اندر آکر اس کا جائزہ لے لوں۔ میری

آمد پر مرغیوں کو اندر رکھدیا گیا۔ جھونپڑی تاریک تھی، فرش کا زیادہ تر حصہ کچا، گندا، چیمپا اور مرتعش تھا۔ یہاں وہاں ایک دو تختے تھے جن کو نکالا جاتا تو ٹوٹ جاتے۔ مسز گوسن نے مجھے چھت اور دیواریں اندر سے دکھانے کے لئے لیمپ جلایا۔ تختے کا فرش اگرچہ پلنگ کے نیچے تک جاتا تھا۔ لیکن وہ مجھے خبردار کر رہا تھا کہ میں تہہ خانے میں قدم نہ رکھوں جو دو فٹ گہرا اور گرد سے اٹا ہوا ایک گڑھا تھا۔ مسز گوسن کے کہنے کے مطابق "چھت پر اچھے تختے تھے۔ چاروں طرف اچھے تختے تھے اور کھڑکی بھی اچھی تھی" دراصل یہ کھڑکی دو چوکور تختوں کی تھی جن میں سے ایک ابھی صرف ایک ہی گذری تھی۔ اس میں ایک اسٹول، ایک پلنگ، ایک بیٹھنے کی جگہ اور ایک بچہ تھا جو اس گھر میں پیدا ہوا تھا۔ ایک ریشمی چھتری تھی، ایک مہاگنی چوکٹے سنہری فریم کا آئینہ تھا۔ کافی دھلنے والی ایک نئی چکی جو شاہ بلوط کے لوہے کی کیل ٹھونک کر جڑ دی گئی تھی۔ بس یہی اس جھونپڑی کا سارا سامان تھا۔ جلد ہی سودا ہو گیا کیونکہ جیمز اس عرصہ میں واپس آ گیا تھا۔ مجھے اس رات کو چار ڈالر اور چالیس ڈالر دینے تھے اور اسے صبح پانچ بجے وہ جھونپڑی خالی کر جانی تھی اور اس دوران میں کسی دوسرے کے ہاتھ نہیں بیچنی تھی۔ مجھے چھ بجے اس جھونپڑی پر قبضہ کر لینا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ صبح سویرے آنا بہتر ہوگا اور مجھے اس بات کا بھی دھیان رکھنا ہوگا کہ کچھ لوگ زمین کے کرائے اور ایندھن کے فرضی اور ناجائز مطالبات لے کر آئیں گے۔ اس نے مجھے یقین دلایا کہ اس جھونپڑی پر صرف یہی ایک بوجھ ہے۔ چھ بجے میں اس کے اور اس کے خاندان کے قریب سے گذرا۔ ایک بہت بڑی گٹھڑی میں ان کا کل سامان تھا۔ پلنگ، کافی دھلنے کی چکی، آئینہ مرغیاں۔ صرف بلی نہیں تھی۔ وہ جنگل میں بھاگ گئی تھی۔ اور جنگلی بلی بن گئی تھی۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ وہ گلہریاں پکڑنے کے لئے رکھے ہوئے پھندے

میں جا پھنسی اور آخر کار ایک مردہ بلّی بن گئی۔

میں نے اس دن یہ جھونپڑی گرا دی اور اس کا ملبہ تھوڑا تھوڑا چھکڑے میں لاد کر تالاب کے کنارے لے گیا وہاں میں نے اس کے تختوں کو گھاس پر پھیلا دیا تاکہ دھوپ میں ان کا رنگ بدل جائے اور وہ دوبارہ سیدھے ہو جائیں۔ جب میں اپنا ٹھیلہ لئے ہوئے جنگل کی پگڈنڈی پر جا رہا تھا تو ایک چڑیا چہچہائی ۔ ایک نوعمر لڑکے پیٹرک نے دغابازی سے کام لیتے ہوئے مجھے مطلع کیا کہ ایک آئرستانی پڑوسی سیلی ٹھیلہ لے کر چلے جانے اور آنے کے دوران میں کچھ سیدھے اور ٹھونکے جانے کے قابل کیل، کنڈے اور نوکدار سلاخیں اپنی جیب میں ڈال کر لے گیا تھا۔ اور جب میں دن گزارنے کے لئے واپس آیا تو اس نے وہاں کھڑے ہو کر بڑی بے پروائی سے دیکھا جیسے وہ اس بہار کے تصور میں کھویا ہوا ہو۔ اس نے کہا "ان دنوں کام بہت کم ملتا ہے۔" وہ شخص تماشائیوں کی دنیا کی نمائندگی کر رہا تھا اور بظاہر اس نہایت معمولی واقعہ کو ٹرائے سے اصنام کے ہٹائے جانے کے واقعہ کے برابر اہمیت دے رہا تھا۔

میں نے اپنا تہہ خانہ پہاڑ کی جنوبی ڈھلوان کی طرف بنایا جہاں پہلے جنگلی گلہری نے اپنا بل بنا رکھا تھا۔ میں نے یہ تہہ خانہ چھ فٹ چوکور اور سات فٹ گہرا بنایا۔ سماق اور بلیک بیری کی جڑیں اور گہری گھاس اور جھاڑیاں اکھاڑ کر پھینک دیں۔ یہ تہہ خانہ نفیس ریت نکل آنے تک کھودا گیا۔ جہاں کسی موسم سرما میں آلو منجمد نہیں ہو سکتے۔ میں نے بغلی دیوار میں ڈھلوان ہی رہنے دی۔ اور ان میں پتھر نہ لگائے کیونکہ ان پر دھوپ کبھی نہیں پڑی۔ اس لئے ریت ابھی تک اپنی جگہ پر قائم ہے۔ یہ صرف دو گھنٹے کا کام تھا۔ مجھے زمین کھودنے میں خاص مزہ آیا۔ اس لئے کہ ہر عرض البلد میں آدمی معتدل درجہ حرارت حاصل کرنے

کے لئے زمین کھودتے ہیں۔ شہر کی انتہائی شاندار عمارت کے نیچے بھی آپ کو ایک تہہ خانہ ملے گا جہاں لوگ عہدِ قدیم کی طرح زمین کے اندر پیدا ہونے والی غذا کی اشیا کا ذخیرہ رکھتے ہیں اور عمارت کے بالائی ڈھانچے کے غائب ہو جانے کے مدتوں بعد تک آنے والی نسلیں زمین میں اُس گڑھے کا نشان دیکھتی ہیں۔ مکان ابھی تک بِل میں داخل ہونے کے راستہ پر ایک قسم کا چھجہ ہے۔

میں نے آخر کار مئی کے اوائل میں چند شناساؤں کی مدد سے جو کسی ضرورت کی بجائے ہمسائیگی کے رشتہ کو بہتر بنانے کے موقع سے فائدہ اٹھانے کے لئے لی گئی تھی اپنے گھر کی چوکھٹ کھڑی کر دی۔ مکان کا ڈھانچہ کھڑا کرنے والے کسی اور شخص کی اتنی عزت نہیں ہوئی ہو گی جتنی میری ہوئی۔ مجھے یقین ہے کہ ان کی قسمت میں ایک اس سے زیادہ بلند و بالا عمارتوں کا ڈھانچہ کھڑا کرنے میں مدد دینا لکھا ہے۔ جونہی مکان کے تختے لگ گئے اور اس کی چھت پڑ گئی۔ میں نے ۴ جولائی سے اس مکان میں رہنا شروع کر دیا۔ تختوں کے کنارے بڑی احتیاط سے پتلے پتلے بنائے گئے تھے اور یوں ایک دوسرے کے اوپر چڑھا دئے گئے تھے کہ برسات میں مکان کے ٹپکنے کا اندیشہ نہیں رہا تھا۔ اس مکان میں کھانا تیار کرنے سے پہلے میں نے ایک گوشے میں چمنی کی بنیاد رکھ دی تھی میں تالاب سے دو چھکڑوں بھر پتھرا اپنے بازوؤں میں اٹھا کر پہاڑ پر لایا۔

میں نے موسمِ خزاں میں اپنے کھیت کو گوڑنے کے بعد گرمی کے لئے آگ کی ضرورت محسوس ہونے سے پہلے چمنی تعمیر کر لی اور اس عرصہ میں اپنا کھانا زمین پر گھر کے باہر صبح سویرے تیار کرتا رہا۔ میرے خیال میں کئی اعتبار سے یہ طریقہ کار اب بھی مروجہ طریقہ سے زیادہ آرام دہ اور پسندیدہ ہے۔ اگر میری روٹی کے پکنے سے پہلے طوفان امڈ آتا تو میں آگ کے اوپر چند تختے لگا دیتا۔ اور ان کے

نیچے بیٹھ کر روٹی کی دیکھ بھال کرتا رہتا اور اس طرح چند گھنٹے بڑے مزے سے
گزر جاتے۔ اُن دنوں جب میرے ہاتھ مصروفِ کار رہتے تو میں بہت کم پڑھتا تھا لیکن
زمین پر پڑے ہوئے کاغذ کے تھوڑے سے ٹکڑے، میز (قلم یا میز پوش) میرے
لئے کافی تفریح کا سامان بہم کرتے تھے اور درحقیقت وہی مقصد پورا کرتے تھے جو
رزمیہ نظم الیئیڈ کرتی ہے۔

اگر تھوڑے سے زیادہ سوچ بچار کرنے کے بعد مکان تعمیر کیا جائے تو وہ اور بھی
بہتر رہے گا۔ مثال کے طور پر غور کرنا ہوگا کہ انسان کی فطرت میں دروازہ، کھڑکی،
تہہ خانہ اور بالائی کمرہ بنانے کی کون سی وجہ موجود ہے۔ پھر ہم کوئی بالائی ڈھانچہ
اس وقت تک نہیں بنائیں گے جب تک اپنی دنیاوی ضروریات سے زیادہ قوی کوئی
اور وجہ نہیں ڈھونڈ لیں گے۔ ایک آدمی کے لئے اپنا گھر بنانا اتنا ہی مناسب ہے جتنا
پرندوں کے لئے اپنا گھونسلا بنانا۔ اگر انسانوں نے اپنے ہاتھوں سے اپنے مکان
بنائے ہوتے اور سادگی اور ایمان داری سے اپنے اور خاندان کے لئے خوراک
مہیا کی ہوتی تو آفاقی طور پر اُن کی تخلیقی قوت اسی طرح بڑھ جاتی جس طرح دنیا
بھر میں پرندے مصروفیت کے وقت چہچہاتے ہیں۔ لیکن افسوس ہم کالے چڑیا
اور کوئل کو پسند کرتے ہیں جو ایسے گھونسلوں میں انڈے دیتی ہیں جن کو دوسرے پرندوں
نے بنایا ہے اور کسی راہ گیر کو اپنی بےسُری چوں چوں اور راگ اور بے ہنگم گیتوں سے محظوظ
نہیں کرتیں۔ کیا ہم نے مکان کی تعمیر کی ساری خوشیاں بڑھئی کے لئے وقف کر دی ہیں؟
انسانوں کی اکثریت کے تجربہ میں فنِ تعمیر کا مطلب کیا ہے؟ میں نے پیدل سیر کے دوران
میں کبھی کسی ایسے شخص کو نہیں دیکھا جو اپنا مکان بنانے کی طرح کے کسی سادہ اور
قدرتی کام میں مصروف ہو۔

ہم برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔ صرف درزی ہی انسان کا نواں حصہ نہیں

ہے بلکہ اُتنا ہی پارری، تاجر اور کسان بھی ہے۔ محنت کی یہ تقسیم کہاں جاکر ختم ہوگی؟
اور آخرکار اس کا مقصد کیا ہے؟ اس میں شک نہیں کہ دوسرا شخص بھی میرے لئے
سوچ سکتا ہے۔ لیکن یہ بات اس لئے پسندیدہ نہیں ہے کہ وہ اس طرح سوچے
کہ مجھے اپنے بارے میں سوچنے ہی نہ دے۔

یہ صحیح ہے کہ اس ملک میں ماہرینِ تعمیرات نام کے لوگ بھی ہیں اور میں نے کم سے کم
ان میں سے ایک کے بارے میں یہ سُن رکھا ہے کہ وہ ایسے تعمیری نقش و نگار بنانے کا
ارادہ رکھتا ہے جن میں صداقت ہو یا جو ضروری ہونے کی وجہ سے حسین ہوں۔ وہ اس ارادے
کا اظہار یوں کرتا ہے۔ جیسے اس کو الہام ہوا ہو۔ اس کے نقطۂ نظر سے تو شاید یہ بات بہت
اچھی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن عام اناڑی پن سے کچھ ہی بہتر ہے۔ وہ فنِ تعمیر کا ایک جذباتی
اصلاح پسند ہے۔ کیونکہ اُس نے بنیاد کی بجائے کارنس سے کام شروع کیا۔ یہ اس لیے
تھا کہ وہ کیسے نقش و نگار میں صداقت کا رنگ بھرے۔ ہو سکتا ہے کہ ہر شکر چڑھے آلوچے
میں بادام یا زیرہ رومی کا بیج ہو لیکن میرا خیال ہے کہ بادام شکر کے بغیر زیادہ لذیذ
ہوتے ہیں۔ اُسے اس بات سے کوئی سروکار نہیں ہے کہ مکان کے اندر رہنے والا کیسے
اس مکان کے اندرونی اور بیرونی حصوں کو تعمیر کرے گا اور کیسے ان نقش و نگار کو اُن کے
رحم و کرم پر چھوڑ دے گا کسی سمجھ دار انسان نے آج تک یہ سوچا ہے کہ نقش و نگار محض بیرونی
چیز ہوتے ہیں۔ اور اُس نے کب یہ مانا ہے کہ اس کچھوے کو نقطہ دار کھپرا اور کھپرے دار
گھونگھے کو اس کی موتی جیسی چمک اسی طرح ملی ہے جس طرح براڈوے کے باشندوں کو ان
کا تثلیثی گرجا۔ لیکن انسان کو اپنے مکان کے اسلوبِ تعمیر سے اسی طرح کوئی واسطہ نہیں
ہوتا جس طرح کچھوے کو اپنے کھپرے سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ سپاہی کو کبھی اتنا کاہل
ہونے کی ضرورت نہیں کہ وہ اپنے جھنڈے پر اپنی خوبیوں کے صحیح رنگ کی عکاسی کرنے
کی کوشش کرے۔ دشمن کو اس کا پتہ چل جائے گا اور جب آزمائش کی گھڑی آئے گی

تو اس سیاہی کا رنگ زرد پڑ جائے گا۔ مجھے تو ایسا دکھائی دیتا ہے جیسے یہ ماہر تعمیر کارنس پر جھکا ہوا ہو اور مکان میں رہنے والے غیر مہذب لوگوں کے کانوں میں کچھ جھوٹی اور کچھ سچی باتیں سرگوشی کے انداز میں کہہ رہا ہو حالانکہ وہ غیر مہذب لیکن حقیقتاً اس سے زیادہ آگاہ ہیں۔ میں جس عمارتی حسن کو اب دیکھ رہا ہوں۔ اس کے بارے میں یہ جانتا ہوں کہ وہ دھیرے دھیرے باطن سے نکل کر ظاہر میں آیا ہے۔ یعنی یہ حسن مکان میں رہنے والے کی ضروریات اور کردار نے پیدا کیا ہے جو اس مکان کا حقیقی معمار ہے۔ اور یہ حسن ایسی کسی غیر شعوری صداقت اور شرافت سے ظہور میں آیا ہے جس میں نمود و نمائش کا شائبہ تک نہیں۔ مستقبل میں بھی اس قسم کی جتنی زائد خوبصورتی پیدا ہو گی اس سے قبل زندگی کی ایسی ہی غیر شعوری خوبصورتی کا ہونا ضروری ہو گا۔ اس ملک میں سب سے زیادہ دلچسپ مکان جیسا کہ ایک مصور جانتا ہے عام طور سے غریبوں کے انتہائی بے تصنع اور حقیر جھونپڑے اور لکڑی کے مکان ہیں۔ یہ مکان ان مکینوں کی زندگی ہیں جن کے وہ گھر ہیں۔ محض ان مکانوں کی اوپری سطح کی کوئی خصوصیت ان کی زندگی نہیں ہے جو ان کو خوشنما بناتی ہے۔ اسی طرح ایک شہری کے اداس مکان بھی دلچسپ ہو جائیں گے۔ جب اس کی زندگی اس کے تصور کے مطابق سادہ اور پسندیدہ ہو جائے گی۔ اور اس کے مکان کی ساخت میں مرعوب ڈالنے والا کوئی تاثر نہیں رہے گا صحیح معنوں میں عمارتی زیب و زینت کا اعلیٰ حصہ کھلاہے اور ستمبر کی طوفانی ہوا ماہیے کی کلغیوں کی طرح ان عمارتی نقش و نگار کو اڑا کر لے جائے گی اور ان مکانوں کے کارآمد حصوں کو گزند پہنچائے بغیر ان کو ننگا کر دے گی۔ جن لوگوں کے تہہ خانہ میں انجیریں اور شرابیں نہیں ہیں وہ عمارتی نقش و نگار کے بغیر بھی زندہ رہ سکتے ہیں۔ اگر ادب میں مزین اسلوب کے بارے میں اتنا ہی

شور و غل بپا کیا گیا ہوتا اور بائبل کے معماروں نے بھی کارنس بنانے میں اتنا ہی وقت ضائع کیا ہوتا جتنا کلیسا کے معمار کرتے ہیں تو نہ جانے کیا حشر ہوتا؟ ادب لطیف اور فنونِ لطیفہ اور ان کی تعلیم دینے والے اسی طرح ظہور میں آتے ہیں۔ کاریگر ان کو اس بات سے واقعی بہت سروکار ہے کہ وہ اس لئے پریشان رہتے ہیں کہ چند لکڑیاں ان کے اوپر یا نیچے کس ڈھنگ سے رکھی گئی ہیں اور کون سے رنگ ان کے صندوق پر لگائے گئے ہیں۔ یہ بات واقعی کچھ اہمیت اختیار کر سکتی ہے اگر وہ خود لکڑیاں لگائے گا اور روغن کرے گا لیکن جب مکین کی روح مکین سے نکل جائے گی تو تابوت بنانا اپنی قبر بنانے کے مترادف ہوگا۔ یہ قبر تعمیر کرنے کا فن ہے۔ "بڑھئی" کا دوسرا نام تابوت ساز ہے۔

ایک شخص مایوسی کے عالم میں اور زندگی سے بے پروا ہو کر یہ کہتا ہے کہ آپ اپنے قدموں میں پڑی ہوئی مٹھی بھر مٹی اٹھا لیجئے اور اپنا مکان اس کے رنگ سے رنگ دیجئے۔ کیا یہ شخص اپنے آخری اور تنگ مکان کے بارے میں سوچ رہا ہے؟ اس کے لئے بھی ایک سکہ چاہیے۔ جو آپ فیصلہ کر لیجئے۔ اس شخص کو کتنی فرصت ہوگی! آپ مٹھی بھر مٹی کیوں اٹھائیں۔ اپنے مکان کو اپنے چہرے کا رنگ دینا زیادہ بہتر ہوگا۔ اسے اپنے لئے زرد اور سرخ پڑنے دیجئے۔ جھونپڑیوں کے فن تعمیر کے اسلوب کو بہتر بنانے کی تحریک بھی کیا خوب ہے۔ جب آپ کے پاس سارے زیورات تیار ہو جائیں گے تو میں ان کو پہن لوں گا۔

میں نے موسم سرما سے پہلے ایک چمنی بنائی اور اپنے مکان کے پہلوؤں پر جسے بارش سے پہلے ہی محفوظ کروا لیا تھا لکڑی کی کھپچیاں جڑ دیں۔ لکڑی کی یہ ناہموار کھپچیاں میں نے شہتیروں کے پہلے تراشوں سے بنائی تھیں اس لئے مجھے

رندے سے ان کو ہموار بنانا پڑا۔

اس طرح میرے پاس لکڑی کی پھٹیوں سے جڑا ہوا اور پلستر کیا ہوا مکان ہے اور جو دس فٹ چوڑا اور پندرہ فٹ لمبا ہے۔ اس کے کھمبے آٹھ آٹھ فٹ کے ہیں۔ ایک بالائی کمرہ ہے اور نیچے ایک کوٹھڑی ہے۔ ہر پہلو پر ایک بڑی کھڑکی ہے۔ کھٹکے سے بند ہونے والے دو دروازے ہیں۔ ایک دروازہ ایک کونے پہ ہے جس کے سامنے اینٹوں کا آتش دان ہے۔ میں نے جو سامان استعمال کیا اس کی عام قیمت ادا کرنے کے بعد لیکن کام کی مزدوری نہ گنتے ہوئے کیونکہ وہ سارا کام میں نے خود کیا تھا، میرے گھر بنانے والی صحیح لاگت حسب ذیل ہے۔ میں یہ تفصیل اس لئے درج کر رہا ہوں کہ بہت کم لوگ ایسے ہیں جو صحیح طور پر یہ بتا سکیں کہ ان کے مکان پہ کتنی لاگت آئی ہے اور ان لوگوں کی تعداد تو ان لوگوں سے بھی کم ہے جو اس سامان کی الگ الگ قیمت بتا سکیں جس سے مکان بنتا ہے۔

تختے	۸ ڈالر اور ½۳ سینٹ	زیادہ تر تختے جھونپڑی کے تھے
لکڑی کی بے کار پھٹیاں چھت اور بغلوں کیلئے	۴ ڈالر	
لکڑی کی پٹیاں	ایک ڈالر پچیس سینٹ	
دو پرانی کھڑکیاں شیشوں سمیت	۲ ڈالر ۴۳ سینٹ	
ایک ہزار پرانی اینٹیں	۴ ڈالر	
چونے کے دو پیپے	۲ ڈالر ۴۰ سینٹ	یہ ذرا مہنگے تھے
بال	۳۱ سینٹ	میری ضرورت سے زیادہ آ گئے

آتش دان کے لئے لوہا	پندرہ سینٹ
کیل	۳ ڈالر ۹۰ سینٹ
قبضہ اور پیچ	۱۴ سینٹ
کنڈی	۱۰ سینٹ
کھڑیا مٹی	ایک سینٹ
باربرداری	ایک ڈالر ۴۰ سینٹ (بہت سا سامان میں نے خود پیٹھ پر ڈھویا)

کل میزان ۲۸ ڈالر ½ ۱۲ سینٹ

یہ ہے وہ سارا سامان جس میں عمارتی لکڑی، پتھر اور ریت شامل نہیں۔ کیونکہ ایک دھرنا مار کر بیٹھنے والے کے حقوق کی رُو سے میں ان کا حقدار تھا میرے پاس مکان سے ملحقہ لکڑی کا ایک چھوٹا سا سائبان بھی ہے جو زیادہ تر مکان کی تعمیر کے بعد بچے ہوئے سامان سے بنایا گیا۔

میں ایک ایسا مکان بنانا چاہتا ہوں جو کنکارڈ کی بڑی سڑک پر واقع مکانوں سے شان و شکوہ اور آسائش میں بڑھ چڑھ کر ہوگا۔ بات صرف اتنی ہے کہ وہ مکان مجھے اتنا پسند ہو جتنا مجھے یہ مکان پسند ہے اور اس پر اتنا ہی خرچ آئے جتنا اس پر آیا ہے۔

اس طرح مجھے اس بات کا پتہ چل گیا کہ وہ طالب علم جو ایک پناہ گاہ کا طالب ہے عمر بھر کے لئے ایک ایسا مکان حاصل کر سکتا ہے جس پر اس سے زیادہ رقم خرچ نہیں آئے گی جو وہ سال بھر کے کرایہ کے طور پر ادا کرتا ہے۔ اگر آپ یہ محسوس کر رہے ہیں کہ میں ضرورت سے زیادہ ڈینگ مار رہا ہوں تو میرا عذر صرف اتنا ہے کہ میں یہ ڈینگ اپنے لئے نہیں ساری انسانیت کے لئے مار رہا ہوں۔ اور میری

باتوں کے تضادات میرے بیان کی صداقت پر اثر انداز نہیں ہوتے۔ ریاکاری اور منافقت کے بغیر میرے لئے گندم سے چوکر کو الگ کرنا مشکل ہے اور مجھے اس بات پر اتنا ہی افسوس ہے جتنا کسی دوسرے کو۔ میں اس معاملے میں آزادی اور وضاحت سے بات کروں گا۔ اس لئے کہ ایسا کرنے سے اخلاقی اور جسمانی دونوں تقاضوں کو مدد ملتی ہے اور میں نے یہ تہیہ کر رکھا ہے کہ میں عجز و انکسار کے باعث شیطنت کی وکالت نہیں کروں گا۔ میں صداقت کی حمایت میں اپنی آواز ضرور بلند کروں گا۔ کیمبرج کالج میں طالب علم کے کمرے کا کرایہ جو میرے کمرے سے کچھ ہی بڑا ہوتا ہے تیس ڈالر سالانہ ہے کارپوریشن نے ایک ہی چھت کے نیچے ساتھ ساتھ ایسے بتیس کمرے بنائے ہیں اس کمرے میں جو شخص رہتا ہے اُسے شور و غل مچانے والے پڑوسیوں کے ہاتھوں پریشانی ہوتی ہے اور غالباً کمرہ بھی چوتھی منزل پر ہوتا ہے۔ میں یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اگر ہم واقعی اس معاملہ میں زیادہ عقلمند ہوتے تو ہمیں نہ صرف کم تعلیم کی ضرورت ہوتی (کیونکہ بہت کچھ پہلے ہی حاصل کر چکے ہوتے) بلکہ تعلیم حاصل کرنے کے لیے مالی خرچ بھی بڑی حد تک غائب ہو جاتا۔ ایک طالب علم کو کیمبرج یا کسی دوسری درسگاہ میں جن سہولتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کے لیے اُسے یا کسی دوسرے کو اُس قربانی سے جو باہمی سمجھوتے کے مطابق دینی ہوتی ہے۔ دس گُنی زیادہ زندگی کی قربانی دینی پڑتی ہے۔ جن چیزوں کے لئے زیادہ روپیہ طلب کیا جاتا ہے وہ ایسی ہوتی ہی نہیں ہیں جن کا طالب علم طلبگار ہوتا ہے۔ مثلاً تعلیمی سال کے بل میں پڑھائی کی فیس ایک اہم مد ہوتی ہے۔ وہ اس سے بہتر تعلیم اپنے صاحب ذوق ہمعصروں سے مل جل کر حاصل کرتا ہے جس کے لئے اُسے کوئی فیس نہیں دینی پڑتی۔ ایک کالج قائم کرنے کا عام طریقہ یہ ہے کہ اس کے لئے ڈالروں اور سینٹوں کی شکل میں چندہ جمع کیا جاتا اور پھر اندھا دھند تقسیم کار کے اصولوں کی

آخری حد تک پیروی کر کے (حالانکہ اس اصول کی اُسکی حدود میں رہنے کے سوا
کبھی پیروی نہیں کرنی چاہیئے) ایک ٹھیلے دار کو بلایا جاتا ہے جو اسے نفع اندوزی
کا موضوع بنا لیتا ہے۔ وہ اس کی بنیاد رکھنے کے لئے آرٹسٹوں اور دیگر مزدوروں
کو ملازم رکھتا ہے اور وہ طلبا جن کو اس کالج میں تعلیم حاصل کرنا ہے اس میں (۱) حملہ
لینے کے لیے تیار ہو کر بیٹھے رہتے ہیں۔ (۲) چشم پوشی کا خمیازہ لگاتار آنے والی نسلوں
کو بھگتنا پڑتا ہے۔ میرے خیال میں یہ بہتر ہوگا کہ طلبا اور دوسرے لوگ جو اس سے
فیض یاب ہونا چاہتے ہیں وہی اس کالج کی بنیاد رکھیں۔ وہ طالب علم ضروری محنت
سے باز رہ کر جس کے ساتھ کتنی تگ و دو کر کے اپنے لئے خوشگوار لمحہ فرصت اور عزت
حاصل کرتے ہیں۔ دراصل نیز پیدا اور ذلیل قسم کی فرصت حاصل کرتا ہے۔
وہ اپنے آپ کو اس تجربہ سے محروم کرتا ہے جو لمحات فرصت کو مقصد خیز
بناتا ہے۔ ایک طالب علم کہتا ہے "لیکن آپ کا اس سے کہیں یہ مطلب تو نہیں
کہ طلبا کو دماغ کی بجائے ہاتھوں سے کام لینا چاہیئے؟" دراصل میرا مطلب
یہ نہیں ہے البتہ میری مراد یہ ہے کہ اُسے خود اس سے ملتی جلتی بات پر
غور کرنا چاہیئے۔ یعنی طلبا کو یہ چاہیئے کہ وہ زندگی کو کھیل نہ سمجھیں اور اس
کا محض اوپر اوپر سے مطالعہ نہ کریں۔ کیونکہ ملک کی پیداوار ہی اُن کے اس مہنگے
کھیل کی قیمت ادا کرتی ہے۔ طلبا کو چاہیئے کہ وہ ایمانداری کے ساتھ زندگی
کو شروع سے آخر تک بسر کریں۔ نوجوان فوراً ہی زندگی کا تجربہ کرنے کی کوشش
کئے بغیر کس طرح سے زندگی بسر کرنا کیونکر سیکھ سکتے ہیں؟ میرا خیال ہے کہ اس
سے اُن کے دماغوں کی اتنی ہی ورزش ہوگی جتنی علم ریاضی سے ہوتی ہے۔
مثلاً اگر میں یہ خواہش چاہوں کہ ایک لڑکا آرٹ اور سائنس کی معلومات حاصل
کرے تو میں عام طریقہ ہرگز اختیار نہیں کروں گا۔ عام طریقہ یہ ہے کہ اس

کو کسی پروفیسر کے پڑوس میں بھیج دیا جائے جہاں زندگی کے آرٹ کے سوا سب
کچھ سکھایا جاتا اور عمل میں لایا جاتا ہے۔ لیکن وہ لڑکا خوردبین یا دوربین سے
زندگی دیکھتا ہے لیکن اپنی قدرتی آنکھوں سے کبھی اس کا مشاہدہ نہیں کرتا
وہ علم کیمیا حاصل کرتا ہے لیکن اس بات کو کبھی نہیں جان سکتا کہ اُس
کی روٹی کیونکر تیار ہوتی ہے لیکن وہ لڑکا میکانکی علم اور اس علم سے بے
بہرہ رہتا ہے کہ مشین کیسے بنتی ہے۔ یا نیپچون تک نئے سیارے تلاش کرتا
ہے۔ لیکن اپنی آنکھ کے تنکے کا اُسے پتہ نہیں چلتا یا اُسے اتنی بھی خبر
نہیں ہوتی کہ وہ خود کس آوارہ گرد کے ساتھ گھوم رہا ہے یا اُسے یہ معلوم
نہیں ہوتا کہ کتنے خونخوار جانور اُسے چاروں طرف سے نگل رہے ہیں گو وہ
سرکے کی بوندوں میں خونخوار جانور دیکھ رہا ہوتا ہے۔ ایک مہینے کے اختتام پر
کون زیادہ آگے بڑھ چکا ہوگا۔ وہ لڑکا جس نے ضرورت کے مطابق پڑھ کر
کچا لوہا خود کھودا اور گلا کر اپنا چاقو بنایا ہے یا وہ لڑکا جو اپنے ادارہ میں
دھاتوں کے صاف کرنے کے فن پر لیکچر سنتا رہا ہے اور جس کے باپ نے
اُسے راجرس چاقو بھیجا ہے؟ ان میں سے کس لڑکے کے لئے اس کا زیادہ
امکان ہے کہ وہ اپنی انگلیاں کاٹ لے گا؟ جب میں نے کالج چھوڑا تو مجھے
سخت حیرت ہوئی کہ میں نے جہازرانی کی تعلیم حاصل کی ہے۔ کاش میں ایک
بار بندرگاہ تک گیا ہوتا۔ میں نے اس فن کے متعلق زیادہ علم حاصل کر لیا ہوتا۔
غریب طالب علم کبھی پڑھتا ہے اور اُسے صرف سیاسی اقتصادیات پڑھائی جاتی
ہے اور زندہ رہنے کی اقتصادیات کو جو فلسفہ کے ہم معنی ہے ہمارے کالجوں
میں فروغ نہیں دیا جاتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لڑکا جب ایڈم سمتھ،
ریکارڈو اور سے کی کتابیں پڑھ رہا ہوتا ہے تو اپنے باپ کو قرضے کے

ناقابلِ انتفاع بوجھ کے تلے دبا دیتا ہے۔

ہمارے کالجوں کا جو حال ہے وہی ہماری سینکڑوں ترقیوں کا ہے۔ ان کے بارے میں ایک مغالطہ ہے۔ وہاں سدا حقیقی ترقی نہیں ہوتی۔ شیطان اس میں اپنے پہلے لگائے ہوئے حصے کا اور بعد میں کئی بار لگائے جانے والے سرمایہ کا سود در سود آخری حد تک وصول کر رہا ہے۔ ہماری ایجادات حقیر کھلونے ہیں جو ہماری توجہ سنجیدہ باتوں کی طرف سے ہٹا دیتی ہے۔ وہ ایک غیر ترقی یافتہ مقصد حاصل کرنے کے ترقی یافتہ ذرائع ہیں یعنی وہ ایک ایسا مقصد ہے جسے پہلے ہی بڑی آسانی کے ساتھ حاصل کیا جا سکتا تھا جس طرح ریل کی پٹڑیاں بوسٹن یا نیویارک تک جاتی ہیں۔ ہم بہت جلدی کرتے ہیں کہ کسی طرح تار کے مقناطیسی کھمبے مین سے ٹیکساس تک پہنچا دیں۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ مین اور ٹیکساس کے پاس کوئی اہم پیغام ہی نہ ہو۔ یہ دونوں حالتیں اُس شخص کی حالت کے مطابق ہیں جو اس بات کی سچی خواہش رکھتا تھا کہ اُسے ایک مشہور بہری خاتون سے ملایا جائے لیکن جب اُس شخص کو اُس بہری خاتون کے سامنے پیش کیا گیا اور اُسے خاتون کے کان میں بات کہنے کا آلہ اس کے ہاتھ میں دے دیا گیا تو وہ بیچارہ کوئی بات نہ کہہ سکا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اصل مقصد یہ ہے کہ تیز تیز بولا جائے اور عقل کی کوئی بات نہ کہی جائے۔ ہم اس بات کے خواہاں ہیں کہ اٹلانٹک کے نیچے سرنگ بچھا دیں۔ تاکہ پرانی دنیا سے نئی دنیا تک سفر میں چند ہفتے کم لگیں۔ لیکن عین ممکن ہے کہ بڑے بڑے کان رکھنے والے امریکیوں تک سب سے پہلی خبر یہ پہنچے کہ شہزادی اڈیلیڈ کو کالی کھانسی ہے۔ بہر کیف جس شخص کا گھوڑا ایک میل فی منٹ کے حساب سے دوڑتا ہے وہ

کوئی اہم پیغام لے کر نہیں جاتا۔ وہ نہ تو مبلغ انجیل ہے اور نہ ہی ٹڈیاں اور جنگلی شہد کھاتا ہوا آرہا ہے۔ مجھے شک ہے کہ اڑتے ہوئے قاصد کبھی محلے کا ایک دانہ بھی چکی تک لے گئے ہوں۔

ایک صاحب نے مجھ سے کہا "مجھے تعجب ہے کہ آپ روپیہ نہیں جمع کرتے۔ ویسے آپ کو سیر و سیاحت کا شوق ہے۔ آج آپ گاڑی میں بیٹھ کر فچبرگ جائیے اور دیہات کی سیر کیجئے۔" لیکن میں ان سے زیادہ عقلمند ہوں۔ میں نے یہ بات جان لی ہے کہ سب سے زیادہ تیز رفتار وہ مسافر ہوتا ہے جو پیدل سفر کرتا ہے۔ میں نے اپنے اس دوست سے کہا "آئیے ہم کوشش کریں اور یہ دیکھیں کہ کون پہلے وہاں پہنچتا ہے۔ تیس میل کا فاصلہ ہے۔ کرایہ نوے سینٹ ہے۔ قریب قریب ایک دن کی اجرت۔ مجھے یاد ہے کہ جب اسی سڑک پر مزدوروں کی ایک روز کی اجرت ساٹھ سینٹ ہوا کرتی تھی۔ میں ابھی پیدل چل پڑوں گا اور رات سے پہلے وہاں پہنچ جاؤں گا۔ میں نے اس رفتار سے ہفتوں سفر کیا ہے۔ آپ اس عرصہ میں اپنے کرایہ کے پیسے کمائیں گے۔ آپ وہاں کل کسی وقت یا شاید آج ہی رات پہنچیں گے بشرطیکہ آپ کو اسی وقت خوش قسمتی سے کام مل جائے۔ فچبرگ جانے کی بجائے آپ دن کا زیادہ حصہ کام کرتے رہیں گے۔ اسی طرح اگر ریل کی پٹڑی ساری دنیا کا چکر کاٹ لے تو میرے خیال میں میں آپ سے آگے ہی رہوں گا۔ جہاں تک دنیا کی سیر کرنے اور اس قسم کا تجربہ حاصل کرنے کا سوال ہے مجھے آپ سے صاحب سلامت قطعاً ترک کرنی پڑے گی۔"

یہ ایک ایسا آفاقی قانون ہے جس سے کوئی انسان بچ نہیں سکتا۔ جہاں تک ریل گاڑی کا تعلق ہے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ جتنی لمبی ہے اتنی ہی

چوڑی ہے۔ دُنیا کے گرد ہر انسان کے لیئے ریل کی پٹڑی بنانا اس سیارے کی
سطح کو ہموار کرنے کے مترادف ہے۔ لوگوں کو یہ ایک مبہم سا خیال ہے کہ اگر انہوں
نے جائینٹ اسٹاک کمپنیوں اور کدال چلانے کا کام دیر تک جاری رکھا تو وہ بہت
جلد کچھ خرچ کیئے بغیر ریل گاڑی پر سوار ہو کر کہیں نہ کہیں ضرور پہنچ جائیں گے۔
اسٹیشن تک لوگوں کی ایک بھیڑ دوڑی ہوئی جاتی ہے۔ کنڈکٹر چلاتا ہے "سب
لوگ گاڑی پر سوار ہو جائیں!" دھواں اٹھتا ہے، بخارات میں تحلیل ہو جاتا ہے
اور ہم دیکھتے ہیں کہ بہت کم لوگ گاڑی پر سوار ہوتے ہیں۔ باقی لوگ گاڑی کے
نیچے آجاتے ہیں۔ اور اسے ایک "المناک حادثہ" کہہ دیا جاتا ہے۔ اور کہا جائے
گا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ لوگ گاڑی پر سوار ہو جائیں گے جو اس میں سوار ہونے
کے لیے کرایہ کما چکے ہیں بشرطیکہ وہ اتنی دیر تک زندہ رہیں۔ ہو سکتا ہے کہ
اس وقت تک گاڑی میں سوار ہونے کے لیئے ان کے جسم میں لچک اور دل میں خواہش
باقی نہ رہے۔ زندگی کے بہترین حصے کو اس لئے دولت پیدا کرنے میں صرف کر دینا
کہ زندگی کے انتہائی قیمتی حصے میں کوئی شخص تھوڑی سی آزادی سے لطف اندوز ہو گا،
مجھے اس انگریز کی یاد دلاتا ہے جو سب سے پہلے اس غرض سے ہندوستان گیا کہ وہاں
جاکر روپیہ کمائے گا اور انگلستان واپس آکر ایک شاعر جیسی زندگی بسر کرے گا۔
اُسے چاہیئے تھا کہ وہ فوراً چھت والی کوٹھڑی میں چلا گیا ہوتا۔ "اس دھرتی پر
اپنی اپنی جھونپڑی سے نکل کر لاکھوں آئرستانی" یہ پوچھتے ہیں "کیا کہتے ہیں آپ!
ہم نے جو ریل کی پٹڑی بنائی ہے کیا وہ کوئی اچھی چیز نہیں ہے؟" میں جواب
دیتا ہوں "نسبتاً اچھی چیز ہے۔ میرا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آپ اس سے بھی کوئی
خراب چیز بنا سکتے تھے۔ چونکہ آپ میرے بھائی ہیں اس لیئے میں تو یہی کہوں گا
کاش آپ مٹی کھودنے کی بجائے اپنا وقت کسی اور اچھے کام میں صرف کرتے!"

اپنے گھر کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے سے پہلے میں نے پسندیدہ اور ایماندارانہ طریقہ سے
دس یا بارہ ڈالر کمانے کے لئے جن سے اپنے غیر معمولی اخراجات پورے کر سکوں۔
ڈھائی ایکڑ نرم اور ریتلی زمین میں سیم لگا دی اور تھوڑے سے حصّہ میں آلو، مکئی
مٹر اور شلجم بو دیئے۔ یہاں کا سارا قطعۂ اراضی گیارہ ایکڑ ہے۔ جس میں زیادہ تر
صنوبر اور پائن کے درخت ہیں۔ یہ زمین پچھلی فصل میں ۸ ڈالر اور ۸ سینٹ
فی ایکڑ کے حساب سے فروخت ہوئی تھی ایک کسان نے کہا تھا کہ اس میں چیں
چیں کرنے والی گلہریوں کے سوا اور کچھ پیدا نہیں ہو سکتا۔" میں چونکہ اس زمین کا
مالک نہیں تھا اور اس پر محض دھرنا مار کر بیٹھ گیا تھا۔ اس لئے میں نے زمین میں
کوئی کھاد نہیں ڈالی۔ میں اس زمین پر دوبارہ کاشت کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔
لہٰذا میں نے ایک ہی بار ساری زمین نہیں گوڑی۔ میں نے ہل چلاتے ہوئے
گھاس کی بہت سی جڑیں کھود ڈالیں۔ اور اس طرح مجھے دیر تک کام آنے والا
ایندھن میسر آ گیا۔ میں نے ان جتے ٹیلوں کے کچھ چھوٹے چھوٹے حلقے بھی یونہی
چھوڑ دیئے جو گرمیوں میں سیم کی ہریالی سے آسانی کے ساتھ پہچانے جا
سکتے ہیں۔ میرے مکان کے پیچھے پڑی ہوئی ناقابل فروخت اور بے جان لکڑی
اور تالاب پر بہہ کر آنے والی لکڑی میرے لئے باقی ایندھن مہیا کرتی رہی
ہے۔ مجھے دو بیل اور ایک شخص کرایہ پر لینا پڑا۔ گو ہل میں نے اپنے ہاتھوں
سے پکڑے رکھا۔ پہلی فصل میں اوزاروں، بیجوں اور مزدوری وغیرہ کے لئے
کھیت پر میرے اخراجات ۱۴ ڈالر ۷۲½ سینٹ تھے۔ بیج مجھے کسی نے دے
دیئے تھے۔ اگر آپ زیادہ مقدار میں بیج نہ بوئیں تو ان پر زیادہ خرچ نہیں آتا۔
مجھے بارہ بشل سیم ۲۸ من ۲۸ سیر، اٹھارہ بشل آلو ۱۳ من ۲ سیر، تھوڑے
سے مٹر اور تھوڑی سی جوار میسر آئی۔ جو اور شلجم دیر سے بوئے گئے تھے اس

لئے وہ بالکل نہیں ہوئے۔ کھیت سے میری کل آمدنی یہ تھی :-

آمدنی	۲۳ ڈالر ۴۴ سینٹ
اخراجات	۱۴ ڈالر ۷۲½ سینٹ
باقی	۸ ڈالر

اس کے علاوہ جو پیداوار میں نے استعمال کی اور جو تخمینے کے وقت موجود تھی۔ اس کی قیمت ۴ ڈالر ۵ سینٹ تھی۔ غلّے کی جتنی مقدار میرے پاس تھی۔ وہ اس گھاس کی قیمت سے زیادہ تھی جو میں نے اُگائی نہیں تھی۔ تمام باتوں کو خیال میں رکھتے ہوئے آج کل کے حالات اور انسان کی روح کی اہمیت کو بھی مدنظر رکھتے ہوئے اور اس امر کے قطع نظر کہ میرے تجربے میں بہت کم وقت صرف ہوا تھا۔ اور ایک حد تک اسی لئے کہ یہ تجربہ بالکل عارضی نوعیت کا تھا مجھے یقین تھا کہ میں اس سال کا نتیجہ کسان سے اچھا رہا ہر اس کسان سے بھی اچھا رہا کیونکہ میں نے اپنی ضرورت کے مطابق ایک تہائی ایکڑ زمین کی گوڑائی کی اور کاشتکاری سے متعلق آرتھر ینگ اور دیگر مصنفین کی مشہور کتابوں سے متاثر ہوئے بغیر اپنے دو برس کے تجربہ سے یہ سیکھا کہ اگر کوئی شخص سادہ زندگی بسر کرے اور اتنا ہی اناج کھائے جتنا وہ پیدا کرتا ہے یعنی اس سے زیادہ اناج نہ پیدا کرے جتنا وہ کھاتا ہے اور اس اناج کا تبادلہ ناکافی تعداد میں ملنے والی پُر آسائش اور مہنگی اشیاء سے نہ کرے تو اُسے صرف چند مربع راڈ زمین کی کاشت کرنی پڑے گی۔ اپنی زمین کو فوراً گوڑنا بیلوں سے جوتنا، پرانی میں کھاد ڈالنے کی بجائے نئی جگہ ڈھونڈنا زیادہ سستا پڑے گا۔ گرمیوں میں فرصت کے وقت اس شخص کے لئے اپنی کھیتی باڑی کا ضروری کام کرنا بائیں ہاتھ کا کھیل ثابت ہو سکتا ہے۔ اس طرح وہ آجکل

کی طرح ایک بیل، گھوڑے، گائے یا سور کے دُم سے بندھا نہیں رہے گا۔ میں غیر جانبداری سے اس موضوع پر اُس شخص کی طرح جسے موجودہ اقتصادی اور سماجی انتظاموں کی کامیابی اور ناکامی سے کوئی دلچسپی نہ ہو۔ میں کنکارڈ کے ہر کسان کی نسبت زیادہ آزاد تھا کیونکہ میں کسی مکان یا کھیت سے بندھا ہُوا نہ تھا۔ میں اپنی ذہانت کے رُجحان کی پیروی کر سکتا تھا جو ہر لمحہ پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتا رہتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کسانوں کے مقابلہ میں میری حالت زیادہ اچھی تھی کیونکہ اگر میرا گھر جل جاتا یا میری فصل جاتی رہتی تو میں پہلے جتنی اچھی حالت میں رہ سکتا تھا۔

میں یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہوں کہ انسان مویشیوں کے اتنے رکھوالے نہیں ہیں جتنے مویشی انسانوں کے رکھوالے ہیں۔ کیونکہ وہ انسانوں سے زیادہ آزاد ہیں۔ انسان اور بیل کام کا تبادلہ کرتے ہیں۔ اگر ہم ضرورتی کام کو مدِنظر رکھیں تو ہمیں بیل زیادہ فائدہ میں نظر آئیں گے۔ کیونکہ ان کے کھیت بہت زیادہ بڑے ہیں۔ انسان چھ ہفتوں تک سوکھی گھاس کاٹنے میں تبادلہ کا صرف تھوڑا سا کام کرتا ہے۔ گھاس کاٹنا بچوں کا کھیل نہیں۔ یقیناً کوئی ملک جس کے باشندے ہر اعتبار سے سادہ زندگی بسر کرتے ہیں یعنی فلسفیوں کا کوئی ملک اتنی بڑی غلطی نہیں کریگا۔ کہ مویشیوں کی محنت استعمال میں لائے۔ یہ صحیح ہے کہ فلسفیوں کا کبھی کوئی ملک نہیں ہوا۔ اور آئندہ اس کے ہونے کی اُمید بھی نہیں ہے۔ مجھے یہ بھی یقین نہیں ہے کہ فلسفیوں کے ملک کا ہونا مفید بھی ہے یا نہیں۔ بہرکیف میں نے کبھی کسی گھوڑے یا بیل کو ہرگز نہ سدھایا ہوتا اور اسے سدھا کر اپنے لئے کام کرنے کے سلسلے میں کھانا کھلانے کی غرض سے ہرگز نہ لے جاتا۔ کیونکہ مجھے یہ ڈر رہتا کہ میں کہیں محض گھوڑ سوار اور چرواہا بن کر نہ رہ جاؤں کیا ہمیں اس بات کا یقین ہے کہ ایک آدمی کا نفع دوسرے آدمی کا نقصان ہے اور اصطبل میں کام کرنے والا لڑکا اپنے مالک کی طرح مطمئن ہے؟ میں تسلیم کرتا ہوں کہ بہت سے

عوامی کام اس قسم کی امداد کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتے تھے۔ لیکن انسان کو چاہیئے کہ وہ ان کاموں پہ نازاں ہوتے وقت اس فخرو ناز میں بیل اور گھوڑے کو بھی شریک کر لیا کرے کیا اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ وہ ایسا کر کے اس سے بھی زیادہ شایان شان کارنامہ سرانجام نہیں دے سکتا تھا؟ جب انسان اُن کی مدد سے نہ صرف غیر ضروری یا فنکارانہ بلکہ عشرت پسندانہ اور فضول کام کرنا شروع کر دیتا ہے تو یہ بات ناگزیر ہو جاتی ہے کہ کچھ لوگ بیلوں کے ذریعہ تبادلہ کا سارا کام کرتے ہیں یا دوسرے الفاظ میں انتہائی طاقتور کے غلام بن جاتے ہیں۔ اس طرح انسان نہ صرف اس جانور کے لئے کام کرتا ہے جو اس کے اندر موجود ہے بلکہ وہ اس کی علامت کے طور پہ اُس جانور کے لئے بھی کام کرتا ہے جو اُس کے باہر ہے۔ اگرچہ ہمارے پاس اینٹ اور پتھر کے بڑے بڑے مکان ہیں۔ لیکن انسان کی خوشحالی کا ابھی تک اندازہ اس بات سے لگایا جاتا ہے کہ اس کے میدان سے اس کا اناج کتنا اونچا ہے۔ اس قصبہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہاں بیلوں، گائیوں اور گھوڑوں کے لئے بڑے بڑے مکان ہیں۔ اور وہ پبلک عمارتوں کے سلسلے میں کبھی پچھڑا ہوا نہیں ہے لیکن اس ملک میں آزادی کے ساتھ پرستش کرنے یا تقریر کرنے کے لئے بہت کم ہال ہیں۔ آخر قومیں اپنے فنِ عمارت سازی کی بجائے اپنی قوتِ فکر و خیال سے اپنی یادگاریں کیوں نہیں قایم کرتی ہیں؟ بھگوت گیتا مشرق کے تمام کھنڈرات سے کس قدر دلنشین ہے۔ مینار اور مندر بادشاہوں کی عشرت ہیں۔ ایک سادہ اور آزاد ذہن رکھنے والا شخص کسی بادشاہ کے حکم پر محنت نہیں کرتا۔ ذہانت کسی شہنشاہ کی خادم نہیں ذہانت کا مواد سونا، چاندی اور سنگِ مرمر نہیں ہے۔ اور اگر ہے تو صرف ایک حد تک ہے پھر آپ ہی کہیئے کہ اس قدر پتھر تراشنے کا مقصد کیا ہے۔ جب میں آرکیڈیا میں تھا تو میں نے وہاں کسی کو پتھر تراشتے نہیں دیکھا۔ قوموں پر اس دیوانہ

نے غلبہ پا کر لکھا ہے کہ جتنی مقدار میں وہ تراشے ہوئے پتھر چھوڑ جائیں گی اُتنی ہی
ان کی یادگاریں زیادہ پائیدار ہوں گی۔ کاش انہوں نے اپنے اطوار پر چلا کرنے میں اتنی
عرقریزی سے کام لیا ہوتا! عقل کی ایک چھوٹی سی بات اس عمارت کی نسبت زیادہ
بڑی یادگار ہے جس کی بلندی چاند کو چھوتی ہے۔ میں تو پتھروں کو ان کی اپنی جگہ
پر دیکھنا پسند کرتا ہوں۔ تھیبز کی شان و شوکت بیہودہ شان و شوکت تھی۔ کسی ایماندار
شخص کے کھیت کے گرد جریب بھر پتھر کی دیوار سینکڑوں دروازوں والے شہر
تھیبز سے زیادہ معقول ہے جو زندگی کے حقیقی مقصد سے دور ہٹ چکا تھا۔ وحشی
مذہب اور تمدن زیادہ شاندار مندر تعمیر کرتا ہے جو وحشیانہ اور [illegible] ہوتا ہے
لیکن جسے آپ عیسائیت کہہ سکتے ہیں وہ ایسا نہیں کرتی۔ ایک ملک جتنے پتھر
تراشتا ہے وہ صرف اس کی قبر بنانے کے کام آتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو زندہ
دفن کر لیتا ہے۔ جہاں تک اہرام مصر کا تعلق ہے ان کے سلسلے میں صرف حیرت انگیز بات
یہ ہے کہ ایک جاہ طلب احمق کی قبر تیار کرنے کے لئے اتنے آدمی میسر آ سکے کہ انہوں نے
ذلت اٹھا کر ساری عمر اس کام میں صرف کر دی۔ یہ زیادہ عقلمندی اور مردانگی کی بات
ہوتی اگر اس احمق کو دریائے نیل میں غرق کر دیا جاتا۔ عین ممکن ہے کہ میں ان لوگوں اور
اس احمق کے لئے کوئی عذر تلاش کر سکوں۔ لیکن میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔ جہاں
تک معماروں کے مذہب اور آرٹ کیلئے ان کی محبت کا سوال ہے یہ ساری دنیا میں
ایک ہی طرح کا ملے۔ چاہے وہ عمارت مصر کا کوئی مندر ہو یا امریکہ کا کوئی بنک۔ اس
سے جو مقصد پورا ہوتا ہے اس کے مقابلہ میں اس پر لاگت زیادہ آتی ہے۔ اس کا اصل
مقصد نمود و نمائش ہے۔ جس میں لہسن اور روٹی اور مکھن کی بو بھی شامل ہے۔ ایک
ہونہار معمار مسٹر بالکوم اپنے وٹرووئیس کی پشت پر سخت سرمہ والی پنسل اور
رولر سے نقشہ کھینچتا ہے اور پھر سارا کام ڈابسن اینڈ سنز سنگتراشوں کے سپرد

کر دیا جاتا ہے۔ جب تیس صدیاں اس پر حقارت سے نظر ڈالتی ہیں۔ تو انسانیت اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے لگتی ہے۔ جہاں تک آپ کے بلند قامت میناروں اور یادگاروں کا تعلق ہے میں کہتا ہوں کہ اس قصبے میں ایک پاگل رہتا تھا جس کا ارادہ تھا کہ وہ زمین کھودتے کھودتے چین تک جا نکلے گا۔ اور اس کے کہنے کے مطابق وہ اتنی دور تک پہنچ گیا تھا کہ اسے چینی برتنوں اور کیتلیوں کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دینے لگی تھی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ میں اس پاگل کے بنائے ہوئے سوراخ پر عش عش کرنے کے لئے اپنے اصول کو ترک نہیں کروں گا۔ بہت سے لوگوں کو مغرب اور مشرق کی یادگاروں کے بارے میں یہ بڑی فکر رہتی ہے کہ وہ معلوم کریں کہ وہ یادگاریں کن لوگوں نے بنائی تھیں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں یہ جاننا چاہوں گا کہ کس نے ان ایام میں یادگاریں نہیں بنائی تھی۔ جو ان تمام باتوں سے بالاتر تھا۔ لیکن میں اپنے اعداد و شمار والی بات جاری رکھوں گا۔

میں نے دریں اثنا گاؤں میں زمین کی پیمائش، بڑھئی اور مختلف اقسام کی روزانہ مزدوریاں کر کے (کیونکہ میں اتنے ہی کام جانتا ہوں جتنی میرے ہاتھوں کی انگلیاں ہیں) ۱۳ ڈالر ۳۴ سینٹ کما لئے تھے۔ ۴ جولائی سے یکم مارچ یعنی اس تاریخ تک جب یہ تخمینے لگائے گئے ۸ مہینے کا خرچ حسب ذیل تھا۔ اگرچہ میں ۲ برس تک رہا۔ اس خرچ میں وہ آلو، تھوڑا سا اناج اور تھوڑے سے مٹر شامل نہیں ہیں جو میں نے خود اُگا لئے تھے۔ اور نہ اجناس کی قیمت شامل ہیں جو اس وقت میرے پاس موجود ہیں۔

چاول	ایک ڈالر ۷۳½ سینٹ
راب	ایک ڈالر ۷۳ سینٹ سیرین کی سب سے سستی قسم
رائی کا آٹا	ایک ڈالر ۴¾ سینٹ

جوار کا آٹا	۹۹ ۳/۴ سینٹ	رائی سے بھی سستا
سؤر کا گوشت	۲۲ سینٹ	
میدہ	۸۸ سینٹ	جوار کے آٹے سے دام اور محنت میں زیادہ
شکر	۸۰ سینٹ	
سؤر کی چربی	۶۵ سینٹ	
سیب	۲۵ سینٹ	
خشک سیب	۲۲ سینٹ	
شکر قند	۱۰ سینٹ	
ایک کدو	۶ سینٹ	
ایک تربوزہ	۲ سینٹ	
نمک	۳ سینٹ	

[illegible]

جی ہاں میں نے کل ۸ ڈالر اور ۷۴ سینٹ کی خوراک کھائی۔ اگر مجھے اس بات کا علم نہ ہوتا کہ میرے بیشتر قارئین مجھ جیسے مجرم ہیں۔ اور ان کے اعمال چھپ کر زیادہ شاندار معلوم نہیں ہوں گے تو میں اپنے جرم کو شرم محسوس کئے بغیر لیکن شائع نہ کر دیتا۔ اس سے اگلے برس میں بعض اوقات، رات کے کھانے کے لئے مچھلیاں پکڑتا تھا۔ اور ایک دفعہ تو میں نے اس حد تک قدم اٹھایا کہ اس گلہری کو مار ڈالا جس نے میرا سیم کا کھیت تباہ کر دیا تھا۔ ایک تاتاری کے کہنے کے مطابق اس گلہری کو نیا جنم دینے کے لئے اسے کھا بھی گیا محض تجربہ کے لئے۔ اس کے مشک بیز ذائقہ کے متعلق نظر انداز کرنے سے مجھے صرف وقتی لطف آیا۔ میں نے یہ دیکھا کہ گاؤں کا قصاب آپ کی گلہری کا گوشت کتنا ہی صاف کر کے کیوں نہ دے گلہری کے گوشت کو زیادہ استعمال کرنا ایک اچھی عادت ثابت نہ ہوگا۔

اس زمانہ میں لباس اور دیگر اتفاقیہ اخراجات یہ تھے اگرچہ اس حد سے کوئی خاص نتیجہ اخذ نہیں کیا جاسکتا۔

۸ ڈالر ۴۰.۳/۴ سینٹ

تیل اور گھر کے چند برتن ۲ ڈالر

دھلائی اور کپڑوں کی مرمت کے سوا رکیونکہ یہ کام اکثر گھر کے باہر کئے جاتے ہیں، جن کا بل ابھی تک موصول نہیں ہوا ہے۔ میرے سارے اخراجات بس اتنے ہی ہیں۔ یہی وہ طریقے ہیں۔ جن کے ذریعہ دنیا کے اس حصہ میں روپیہ لازمی طور سے باہر چلا جاتا ہے۔

مکان	۲۸ ڈالر ۱۲.۱/۲ سینٹ
کھیت پر ایک سال کے اخراجات	۱۴ ڈالر ۷۲.۱/۲ سینٹ
آٹھ مہینے کی غذا	۸ ڈالر ۷۴ سینٹ
کپڑے وغیرہ آٹھ مہینے کے لئے	۸ ڈالر ۴۰.۳/۴ سینٹ
تیل وغیرہ آٹھ مہینے کے لئے	۲ ڈالر

کل میزان ۶۱ ڈالر ۹۹.۳/۴ سینٹ

میں اپنے اُن قارئین سے مخاطب ہوں جن کو اپنی روزی پیدا کرنا ہے ان اخراجات کو پورا کرنے کے لئے میرے پاس کھیت کی پیداوار ہے جو میں نے فروخت کی ہے۔

۲۳ ڈالر ۴۴ سینٹ

روزانہ محنت کی کمائی ۱۳ ڈالر ۳۴ سینٹ

کل میزان ۳۶ ڈالر ۷۸ سینٹ

اگر اس کو اخراجات میں سے منہا کر دیا جائے تو ۲۵ ڈالر ۲۱¾ سینٹ
باقی بچتے ہیں۔ جب میں نے کام شروع کیا تھا تو میرے پاس اتنی ہی رقم تھی۔ اخراجات
کا اندازہ بھی کچھ اتنا ہی تھا۔ تصویر کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ مجھے اس طرح جو آزادی
اور صحت میسر ہوئی اس کے علاوہ میرے پاس اب ایک آرام دہ مکان ہے
اور میں اس میں جب تک میرا جی چاہے رہ سکتا ہوں۔

اگرچہ یہ اعداد و شمار بظاہر سرسری اور غیر سلیقہ آموز دکھائی دے سکتے ہیں،
لیکن کسی حد تک مفید بھی ہیں۔ مجھے ایسی کوئی چیز نہیں دی گئی جس کا میں نے حساب
نہ دیا ہو۔ متذکرہ بالا تخمینوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ مجھے ہر ہفتہ صرف غذا پہ
تقریباً ۲۷ سینٹ خرچ کرنے پڑے۔ میری غذا اس کے بعد آنے والے دو برس
تک یہ تھی۔ رائی، خمیر کے بغیر جوار کی روٹی، آلو، چاول، تھوڑا سا نمکین سؤر
کا گوشت، راب اور نمک۔ میں صرف پانی پیتا تھا۔ میرے لئے یہی موزوں
تھا کہ میں چاول کھایا کروں، اس لئے کہ مجھے ہندوستانی فلسفہ سے محبت
تھی۔ بیان کو مکمل کرنے کے لئے بعض عادی نکتہ چینوں کے اعتراض کو ٹالنے کے لئے یہ بتا دیتا ہوں کہ
کہ اگر میں نے کبھی کبھی باہر کھانا کھایا جیسا کہ میں نے اکثر کیا اور مجھے یقین ہے کہ
ایسا کرنے کے مجھے پھر مواقع میسر آئیں گے، تو اس سے میرے گھریلو انتظامات
میں خلل پڑا۔ لیکن جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں، باہر کھانا ایک مسلسل فعل ہے۔
اس لئے وہ اس قسم کے تقابلی حساب کتاب پر بالکل اثر انداز نہیں ہوتا۔

میں نے پچھلے دو برس کے تجربے سے یہ بات سیکھی کہ کوئی شخص اس
عرض البلد میں اپنے لئے ضروری خوراک ناقابلِ یقین حد تک تھوڑی سی محنت
اُٹھا کر حاصل کر سکتا ہے، یعنی ایک انسان جانوروں کی طرح سادہ غذا کا استعمال
کرتے ہوئے اپنی صحت اور قوت برقرار رکھ سکتا ہے۔ میں نے اپنا رات کا

کھانا اطمینان بخش طریقہ سے تیار کیا ہے۔ کئی اعتبار سے وہ کھانا اطمینان بخش ہے۔ میں نے اپنے کھیت سے خرفہ اکھاڑ کر اسے اُبالا ہے۔ اور اس میں نمک ملایا ہے۔ آپ خرفہ کا لاطینی نام پورٹولوکا اولے ریسیا اس لئے رکھا ہے کیونکہ اس نام میں ذرا چاشنی ہے۔ آپ خود ہی کہئے کہ کوئی معقول انسان جو امن زمانہ اور معمولی دنوں میں اس سے زیادہ پسندیدہ خوراک اور کیا کھائے گا کہ اس کے پاس اُبلے ہوئے سبز میٹھے بھٹے کی کافی بالیاں ہوں اور اُن میں نمک ملا ہوا ہو؟ میں جو تھوڑی سی متنوع غذا استعمال کرتا تھا۔ وہ اگرچہ صحت کے تقاضے پوری نہیں کرتی تھی لیکن بھوک کو ضرور دبا دیتی تھی۔ اس پہ بھی انسانوں کی اب یہ حالت ہوگئی ہے کہ وہ اکثر فاقہ کشی کرتے ہیں۔ اس لئے نہیں کہ وہ ضروریات زندگی سے محروم ہیں۔ بلکہ اس لئے کہ وہ عشرتوں کے طلبگار رہتے ہیں اور میں ایک ایسی نیک عورت کو جانتا ہوں جس کا خیال ہے کہ اس کا بیٹا صرف اس لئے مر گیا ہے کہ وہ صرف پانی پیا کرتا تھا۔

قاری یہ خوب ہی دیکھ رہا ہوگا کہ میں غذائی نقطہ نظر سے نہیں بلکہ اقتصادی نقطہ نظر سے اس موضوع پر بات کر رہا ہوں اور مجھے امید ہے کہ وہ اس وقت تک میری طرح سیر شکم رہنے کا امتحان لینے کی جرأت نہیں کریگا جب تک اسکے پاس اپنا نعمت خانہ بھرپور نہ ہوگا۔

میں نے پہلے پہل نمک ملی خالص جوار کی روٹی بنائی۔ یہ حقیقی پنجہ روٹیاں ہوتی تھیں میں گھر کے باہر آگ پر ان روٹیوں کو کسی بھٹی یا شہتیر کے کسی ٹکڑے پر پھیلا کر پکایا کرتا تھا۔ ان روٹیوں کو اکثر دھواں لگ جاتا تھا۔ اور اُن سے صنوبر کا سا ذائقہ آتا تھا۔ میں نے میدہ بھی آزمایا۔ لیکن آخر کار میں نے رائی اور جوار کے ملے جلے آٹے کو بہت آسان اور لطف دہ پایا۔ موسم سرما میں ایک کے بعد ایک ایسی چند چھوٹی روٹیاں پکانے

میں اور ان کو جس طرح ایک مصری بچہ نکلنے کے لئے رکھے گئے انڈوں کو الٹتا پلٹتا ہے الٹنے پلٹنے میں بڑا مزا آتا تھا۔ وہ دراصل اناج کا پھل تھا جنہیں میں نے پکایا تھا۔ ان سے مجھے پھلوں جیسی خوشبو آتی تھی۔ میں اس خوشبو کو دیر تک برقرار رکھنے کے لئے روٹیاں کپڑے میں لپیٹ دیا کرتا تھا۔ میں نے روٹی بنانے کے قدیم اور ناگزیر فن پر جتنی بھی کتابیں مل سکیں پڑھ ڈالیں۔ میں نے اس فن کے بارے میں اس زمانہ سے معلومات حاصل کیں جو انسانیت کا ابتدائی دور تھا۔ اور جب انسان نے بے خمیر کی روٹی ایجاد کی تھی۔ اور جب وہ جنگلی میووں کی گری اور کچے گوشت سے خوراک کی اس نرمی اور لطافت تک پہنچا تھا۔ میں اپنے مطالعہ کے دوران میں اس عہد تک پہنچا جب گندھے ہوئے آٹے میں اتفاقیہ کھٹاس پیدا ہو گئی تھی۔ اور انسان نے یہ سمجھ لیا تھا کہ اس نے خمیر اٹھانے کا فن سیکھ لیا ہے۔ اس کے بعد مختلف تخمیرات سے واقفیت حاصل کرنے کے بعد میں "اچھی، میٹھی اور خوش ذائقہ روٹی تک پہنچا جو زندگی کے لئے صحت بخش یعنی زندگی کی لاٹھی ہوتی ہے۔ بعض لوگ خمیر کو روٹی کی جان سمجھتے ہیں۔ یعنی خمیر وہ روح ہے جو روٹی کی رگ رگ میں جذب ہو جاتی تھی۔ لوگ روم کی دیوی ویسٹا کی قربان گاہ کی آگ کی طرح اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ لوگ، پہلے پہل اس نایاب چیز کو بوتل میں بند کر کے "فلاور" میں لائے ہوں گے تاکہ امریکہ میں اس کو تجارت کریں۔ اس خمیر کی مقبولیت اس ملک میں غذائی جدار کھانے کی حیثیت سے نصیب رہا ہے اور بڑھ رہا ہے۔ میں یہ خمیر باقاعدگی اور ایمانداری کے ساتھ گاؤں سے لایا۔ آخرکار ایک صبح میں خمیر کے استعمال کے قواعد بھول گیا۔ میں نے اپنا خمیر کھو دیا اس حادثہ سے مجھے یہ پتہ چلا کہ خمیر کوئی ناگزیر چیز نہیں ہے۔ کیونکہ میری یہ دریافت عمل ترکیبی

کی بجائے تحلیلی عمل کے ذریعہ ظہور میں آئی تھی۔ اس کے بعد سے میں نے خوشی
خمیر کا استعمال ترک کر دیا تھا۔ گو بیشتر خانہ دار عورتوں نے مجھے یقین دلایا کہ
خمیر کے بغیر خوش ذائقہ اور اچھی روٹی بنتی ہی نہیں ہے۔ اور بہت سے
سن رسیدہ بزرگوں نے یہ پیشگوئی کی کہ وہ روٹی کھانے سے جس میں خمیر نہ ہو
اصل قوتیں بہت جلد انحطاط پذیر ہو جائیں گی۔ اس کے باوجود میں خمیر کو روٹی
کا ضروری جزو نہیں سمجھتا۔ اور ایک برس تک بے خمیر روٹی کھانے کے بعد بھی
زندہ ہوں۔ میں خوش ہوں کہ مجھے جیب میں خمیر سے بھری ہوئی بوتل رکھنے کی زحمت
سے نجات مل گئی ہے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا تھا کہ بوتل کا ڈاٹ اڑ جاتا تھا۔
اور اس میں سے بہتا ہوا خمیر مجھے نادم کر دیتا تھا۔ خمیر کی بوتل کو سرے سے بالائے
طاق رکھ دینا ہی آسان اور باعزت طریقہ ہے۔ انسان ایک ایسا حیوان ہے جو دوسر
حیوانات کی نسبت اپنے آپ کو ہر آب و ہوا اور ہر طرح کے ماحول میں ڈھال لیتا ہے۔
میں نے کبھی اپنی روٹی میں سوڈا یا کوئی دوسری تیزابی یا الکلی نہیں ڈالی۔ ایسا
دکھائی دیتا ہے کہ میں نے اپنی روٹی مارکس لوکیس کیٹو کے نسخہ کے مطابق
بنائی جو اس نے دو سو برس قبل مسیح بتایا تھا۔ اس نسخے کا مطلب یہ تھا۔ گوندھی
ہوئی روٹی یوں بناؤ۔ ہاتھ اور ناند اچھی طرح دھو لو۔ آٹا ناند میں ڈال دو۔ آٹے
میں تھوڑا تھوڑا پانی ملاؤ اور اسے خوب گوندھو۔ جب اسے اچھی طرح گوندھ چکو
تو اس کا پیڑا بنا لو۔ اور پھر اسے ڈھکن دار برتن میں رکھ کر پکاؤ۔ یعنی روٹی پکانے
والی کیتلی میں۔ اس نسخہ میں خمیر کا ذکر تک نہیں ہے۔ لیکن میں نے زندگی کی
اس لاٹھی کا بیشتر سہارا نہیں لیا ہے۔ ایک دفعہ جیب خالی تھی اور میں نے ایک
مہینہ سے بھی زائد مدت تک خمیر کا منہ نہیں دیکھا۔

نیو انگلینڈ کا ہر باشندہ رائی اور جوار کے اس ملک میں اپنا روٹی کا سامان

پیدا کر سکتا ہے۔ اُسے ان چیزوں کے لئے دور افتادہ منڈیوں پر جہاں اتار چڑھاؤ ہوتا رہتا ہے انحصار رکھنے کی ضرورت نہیں۔ ہم سادگی اور خود مختاری سے اس قدر دور ہٹ گئے ہیں کہ کنکارڈ میں تازہ اور میٹھا آٹا دوکان میں کبھی بکتا ہی نہیں ہے۔ جوار کا دلیہ اور موٹا اناج کوئی نہیں استعمال کرتا۔ کسان اس غلہ کو جو وہ خود پیدا کرتا ہے مویشیوں اور سؤروں کو کھلا دیتا ہے۔ وہ دوکان سے میدہ خریدتا ہے۔ وہ اتنا صحت بخش نہیں ہوتا اور اس کی قیمت بھی زیادہ ہوتی ہے میں نے دیکھا ہے کہ میں آسانی سے اپنے لئے سن دو من رائی اور جوار پیدا کر سکتا ہوں۔ اس لئے کہ رائی تو بری سے بری زمین میں بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ جوار کے لئے بھی زرخیز زمین کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ان کو ہاتھ کی چکی سے پیس سکتا تھا۔ اور اس طرح چاول اور سؤر کے گوشت کے بغیر گزارہ کر سکتا تھا۔ اگر مجھے کبھی شیرینی کی ضرورت ہوتی تو میں نے یہ تجربہ کیا کہ میں کدو اور چقندر سے نہایت عمدہ قسم کی چاشنی تیار کر سکتا ہوں۔ میں جانتا تھا کہ اگر میں میپل کے چند پیڑ لگا دوں تو ان سے شکر بڑی آسانی کے ساتھ حاصل کر سکتا ہوں جس زمانہ میں میپل کے پیڑ پھل پھول رہے ہوں۔ اس زمانہ میں ان چیزوں کے علاوہ جن کا میں ذکر کر چکا ہوں مختلف اشیا استعمال کر سکتا ہوں کیونکہ ہمارے آباؤ اجداد یہ گیت گایا کرتے تھے۔

"ہم منہ میٹھا کرنے کے لئے
کدو، گاجروں اور اخروٹ کے پیڑ کی چھالوں
سے شراب تیار کر سکتے ہیں!"

آخر میں نمک کی باری آتی ہے جسے اشیائے خوردنی کا ضروری جزو کہا جاتا ہے نمک حاصل کرنے کے لئے سمندر کے ساحل پر جانا زیادہ موزوں رہے گا۔ اور اگر میں نمک قطعاً استعمال نہیں کروں گا تو مجھے بہت کم پانی پینا پڑے گا۔ میں نے

یہ بات کہیں نہیں پڑھی کہ انڈین لوگ اس کی تلاش میں نکلنے کی زحمت گوارا کیا کرتے تھے۔

جہاں تک میری خوراک کا تعلق ہے۔ میں اس کے لئے ہر قسم کی تجارت اور تبادلہ سے بچ سکتا تھا۔ مکان میرے پاس پہلے ہی سے موجود تھا۔ اس لئے سوال صرف کپڑے اور ایندھن حاصل کرنے کا رہ جاتا تھا۔ میں نے جو پتلون پہن رکھی ہے۔ وہ ایک کسان کے گھرانے میں بنی گئی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ انسان میں ابھی تک اتنی نیکی باقی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایک کسان کا مزدور بن جانا اتنا ہی عظیم کارنامہ ہے جتنا کسی انسان کا کسان بن جانا۔ ایک نئے ملک میں ایندھن بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ جہانتک گھر کا تعلق ہے اگر مجھے وہاں دھرنا مارنے کی اجازت نہ ملتی تو میں ایک ایکڑ زمین اُتنے ہی داموں میں خریدتا جتنے داموں میں وہ زمین فروخت ہوئی تھی۔ جس پر میں نے کاشت کی تھی۔ یعنی ۸ ڈالر ۸ سینٹ میں۔ لیکن جو صورت حال تھی۔ اسے دیکھتے ہوئے میرا خیال تھا کہ میں نے اس زمین پر قبضہ جما کر اس کی قیمت میں اضافہ کر دیا تھا۔

میری باتوں پہ یقین نہ کرنے والوں کا ایک ایسا طبقہ ہے جو بعض اوقات مجھ سے ایسے سوالات پوچھتا ہے کہ میں خیال کرتا ہوں کہ میں صرف ترکاریاں کھا کر زندہ رہ سکتا ہوں۔ میں فوراً ہی بات کی تہہ تک پہنچنے کے لئے اپنی عادت کے مطابق یوں جواب دیتا ہوں کہ میں تختوں کے کیل کھا کر بھی زندہ رکھ سکتا ہوں!" اگر وہ اس بات کو نہیں سمجھتے تو پھر وہ میری اس بات کو بھی نہیں سمجھ سکتے جو میں کہنا چاہتا ہوں۔ میں تو اس قسم کے تجربات کا حال سن کر بہت خوش ہوتا ہوں کہ ایک نوجوان نے موٹے اناج پہ گذر بسر کی جو ابھی پوری طرح پکا بھی نہیں تھا۔ اور اس نے اپنے دانتوں سے چکی کا کام لیا۔ گلہریوں کے قبیلہ نے

یہی کوشش کی کہ وہ اس میں کامیاب رہا۔ انسانی نسل بھی ان تجربوں میں دلچسپی رکھتی ہے۔ گویا بعض بوڑھی عورتیں جن میں تجربات کرنے کی صلاحیت نہیں ہے یا وہ لوگ جو ملوں میں ایک تہائی حصہ کے مالک ہیں ان تجربات سے ڈر سکتے ہیں

میرا فرنیچر جس کا ایک حصہ میں نے خود تیار کیا تھا۔ اور جس کا باقی حصہ پر کوئی لاگت نہیں آئی تھی اور جس کا میں نے کوئی حساب پیش نہیں کیا ہے ایک پلنگ، ایک میز، ایک ڈیسک، تین کرسیوں، تین انچ قطر کا ایک آئینہ۔ ایک چمٹا لوہے کی میخوں۔ ایک کیتلی، ایک دستہ دار دیگچی، تیل کے ایک جگ، صابن کے ایک جگ اور ایک جاپانی لیمپ پر مشتمل تھا۔ کوئی شخص اتنا غریب نہیں ہے کہ اسے ایک کدو پر بیٹھنے کی ضرورت پڑے۔ یہ سراسر سستی اور کاہلی ہے۔ گاؤں کی کوٹھڑیوں میں ایسی بہت سی کرسیاں ہیں جن کو میں پسند کرتا ہوں۔ فرنیچر! خدا کا شکر ہے کہ میں فرنیچر کے گودام کی مدد کے بغیر بیٹھ اور اٹھ سکتا ہوں۔ فلسفی کے سوا ایسا کوئی انسان نہ ہوگا جسے یہ دیکھ کر شرم نہ آتی ہے کہ اس کا فرنیچر گاڑی پہ باندھ کر رکھا ہوا ہے۔ اور اس کے خالی بکسوں کو یعنی اس کے کنگلے پن کو دن دہاڑے انسانوں کی آنکھیں دیکھ رہی ہیں۔ یہ فرنیچر کا کاٹھ کباڑ ہے۔ اس قسم کے ڈھیر کو دیکھ کر میں کبھی یہ فیصلہ نہیں کر پایا کہ وہ نام نہاد امیروں کا فرنیچر ہے یا غریبوں کا۔ مجھے اس کا مالک ہمیشہ غریب نظر آتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ آپ کے پاس اس قسم کا جتنا زیادہ سامان ہوگا اتنے ہی آپ غریب ہوں گے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان ڈھیروں میں ایک درجن جھونپڑوں کا سامان ہوتا ہے۔ اس حساب سے اگر ایک جھونپڑا غریب ہوا تو وہ بارہ گنا زیادہ غریب ہو گیا۔ از راہ کرم یہ بات بتائیے کہ اگر ہم ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے ہیں تو اس کا مطلب فرنیچر سے چھٹکارا پانے یا کینچلی بدلنے کے سوا

اور کیا ہوتا ہے؟ ہم اس دنیا سے دوسری دنیا میں چلے جاتے ہیں۔ جو فرنیچر سے
سجی سجی ہوتی ہے۔ اور پہلے فرنیچر کو جلانے کے لئے چھوڑ جاتے ہیں۔ یہ تو وہی
بات ہوئی کہ انسان کی کمر کی پیٹی سے ہر قسم کے پھندے بندھے ہوئے ہیں اور وہ
ان دشوار گذار راہوں سے جن سے ہو کر اسے گذرنا ہوتا ہے اپنی اس پیٹی کو
گھسیٹے بغیر نہیں چل سکتا۔ وہ ایک خوش نصیب لومڑی تھی۔ جو اپنی دم پھندے
میں چھوڑ گئی تھی۔ چھٹکارا آزادی حاصل کرنے کے لئے اپنی تیسری ٹانگ خود
ہی کتر ڈالتی ہے۔ اگر انسان اپنی لیک کو دیکھتا ہے تو اس پر حیرت کی کونسی بات
ہے۔ نہ جانے کتنی بار آپ نے چالاکی سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ جناب۔ مجھے
اس جسارت کی اجازت دیجیئے کہ میں آپ سے یہ پوچھ سکوں کہ دوچار ہونے سے
آپ کی کیا مراد ہے؟ اگر آپ صاحب نظر ہیں تو دیکھیں گے کہ جب کسی شخص سے
آپ کی ملاقات ہوتی ہے۔ اس کی وہ تمام چیزیں جن کا وہ مالک ہے بلکہ اس
کی وہ تمام چیزیں بھی جن کا مالک ہونے سے وہ انکار کرتا ہے۔ اس کے پیچھے
موجود ہوتی ہیں جیسے کہ باورچی خانے کا سامان اور وہ تمام چیزیں اور دیواریں کا سامان
بھی جن کو وہ محفوظ رکھتا ہے اور جن کو جلاتا نہیں۔ وہ اس سارے سامان سے
جتا ہوا ہے۔ اور اسے کشاں کشاں کھینچ رہا ہے۔ میں اس انسان کو بے چارہ سمجھتا
ہوں جو پیچیدار گڑھے یا دروازے سے خود تو نکل گیا ہو لیکن اس کی برف کی
گاڑی پھنس کر رہ گئی ہو۔ اور اس کے پیچھے نہ چل سکتی ہو۔ جب میں کسی بنے
سنورے بظاہر آزاد اور سفر کے لئے کمربستہ شخص کو اپنے فرنیچر کے بارے
میں یہ کہتا ہوا سنتا ہوں کہ اس کے سامان کا بیمہ ہو گیا ہے یا نہیں "یا میں اپنے
اس فرنیچر کا کیا کروں" تو مجھے اس پر ترس آجاتا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ ایک رنگ
برنگی تتلی مکڑی کے جالے میں پھنس گئی ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ ان لوگوں کے پاس بھی

جن کے بارے میں آپ مدت تک خیال کرتے رہے ہیں کہ وہ کوئی فرنیچر نہیں رکھتے کسی نہ کسی کے غلط گھر میں فرنیچر موجود ہے۔ میں آج کے انگلستان کو ایک بوڑھا شریف زادہ سمجھتا ہوں۔ جو بہت سا سامان اور الم غلم چیزیں لئے ہوئے سفر کر رہا ہے۔ اور اس میں اس کو علاوہ اٹھانے کی ہمت نہیں ہے۔ بڑے ٹرنک، چھوٹے ٹرنک، بکس اور بنڈل۔ ان میں سے پہلے تین تو کم سے کم پھینک ہی دیجئے۔ آج ایک تندرست اور توانا شخص کی طاقت سے باہر ہے کہ وہ اپنا پلنگ اٹھا کر چلے۔ میں یقیناً ایک بیمار شخص کو یہی مشورہ دوں گا کہ وہ اپنا پلنگ چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہو۔ جب میں کسی جوان کو اپنے بنڈل تلے لڑکھڑا کر چلتا ہوا دیکھتا ہوں جس میں اس کا سب کچھ ہوتا ہے۔ تو وہ بنڈل اس کی گردن پر مجھے ایک بہت بڑے پھوڑے کی طرح دکھائی دیتا ہے مجھے اس پر بڑا ترس آتا ہے کہ اس کی کل کائنات صرف اتنی سی ہے۔ اور بیچارے کو اسے اٹھا کر چلنا پڑ رہا ہے۔ اگر مجھے اپنا پسندیدہ گھسیٹنا ہی ہے تو میں اتنی احتیاط ضرور رکھوں گا کہ وہ پھندا ہلکا ہو اور میرے جسم کے کسی اہم حصہ کو مجروح نہ کرے۔ لیکن غالباً سب سے زیادہ عقلمندی کی بات یہ ہوگی کہ اس پھندے میں اپنا پنجہ ڈالا ہی نہ جائے۔

میں سرسری طور پر یہ بات بھی کہوں گا کہ میں نے پردوں پر کوئی پیسہ خرچ نہیں کیا ہے کیونکہ چاند اور سورج کے سوا میرے گھر کے اندر کوئی جھانک کر دیکھنے والا ہی نہیں ہے۔ اور میں چاہتا ہوں کہ سورج اور چاند میرے گھر کے اندر جھانک کر دیکھیں چاند میرے دودھ کو کھٹا نہیں کرے گا۔ اور نہ میرے گوشت کو سڑا دے گا۔ سورج بھی میرے فرنیچر کو گزند نہیں پہنچائے گا یا میرے قالین کا رنگ نہیں اڑائے گا۔ ہاں اگر سورج کسی وقت بہت ہی گرمجوش دوست بن جائے گا تو میں کسی ایسے پردے کے پیچھے چلا جاؤں گا جو قدرت نے مہیا کیا ہے اور خانہ داری کے سامان میں کسی اور چیز کا اضافہ نہیں کروں گا۔ ایک دفعہ ایک خاتون نے چٹائی دینا چاہی لیکن میرے گھر

میں چونکہ کوئی فالتو کمرہ نہیں تھا اور نہ میرے پاس اُس کی جھاڑ پونچھ کے لئے فالتو وقت تھا اس لئے میں نے لینے سے انکار کر دیا۔ میں نے اپنے دروازے کے آگے پڑے ہوئے مٹی کے ڈھیلے پر پاؤں پونچھنے کو ترجیح دی۔ بدی کی ابتدا ہی میں بدی سے گریز زیادہ اچھا رہتا ہے۔ تھوڑے دنوں کی بات ہے میں ایک پادری کے سامان کے نیلام کے وقت وہاں موجود تھا۔ اُس پادری کی زندگی بے ثمر ساماں نہیں تھی۔ بقول شیکسپیئر —

"انساں جو بُرائیاں کرتا ہے وہ اس کے بعد بھی زندہ رہتی ہیں!"

حسبِ معمول اس کے سامان میں وہ کاٹھ کباڑ بھی تھا۔ جو اس کے باپ کے زمانہ سے اکٹھا ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اس کے باقی سامان میں سُکھا کر محفوظ رکھا ہوا ایک کیچوا بھی تھا۔ یہ چیزیں نصف صدی تک اس کی کوٹھڑی اور کباڑ خانے میں پڑی رہی تھیں۔ اس نے ان چیزوں کو جلایا نہیں تھا۔ اُن کی ہولی جلانے کی بجائے یا جلا کر اُن کو پاکیزہ کر دینے کی بجائے اب ان کا نیلام کیا جا رہا تھا یا دوسرے لفظوں میں ان قسم کی چیزوں کی تعداد میں اضافہ کیا جا رہا تھا۔ پڑوسی ان چیزوں کو دیکھنے کے لئے بڑے شوق سے جمع ہو گئے۔ اُنہوں نے ان چیزوں کو خرید لیا وہ ان کو بڑی احتیاط کے ساتھ اپنی کوٹھڑیوں اور کباڑ خانوں میں لے گئے تاکہ وہ اس وقت تک وہاں پڑی رہیں جب تک کہ اپنی جائدادیں تقسیم نہ ہوں۔ اس طرح ایک بار پھر یہی چکر چلے گا۔ آدمی جب مرتا ہے تو خاک اُڑاتا ہے!

غالباً ہمارے لئے یہ بات فائدہ مند ہو گی کہ ہم بعض وحشی اقوام کے رواج کی تقلید کریں۔ کیونکہ وہ ہر برس کینچلی اتارنے والی حرکت کرتی ہیں۔ اُن کے دماغ میں ایک خیال ضرور ہے چاہے اس میں کوئی حقیقت ہو یا نہ ہو۔ کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ ہم نئے "ملبوسات" یا پہلے پہل کے پھلوں کا جشن منائیں۔ جو بارٹرم کے قول کے مطابق ملاوی انڈین منایا کرتے تھے۔ وہ لکھتا ہے۔ جب کوئی قصبہ نئے ملبوسات کا جشن مناتا ہے۔

تو وہ اس کے لئے پہلے ہی سے نئے کپڑے، نئے دیگ، نئی کڑھائیاں اور نئے گھریلو برتن اور فرنیچر حاصل کر لیتا ہے۔ لوگ اپنے سارے گھسے ہوئے کپڑے اور دوسری بیکار چیزیں جمع کرتے ہیں، اپنے گھروں، چوراہوں اور سارے قصبے کو جھاڑتے اور پونچھتے ہیں۔ اس کی ساری گندگی صاف کر دیتے ہیں۔ اپنی پرانی چیزوں کو اپنے بچے کھچے غلہ اور دیگر سامان کے ساتھ ایک مشترکہ ڈھیر میں ڈال دیتے ہیں۔ اور پھر اس ڈھیر کو آگ لگا کر جلا دیتے ہیں۔ دوا کھانے اور تین دن تک برت رکھنے کے بعد سارے قصبہ کی آگ بجھا دی جاتی ہے۔ اس برت کے دوران میں وہ ہر قسم کی گرسنگی اور ہوسناکی سے پرہیز کرتے ہیں۔ عام معافی کا اعلان کر دیا جاتا ہے۔ اب سارے غنڈے قصبہ میں واپس آ سکتے ہیں۔"

"چوتھے روز ان کا سب سے بڑا مہنت چوراہے میں سوکھی لکڑیوں کو رگڑ کر نئی آگ پیدا کرتا ہے۔ اس کے بعد قصبہ کے ہر گھر کو نئی اور پاکیزہ آگ مہیا کی جاتی ہے۔

"پھر وہ نئے اناج اور نئے پھلوں کی ضیافت اڑاتے ہیں۔ تین دن تک ناچتے اور گاتے ہیں۔ اس کے بعد چار دنوں تک وہ مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ اور اپنے ہمسایہ قصبے کے دوستوں سے مل کر خوشیاں مناتے ہیں۔ جنہوں نے اسی طرح اپنے آپ کو پاکیزہ بنایا اور تیار کیا ہوتا ہے۔"

میکسیکو کے لوگ بھی ہر باون برس کے بعد اس بات پر یقین رکھتے ہوئے کہ اب دنیا میں قیامت آنے والی ہے اپنے آپ کو پاک و صاف کیا کرتے تھے۔ میں نے اس سے زیادہ حقیقی متبرک رسم کا ذکر کبھی نہیں سنا۔ یعنی ایسی رسم جس کے بارے میں لغت یہ کہتا ہے "اُسے ایک باطنی اور روحانی رحمت کی ظاہری اور نمایاں علامت ہونا چاہیئے۔ اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے مجھے ذرا بھی شبہ نہیں ہے کہ ان لوگوں کو اصل میں خدا نے ایسا کرنے کی تحریک دلائی تھی۔ اگرچہ اس

قسم کے الہام کا بائبل میں کوئی ذکر نہیں ملتا۔

میں پانچ سے زائد برسوں تک صرف اپنے ہاتھوں کی محنت پر گذر بسر کرتا رہا۔ میں نے دیکھا کہ سال میں چھ ہفتے تک کام کرنے سے میں زندہ رہنے کے سارے اخراجات پورے کر سکتا ہوں۔ مجھے مطالعہ کے لئے صاف طور پر سارا موسم گرما اور گرمیوں کا بڑا حصہ مل جاتا تھا۔ میں نے اسکول میں پڑھانے کی مکمل طور سے کوشش کی ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ اس وقت میرے اخراجات میری آمدنی کے برابر تھے، یا میری آمدنی سے بہت زیادہ تھے۔ کیونکہ خیال اور اعتقاد سے قطع نظر مجھے حالات کے مطابق لباس پہننا اور پڑھانا پڑتا تھا۔ اور اس مصرف سے میرا وقت ضائع ہوتا تھا۔ چونکہ میں اپنے ہموطنوں کی ان کی بھلائی کے لئے نہیں بلکہ اپنی روزی پیدا کرنے کے لئے پڑھاتا تھا اس لئے میرا تجربہ ناکام رہا۔ میں نے کوئی دھندہ کرنے کی بھی کوشش کی لیکن میں نے دیکھا کہ کاروبار کا ڈھنگ سیکھنے میں دس برس لگیں گے اور اس وقت تک میں شیطان کے راستہ پر چلنے لگوں گا۔ حقیقتاً مجھے اس بات کا ڈر تھا کہ میں اس مدت میں وہ کام کرنے لگوں گا جسے ایک اچھا کاروبار کہا جاتا ہے۔ جب میں اس سے پہلے اس تلاش میں تھا کہ مجھے روزی پیدا کرنے کے لئے کیا کچھ کرنا چاہئے تو دوستوں کی رائے پر عمل کرنے کا تلخ تجربہ ابھی تک میرے دماغ میں تازہ تھا۔ ایسا کرنے سے میری اپنی صلاحیت مجروح ہو گئی۔ میں نے اکثر یہ بات بڑی سنجیدگی سے سوچی کہ مجھے کوندنی کے پھل چننے چاہئیں۔ یہ کام میں واقعی کر سکتا تھا۔ اس سے جو تھوڑا بہت نفع ہوتا وہ میرے لئے کافی ہو سکتا تھا۔ میری سب سے بڑی مہارت یہی ہے کہ میری ضرورت بہت ہی مختصر ہے۔ میں احمقانہ طور پر سوچتا تھا کہ اس کام میں قلیل سرمایہ کی ضرورت پڑے گی اور میرے مزاج اور موڈ میں کوئی رخنہ اندازی نہیں ہوگی۔

میرے ملنے والے اپنے اپنے دھندوں اور اپنے اپنے پیشوں میں کسی قسم کی جھجک
کے بغیر جٹ گئے۔ میں نے یہی سوچا کہ میرا کام بھی زیادہ تر اُن کے دھندوں جیسا ہے
سارے موسم گرما میں پہاڑیوں میں گھوم پھر کے گوندنیاں چنتا اور پھر ان کو بڑی لاپروائی
کے ساتھ بیچ دیتا۔ ایڈمیٹس کی بھیڑوں کی رکھوالی کرنے کے مترادف تھا۔ میں نے یہ بھی
سوچا تھا کہ میں جنگلی جڑی بوٹیاں جمع کرسکتا ہوں یا سدا بہار پودے اُن دیہاتیوں تک
لے جاسکتا ہوں جو چاہتے ہیں کہ ان کو جنگلوں کی یاد دلائی جائے۔ میں یہ چیزیں شہر میں
بھی لے جاسکتا تھا لیکن اب مجھے اس بات کا علم ہو چکا ہے کہ کاروبار ہر چیز کو ایک
لعنت بنا دیتا ہے۔ آپ چاہے پیغامات الٰہی کی تجارت ہی کیوں نہ کریں کاروبار کی
ساری لعنت اس دھندے سے وابستہ ہو جائے گی۔

چونکہ میں بعض چیزوں کو دوسری چیزوں پر ترجیح دیتا تھا خصوصاً اپنی آزادی
کو بیش بہا سمجھتا تھا۔ اور ہر قسم کی مصیبت سہہ سکتا۔ اور کامیاب ہو سکتا تھا اس
لیے میں قیمتی قالین یا دوسرا نفیس فرنیچر یا نازک برتن یا یونانی اور گاتھی طرز کا
مکان حاصل کرنے کی خواہش نہیں رکھتا تھا۔ اگر کچھ ایسے لوگ موجود ہیں جو ایسی
چیزیں حاصل کرنے میں کسی رکاوٹ کو حائل نہیں سمجھتے۔ اور جو ان کو حاصل کر لینے
کے بعد ان کو استعمال کرنا بھی جانتے ہیں تو میں ان کو حاصل کرنے کی دوڑ دھوپ اُن پر
چھوڑے دیتا ہوں۔ بعض لوگ بہت محنتی ہوتے ہیں اور محنت کو محنت کی خاطر ہی
عزیز رکھتے ہیں کہ کہیں محنت سے چھٹی پا کے کسی بات میں نہ پھنس جائیں۔ میں ایسے لوگوں
کے لئے فی الحال کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ جو لوگ یہ نہیں جان سکتے کہ اگر ان کو اس سے
زیادہ فرصت میسر آئے جو اس وقت ان کو حاصل ہے تو وہ اس فرصت میں کیا
کریں گے۔ میں ان کو یہی مشورہ دوں گا کہ وہ جتنی محنت اس وقت کر رہے ہیں
اس سے دگنی محنت کریں۔ یعنی اس وقت تک کام کریں کہ اپنی گذر بسر کا خرچ ادا

کر کے اپنی آزادی کا پروانہ حاصل کر سکیں۔ جہاں تک میرا اپنا تعلق ہے، مجھے پتہ چلا ہے کہ روزانہ اجرت پر کام کرنے والا مزدور سب سے زیادہ آزاد ہے۔ خاص طور پر اس لئے کہ سال بھر میں تیس چالیس روز تک کام کر لینے سے آدمی اپنا خرچ چلا سکتا ہے۔ مزدور کا دن سورج ڈوبتے ہی ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ اپنے مشاغل میں اپنا وقت صرف کرنے کے لئے آزاد ہوتا ہے۔ اسے محنت سے نجات مل جاتی ہے۔ لیکن اس کے مالک کو جو ہر مہینے سٹہ لگاتا ہے سال کے شروع سے آخر تک کسی دن بھی آرام کا سانس لینے کی فرصت نصیب نہیں ہوتی۔

قصہ مختصر مجھے پورا یقین ہے کہ تجربہ اور اعتقاد کی بدولت ہی اس دنیا میں ان کا گذر بسر کرنا نصیب نہیں بلکہ ایک تفریح ہے۔ بشرطیکہ سادگی اور عقلمندی سے زندگی بسر کریں۔ سادہ اقوام کی کاوشوں کو زیادہ مصنوعی اقوام ابھی تک کھیل سمجھتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ انسان کو عرق ریزی کرنے ہی سے اپنی روزی پیدا کرنی چاہیئے یہ بات الگ ہے کہ اسے میری نسبت زیادہ پسینہ آتا ہے۔

میرے ملنے والوں میں سے ایک نوجوان نے جسے چند ایکڑ زمین ورثہ میں ملی ہے مجھے بتایا کہ وہ سوچتا ہے کہ اگر اس کے پاس ذرائع ہوتے تو وہ بھی میری ہی طرح زندگی بسر کرتا۔ میں ہرگز یہ نہیں چاہوں گا کہ کوئی کسی اعتبار سے میری طرح زندگی بسر کرے۔ کیونکہ ایسا ہو سکتا ہے کہ جب تک وہ اس طرز زندگی پر دسترس حاصل کرے تب تک میں کوئی اور طرز زندگی اختیار کر لوں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ جس قدر ممکن ہو اس دنیا میں زیادہ سے زیادہ مختلف لوگ ہونے چاہئیں۔ لیکن میری یہ بھی خواہش ہے کہ ہر شخص بڑی احتیاط سے اپنا طریقہ ڈھونڈے اور اس کی پیروی کرے۔ اور اپنے باپ یا اپنی ماں یا اپنے پڑوسی کے طریقہ پر نہ چلے۔ کوئی نوجوان تعمیر، پودے لگانے یا جہاز رانی کا کام کر سکتا ہے لیکن اسے کسی بات کو اس کام

میں مخل نہیں ہونے دینا چاہیئے۔ جو وہ کرنا چاہتا ہے۔ یہ ریاضی کا صرف ایک نقطہ ہی ہے جو ہمیں اسی طرح عقلمند بناتا ہے جس طرح ایک ملاح یا ایک مفرور غلام قطبی ستارے کو اپنی نظروں کے سامنے رکھتا ہے۔ اگر ہم اس نقطہ کو پیش نظر رکھیں گے تو یہ عمر بھر ہماری رہنمائی کرنے کے لئے کافی ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ ہم اندازے کے مطابق اپنی بندرگاہ پر نہ پہنچیں۔ لیکن ہم سچے راستے پر تو چلتے رہیں گے۔

اس معاملہ میں بلاشک جو بات ایک کے لئے درست ہے۔ وہ ہزاروں کے لئے اس سے بھی زیادہ درست ہے۔ کیونکہ ایک بڑا گھر تناسب کے اعتبار سے ایک چھوٹے گھر سے زیادہ مہنگا نہیں ہے کیونکہ ایک ہی چھت سارے گھر کو ڈھک لیتی ہے۔ ہر گھر میں ایک ہی تہہ خانہ ہوتا ہے اور ایک ہی دیوار کئی کمروں کو ایک دوسرے سے الگ کرتی ہے۔ جہاں تک میرا سوال ہے میں نے اکیلے رہنے کو ترجیح دی۔ علاوہ ازیں عام طور سے سارا مکان خود تعمیر کرنا دوسروں کو مشترکہ دیوار کے فوائد کا قائل کرانے سے زیادہ سستا رہتا ہے اگر بالفرض آپ نے اُسے رضامند بھی کر لیا تو یہ درمیانی دیوار سستی ہونے کیوجہ سے بہت پتلی ہوگی۔ اس کے علاوہ دوسرا شخص برا ثابت ہو سکتا ہے اور عین ممکن ہے کہ وہ اپنی طرف کے حصے کی مرمت نہ کرائے۔ وہ تعاون جو عام طور سے ہو سکتا ہے بہت ہی جز دی اور سطحی ہوتا ہے۔ اور حقیقی تعاون تو نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔ گویا وہ ایک ایسا مدھم نغمہ ہوتا ہے جو انسان کو سنائی ہی نہیں دیتا۔ جو شخص خوش اعتقاد ہے وہ لگاتار خوش اعتقادی سے تعاون کرے گا۔ اور اگر کسی کے ہاں اعتقاد عنقا ہے تو اُسے چاہیے کسی کے ساتھ کیوں نہ رہنے دیا جائے۔ وہ دُنیا کے دوسرے لوگوں کی طرح زندگی بسر کرتا رہے گا۔ اعلیٰ اور اسفل مفہوم میں امداد باہمی کے معنی مل کر اپنی روزی پیدا کرنا ہیں۔

حال ہی میں کسی کو یہ تجویز پیش کرتے ہوئے سُنا گیا تھا کہ دو نوجوانوں کو دنیا کے سفر پہ جانا چاہیئے۔ ان میں سے ایک نوجوان جس کے پاس روپیہ نہ ہوگا راستہ میں ہل جوت کر اور جہاز پر کام کر کے اپنی روزی پیدا کرے گا۔ اور دوسرا اپنی جیب میں چیک لے کر چلے گا یہ معلوم کرنا بہت آسان ہے کہ وہ زیادہ دیر تک ایک دوسرے کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ اور ایک دوسرے سے لگاؤ نہیں کر سکتے کیونکہ ان میں سے ایک نوجوان اپنی روزی کا کام ہی نہیں کرے گا۔ وہ اپنی تجارت کے دوران میں پہلی ہی مشکلات پیش آنے پر ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں گے سب سے اہم بات جو میں کہنا چاہتا ہوں یہ ہے کہ وہ شخص جو تنہا جانا چاہے آج ہی روانہ ہو سکتا ہے۔ لیکن جو شخص کسی دوسرے کے ساتھ جانا چاہتا ہو اُسے اس شخص کے تیار ہونے کا انتظار کرنا پڑے گا۔ اور بہت ممکن ہے کہ ان کی روانگی میں تاخیر ہو جائے۔

میں نے اپنے قصبہ کے لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سُنا ہے کہ یہ ساری خودغرضی کی باتیں ہیں۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے اب تک [illegible] کے بہت کم کام کئے ہیں میں نے احساسِ فرض کے سلسلے میں کچھ قربانیاں کی ہیں اور دوسری قربانیوں کے ساتھ اس مسرت کو بھی بھینٹ چڑھا دیا ہے۔ ایسے لوگ بھی موجود ہیں جنہوں نے مجھے ان باتوں پر رضامند کرنے کے لئے سارے حربے استعمال کر ڈالے کہ میں قصبہ کے کسی غریب خاندان کا بوجھ اپنے کندھوں پہ لے لوں۔ اگر میرے پاس اور کوئی کام نہ ہوتا شیطان ہمیشہ بیکاروں کے لئے کوئی نہ کوئی شغل ڈھونڈ لیتا ہے تو میں شاید کوئی ایسی تفریح کر لیتا۔ بہرکیف جب کبھی میں نے یہ سوچا کہ میں بعض اشخاص کی آرام دہ گذر بسر کا اسی طرح انتظام کروں جس طرح اپنی گذر بسر کا انتظام کرتا ہوں اور میں ان کے خدا کو اپنا ممنون

احسان بناؤں اور میں نے اس پیشکش کی جسارت بھی کی تو ان سب نے بلا تامل
غریب رہنے کو ہی ترجیح دی۔ جب میرے قصبہ کے مرد اور عورتیں مختلف
طریقوں سے دوسروں کی بھلائی میں مصروف ہیں تو مجھے یقین ہے کہ وہ کم سے
کم ایک شخص کو کسی دوسرے اور کم انسان دوست مشغلہ میں مبتلا رہنے کی اجازت
دے دیں گے۔ آپ میں دوسرے کام کرنے کی طرح خیراتی کام کرنے کی بھی خاص
اہلیت ہونی چاہیئے۔ جہاں تک بھلائی کرنے کا سوال ہے یہ ایک ایسا پیشہ ہے
جس میں ضرورت سے زیادہ ہی کے لیئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس کے علاوہ میں اسے
کافی حد تک آزما بھی چکا ہوں۔ آپ کو یہ بات چاہے عجیب سی کیوں نہ معلوم ہو
لیکن مجھے پورا یقین ہے کہ یہ کام میرے مزاج کے مطابق نہیں ہے۔ غالباً مجھے
شعوری طور پر اور دیدہ و دانستہ طور پر بھلائی کرنے کا اپنا خاص کام نہیں چھوڑ
دینا چاہیئے۔ سماج مجھ سے تقاضا کرتا ہے کہ مجھے ساری کائنات کو تباہی
سے بچانا چاہیئے۔ مجھے یقین ہے کہ دوسرے مقامات پر ایسا کرانے سے
بھی زیادہ عظیم استقلال موجود ہے جو کائنات کو محفوظ رکھے ہوئے ہے لیکن
میں کسی انسان اور اس کی ذہانت کے درمیان رخنہ انداز نہیں ہونا چاہتا۔
ایک شخص جو یہ کام سچے دل سے کرتا ہے اور جس کو کرنے سے میں انکار کرتا
ہوں اور یہی کہوں گا کہ "اگر ساری دنیا اس کام کو بیکار کہے (جس کا امکان
بہت زیادہ ہے) تب بھی یہ کام کیئے جاؤ"

میں یہ فرض کرنے کے لیئے ہرگز تیار نہیں ہوں کہ میرا معاملہ ایک خاص
معاملہ ہے۔ اس میں شک نہیں ہے کہ میرے بیشتر قارئین اس قسم کے دلائل پیش
کریں گے۔ جہاں تک کوئی کام کرنے کا سوال ہے (اگرچہ میں یہ یقین نہیں دلا سکتا
کہ میرے پڑوسی اسے کوئی بھلا کام کہیں گے) میں بلا تامل یہ کہہ سکتا ہوں کہ

میں ایک بڑا جفاکش مزدور ثابت ہوں گا۔ مگر وہ کام کیا ہوگا اس کا فیصلہ مجھ سے کام لینے والے کو کرنا ہوگا۔ بالعموم وہ بھلا کام میرے عام راستے سے ذرا ہٹ کر ہوگا اور زیادہ تر غیرارادی ہوگا۔ لوگ خاص طور سے یہ بات کہتے ہیں کہ آپ جہاں بھی ہیں اور جیسے بھی ہیں اچھے ہیں۔ وہیں سے ابتدا کیجئے۔ زیادہ قابل بننے کی کوشش کئے بغیر اور مہربانی کو مدنظر رکھتے ہوئے نیکی کئے چلے جائیں۔ اگر میں اس طرح کی ہدایت دیتا تو یہ کہتا "خود نیک انسان بننے کی کوشش کیجئے" جیسے سورج کو صرف چاندیا چھٹے درجہ کے ستارے کے برابر تابندہ ہوکر رک جانا چاہیئے۔ اور رابن گڈ فیلو کی طرح ہرجھونپڑے کی کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھنا چاہیئے۔ تاکہ وہ دیوانوں کی تعداد نہ بڑھائے رگوشت کو نہ سڑالے اور اندھیرے کو زیادہ نمایاں نہ کرے اور اپنی حقیقی حرارت اور منفعت بخشی کو اس حد تک نہ بڑھائے اور نہ اتنا درخشاں ہو جائے کہ فانی انسان اس کے چہرے پر نظر نہ ڈال سکے۔ اور اس کے بعد بھی اور اس مدت کے دوران میں بھی اپنے مدار پر دنیا کے گرد گھوم کر نیکی کرتا رہے یا دوسرے الفاظ میں جیسا کہ فلسفہ نے دریافت کیا ہے دنیا اس کے گرد گھوم کر نیکی حاصل کرتی رہے۔ جب فےٹون نے یہ ثابت کرنے کیلئے کہ وہ دیوتاؤں کی نسل میں سے ہے اپنا فضل و کرم دکھانا چاہا اور سورج کا رتھ ایک دن کے لئے لیا تو وہ اسے مقررہ راستہ سے ہٹا کر چلانے لگا۔ اس نے آسمان کے نیچے گلیوں میں کئی مکان جلا ڈالے۔ اور زمین کو جھلس دیا ہر ایک چشمہ سکھا دیا۔ صحرا کو بہت بڑا ریگستان بنا دیا۔ آخر کار جوپیٹر نے اس پر بجلی گرا کر اسے سر کے بل پٹک دیا۔ اور سورج نے اس کی موت پر رنج کے مارے ایک برس تک روشنی نہ پھیلائی۔

کوئی بو اتنی بری نہیں ہوتی جتنی نیکی میں بدی کی آمیزش کر دینے سے اٹھتی ہے

وہ انسانی اَور ربانی گلی سڑی لاش ہوتی ہے۔ اگر میں یقین کے ساتھ یہ جان سکوں کہ کوئی شخص شعوری طور پر بھلائی کرنے کے ارادے سے میرے گھر آرہا ہے تو میں اپنے آپ کو بچانے کے لئے ایسے بھاگ کھڑا ہوں گا۔ جیسے وہ افریقی صحراؤں کی گلا خشک کر دینے والی ہوا ہو جس کو سموم کہا جاتا ہے اور جو مُنہ، ناک، کانوں اَور آنکھوں کو دُھول سے اس طرح بھر دیتی ہے کہ دم گھٹنے لگتا ہے۔ میں اس ڈر سے بھاگ کھڑا ہوں گا کہ وہ مجھ سے کوئی نہ کوئی بھلائی کر بیٹھے گا۔ اَور اسکے کچھ زہریلے جراثیم میرے خون میں شامل ہو جائیں گے۔ مَیں اس معاملے میں بدی کو اُس کے قدرتی انداز میں برداشت کرنا زیادہ اچھا خیال کروں گا۔ کوئی شخص محض اس لئے نیک نہیں بن جاتا کہ مجھے بھوک لگے تو وہ مجھے کھانا کھلا دے۔ یا مَیں سردی سے ٹھٹھرنے لگوں تو وہ مجھے گرمی پہنچائے یا مَیں کبھی گڑھے میں گر پڑوں تو وہ مجھے اُوپر کھینچ لے۔ میں آپ کے سامنے نیو فاؤنڈ لینڈ کا کتا پیش کر سکتا ہوں جو اسی قسم کے اَور اتنے ہی کام کرے گا۔ عام معنوں میں انسان دوستی کا مطلب ساتھی انسانوں سے محبت نہیں ہے۔ ہاورڈ اپنے انداز کا بلا شک وشبہ ایک انتہائی مہربان اَور قابل شخص تھا۔ اُسے اُس کے نیک کاموں کا انعام بھی ملا۔ لیکن سینکڑوں ہاورڈ ہمارے کس کام کے۔ اگر انسان کی دوستی اس وقت ہماری مدد نہیں کرتی جب ہماری حالت اچھی نہیں ہوتی اَور ہم مدد کئے جانے کے زیادہ اہل ہوتے ہیں؟ میں نے انسان دوستوں کی کسی میٹنگ کے بارے میں نہیں سُنا کہ اس میٹنگ میں میری یا مجھ جیسے لوگوں کی بھلائی کے لئے خلوص کے ساتھ کوئی تجویز پیش کی گئی۔

جیسوٹ پادری ان انڈینوں کے ہاتھوں بہت لاچار ہو جاتے تھے جو آگ میں جلائے جانے کے وقت اپنے پہ ظلم توڑنے والے لوگوں کو اذیت رسانی کے نئے

نئے طریقے بتاتے تھے۔ چونکہ وہ جسمانی اذیت برداشت کرنے میں زیادہ بہتر تھے اس لئے وہ اس تشفی سے بھی بے نیاز تھے۔ جو عیسائی مبلغ انہیں پیش کیا کرتے تھے۔ یہ قانون کہ دوسروں کے ساتھ وہی سلوک کرو جو تم دوسروں سے اپنے بارے میں کرانا چاہتے ہو۔ ان لوگوں کو تھوڑی سی ترغیب کے ساتھ متاثر کر دیتا ہے۔ اور جو نئے انداز سے اپنے دشمنوں سے محبت کرتے ہیں اور بڑی فراخدلی سے دشمنوں کی ہر حرکت معاف کر دیتے ہیں۔

لیکن آپ غریبوں کو وہ امداد ضرور دیجئے جس کی انہیں بہت ضرورت ہے چاہے آپ اپنی مثال سے ان کو بہت نیچے ہی کیوں نہ چھوڑ جائیں اگر آپ ان کو روپیہ دیتے ہیں تو یہ روپیہ خود بھی ان کے ساتھ خرچ کیجئے اور روپیہ کا خرچ کرنا صرف ان پر ہی نہ چھوڑ دیجئے۔ ہم بعض اوقات عجیب و غریب غلطیاں کرتے ہیں۔ اکثر اوقات غریب آدمی اتنا بھوکا اور کمزور نہیں ہوتا۔ جتنا وہ غلیظ، چیتھڑوں میں ملبوس اور گھناؤنا ہوتا ہے۔ یہ جزوی طور پر اس کی بدذوقی ہے۔ بدنصیبی نہیں۔ اگر آپ اسے روپیہ دیں گے تو شاید وہ کچھ اور چیتھڑے خرید لے گا۔ مجھے ان بھدے آئرستانی مزدوروں پر ترس آتا تھا جو تالاب پر برف کاٹتے تھے۔ وہ پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس ہوتے تھے۔ جبکہ میں اپنے صاف ستھرے اور کسی حد تک زیادہ فیشن ایبل کپڑوں میں سردی سے کانپتا رہتا تھا۔ ان میں سے ایک مزدور ایک انتہائی سرد دن پھسل کر تالاب کے پانی میں جا گرا اور میرے گھر آگ تاپنے کے لئے آگیا۔ میں نے دیکھا کہ پہلے اس نے تین پتلونیں اور دو جوڑے موزے اتارے پھر جا کر کہیں اس کی جلد نظر آئی۔ یہ درست ہے کہ وہ کپڑے بہت گھسے ہوئے اور پھٹے پرانے تھے۔ لیکن اسے ان کپڑوں کو لینے سے انکار کر دینا

چاہیئے تھا جو میں لے اُسے پیش کئے تھے۔ کیونکہ اس کے پاس کافی فاضل کپڑے تھے۔ اُسے اس تالاب میں غوطہ لگانے کی سخت ضرورت تھی۔ اس کے بعد مجھے اپنے آپ غصہ آنے لگا۔ اور میں نے خیال کیا کہ اُس آرٹسٹانی مزدور کو کپڑوں کی پوری دوکان دے دینے کی بجائے ایک فلالین کی قمیض دینی چاہیئے تھی۔ اگر ایک شخص برائی کی جڑ کاٹ رہا ہے۔ تو ہزاروں اشخاص برائی کے پیڑ کی صرف شاخیں چھیل رہے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ جو شخص حاجت مندوں پر سب سے زیادہ وقت اور روپیہ صرف کر رہا ہے۔ وہ اپنی طرزِ زندگی سے اُن کے لئے ایسے رنج و غم پیدا کر رہا ہے۔ جن کو دُور کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس کی حالت اُس پاکبانہ غلام فروش کی سی ہے جو ہر دسویں غلام کی فروخت سے ہونے والی آمدنی باقی نو غلاموں کو اتوار کی چھٹی دلانے پر صرف کرتا ہو۔ بعض لوگ اس طرح مہربانی کا اظہار کرتے ہیں کہ غریب لوگوں کو اپنے باورچی خانے میں کام دے دیتے ہیں۔ اگر خود اپنے آپ کو باورچی خانے میں مصروف رکھتے تو کیا زیادہ مہربان نہ ثابت ہوتے؟ آپ اس بات کی ڈینگ مارتے ہیں کہ آپ اپنی آمدنی کا دسواں حصہ خیرات میں دیتے ہیں۔ کاش آپ اپنی آمدنی کا باقی ۹/۱۰ حصہ بھی صرف کر ڈالتے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ سماج مبادا! وکا صرف دسواں حصہ حاصل کرتا ہے۔ کیا یہ اُس شخص کی بدولت ملتا ہے۔ جس کی تحویل میں مال ہوتا ہے۔ یا عدل و انصاف کے افسروں کی چشم پوشی کی بدولت؟

انسان دوستی ہی زیادہ تر ایسی واحد خوبی ہے۔ جس کی ساری انسانیت قدر کرتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسے بہت بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے۔ اور یہ ہماری خود غرضی ہے۔ جو اسے بڑھا چڑھا کر پیش کرتی ہے۔ ایک دن جب دھوپ بہت کھلی ہوئی تھی۔ کنکارڈ میں ایک تنومند غریب آدمی نے میرے

سامنے اپنے قصبہ کے ایک شخص کی بہت تعریف کرتے ہوئے کہا کہ وہ غریبوں
پر بہت مہربان ہے۔ دراصل اس کا یہ مطلب تھا کہ وہ اس پر بہت مہربان ہے۔
موجودہ نسل میں ماں باپ کی نسبت مہربان چچاؤں اور چچیوں کی زیادہ عزت
کی جاتی ہے۔ میں نے ایک دفعہ پھر ایک پادری کو جو ذہین اور عالم تھا انگلستان
پر لیکچر دیتے ہوئے سنا۔ اس نے انگلستان کے سائنس دانوں، ادیبوں،
اور سیاسی شخصیتوں مثلاً شیکسپیئر، بیکن، کرامول، ملٹن، نیوٹن وغیرہ کے
ناموں کی فہرست پیش کرنے کے بعد وہاں کے بڑے بڑے عیسائی مجاہدوں
کا ذکر کیا۔ اس کے پیشہ کا یہی تقاضا تھا کہ وہ ان کا ذکر کرے۔ اس نے
ان لوگوں کو سب سے زیادہ عظیم المرتبت بتایا۔ یعنی عظیم تر سے عظیم ترین۔
اور وہ لوگ تھے ہیں، ہاورڈ، اور مسز فرائی۔ ہر شخص اس بات کے کھوکھلے پن
اور جھوٹ کو محسوس کر سکتا ہے۔ موخر الذکر انسان انگلستان کے بہترین
مرد و زن نہیں تھے۔ غالباً اس کے بہترین انسان دوسرے تھے۔

انسان دوستی کی جو تعریف کی جاتی ہے۔ میں اسے گھٹا کر پیش نہیں کرنا
چاہتا۔ لیکن میں صرف یہ مطالبہ کرتا ہوں کہ ان لوگوں کے ساتھ انصاف کیا جائے
جو اپنی زندگیوں اور تصانیف کے اعتبار سے ساری انسانیت کے لئے نعمت
ہیں۔ میں خصوصاً کسی انسان کی دلیری اور فراخدلی کی قدر نہیں کرتا۔ یہ تو اس
شخصیت کی شاخیں اور پتیاں ہیں۔ جو پودے ابھی ہریالی کھو بیٹھتے ہیں
ہم ان کا جوشاندہ بنا کر بیمار کو پلاتے ہیں۔ ان سے بہت معمولی کام لیا جاتا
ہے۔ اور مجھ بار حکیم ہی انہیں استعمال کرتے ہیں۔ میں تو انسان کا پھول
اور پھل چاہتا ہوں تاکہ اس کی خوشبو اڑے اور مجھ تک پہنچے۔ اور ملاقات
کے وقت اور بھی زیادہ لطف آئے۔ اس کی نیکی ہرگز ہرگز جزوی اور عارضی

نہیں ہونی چاہیئے - بلکہ ایک مسلسل بہاؤ کی طرح ہونی چاہیئے جس کی اُسے
کوئی قیمت نہیں دینی پڑتی اور جس کا اسے احساس نہیں ہوتا۔ یہ ایک خیرات
ہے جو ان گنت گناہوں پر دہ ڈالتی ہے۔ انسان دوست بھی اکثر انسانیت کو اپنے
سر سے اُتارے ہوئے غموں کے بوجھ سے فضا کی طرح گھیر لیتا ہے اور اسے
ہمدردی کا نام دیتا ہے - ہمیں مایوسی کی بجائے دلیری اور بیماری کی بجائے
صحت اور آسائش عطا کرنی چاہیئے کہ یہ کارروائی چھوت کی بیماری کی طرح
نہ پھیل جائے - کس جنوبی میدان سے آہ وزاری کی صدا آرہی ہے؟ کس علاقے
میں وہ ناسمجھ رہتا ہے - جہاں تک ہمیں علم کی روشنی پہنچانی چاہیئے؟ وہ کون
سا شرابی اور حیوان صفت انسان ہے جسے نجات دلانی چاہیئے؟" اگر ایک شخص
کو کوئی تکلیف ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے فرائض سرانجام نہیں دے
سکتا چاہے وہ تکلیف پیٹ کا درد ہی کیوں نہ ہو کیونکہ پیٹ کی ہمدردی
کا منبع ہے، تو وہ فوراً دنیا کی اصلاح پر تل جاتا ہے - چونکہ وہ خود ایک چھوٹی
سی کائنات ہے اس لیئے [illegible] ہے کہ دنیا کچے سیب کھاتی رہی ہے
دراصل اس کی نظر میں [illegible] ہے جس کے متعلق یہ
اندیشہ ہے کہ انسان [illegible] اس کو دانتوں سے کترنے
لگیں گے - یہ اس کی حقیقی [illegible] اور [illegible] ایسے فائدہ کو اٹھا سکتا
ہے - اس کی شدید انسان دوستی فوراً اسکیموؤں اور پیٹاگونیوں کو ڈھونڈ لیتی ہے
اور ان میں گنجان آباد ہندوستانی اور چینی دیہات بھی شامل کر لیتی ہے - اس طرح
چند برس کی دوستی کے بعد جس کے دوران میں حکومتیں اُس کو اپنے مقاصد
کے لیئے استعمال کرتی رہتی ہیں، اس کے ضعفِ معدہ کا مرض دُور ہو جاتا ہے - اور اسے
زمین کے ایک یا دو اشخاص کے گالوں پر بھی ہلکی سی سرخی پیدا ہو جاتی ہے گویا اب

وہ قریب قریب پک چکا ہوتا ہے اور اس کی زندگی کی خامیاں رفع ہو جاتی ہیں۔ اور وہ دوبارہ میٹھی اور خوش ذائقہ بن جاتی ہے۔ میں نے جتنی بڑی غلطی کا ارتکاب کیا ہے اُس سے بڑی غلطی میرے خیال میں بھی نہیں آئی۔ میں کسی ایسے شخص سے واقف نہیں ہوں اور شاید اس کو کبھی نہیں جان سکوں گا جو مجھ سے زیادہ بڑا ہو۔

مجھے یقین ہے کہ ایک اصلاح پسند کو جو بات افسردہ بنا دیتی ہے چاہے وہ اصلاح پسند خدا کے بیٹوں میں سب سے زیادہ مقدس ہی کیوں نہ ہو اپنے جیسے انسانوں کا دُکھ درد نہیں ہے بلکہ اس کی کوئی ذاتی تکلیف ہی اُسے غمگین بناتی ہے اُس تکلیف کو دُور کر دیجئے، اس کی زندگی میں بہار آنے دیجئے، اس کے بستر تک صبح درخشندہ لے آئیے۔ پھر دیکھئے وہ اپنے سخی رفیقوں کو اُن سے معذرت طلب کئے بغیر چھوڑ کر چلا جائے گا۔ اگرچہ میں نے ایسی خبریں بڑی تعداد میں شایع کی ہیں اور میں انکے خلاف وعظ بھی کر سکتا ہوں لیکن میں نے تمباکو کے خلاف لیکچر اس لئے نہیں دیا کہ میں نے آج تک تمباکو کبھی نہیں چبایا۔ یہ وہ جرمانہ ہے جو تمباکو ترک کر دینے والوں کو ادا کرنا چاہیئے۔ یعنی ان لوگوں کو جو اسے استعمال کر کے چھوڑ چکے ہیں۔ اگر آپ بھولے سے کبھی ایسی انسان دوستی کریں تو آپ کے بائیں ہاتھ کو یہ خبر نہیں ہونی چاہیئے کہ آپ کا دائیاں ہاتھ کیا کر رہا ہے۔ اس لئے یہ جاننے کے قابل بات نہیں ہے۔ ڈوبنے والے کو بچائیے۔ مگر اپنے جوتے کا فیتہ باندھ لیجئے۔ اور سوچ سمجھ کر کوئی محنت کا کام اُجرت لئے بغیر کر ڈالئے۔

رنگیلوں مُنیوں کے ساتھ ملنے جلنے سے ہمارا اخلاق بگڑ گیا ہے۔ ہماری حمد و ثنا کی کتابیں خدا کے قہر و عتاب کے دلدوز گیتوں سے اور ہماری ابدی اطاعت سے لبریز ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ پیغمبروں اور نجات دہندوں نے انسانوں کی اُمیدوں کو تقویت دینے کی بجائے ہمارے ڈر اور خوف کی تسکین کی ہے

کہیں بھی اس سادہ اور خود بخود برانگیز ہونے والی تسکین کا ذکر نہیں ہے۔ جو زندگی کا تحفہ ملنے پر انسان کو ہونی چاہیئے۔ اور کہیں بھی خدا کی حمد وثنا نہیں کی گئی ہے جو یاد رکھنے کے قابل ہو۔ مجھے ہر طرح کی صحت مندی اور کامیابی خوشی بخشتی ہے۔ چاہے وہ کتنی ہی دُور کیوں نہ ہو اور بظاہر اس کا مجھ سے کوئی واسطہ نہ ہو ہر طرح کی بیماری اور ناکامی مجھے غم زدہ اور میرا بُرا حال کر دیتی ہے۔ چاہے اس کو مجھ سے اور مجھے اُس سے ہمدردی ہی کیوں نہ ہو۔ اگر ہم انسان کو حقیقتاً انڈین انداز میں کھینچی نباتاتی، مقناطیسی یا قدرتی ذرائع سے دوبارہ صحت مند بنانا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے ہمیں قدرت کی طرح سادہ اور توانا بننا چاہیئے ان بادلوں کو ہٹا کر جو ہمارے اُوپر مسلط ہیں اپنے مساوات میں تھوڑی سی زندگی جذب کرنی چاہیئے بجز بیوں کا نگران بننے کی کوشش نہ کیجیئے بلکہ اس دُنیا کے قابل اور ذہین انسانوں میں سے ایک بننے کی سعی کیجیئے۔

میں نے شیراز کے شیخ سعدی کی کتاب "گلستان" پڑھی ہے۔ لوگوں نے ایک دانشور سے پوچھا کہ "خدا نے وہ جہاں نے جو بڑے بڑے ہرے ہرے درخت پیدا کیئے ہیں۔ ان میں سے سرو کے سوا کسی کو آزاد نہیں کہتے۔ حالانکہ سرو میں کوئی پھل نہیں لگتا۔ اس کی کیا وجہ ہے؟" دانشور نے جواب دیا "ہر شخص اپنے لئے ایک موزوں پھل رکھتا ہے۔ اس کا ایک مقررہ موسم ہوتا ہے۔ اس موسم میں وہ تازہ اور شگفتہ رہتا ہے اس میں پھول کھلتے ہیں۔ لیکن موسم کے ختم ہوتے ہی وہ سُوکھ جاتا ہے اور مرجھا جاتا ہے۔ ان حالتوں میں کوئی حالت سرو پر طاری نہیں ہوتی۔ وہ ہمیشہ ہرا بھرا رہتا ہے۔ آزاد منش لوگوں اور درویشوں کی بھی یہی فطرت ہے عارضی چیزوں کو عزیز نہ رکھیئے۔ دجلہ اور فرات دریا بغداد میں اس وقت بھی بہتے رہیں گے جب خلفا کی نسل مٹ چکی ہوگی۔ اگر آپ کے انداز میں بے اندازہ

دولت ہے تو کھجور کے درخت جیسی سخاوت سے کام لیجئے۔ اگر آپ کے ہاتھ میں دوسروں کو دینے کے لئے کچھ نہیں ہے تو سرو کی طرح آزاد یعنی مردِ آزاد بن جائیے۔"
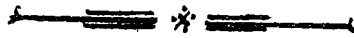
تعریفی اِشعار

غریبی کی کھوکھلی ڈینگیں

اَے غریب اَور حاجت مند کنگال! تُو بہت زیادہ توقع رکھتا ہے۔
اَور آسمان میں اپنے لیئے ایک مقام پانے کے لئے دعوی کر رہا ہے
کیونکہ تیرے حقیر جھونپڑے یا ٹب میں
ایک سُست و کاہل یا فضیلت مآب نیکی،
سستی دھوپ یا سایہ دار چشموں میں جڑ وں اور
جڑی بُوٹیوں کے سہارے پرورش پا رہی ہے ــــ
جہاں تیرا دایاں ہاتھ ذہن سے اُن انسانی
جذبات کو نوچ کر جن پر دلآویز نیکیاں نشوونما پاتی ہیں۔
قدرت کو ذلیل کر رہا ہے، احساس کو مفلوج
بنا رہا ہے۔ اَور گورگن کی طرح سرگرمِ عمل انسانوں
کو پتھر میں تبدیل کر رہا ہے۔
ہمیں تیری پابند و مجبور پرہیزگاری کی بے کیف شرکت یا غیرفطری حماقت

کی ضرورت نہیں ہے۔ جو غم اور خوشی سے آگاہ نہیں ہے ـــ ہمیں تیرے ارفع صبر و تحمل کی بھی ضرورت نہیں ہے جو تو نے زبردستی سرگرم انسانوں پر وارد کر رکھا ہے ـــ

یہ پست اور حقارت انگیز انبوہ
جو عامیانہ گداوں پر متمکن ہو جاتا ہے۔

تیری غلامانہ ذہنیت ہی کو زیب دیتا ہے ـــ لیکن ہم تو صرف اُن نیکیوں کو فروغ دیتے ہیں جن میں افراط و تفریط کی گنجائش ہو۔ پُرشجاعت اور فراخدلانہ اقدامات ـــ شاہانہ جاہ و جلال ـــ ہمہ گیر فراست اور الوالعزمی یعنی وہ اوصاف جن کا عہدِ قدیم نے کوئی نام نہیں چھوڑا۔ لیکن اُنکی مثالیں ضرور چھوڑی ہیں۔ ہرکیولیس، ایکلیز، تھیسس!

اپنی قابلِ نفرت کوٹھڑی میں واپس چلا جا ـــ
اور جب تجھے نیا درخشندہ ماحول نظر آئے
تو یہ جاننے کے لئے مطالعہ کر کہ وہ ذہین اور قابل لوگ کیا تھے!

ٹی۔ کیرن

میں کہاں رہتا تھا اور میرا مقصدِ حیات کیا تھا

ہماری عادت ہے کہ ہم اپنی عمر کے ایک خاص موسم میں ہر جگہ کے بارے میں یہ خیال کرتے ہیں کہ وہاں ہمارا مکان بن سکتا ہے ۔ میں نے اس عادت کے پیشِ نظر اس جگہ سے جہاں میں رہتا ہوں بارہ میل کے فاصلہ کے اندر چاروں طرف دیہی علاقہ کا جائزہ لیا ۔ میں نے تصور ہی تصور میں یکے بعد دیگرے سارے فارم خرید لیے کیونکہ وہ سب خریدے جانے تھے اور مجھے اُن کی قیمتیں بھی معلوم تھیں ۔ میں خیال ہی خیال میں ہر کسان کے گھر تک گیا ۔ اُس کے جنگلی سیب چکھے ۔ مویشیوں کی پرورش کے بارے میں اُس سے باتیں کیں ، اُس کے فارم کی مُنہ مانگی قیمت دی ۔ اور پھر اُس فارم کو اُسی کے پاس رہن رکھ دیا ۔ میں نے ہر فارم کے زیادہ دام لگا دیئے ۔ سب کچھ خرید لیا ۔ کوئی بیع نامہ نہیں لیا ۔ اُس کے قول ہی کو اس کا عمل سمجھ لیا ۔ کیونکہ زبانی جمع خرچ مجھے بہت مرغوب ہے ۔ میں نے اس کھیت کی کاشت کی اور کسی حد تک میرا یقین ہے کہ میں نے اُسے بھی تربیت دی ۔ اور جب میں ان باتوں سے کافی دیر تک لطف اندوز ہو چکا تو کنارہ کش ہو گیا تاکہ وہ خود ہی اس کام کو جاری رکھے ۔ اس تجربہ نے مجھے اس بات کا مستحق بنا دیا کہ میرے دوست مجھے ایک طرح کی حقیقی جائداد کا دلال سمجھیں ۔ میں جہاں بھی بیٹھتا یہ خیال آتا کہ وہاں میرا مکان بن سکتا ہے اور اس حساب

سے ہر اراضی منظر مجھ سے دور ہٹ جاتا۔ مکان آخر کیا ہے ایک اقامت گاہ ہی تو
ہے۔ مکان دیہات میں ہو تو زیادہ اچھا ہے۔ میں نے اپنے مکان کے لئے بہت سی
ایسی جگہیں تلاش کیں جن کو بہتر بنانے کا مستقبل قریب میں کوئی امکان نہ تھا۔ بعض لوگوں کا
خیال تھا کہ یہ جگہیں قصبہ سے بہت دور ہیں۔ لیکن میری نظر میں قصبہ اُن سے زیادہ دور
تھا۔ میں جی ہی جی میں کہا کرتا تھا کہ عین ممکن ہے میں یہیں قیام کر دوں۔ اور میں
وہاں قیام بھی کرتا تھا۔ ایک ہی گھنٹہ میں موسم گرما اور موسم سرما کی زندگی بسر کر لیتا
تھا۔ یہ اندازہ بھی لگا لیتا تھا کہ میں ایک جگہ کے موسم کو سالہا سال تک کیسے برداشت کر
سکوں گا۔ سردیوں کا کیسے مقابلہ کر سکوں گا۔ اور یہاں کا موسم بہار مجھے کیسا معلوم ہوگا
جو لوگ اس علاقہ میں مستقل طور پر رہتے ہیں۔ ان کو چاہیئے کہ جب کبھی کہیں بھی وہ مکان
بنائیں اس بات کا یقین رکھیں کہ میں تصور میں اُن سے پہلے وہاں [illegible] بنا چکا ہوں
اس قطعہ اراضی کو باغ، جنگل یا چراگاہ میں تقسیم کر دینے اور یہ طے کرنے کے لئے
ایک سہ پہر کافی ہوتی تھی کہ کون کون سے شاہ بلوط اور صنوبر کے درخت دروازے
کے سامنے بدستور لگے ہوئے چھوڑ دیئے جائیں۔ اور کون کونسا دھوپ میں جھلسا
ہوا درخت کن کن مکانات سے خوشنما دکھائی دیتا ہے۔ اور میں اس خیال کو ایک غیر
مزروعہ زمین کی طرح بالکل رد کر دیتا تھا۔ کیونکہ ایک شخص میں جتنی چیزوں سے کنارہ
کشی کر لینے کی استطاعت ہوتی ہے اسی تناسب سے وہ دولتمند ہوتا ہے۔ میرا
تخیل یہاں تک اڑان لینے لگا تھا کہ میں سوچا کرتا تھا کہ مجھے اختیار ہے کہ میں فلاں فلاں
فارم خریدوں یا نہ خریدوں۔ میں انہیں مسترد کر دینے کا حق حاصل کرنا چاہتا تھا۔ میں ان
کو بیچ خرید کر مصیبت مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ مجھے حقیقی قبضہ سے بہت ہی قریب
ایک واقعہ پیش آیا جبکہ میں ہولول کا مکان خرید کر بوائی کے لئے بیج منتخب کرنے اور انہیں
لانے اور لے جانے کے لئے ایک ٹھیلہ بنانے کا سامان اکٹھا کر رہا تھا۔ قبل اس کے کہ مالک

مجھے اس مکان کا بیع نامہ دیتا اُس کی بیوی نے (کیونکہ ہر مرد کی بیوی ایسی ہی ہوا کرتی ہے) اپنا ارادہ تبدیل کر لیا فیصلہ کیا کہ وہ مکان فروخت نہیں کرے گی۔ بوئول نے مجھے یہ سودا چھوڑ دینے کے لئے دس ڈالر کی رقم پیش کی۔ سچ تو یہ ہے کہ میری دُنیاوی دولت صرف دس سینٹ تھی۔ اور یہ بات میرے حیطۂ امکان سے باہر تھی کہ میں یہ بتا سکوں کہ میں وہ شخص ہوں جس کی کُل متاع صرف دس سینٹ ہے۔ یا جس کے پاس فارم ہے یا دس ڈالر ہیں یا جس کے پاس ساری چیزیں ہیں۔ بہرکیف میں نے کہا" اپنے دس ڈالر اپنے پاس رکھیئے۔ اور فارم بھی" میں نے ایسا اس لئے کیا کہ میں نے معاملہ کو کافی آگے بڑھا دیا تھا اور میں نے یہاں تک سخاوت بھی دکھائی کہ میں نے اُس کے ہاتھوں وہ فارم اُتنی ہی میں بیچ دیا۔ جتنے میں اُس سے خریدا تھا۔ چونکہ وہ کوئی امیر شخص نہ تھا اس لئے میں نے دس ڈالر اُسے بطور تحفہ دیدیئے۔ اس کے باوجود میرے پاس دس سینٹ بچ رہے۔ میرے پاس بیج تھے۔ اور وہ سارا سامان بھی جو میں نے ٹھیلہ بنانے کے لئے جمع کیا تھا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میں اپنی ملکیت کا کوئی حصّہ کھوئے بغیر رئیس بن گیا ہوں۔ میں نے اس جگہ کے مناظر اپنی نظر میں رکھے اور آج بھی اس فارم کی سالانہ پیداوار کسی ٹھیلہ کے بغیر اُٹھا لاتا ہوں۔ جہاں تک مناظر کا تعلق ہے۔

"میں ان تمام چیزوں کا بادشاہ ہوں جنہیں میں دیکھتا ہوں ——
اور کوئی شخص میرے اس حق کے متعلق جھگڑا نہیں کر سکتا"

میں نے اکثر اوقات دیکھا ہے کہ جب کوئی شاعر کسی فارم کے انتہائی بیش بہا حصّہ سے لطف اندوز ہو کر لوٹتا ہے تو تند خو کسان یہ فرض کر لیتا ہے کہ اس بے چارے شاعر کو چند جنگلی سیبوں کے سوا اور کچھ نہ ملا۔ اس کسان کو برسوں تک پتہ نہیں چلتا

کہ شاعر نے اُس کے فارم پر نظم کہی ہے۔ یعنی اُس شاعر نے اُس کے فارم کے گرد ایک اَن دیکھی باڑھ کھینچ کر اُسے اچھی طرح بند کر دیا ہے۔ اس نے دُودھ کی ساری بالائی اُتار لی اور کسان کے لئے صرف بالائی نکلا ہُوا دُودھ چھوڑ دیا ہے۔

میرے لئے ہولول فارم کی حقیقی دلکشیاں یہ تھیں۔ وہ سب سے الگ تھلگ قصبے سے دو میل کے فاصلہ پر واقع تھا۔ اس کا قریب ترین پڑوسی نصف میل کے فاصلہ پر رہتا تھا۔ ایک وسیع و عریض کھیت اُسے شاہراہ سے جدا کرتا تھا۔ اس کی ایک حد ساحل دریا تک جاتی تھی۔ وہ میری نظر میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ لیکن اس کا مالک دعوےٰ سے کہتا تھا کہ دریائی کہرے کے باعث وہ بہار کے پالے سے محفوظ رہتا ہے۔ اس کے مکان اور اناج گھر کا خاکستری رنگ، اس کی خراب و خستہ حالت، اس کا ٹوٹا پھوٹا احاطہ، جو میرے اور مکین کے درمیان ایک طویل دیوار حائل کرتا تھا۔ اس کے کھوکھلے اور کائی سے لتھڑے ہوئے سیب کے درخت جن کو خرگوشوں نے کُتر ڈالا تھا۔ یہ کیسے کیسے پڑوسی مجھے نصیب ہونے والے تھے! لیکن ان سب سے زیادہ کیف افزا وہ یادیں تھیں۔ جو میری اولین سیروسیاحت سے تعلق رکھتی تھیں۔ جب یہ مکان سُرخ میپل کے گھنے باغ کے عقب میں چھپا ہُوا تھا اور اس میں ایک پالتو کتّا بھونکتا تھا۔ پیشتر ازیں کہ اس کا مالک اس میں سے پتھر چُن کر پھینکنے کا کام ختم کر ڈالتا، یا وہ سیب کے کھوکھلے پیڑوں کو کاٹ دیتا۔ یا بید کے پیڑوں کو اکھاڑ پھینکتا جو اس کھیت میں اُگ آئے تھے۔ یا قبل اس کے کہ وہ اس فارم کو اپنے خیال کے مطابق بہتر بنا سکتا میں اُسے جلدی سے خرید لینا چاہتا تھا۔ اس فوائد سے فیضیاب ہونے کے لئے میں اس فارم کا سارا بوجھ اپنے سر لیتا یعنی اٹلس کی طرح ساری زمین کا بوجھ اپنے کندھوں پر اُٹھا لینا چاہتا تھا۔ مجھے یہ معلوم نہیں کہ اٹلس کو اس مشقت کے

عوض میں کتنی اُجرت ملی تھی۔ بہرکیف میں جس غرض سے یہ سارا کام کرنا چاہتا تھا وہ اس کے سوا اور کچھ نہ تھی کہ میں اُس کی قیمت دے دوں اور کسی قسم کے جھگڑے کے بغیر اس پر قبضہ کر لوں۔ میں یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر میں کھیت کو اس کی حالت پر چھوڑ آیا تو مجھے حسبِ منشا وافر فصل میسر آئے گی۔ لیکن اس سارے سودے کا وہ حشر ہوا جو میں بیان کر چکا ہوں۔

اگرچہ میں ایک باغ کی آبیاری کرتا ہوں لیکن وسیع پیمانہ پر کاشتکاری کے متعلق میں اس قدر کہہ سکتا ہوں کہ میرے پاس بیج موجود تھے۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ بیج جتنے پرانے ہو جاتے ہیں اتنے ہی اچھے ہوتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ وقت گزرنے پر بُرے بھلے کی تمیز پیدا ہو جاتی ہے۔ آخرکار جب میں بیج بوؤں گا تو مجھے زیادہ مایوسی نہ ہوگی۔ میں اپنے دوستوں سے آخری بار یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ جب تک ممکن ہو آزاد رہیے۔ اور اپنے آپ پر کوئی قید و بند عائد نہ کیجیے۔ جیل کی قید اور فارم کی قید میں کوئی لمبا چوڑا فرق نہیں ہے۔

بوڑھا کیٹو جس کی کتاب ڈی۔ ای اسٹکا میری معلم ہے۔ لکھتا ہے (میں نے اس کتاب کا جو ترجمہ پڑھا ہے۔ اس میں یہ عبارت بالکل بے معنی ہو کر رہ گئی ہے) "جب آپ کوئی فارم خریدنے کی بابت سوچتے ہیں تو یہ اچھی طرح سے سوچ سمجھ لیجیے کہ اس کے خریدنے میں آپ لالچ سے کام نہیں لیں گے۔ اس کی اچھی طرح جانچ کرنے سے گریز نہ کیجیے۔ صرف ایک بار اس کے چاروں طرف گھوم لینے کو کافی نہ سمجھیے۔ وہ اگر اچھا ہے تو جتنی بار اس کے گرد گھوم کر آپ دیکھیں گے اتنا ہی زیادہ پسند آئے گا۔" میرا خیال تھا کہ میں فارم خریدنے میں ہرگز لالچ نہیں کروں گا۔ بلکہ عمر بھر اس کے گرد گھومتا رہوں گا اور پہلے ہی اس میں دفن ہو جاؤں گا تاکہ آخر میں وہ مجھے اور بھی زیادہ پسند آئے۔

میرا یہ تجربہ اس طرح کا دوسرا تجربہ تھا۔ میں اسے ذرا مفصل طور پر بیان کروں گا آپ کی سہولت کو مدنظر رکھتے ہوئے دو سال کے تجربہ کو ایک ہی سال میں سمو دوں گا۔ میں جیسا کہ کہہ چکا ہوں یاسیت کی قصیدہ خوانی نہیں کروں گا بلکہ عین اُس طرح جس طرح صبح کو ایک مرغ دڑبے پر کھڑا ہو کر بانگ دیتا ہے میں بھی بڑے دھڑلے سے ڈینگیں ماروں گا تاکہ میں اگر کوئی اور کام نہ کر سکوں تو کم سے کم پڑوسیوں کو تو بیدار کر دوں۔

جب میں پہلے پہل جنگل میں آکر رہنے لگا یعنی جب میں نے اپنی راتیں بھی وہاں دن کی طرح بسر کرنی شروع کر دیں۔ تو وہ ۴ر جولائی ۱۸۴۵ء کا دن آزادی کا دن تھا۔ میرا مکان اس قابل نہ تھا کہ وہاں موسم سرما گذارا جا سکے۔ اس میں صرف بارش سے ہی پناہ لی جا سکتی ہے۔ اس میں نہ پلستر ہوا تھا اور نہ کوئی چمنی تھی۔ اس کی دیواریں سخت کھردری اور بارش زدہ تختوں کی بنی ہوئی تھیں۔ ان میں بڑے بڑے شگاف تھے جن سے رات کو مکان بہت ہی سرد ہو جاتا تھا۔ وہ مکان سیدھے اور سفید تراشے ہوئے کھمبوں اور تازہ رندہ کئے ہوئے دروازوں، کھڑکیوں اور چوکھٹوں کے باعث صاف ستھرا اور ہوادار دکھائی دیتا تھا۔ یہ کیفیت صبح کے وقت زیادہ نمایاں ہوتی تھی اس لئے کہ اس کی لکڑیاں شبنم سے بھیگ جاتی تھیں اور مجھے یہ خیال گزرتا تھا کہ دوپہر تک ان میں سے تھوڑی سی گوند بہہ نکلے گی۔ میرے خیال میں اس پر یہ صباحت دن بھر مسلط رہتی تھی۔ اور اسے دیکھ کر مجھے وہ پہاڑی مکان یاد آجاتا تھا جہاں میں پچھلے برس گیا تھا۔ یہ ایک ہوادار کٹی تھی۔ جس پر پلستر نہیں ہوا تھا۔ یہ کٹی کسی مسافر دیوتا کے آرام کرنے اور کسی دیوی کے اپنی پوشاک گھسیٹ کر چلنے کے لئے بہت موزوں تھی۔ میرے مکان میں ایسی ہی ہوائیں چلتی تھیں جو کوہسار میں چلا کرتی ہیں۔ یعنی یہ وہ ہوائیں تھیں جو ارضی نغمہ کی شکستہ تانوں اور سماوی ترنم کے ٹکڑوں

سے لدی ہوتی ہیں۔ نسیم صبح چلتی رہتی تھی۔ تخلیق کی نظم یہاں مسلسل پڑھی جاتی تھی۔
لیکن بہت کم کان اس نظم کو سنتے تھے۔ زمین کی سطح کا ہر بیرونی حصہ اولمپس (یونانی
دیوتاؤں کا مسکن) تھا۔ اس سے پہلے میں اگر کسی مکان کا مالک تھا تو وہ ایک کشتی کو چھوڑ
کر ایک خیمہ تھا۔ جسے میں اکثر اس وقت استعمال کیا کرتا تھا جب موسم گرما میں سیر و تفریح
کی غرض سے نکلتا تھا۔ یہ خیمہ اب بھی لپٹا ہوا میری کوٹھڑی میں موجود ہے۔ لیکن کشتی
ایک ہاتھ سے نکل کر دوسرے ہاتھ میں پہنچ کر وقت کی ندی میں ڈوب چکی ہے۔ پھر جب
مجھے ایک زیادہ پائیدار پناہ گاہ مل گئی تو میں نے اس دنیا میں آباد ہونے کے لیے آگے
کی طرف قدم بڑھایا۔ اس نیم ملبوس ڈھانچے نے میرے گرد ایک بلوریں خول کی سی صورت
اختیار کر لی تھی۔ یہ مکان اپنے معمار پر اثر انداز ہو رہا تھا۔ اور اپنی اس صورت کی
طرف جو ابھی پیدا ہونے والی تھی اسی طرح اشارہ کر رہا تھا جس طرح تصویر کا خاکہ
بننے والی تصویر کا آئینہ ہوتا ہے۔ مجھے ہوا خوری کے لیے باہر جانے کی ضرورت
نہیں پڑتی تھی کیونکہ مکان کے اندر ہوا اتنی ہی صاف اور تازہ تھی۔ موسلا دھار بارش
میں مجھے یہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ میں مکان کے اندر ہوں۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے
میں دروازے کے پیچھے لگا بیٹھا ہوں۔ ہری ونش کہتا ہے "ایسا گھر جہاں چڑیاں نہ ہوں۔
اس گوشت کی طرح ہے جس میں کوئی مسالہ نہ پڑا ہو" میرا مکان ایسا نہ تھا۔ میں اچانک
چڑیوں کا پڑوسی بن گیا تھا۔ اس وجہ سے نہیں کہ میں نے اپنا قفس ان کے قریب تعمیر
کر لیا تھا۔ میں صرف ان چڑیوں کے قریب تر نہیں ہو گیا تھا جو باغ اور کیاریوں میں
اکثر اڑتی رہتی ہیں۔ بلکہ جنگل کے ان وحشی اور زیادہ نغمہ سرا پرندوں کے نزدیک تر بھی
ہو گیا تھا جو شاذ و نادر ہی کسی دیہاتی کو اپنا نغمہ سناتے ہیں۔ یعنی جنگلی ترشہ، ویری،
سرخ تناگر، جنگلی چڑیا، امریکی ابابیل وغیرہ وغیرہ۔

میرا مکان قصبہ کنکارڈ سے ڈیڑھ میل جنوب میں چھوٹے سے تالاب کے کنارے

اور ذرا بلندی پر ایک وسیع جنگل میں واقع تھا۔ جو کنکارڈ اور لنکن کے بیچ میں ہے اور ہمارے واحد کھیت سے جو کنکارڈ میدان جنگ کے نام سے مشہور ہے تقریباً دو میل جنوب میں ہے۔ لیکن میں جنگل میں ذرا پست مقام پر اقامت گزیں تھا۔ سامنے کا کنارہ جو نصف میل دور اور باقی اطراف کی طرح جنگل سے ڈھکا ہوا تھا میرے لئے دور دراز افق تھا۔ جب میں پہلے ہفتہ میں تالاب پر نظر ڈالتا تھا تو مجھے وہ ایسی جھیل دکھائی دیتا تھا جو کسی پہاڑ کی بلندی پر واقع ہو اور جس کی تہہ باقی جھیلوں کی سطح سے زیادہ بلند ہو۔ جب سورج ڈوبتا تو تالاب کہرے والا شب خوابی کا لباس اتارنے لگتا اور یہاں وہاں اس کی ہلکی ہلکی موجیں اور چمکتی ہوئی ہموار سطح دکھائی دینے لگتی۔ ان بھوتوں کی طرح جو رات کے جلسے کے بعد دبے پاؤں منتشر ہو جاتے ہیں کہرا جنگل میں غائب ہو جاتا تھا۔ پہاڑوں کی اوس کی طرح یہاں کی شبنم بھی معمول سے زیادہ دیر تک درختوں پر پڑی رہتی تھی۔

جب اگست کی برسات کے ہلکے طوفانوں کے درمیانی وقفوں میں ہوا اور مینہ بند ہو جاتے۔ سطح ابر آلود رہتا اور وسط دو پہر میں شام کا سا سکون ہوتا اور جنگلی ترغہ جھوم جھوم کر گاتا تو اس کے نغمہ سے تالاب کے دونوں کنارے گونج اٹھتے اور یہ چھوٹی سی جھیل ایک بے بہا پر دوسن بن جاتی۔ اس وقت اس جھیل سے کوئی اور جھیل زیادہ پر سکون اور ہموار نہ ہوتی۔ گھٹا سے سطح آب کی صاف اور ہلکی ہوا کا تاریک ہو جاتا اور پانی میں مختلف عکسوں کا جھلملانا ایک ایسا منظر ہوتا ہے۔ جو جھیل کو آسمان سے زیادہ فردوس نظر بنا دیتا ہے ایک نزدیکی پہاڑی چوٹی سے جسے حال ہی میں جنگل کاٹ کر صاف کر دیا گیا ہے مغرب کی سمت تالاب کے اس پار ایک دلکش منظر ابھرتا ہے جو اس طرف کا ساحل بن جانے والی پہاڑیوں کی دراڑ میں سے نظر آتا ہے۔ چونکہ ان پہاڑوں کے آمنے سامنے کے دامن ڈھلوان ہیں اس لئے ایسا

بلوط کی جھاڑیوں سے ڈھکا ہوا اور کچھ یوں پھیلا ہوا تھا کہ اس کا دوسرا سرا منگولیا
گھاس کے میدانوں اور تتار کے لق و دق صحراؤں سے جا ملتا تھا۔ اس وسیع میدان
میں انسانی نسل کے تمام خانہ بدوش خاندانوں کے رہنے کے لیے کافی جگہ تھی۔
جب دمودر کو اپنے مویشیوں کے لیے نئی اور زیادہ وسیع چراگاہوں کی ضرورت
پڑی تو اس نے کہا "اس دنیا میں ان لوگوں سے زیادہ خوش نصیب کوئی نہیں
جو بے کنار فضاؤں سے آزادی سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔"
وقت اور مقام دونوں ہی بدل گئے تھے۔ اور میں دنیا کے ان حصوں
اور تاریخ کے ان ایام سے بہت دور ہو گیا تھا جو میرے لیے انتہائی دلکش تھے۔
میں جس دنیا میں رہتا تھا وہ عام طور سے اتنی ہی دور تھی جتنی وہ دنیا میں جن کا
ماہر نجوم راتوں کو نظارہ کرتے ہیں۔ ہماری عادت ہے کہ ہم ایسے نایاب اور کیف افزا
مقامات کا خواب دیکھتے رہتے ہیں جو ہر قسم کے شور و تذبذب سے دور فضائے
آسمانی سے کسی دور افتادہ گوشے میں، کہکشاں کے پس پشت ہوں۔ مجھے اس
بات کا پتہ چل گیا کہ میرے مکان کا محل وقوع اس کائنات کے دور افتادہ
دوامی اور پاکیزہ حصے میں ہے اگر تنہا یا الدبران الطائر (ستاروں کے نام) کے
قریبی حلقوں میں رہنا مفید ہے۔ تو میں حقیقتاً وہیں مقیم تھا۔ یعنی اپنے قریب ترین
پڑوسی کے لیے ان ہی ستاروں کی طرح شکریا تا سمٹتا اور ان جیسی نفیس روشنی کے
ساتھ ٹمٹماتا رہتا تھا جن کو وہ صرف ان راتوں ہی میں دیکھ سکتا ہے۔ جب چاند
نہیں نکلتا۔ تخلیق کائنات کے جس حصے پر میں نے دھرنا مارا تھا بالکل ایسا ہی تھا
"ایک گڈریا تھا اور
اس کے خیالات اتنے ہی بلند تھے۔
جتنے وہ پہاڑ جن پہ اس کے ریوڑ

ہر گھڑی اُس کے پاس چرتے رہتے تھے"۔

ہم اس چرواہے کے بارے میں کیا خیال کریں گے جس کے ریوڑ اُس کے
خیالات سے بھی زیادہ بلند چراگاہوں میں چرنے کے لئے چلے جائیں؟

مجھے یہ کہنے دیجئے ہر صبح میرے لئے یہ نوید مسرت لاتی تھی کہ اپنی زندگی
کو اتنی ہی سادہ بنائیں جتنی سادہ فطرت ہے۔ میں یونانیوں کی مانند صبح کی دیوی
آرورا کا پُر خلوص پجاری ہوں۔ میں صبح سویرے بیدار ہو جاتا اور تالاب میں
نہاتا۔ یہ دراصل ایک مذہبی ریاضت تھی اور میرا سب سے بہتر عمل بھی —
کہتے ہیں کہ بادشاہ چنگ تھانگ کے نہانے والے حوض پر یہ الفاظ کندہ تھے۔
"ہر روز مکمل طور سے اپنی تجدید کرو۔ بار بار تجدید کرو۔ ہمیشہ تجدید کرو!" میں
اس کا مطلب سمجھ سکتا ہوں۔ صبح پر شجاعت کارناموں کے عہد کا احیا کر دیتی
ہے۔ جب میں صبح کے دھندلکے میں دروازہ اور کھڑکیاں کھول کر بیٹھتا اور کوئی
مچھر بے سوچے سمجھے یا اپنے آپ کو ظاہر کئے بغیر کمرے میں منڈلانے لگتا تو اُس کی
ہلکی بھنبھناہٹ کا مجھ پر وہی اثر ہوتا جو بڑے سے بڑے کارناموں کا گیت سُننے
سے معلوم ہوتا ہے۔ مچھر کی یہ گنگناہٹ ہومر کا تصنیف کیا ہوا مرثیہ معلوم ہوتی
تھی یا ہوا میں اڑتی ہوئی ایلیڈ اور اوڈیسی جو اپنی آوارگیوں اور اپنے عتابوں کا
گیت گا رہی تھی۔ اس میں ایک طرح کی آفاقیت تھی۔ جب تک اس کی ممانعت
نہ کی جائے وہ اس بات کا کھلا اشتہار تھی کہ دنیا کی توانائی اور زرخیزی ابدی
اور دوامی ہے۔ صبح جو دن کا سب سے زیادہ یاد رکھنے والا وقت ہے۔
دراصل بیداری کی گھڑی ہے۔ اس وقت ہم پر نیم خوابی کی سی کیفیت طاری
نہیں ہوتی۔ کم سے کم ایک پل کے لئے ہمارا وہ حصہ بھی جاگ اٹھتا ہے جو شام
سحر سویا ہی رہتا ہے۔ اس دن سے اگر اسے واقعی دن کہا جائے ہم کیا توقع

رکھ سکتے ہیں۔ جس دن ہماری ذہانت بیدار نہیں ہوتی۔ بلکہ کوئی ملازم ہمیں مشین
کی سی بے دلی کے ساتھ جھنجھوڑ کر بیدار کر دیتا ہے۔ اس دن سے ہم کیا امید کر سکتے ہیں۔
جس دن ہماری نئی نئی حاصل کی ہوئی قوت اور ہمارے دل سے ابھرتے ہوئے حوصلے
بھی ہمیں نہیں جگاتے۔ صبح ہوتے ہی فیکٹری کی سیٹی کی بجائے آسمانی نغمہ کا زیر و
بم سنائی دیتا ہے۔ اور ہوا خوشبو سے لبریز ہوتی ہے۔ اور ہم بیدار ہو کر نیند
کی باقی زندگی سے بلند تر زندگی کی طرف بڑھتے ہیں اور اسطرح تاریکی اپنا ثمر پیدا کر کے
یہ ثابت کر دیتی ہے کہ وہ روشنی سے کم مفید نہیں جس شخص کو یہ یقین نہ ہو کہ ہر دن
میں ایک ایسی تازہ ترین، مقدس ترین اور قابل پرستش گھڑی ہوتی ہے جو اسے کبھی
نصیب نہیں ہوئی تو سمجھ لیجیے کہ وہ شخص زندگی سے مایوس ہو چکا ہے اور زوال
اور تاریکی کے راستے پر گامزن ہے۔ انسان کی ہوس کارانہ زندگی کے جز وقتی التوا کے بعد اسکی
روح یا اس کے اعضا ہر روز نئی قوت حاصل کرتے ہیں۔ اس کی ذہانت اس کی زندگی
کو بہتر بنانے کی دوبارہ کوشش کرتی ہے۔ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ تمام ناقابل فراموش
واقعات صبح کو یا صبح جیسے ماحول میں رونما ہوتے ہیں۔ ویدوں میں لکھا ہے "صبح
ہوتے ہی تمام ذہانتیں جاگ اٹھتی ہیں" شاعری اور آرٹ اور انسان کے سارے
نیک اور یادگار اعمال اسی گھڑی سے شروع ہوتے ہیں۔ میمنن کی طرح شاعر اور سورما
صبح کی دیوی ارورا کی اولاد ہیں اور طلوع آفتاب کے وقت اپنی راگنی چھیڑتے ہیں۔
جس شخص کے لچکدار اور توانا خیالات آفتاب کی رفتار کا ساتھ دیتے ہیں۔ اس کے
لئے دن ہمیشہ صبح ہے۔ اسے اس بات سے کوئی سروکار نہیں کہ گھڑی کیا وقت بتاتی ہے
انسانوں کے اطوار کیا ہیں۔ اور انسانوں کی محنت کیا خیر دیتی ہے۔ صبح وہی ہے جب میں
بیدار ہو جاؤں۔ اور خود میرے دل میں سحر کے آثار نمایاں ہو جائیں۔ اخلاقی سدھار نیند
سے جاگنے کی جدوجہد ہے۔ اگر انسان سوئے نہ رہیں تو اپنے دن کا حساب اس طرح

سے کیوں دیں؟ وہ حساب اور گنتی میں اتنے کمزور تو نہیں ہیں۔ اگر اُن پر غنودگی طاری نہ ہوتی تو وہ یقیناً کچھ نہ کچھ کر دکھاتے۔ کروڑوں انسان صرف اتنی دیر جاگتے ہیں جتنی دیر ان کو محنت کرنی ہو۔ لیکن کروڑوں میں صرف ایک شخص کوئی مفید دماغی یا الوہیت کی زندگی بسر کرنے کے لئے جاگتے ہیں۔ بیداری کا نام ہی زندگی ہے۔ مجھے ابھی تک کوئی ایسا شخص نہیں ملا جو پوری طرح بیدار ہو۔ اس لئے میری نظر اس کے چہرے پر ٹھہرے تو کیسے ٹھہرے؟

ہمیں نیند سے بیدار ہونا سیکھنا چاہیئے اور اپنے آپ کو کسی میکانکی ذریعہ سے نہیں بلکہ طلوعِ سحر کی لامحدود توقع سے جو سوتے ہوئے بھی ہمارا دامن نہیں چھوڑتی مجھے اس بات سے زیادہ حوصلہ افزا کوئی اور بات معلوم نہیں ہے کہ انسان میں سمجھ بوجھ سے کام لے کر اپنی زندگی کو بہتر بنانے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ تصویر میں خاص رنگ بھرنے یا مجسمہ تراشنے اور اس طرح بعض چیزوں کو حسین بنانے میں خوبی ضرور ہے لیکن جس ماحول میں ہم سانس لیتے ہیں اور جس کی وساطت سے ہم دنیا کو دیکھتے ہیں۔ اس میں رنگ بھرنا اور اس کی نوک پلک سنوارنا زیادہ عظیم الشان خوبی ہے یہ کام ہم اخلاقی طور سے انجام دے سکتے ہیں۔ دن کی قدر و قیمت بڑھانا ہی سب سے بڑا فن ہے۔ ہر شخص کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی زندگی کو اس کی تمام جزئیات سمیت ذہنی لحاظ سے بہتر بنا کر اہم ترین ساعت کے قابل بنائے۔ ہمیں جو نامکمل اور حقیر سی معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ اگر ہم انہیں تسلیم نہ کریں یا انہیں استعمال کر کے ختم کر دیں تو وحی آسمانی صاف الفاظ میں ہمیں بتلائے گی کہ ہمیں اس سلسلے میں کیا کرنا ہوگا۔

میں جنگل میں اس لئے گیا تھا کہ وہاں بھرپور زندگی بسر کرنا چاہتا تھا۔ میں زندگی کے تمام ضروری حقائق کا سامنا کر کے یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ میں وہ سبق حاصل کر سکتا ہوں یا نہیں جو زندگی مجھے سکھانا چاہتی ہے۔ میں جنگل میں اس لئے نہیں گیا تھا کہ جب

میں مرنے لگوں تو مجھے اس بات کا پتہ چلے کہ میں نے زندگی کو زندگی کی طرح بسر نہیں کیا۔ میں وہ زندگی بسر نہیں کرنا چاہتا تھا جو دراصل زندگی نہیں ہے۔ زندگی بیش بہا ہے میں وہاں تیاگ کے فلسفہ پہ عمل کرنے کے لئے بھی نہیں گیا تھا بشرطیکہ وہ ضروری نہ ہو جاتا۔ میں بھرپور زندگی بسر کرنا چاہتا تھا اور زندگی کی ہڈیوں کا سارا گودا چوس لینا چاہتا تھا۔ میں اسپارٹا کے باشندوں کی طرح ایسی جبری زندگی بسر کرنا چاہتا تھا جس سے وہ تمام چیزیں جو اصل میں زندگی نہیں ہے سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑی ہوں۔ اور اگر زندگی ذلیل ثابت ہو تو اس کا جھاڑ جھنکار دور کر کے اسے ایک کونے میں بند کر دوں۔ اور اس کو پست ترین سطح پہ رکھ دوں۔ اگر زندگی کمینی اور ذلیل ثابت ہو تو اسے قبول نہ کرتے ہوئے دنیا میں اس کی تشہیر کروں۔ اگر زندگی پاکیزہ ثابت ہو تو اسے تجربہ سے پہچانوں۔ اور اپنے اگلے سیاحت نامہ میں اس کا صحیح صحیح حال بیان کروں۔ مجھے ایسا دکھائی دیتا ہے کہ بیشتر انسان اس تذبذب میں ہیں کہ زندگی خدا کی تخلیق ہے یا شیطان کی۔ اس لئے انہوں نے ذرا عجلت سے کام لے کر یہ نتیجہ اخذ کر لیا ہے کہ انسان کا اہم مقصدِ حیات یہ ہے کہ وہ خدا کی عظمت کے گیت گائے اور ہمیشہ اس سے فیضیاب ہوتا ہے۔

ہم ابھی تک چیونٹیوں کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں۔ اگرچہ حکایت یہ بتاتی ہے کہ ہمیں انسانی صورت اختیار کئے ہوئے ایک مدت ہو چکی ہے۔ ہم بالشتیوں کی طرح بگلوں سے لڑتے ہیں۔ ہم سے غلطی پہ غلطی ہو رہی ہے۔ اور سکے پہ ٹکہ پڑ رہا ہے۔ ہماری سب سے بڑی نیکی بھی بعض مواقع پہ غیر ضروری اور غیر لازمی اور بے چارگی ہوتی ہے۔ ہماری زندگی بے معنی جزئیات میں صرف ہو جاتی ہے۔ ایک ایماندار آدمی کو اپنی دس انگلیوں سے زائد گنتی کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ یا انتہائی خاص مواقع پہ وہ گنتی کے لئے اپنے پیروں کی انگلیاں بھی شامل کر سکتا ہے۔ اور باقی گنتی کو

ردی کی ٹوکری میں ڈال سکتا ہے۔ سادگی! سادگی! سادگی! میں آپ سے یہ عرض کروں گا کہ آپ اپنے معاملات کو صرف دو یا تین کی حد میں رہنے دیجئے۔ سینکڑوں اور ہزاروں کی حد میں نہیں۔ اس گنتی کو دس لاکھ کی بجائے صرف آدھ درجن ہی رہنے دیجئے تاکہ آپ اپنا حساب اپنی انگلیوں پہ گن کر کر سکیں۔ اس مہذب زندگی کے متلاطم سمندر میں ایسے بادل، ایسے طوفان، ایسے ریگ زار اور ایسے ہزاروں مصائب ہیں کہ اگر انسان غلط حساب سے ٹپ ل کر گرنا نہیں چاہتا، غرق نہیں ہونا چاہتا اور دریا کی تہہ میں بیٹھنا نہیں چاہتا تو اسے گنتی میں دن گن گن کر زندگی بسر کرنی ہی ہوگی۔ کوئی عظیم ماہر ریاضی ہی اس گنتی میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ لہٰذا زندگی کو سادہ بنائیے اگر ممکن ہو تو دن میں تین چار بار کھانے کی بجائے ایک ہی بار کھائیے۔ سو اقسام کی غذائیں کھانے کی بجائے صرف پانچ اقسام کی غذائیں کھائیے۔ اسی تناسب سے دوسری ضروریاتِ زندگی میں کمی کر دیجئے۔ ہم اپنی زندگی کی مثال جرمن ریاستوں کے اتحاد کی صورت میں دے سکتے ہیں۔ اس اتحاد میں چھوٹی چھوٹی ریاستیں شامل ہیں اور اُن کی سرحدیں بڑی تیزی سے بدلتی رہتی ہیں۔ کوئی جرمن یہ نہیں بتا سکتا کہ جس ریاست میں وہ رہتا ہے اُس کی صحیح سرحد کیا ہوگی۔ یہ ملک بھی جس نے کئی نام نہاد ترقیاں کی ہیں (اور میں آپ کو بتا دوں کہ یہ ترقیاں محض مصنوعی اور نمائشی ہیں) ایک غیر منظم اور بے قاعدگی سے پھیلا ہوا ادارہ بن گیا ہے۔ اس میں الم غلم فرنیچر پڑا ہے۔ اور وہ اپنے ہی پھیلائے ہوئے جال میں پھنس کر گر رہا ہے۔ جس طرح دیگر لاکھوں گھر برباد ہو چکے ہیں اُسی طرح یہ ملک بھی عیش و عشرت اور مصارفِ بیجا کے باعث اور کفایت شعاری اور بلند مقصدیت کے فقدان کی وجہ سے تباہ ہو رہا ہے۔ اس کا صرف ایک ہی مداوا ہے کہ کفایت شعاری سے کام لیا جائے، اسپارٹا کے باشندوں جیسی سخت اور سادہ زندگی بسر

کی جائے اور ارفع و اعلیٰ مقصد پیشِ نظر رکھا جائے۔ ملک بہت عیاش ہو گیا ہے
لوگوں نے یہ تہیہ کر رکھا ہے کہ قوم کا تجارت کرنا برف برآمد کرنا تار کے ذریعہ باتیں
کیا کرتا ہے۔ بالخصوص و نظر تیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سفر کرنا بہت ضروری
ہے۔ لوگ چاہتے ہیں خود یہ سب کچھ نہ کریں بلکہ چاہتے ہیں کہ قوم یہ ساری باتیں
کرے۔ البتہ اس بات کا ابھی فیصلہ نہیں ہوا ہے کہ ہم بندروں کی طرح رہیں گے
یا انسانوں کی طرح زندگی بسر کریں گے۔ اگر ہم شب و روز محنت کر کے ریل کی پٹڑیاں
نہ ڈھالیں اور ان کو بچھانے کے لیے سلیپر تیار نہ کریں۔ اور رات دن اس کام میں
جُٹے نہ رہیں اور محض اپنی زندگی کی ٹوٹ پھوٹ درست کرکے گھر ہی بیٹھے
رہیں تو یہ ریل کی پٹڑیاں کیسے بنیں گی؟ اور اگر ریل کی پٹڑیاں نہ بنیں تو کیونکر ہم صحیح
وقت پر جنت میں کیسے پہنچیں گے؟ لیکن اگر ہم اپنے گھروں میں بیٹھے کام کرتے رہیں۔
تو ان ریلوں کی ضرورت ہی کیا ہے؟ ہم ریل پر سوار نہیں ہیں بلکہ ریل ہم پر سوار ہے
کیا آپ نے کبھی یہ سوچا ہے کہ ریل کی پٹڑیوں کے نیچے جو سلیپر ہوتے ہیں۔ وہ حقیقتاً
کیا ہیں؟ ہر سلیپر ایک انسان ہے آئرلینڈ یا امریکہ کا باشندہ ہے۔ یہ پٹڑیاں ان
پر بچھی ہوتی ہیں وہ ریت سے ڈھکے ہوتے ہیں۔ ریل گاڑیاں ان پر چلتی ہیں۔ میں
آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ لوگ گراں خواب ہیں۔ ہر چند برس کے بعد نئے سلیپر بچھا
دیئے گئے ہیں۔ اسی طرح پامال ہوتے رہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بعض لوگوں
کو اگر ریل پر سوار ہونے کی مسرت میسر آتی ہے تو دوسروں کو اپنے اوپر ان لوگوں
کو سوار کرنے کی بدنصیبی ملتی ہے۔ جب وہ کسی ایسے شخص کو کچل کر رکھ دیتے ہیں۔
جو سوتے میں چل رہا ہوتا ہے یعنی کسی ایسے سلیپر کو جو اپنے ٹھکانے پر نہیں رکھا ہوتا
اور فاضل ہو جاتا ہے تو وہ اپنی گاڑیاں اچانک روک لیتے ہیں۔ اور اس کے متعلق اتنا
ہنگامہ بپا کرتے ہیں۔ جیسے یہ حادثہ کوئی خاص حادثہ ہو۔ مجھے یہ جان کر بہت

خوشی ہوتی ہے کہ ہر پانچ میل کے فاصلہ پر مزدوروں کی ایک ٹولی موجود رہتی ہے تاکہ وہ ان بچھے ہوئے سلیپروں کو اپنی اپنی جگہ پر ہموار رکھے۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ سونے والے شاید دوبارہ اُٹھ بیٹھیں۔

آخر ہم اتنی عُجلت سے کام کیوں لیتے ہیں۔ اور اپنی زندگی برباد کیوں کرتے ہیں؟ ہم نے شاید یہ ارادہ کر رکھا ہے۔ کہ ہم بھوک لگنے سے پہلے بھوکوں مر جائیں گے۔ لوگ کہتے ہیں کہ بروقت ایک پیوند لگانے سے نو پیوند لگانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اس لئے وہ تمام ہزاروں پیوند آج ہی لگا دیتے ہیں۔ تاکہ کل لاکھوں پیوند نہ لگانے پڑیں۔ جہاں تک کام کا تعلق ہے۔ ہمارے پاس کوئی اہم کام نہیں ہے۔ ہمیں لرزہ ہو گیا ہے۔ شاید اسی لئے ہم اپنا سر ہلانے سے باز نہیں رہ سکتے۔ اگر ہم کلیسا کے گھنٹے کی رسی کو دو چار جھٹکے دیں۔ جیسے آگ لگنے کے وقت گھنٹی بجائی جاتی ہے تو کنکارڈ کے مضافات میں کھیت پر شاید ہی کوئی ایسا کسان نکلے (یعنی وہ کسان بھی جو آج صبح بات بات پر اپنی مصروفیت کا بہانہ کر رہا تھا) یا ایک بھی ایسا لڑکا یا ایک بھی ایسی عورت نکلے گی جو اپنا اپنا کام چھوڑ کر اس آواز پر نہ دوڑ پڑے۔۔ یہ ساری بھاگ دوڑ اس لئے نہ ہو گی۔ کہ عمارت کو نذر آتش ہونے سے بچایا جائے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ان کا اصل مقصد یہ ہو گا کہ وہ عمارت کے جل کر خاکستر ہو جانے کا تماشہ دیکھیں۔ کیونکہ اس عمارت کو تو جلنا ہی ہے۔ اور ہر شخص کو معلوم ہے کہ اس نے یہ آگ نہیں لگائی یا اگر جلنے کا تماشہ نہیں دیکھیں گے۔ تو وہ آگ کے بجھائے جانے کے منظر سے لطف اندوز ہوں گے۔ اور اگر مالکوں کو کالا کئے بغیر آگ بجھائی جا سکتی ہو گی تو وہ اس کام میں تھوڑا بہت ہاتھ بٹائیں گے۔ چاہے وہ جلنے والی عمارت کلیسا ہی کیوں نہ ہو۔ شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو گا جو کھانے کے بعد نصف گھنٹہ کے قیلولہ کے بعد جاگنے پر یہ نہ پوچھتا ہو "کہو کیا خبر ہے" گویا جیسے

وہ سو رہا تھا تو ساری دُنیا اس کے لئے پہرہ دے رہی تھی۔ شاید اس بات کو مدِنظر رکھتے ہوئے بعض لوگ یہ ہدایت کرتے ہیں۔ کہ ان کو آدھ گھنٹہ کے بعد اُٹھا دیا جائے۔ اس میں ذرہ بھر شک نہیں کہ خبر دریافت کرنے کے سوا ان کا اور کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ اور وہ اس خدمت کا صلہ یہ دیتے ہیں کہ اپنے خواب بیان کرنے لگتے ہیں۔ رات بھر کی نیند کے بعد تو خبر اتنی ضروری اور لازمی ہو جاتی ہے جتنا ناشتہ۔ "براہ کرم کوئی نیا واقعہ سنائیے جو اس دُنیا میں کسی شخص کو پیش آیا ہے؟" اور وہ اپنے ٹوسٹ کھاتا اور کافی پیتے ہوئے یہ خبر پڑھتا ہے "واچیٹو دریا پر آج صبح ایک شخص کی آنکھیں نکال دی گئیں!" اور پڑھنے والے کو یہ علم نہیں ہوتا کہ وہ خود دُنیا کے اتھاہ اور تاریک غار میں رہتا ہے۔ اس کے چہرے پر آنکھیں نہیں ہیں۔ بلکہ آنکھوں کے ابتدائی نشان ہیں۔

جہاں تک میرا سوال ہے میں بڑی آسانی سے کسی ڈاک خانہ کے بغیر گذر بسر کر سکتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ ڈاک خانہ کے ذریعہ شاذونادر ہی کوئی اہم اطلاع ارسال کی جاتی ہے۔ جیسا میں دو تین برس پہلے لکھ چکا ہوں۔ اگر ناقدانہ نگاہ سے دیکھا جائے تو مجھے اپنی ساری زندگی میں ایک دو سے زائد ایسے خطوط نہیں ملے ہیں۔ جن کی قدر و قیمت اُن کے ڈاک خرچ کے برابر بھی ہو۔ ایک پیسے میں ایک خط دراصل ایک ایسا ادارہ ہے جس کے ذریعہ آپ ایک پیسہ ایک شخص کے ایسے خیالات کے لئے پیش کرتے ہیں۔ جو صرف مذاحیہ انداز میں بیان کئے جاتے ہیں۔ مجھے یقین کامل ہے کہ میں نے کبھی کسی اخبار میں کوئی ناقابلِ فراموش خبر نہیں پڑھی اگر ہم ایک بار یہ پڑھتے ہیں کہ کسی شخص کو لوٹ لیا گیا یا اُسے ہلاک کر دیا گیا یا وہ کسی حادثہ کا شکار ہو گیا یا یہ کہ ایک مکان جل کر راکھ ہو گیا یا یہ کہ ایک جہاز تباہ ہو گیا یا یہ کہ دُخانی کشتی بھک سے اڑ گئی یا کوئی گائے مغربی ریل گاڑی کے نیچے آ کر کٹ گئی یا یہ کہ ایک پاگل کتا مار ڈالا گیا یا یہ کہ سردیوں میں پتنگوں کا ایک ہجوم ختم ہو گیا تو ہمیں ایسی دوسری خبریں پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ ایسی ایک ہی خبر کافی ہوتی ہے۔ اگر آپ ایک اصول یا قاعدہ جانتے

ہیں تو پھر آپ کو اس کی لاکھوں مثالوں اور اس کے لاکھوں اطلاقوں کی کیا ضرورت ہے؟
ایک فلسفی کے نزدیک وہ تمام باتیں جن کو خبر کہا جاتا ہے محض گپیں ہیں اور اُن خبروں کے
مدیر اور قاری ایسی بوڑھیاں ہیں جو چائے پیتے وقت اس قسم کی گپیں ہانکتی ہیں۔ پھر
بھی ان گپوں کے لوبھیوں کی تعداد کچھ کم نہیں ہے۔ میں نے سُنا ہے کہ تھوڑے دن ہوئے
ایک دفتر کے آگے تازہ خبر سُننے کے لئے لوگوں کا اتنا بھاری ہجوم جمع ہو گیا کہ اُن کے دباؤ
سے اُس دفتر کے متعدد بڑے بڑے شیشے ٹوٹ گئے۔ اور وہ خبریں کچھ ایسی تھیں کہ میں اُن کے
متعلق بڑی سنجیدگی سے کہہ سکتا ہوں کہ کوئی ذہین شخص بارہ مہینے یا بارہ برس پہلے ہی بڑی
صحت اور درستی کے ساتھ دیکھ سکتا تھا۔ اسپین کی مثال لیجئے اگر آپ یہ جانتے ہیں تو صحیح تناسب
سے وقتاً فوقتاً ڈان کارلو اور انفینٹا کا اور ڈان پیڈرو، سیویل اور گرناڈا کا ذکر کیجئے
عین ممکن ہے کہ میں نے جو اخبارات پڑھے تھے ان کے بعد یہ نام کچھ تبدیل ہو گئے ہوں۔
لیکن آپ پرواہ نہ کیجئے۔ اگر کوئی دوسری تفریح لے اڑ ہو چکی ہے تو سانڈوں کی رُوداد لکھ دیجئے
میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اسپین کے متعلق یہ حرف بحرف صحیح خبر ہو گی اور ہمیں اس
بات کا صحیح اندازہ ہو جائے گا کہ وہاں کیا صورتِ حال ہے اور بربادیوں کا کیا عالم ہے۔ اور
یہ اندازے ان اندازوں سے ملتے جلتے ہوں گے جو اخبارات کی سرخیوں کے تحت ہمیں
مختصر اور واضح طور پہ دستیاب ہوتے ہیں رہا انگلستان کا معاملہ تو وہاں سے جو آخری اور
اہم خبر موصول ہوئی تھی وہ ۱۶۴۹ء کے انقلاب سے متعلق تھی۔ اور اگر آپ نے انگلستان
کے کسی اوسط درجہ کے سال کی فصلوں کی تاریخ پڑھی ہے تو آپ کو دوبارہ اس کے
مطالعہ کی ضرورت نہیں بشرطیکہ آپ محض مالی سٹہ نہ لگاتے ہوں۔ اگر ایک ایسے شخص
کی رائے تسلیم کر لی جائے جو بہت کم اخبار پڑھتا ہے تو وہ رائے یہ ہے کہ غیر ممالک
میں کبھی کوئی نئی بات نہیں ہوتی اور انقلاب فرانس بھی اس رائے سے مستثنیٰ نہیں ہے۔
کیسی کیسی خبریں ہوتی ہیں! جو خبریں کبھی پرانی نہیں ہوتیں ان کو جاننا زیادہ اہم

ہے - کیو ہے - لو دوے ریاست کی ایک مشہور شخصیت) نے ایک شخص کو کھونگ
سیو کے پاس اُس کا حال جاننے کے لئے بھیجا۔ کھونگ سیو نے قاصد کو اپنے پاس
بٹھا لیا۔ اور ان الفاظ میں اُس سے سوال کیا "تمہارا آقا کیا کر رہا ہے؟" قاصد نے بصد
احترام جواب دیا "میرا آقا اپنی غلطیوں کو گھٹانا چاہتا ہے لیکن غلطیاں کسی طرح ختم ہی
ہونے میں نہیں آتیں۔" جب وہ قاصد چلا گیا تو فلسفی نے کہا۔ "یہ کتنا ذہین اور قابل
قاصد تھا - کتنا زیرک ایلچی تھا - ہفتہ کے آخر میں کسانوں کو ایک دن آرام کا ملتا ہے
اتوار بُری طرح گزرتے ہوئے ہفتہ کا ایک اچھا انجام ہوتا ہے - ایک نئے ہفتہ کی آمد اور
ہمت افزا ثابت نہیں ہوتی۔ اُس دن عیسائیت کے مبلغ کو چاہیے کہ وہ اپنے لٹکرانے
وعظ سے اکتائے ہوئے کسانوں کے کان کھانے کی بجائے گرجے کی ہری آرام میں کر کے
کر کے بند رکھو۔ بہرحال آخر اس بظاہر سُست رفتاری کا کیا مطلب ہے جو حقیقت میں
انتہائی سُست رفتاری کے مترادف ہے؟"

بناوٹوں اور وسوسوں کو سب سے بڑی صداقت تسلیم کر لیا جاتا ہے اور حقیقت
کو حکایت مانا جاتا ہے۔ اگر لوگ لگاتار حقیقتوں پر نگاہ رکھیں اور اپنے آپ کو توہمات
کا شکار نہ ہونے دیں تو زندگی اگر ہم اُن چیزوں کی مثال دیں، جن کا ہمیں علم ہے
پریوں کی داستان اور الف لیلہ کی تصویر کی کہانی ہو جائے گی۔ اگر ہم اُن چیزوں
کی عزت کریں جو ناگزیر ہیں اور جن کا وجود لازمی بھی ہے تو ہمارے گھروں میں موسیقی
اور شاعری گونج اُٹھے۔ یعنی جب کوئی جلدی نہیں ہوتی اور ہم عقلمندی سے کام لیتے
ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ صرف عظیم ترین اور قابل قدر چیزیں ہی مستقل اور قطعی وجود رکھتی ہیں
اور چھوٹے چھوٹے خوف اور چھوٹے چھوٹے عیش حقیقت کے صرف سائے ہیں۔ حقیقت
کیف افزا اور رفعت پرور ہے۔ انسان آنکھیں بند کر کے سویا رہنے اور دھوکوں سے
فریب کھاتے رہنے پر رضامند ہو جانے سے ہر جگہ اپنی عادت کے زیر اثر روزمرہ زندگی

کو برقرار رکھتا ہے اور اُسے مُستحکم بناتا ہے حالانکہ یہ زندگی اس وقت بھی پُر فریب بنیادوں
پر کھڑی ہوتی ہے۔ بچے جو زندگی کی نقل اتارنے کا کھیل کھیلتے ہیں ایسے بزرگوں سے زیادہ
واضح طور پر زندگی کے حقیقی اصولوں اور تعلقات کو بھانپ لیتے ہیں۔ بزرگ زندگی کو اسکے
شایان شان طور پر بسر کرنا جانتے ہی نہیں۔ بزرگوں کو خیال ہوتا ہے کہ تجربے نے انہیں
زیادہ عقلمند بنا دیا ہے حالانکہ ان کا تجربہ محض ناکامیوں کا تجربہ ہوتا ہے۔ میں نے ہندوؤں
کی ایک کتاب میں پڑھا ہے "کہ ایک بادشاہ کے بیٹے کو بچپن میں ہی شہر بدر کر دیا گیا۔
اس کو ایک جنگلی انسان نے پالا۔ جب وہ بڑا ہو گیا تو یہ سمجھنے لگا کہ وہ جنگلی باشندوں کی
قوم میں سے ہے۔ اس کے باپ کے وزیروں میں سے ایک وزیر نے اسے ڈھونڈ
نکالا اور اُسے یہ بتایا کہ وہ راجہ کا بیٹا ہے۔ اس طرح اُسے اپنی ذات پات کے متعلق
جو غلط فہمی تھی وہ دور ہو گئی۔ اور وہ جان گیا کہ وہ ایک شہزادہ ہے۔" ہندو فلسفی
اپنے بیان کو جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے۔ "اس طرح روح جس ماحول میں رکھ دی جاتی
ہے غلطی سے اُس ماحول کو اپنا ماحول تصور کرنے لگتی ہے۔ بالآخر کوئی مقدس گرو اُسے
اصل حقیقت سے آگاہ کر دیتا ہے۔ پھر جا کر اُسے معلوم ہوتا ہے کہ وہی برہما ہے۔"
میں دیکھ رہا ہوں کہ ہم نیو انگلینڈ کے باشندے [illegible] حقیر زندگی محض اس لئے بسر کرتے
ہیں کہ ہماری آنکھیں اشیا کی سطح دیکھتی ہیں اور اُن کی تہ تک نہیں پہنچتی ہیں۔ ہم سمجھتے
ہیں کہ ہم جو کچھ ظاہر طور پر دیکھتے ہیں وہی حقیقت ہے۔ اگر کوئی شخص اس قصبے میں سے
گزرے اور صرف حقیقت کو دیکھے تو آپ ہی کہئے کہ وہ 'مل ڈیم' [illegible] کہاں جائے گا۔ اس قصبے میں
جو حقائق نظر آئیں گے اگر وہ ان کو ہم سے بیان کرے تو ہم اس کے بیان سے اپنی اس جگہ کو پہچان
نہیں سکیں گے۔ آپ اپنی جلسہ گاہ، عدالت گاہ، [illegible] یا دوکان یا مکان پر نظر ڈالئے اور یہ بتلائیے
کہ سچی آنکھ ان پر حقیقتاً کیا دیکھتی ہے؟ اگر آپ حقیقت بیان کریں تو یہ ساری چیزیں ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں
انسان [illegible] حقیقت کی عزت کرتا ہے جو اس سے بہت دور ہو یعنی جو اس نظام عالم کے اس پار

ہو اَور سب سے دُور ستارے کے پیچھے ہو۔ وہ حقیقت جو آدم سے پہلے بھی اَور آخری انساں کے بعد ہو گی۔ ابدیت میں واقعی کچھ حقیقت اَور رفعت ہے۔ لیکن یہ تمام اوقات مقامات اور واقعات عارضی اَور ہنگامی ہیں۔ خدا اپنی قوت اَور جاہ و جلال کے ساتھ حال ہی میں موجود رہتا ہے اَور تمام زمانوں کے گذر جانے کے بعد بھی اس کی الوہیت پر ذرا بھی اضافہ نہیں ہونے پائے گا۔ ہم میں بلند ترین اَور عظیم الشان چیز کو پہچاننے کی صلاحیت اپنے گرد و پیش کی حقیقتوں کو قطرہ قطرہ جذب کرتے رہنے اَور اُن کو پی کر سرشار ہو جانے سے ہی پیدا ہو سکتی ہے۔ یہ کائنات بڑی فرماں برداری سے ہمارے تصورات کا مسلسل خیر مقدم کرتی ہے۔

ہم چاہے برق رفتاری سے یا سُست رفتاری سے سفر کریں ہمارا راستہ پہلے ہی سے مقرر کر دیا گیا ہے۔ اس لئے ہمیں اپنا وقت غور و فکر میں صرف کرنا چاہیئے۔ آج تک کسی شاعر یا مصور نے کوئی ایسا نادر الوجود اَور حسین تخیل پیش نہیں کیا۔ جو اس کے آباؤ اجداد نے عملاً نہ کر دکھایا ہو۔

آیئے ہم ایک دِن ارادتاً قدرت کی طرح بسر کریں۔ اَور محض اخروٹ کے چھلکے یا مچھر کے پر کے باعث جو ریل کی پٹڑی پر گر پڑتا ہے اپنے راستہ سے نہ بھٹکیں۔ آیئے ہم صبح سویرے بیدار ہوں۔ برت رکھیں یا ناشتہ کریں لیکن دھیرے دھیرے کسی قسم کی پریشانی کے بغیر۔ لوگ آئیں یا جائیں۔ گھنٹیاں بجیں یا بچے روئیں ہم یہ تہیہ کئے ہوئے بیٹھیں رہیں کہ آج کا دِن ہم اپنی مرضی کے مطابق بسر کریں گے۔ ہم ہاتھ پاؤں مارنا کیوں چھوڑ دیں اَور ندی کے بہاؤ کے رُخ کیوں بہنے لگیں۔ اُس خطرناک تیز دھارے اَور بھنور میں پھنسنے اَور ڈوبنے کی ضرورت نہیں۔ جسے صبح کا کھانا کہا جاتا ہے اَور جس کا مقام یا باب نصف النہار ہے۔ آپ اس خطرے سے گزر جائیں گے تو صحیح سلامت رہیں گے۔ اس لئے کہ باقی راستہ ڈھلوان ہے۔ آپ پورا زور لگا کر اَور صبح کی مکمل تازگی سے کام لیتے

ہوئے مستول سے بندھے ہوئے یولیسس کی طرح منہ پھیر کر اپنی کشتی ان کے قریب
سے لے کر آگے بڑھ جائیے۔ اگر انجن سیٹی دیتا ہے تو دینے دیجیے۔ اس کا گلا چیخ چیخ
کر خود ہی بیٹھ جائے گا۔ اگر گھنٹی بجتی ہے تو بجنے دیجیے۔ ہم کیوں دوڑیں؟
ہم اس بات پر کیوں نہ غور کریں کہ اس کی آواز راگ سے ملتی جلتی ہے۔ آئیے۔
ہم باقاعدہ جم کر کام کریں۔ آئیے ہم رائے عامہ، تعصب، روایت، توہم اور
ظاہرداری کے کیچڑ اور پیرس، لنڈن، نیو یارک، بوسٹن، کنکارڈ، کلیسا، امور حکومت
شعر و شاعری اور فلسفہ و مذہب بلکہ ساری دنیا پر جمی ہوئی سڑاند بھری کھاد کا
حصار توڑ کر اپنے قدم اس سخت اور سنگریلی بنیاد پر جمائیں جسے حقیقت کہتے
ہیں اور پھر بلند آواز سے کہیں۔ "ہاں یہی حقیقت ہے اور اس میں کوئی نقص نہیں
ہے!" اس نقطۂ آغاز کے مل جانے کے بعد ہم پانی کے تیز بہاؤ، جاڑے اور آگ کے
نیچے ایک ایسی جگہ تلاش کریں جہاں ایک دیوار یا ریاست قائم کی جا سکتی ہے یا بڑی
حفاظت کے ساتھ لیمپ کا کھمبا، ایک پیمانہ نیل پیما نہیں بلکہ حقیقت پیما نصب
کیا جا سکتا ہے تاکہ آنے والے زمانوں کو اس بات کا پتہ چل جائے کہ اتنی مدت میں
وقتاً فوقتاً بناوٹوں اور ظاہرداریوں کا کتنا گہرا پانی جمع ہو گیا تھا۔ اگر آپ کسی حقیقت
کو آمنے سامنے کھڑے ہو کر دیکھیں گے تو آپ کو اس حقیقت کے دونوں رخوں پر سورج
یوں جھلکتا ہوا نظر آئے گا جیسے وہ روشنی کا پیمانہ ہو۔ اس کا ایک کیف آفریں اور
شیریں دھارا آپ کی رگ پٹھے سے گذر جائے گی۔ عین ممکن ہے کہ آپ اپنی اس فانی
زندگی کو بصد مسرت بنادیں۔ زندگی ہو یا موت ہم حقیقت کے خواہاں ہیں۔ اگر ہم واقعی مر رہے
ہیں تو ہمیں حلق میں اٹکنے والی خرخراہٹ سننی اور انتہائی سردی محسوس کرنی
چاہیے۔ اگر ہم زندہ ہیں تو ہمیں اپنے اپنے کام میں جٹ جانا چاہیے۔

وقت صرف وہ ندی ہے جہاں میں مچھلیاں پکڑنے جاتا ہوں۔ اور جب

میں اس ندی کا پانی پیتا ہوں اور مجھے پتہ چل جاتا ہے کہ وہ ندی کس قدر پایاب ہے۔ اس کا مہین دھارا بہتا چلا جاتا ہے لیکن ابدیت قائم رہتی ہے۔ میں اس کا پانی جی بھر کر پیتا ہوں اور آسمان میں مچھلیوں کا شکار کھیلنا چاہتا ہوں، کیونکہ آسمان کی تہہ میں کنکر اور پتھر یعنی ستارے ہیں۔ میں ایک تک نہیں گن سکتا۔ میں ابجد کا پہلا حروف بھی نہیں جانتا۔ مجھے ہمیشہ اس بات کا افسوس رہا ہے کہ میں اتنا عقلمند کیوں نہیں ہوں جتنا اپنی پیدائش کے وقت تھا۔ ذہن ایک چھرا ہے جو اشیا کے ظاہر کو کاٹتا ہوا ان کے اصل بھید تک پہنچ جاتا ہے۔ میں اپنے کو صرف اس حد تک مصروف رکھنا چاہتا ہوں جس حد تک انہیں مصروف رکھنے کی مجھے ضرورت ہے۔ میرا سر، میرا ہاتھ اور میرا پاؤں ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ میری تمام صلاحیتیں سکڑ کر اس میں جذب ہو گئی ہیں۔ میری جبلت مجھے بتاتی ہے کہ جس طرح بعض جانور اپنی تھوتھنی یا اپنے اگلے پنجوں سے بل کھودتے ہیں بالکل اسی طرح میرا سر بھی بل کھودتا ہے۔ اور اس سر سے میں پہاڑیوں میں بل کھودتا ہوا ان کے اس پار نکل جاؤں گا۔ میرا خیال ہے کہ بیش قیمت شریانیں کہیں میرے آس پاس ہیں۔ معدنیات کا پتہ چلانے والی چھڑی اور اٹھتے ہوئے ہلکے ہلکے بخارات مجھے اس نتیجہ پر پہنچاتے ہیں کہ یہیں سے مجھے اپنی کان کنی شروع کرنی پڑے گی۔
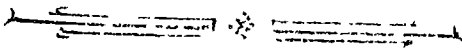
مُطالعہ

اگر انسان اپنے مشاغل کے انتخاب میں زیادہ غور و فکر سے کام لیں تو سارے انسان غالباً ناگزیر طور پر طالب علم اور مشاہدین بن جائیں۔ کیونکہ اُن کی فطرت اور اُن کے مقدر میں سب ایک جیسی دلچسپی رکھتے ہیں۔ ہم اپنے یا اپنی اولاد کے لئے مال و دولت جمع کر کے ایک خاندان یا ریاست قائم کر کے حتیٰ کہ شہرت حاصل کر کے بھی فانی رہتے ہیں لیکن جب ہم حقیقت کی تلاش کرتے ہیں تو غیر فانی ہو جاتے ہیں۔ ہمیں نہ تغیر کا کوئی خطرہ رہتا ہے نہ کسی حادثہ کا۔ سب سے قدیم مصری یا ہندو فلاسفی نے الوہیت کے مجسمہ پر سے نقاب کا ایک گوشہ اُٹھا دیا تھا اور ابھی تک وہ کپکپاتا ہوا پردہ اُٹھا ہوا ہے۔ اور میں اس کی طرح اس عظمت و جلال کا نظارہ کر رہا ہوں۔ جو اُس نے دیکھا تھا کیونکہ اس کے اندر میں ہی تھا جس نے نقاب کشائی کی جرأت کی تھی اور وہ میرے اندر ہے جو عظمت و جلال کو دوبارہ دیکھ رہا ہے اس پردہ پر کوئی گرد نہیں جمی ہے۔ اور اس شانِ الٰہی کی جلوہ نمائی کے بعد سے اب تک کوئی وقت نہیں گزرا ہے۔ وہ وقت جسے ہم حقیقتاً بہتر بناتے ہیں یا جسے بہتر بنایا ہی نہیں جا سکتا۔ نہ ماضی ہے، نہ حال ہے، نہ مستقبل ہے۔

میرا مکان نہ صرف غور و فکر کے لئے بلکہ یونیورسٹی سے بھی زیادہ سنجیدہ مطالعہ کے لئے سازگار تھا۔ اگرچہ میں عام گشتی لائبریری کی رسائی سے بہت دور رہتا تھا۔ لیکن پہلے سے زیادہ ان کتابوں کے زیرِ اثر تھا جو دُنیا بھر میں گشت لگاتی ہیں۔ جن کے جملے ابتدا میں درختوں کی چھال پر لکھے گئے تھے، اور جنہیں اب کبھی کبھی سنئی کے کپڑے سے تیار کئے جانے والے کاغذ پر نقل کر لیا جاتا ہے۔ شاعر میر قمر الدین مست کہتا ہے "کتابوں کا اہم ترین فائدہ یہ ہے کہ میں بیٹھے بیٹھے روحانی دنیا کی سیر کرتا ہوں۔" شراب کے ایک ہی جام سے کیسے سرشار ہوا جا سکتا ہے۔ مجھے اس لطف کا تجربہ اس وقت ہوا جب میں نے رموزِ تصوف کی شراب پی۔ اگرچہ میں نے ہومر کی کتاب ایلیڈ کی ورق گردانی وقتاً فوقتاً ہی کی لیکن سارے موسم گرما میں اُسے اپنی میز پر رکھا۔ مجھے اپنا مکان تعمیر کرنے اور اپنا سیم کا کھیت گوڑنے میں اپنے ہاتھوں کو مسلسل مصروف رکھنا پڑا تھا۔ اس لئے ابتدا میں میرے لئے زیادہ مطالعہ کرنا دشوار تھا۔ پھر بھی میں یہ اُمید لئے ہوئے زندہ رہا کہ میں آئندہ ایسی ہی کتابوں کا مطالعہ کروں گا۔ میں نے اپنے مطالعہ کے درمیانی وقفہ کے دوران میں ایک دو سطحی سفرنامے پڑھے لیکن مجھے اس مشغلہ کے باعث بڑی شرم آئی اور میں اپنے آپ سے یہ سوال کرنے لگا کہ میں آخر اس وقت کس دُنیا میں مقیم ہوں۔

طالب علم کو چاہیئے کہ وہ ہومر یا اسکائیلس کی کتابوں کا مطالعہ یونانی زبان میں کرے۔ ان کتابوں کے مطالعہ میں نہ تو عشرت کا خطرہ ہے اور نہ آسائش پسندی کا۔ ان کتابوں کے مطالعہ کا مطلب یہ ہے کہ ان کا قاری کسی حد تک ان کے ہیروؤں کی پیروی کر رہا ہے۔ اور اپنے صبح کے اوقات ان کی ورق گردانی میں صرف کر رہا ہے۔ یہ وہ کتابیں ہیں جن میں عظیم المرتبت ہستیوں کے کارہائے نمایاں بیان کئے گئے ہیں۔ قسمت کے کارناموں سے بھری ہوئی کتابیں چاہیے ان کو ہماری مادری زبان میں کیوں نہ شائع

کر دیا جائے ۔ ایک ایسی زبان میں ہوں گی جن کو انحطاط پذیر زمانہ مردہ زبان سمجھے
گا ۔ ہمیں ایسی کتابوں کی ایک ایک سطر کے معانی بڑی محنت سے سمجھنے کی کوشش کرنی
چاہیئے کہ عقل ، جراءت اور فراخدلی رکھتے ہیں ۔ اس سے کام لے کر ان کے الفاظ کو
عام روایتی معنوں کی بجائے وسیع ترین معنوں میں لیں ۔ موجودہ زمانہ کی ارزاں اور
بافراط طباعت متعدد ترجموں کے باوجود ہمیں قدیم مصنفوں سے قریب تر لانے
میں بہت کم کامیاب رہی ہے ۔ ہم میں اور ان میں ابھی تک ویسا ہی فرق ہے ۔ اور
جن حروف میں وہ کتابیں چھاپی گئی ہیں وہ آج بھی ایک عجوبہ نظر آتی ہیں ۔

اگر کسی قدیم کتاب کے چند الفاظ سیکھنے میں جوانی کے ایام بیش قیمت لمحات
صرف کر دیئے جائیں تو اسے ہرگز تضیع اوقات نہیں سمجھنا چاہیئے ۔ بلکہ یہ خیال کرنا
چاہیئے کہ محنت کام آئی ۔ اس لئے کہ ایسے الفاظ بازاری روزمرہ سے بالکل مختلف
ہوتے ہیں ۔ ایسے الفاظ معنی خیز اور محرک خیال ہوتے ہیں ۔ کسان اگر چند سنے سنائے
لاطینی الفاظ یاد رکھتا ہے اور ان کو اکثر دوہراتا رہتا ہے ۔ تو یہ کوئی بے فائدہ
بات نہیں ہے ۔ بعض لوگ اس طرح باتیں کرتے ہیں ۔ جیسے انہیں قدیم کتابوں کا
مطالعہ ترک کر کے جدید تر عملی علوم سیکھنے ہی پڑیں گے ۔ لیکن جو صحت مند طالب علم
ہمیشہ قدیم کتابوں کا مطالعہ کرتا رہے گا ۔ چاہے وہ کسی زبان میں اور کتنی ہی پرانی
کیوں نہ ہوں ۔ قدیم کتابیں انسان کے اعلیٰ ترین تحریری خیالات کے سوا اور کیا ہیں ؟
یہ کتابیں ایسے یونانی دارالاستخارہ ہیں جن پر ابھی تک زوال نہیں آیا اور جن سے جدید
ترین سوالات کے جواب بھی ملتے ہیں جواب جو نہ کبھی ڈلفی نے دیئے اور نہ ڈوڈونا
نے ۔ اگر قدامت ایک عیب ہے تو ہمیں قدرت کا مطالعہ چھوڑ دینا چاہیئے ۔ اسلئے
کہ قدرت بہت ہی قدیم ہے ۔ اچھی کتابوں کا مطالعہ یعنی قدیم کتابوں کو سنجیدگی سے
پڑھنا اعلیٰ ترین ریاضت ہے یعنی ایک ایسی ریاضت ہے جس میں قاری کو اس

زمانہ کی تمام سرگرمیوں اور ورزشوں کی نسبت زیادہ کڑی ورزش کرنی پڑے گی۔ اس کے لئے ایک ایسی تربیت کی ضرورت ہے جو کھلاڑیوں کو دی جاتی تھی یعنی ان کتابوں کے مطالعہ کو عمر بھر کا مقصد بنانا پڑیگا۔ کتابوں کو اسی طرح سوچ سمجھ کر اور احتیاط سے پڑھنا چاہیئے جس طرح وہ لکھی گئی ہیں۔ وہ کتابیں جس ملک کی زبان میں لکھی گئی ہیں۔ اس زبان میں گفتگو کر لینا ہی کافی نہیں ہے اس لئے کہ بولی اور لکھی جانے والی زبان یعنی اس زبان میں جو سنی جاتی ہے اور اس زبان میں جو پڑھی جاتی ہے بہت لمبی مدت کا فاصلہ ہوتا ہے۔ اوّل الذکر عام طور پر عارضی ہوتی ہے۔ صرف ایک آواز، ایک زبان اور ایک بولی ٹھولی جو قریب قریب وحشیانہ ہوتی ہے۔ اسے ہم اپنی ماؤں سے جانوروں کی طرح غیر شعوری طور پر سیکھ لیتے ہیں۔ مؤخر الذکر زبان پختگی کی حامل اور پختگی کا تجربہ ہوتی ہے۔ اگر پہلی ہی ہماری مادری زبان ہے تو دوسری پدری زبان ہے یعنی ایک محفوظ اور منتخب ذخیرہ اظہار جو اتنی اہم ہے کہ کانوں سے نہیں سنی جا سکتی۔ اور اسے بولنے کے لئے دوبارہ جنم لینا پڑتا ہے۔ ازمنہ وسطیٰ میں انسانوں کے وہ جم غفیر جو صرف یونانی اور لاطینی زبانیں بولتے تھے۔ اس زمانے میں پیدا ہو جانے کے باعث اس بات کے حقدار نہیں ہو گئے تھے کہ اس زمانے کے ذہین لوگوں کی کتابیں ان زبانوں میں نہیں لکھی گئی تھیں جنہیں وہ جانتے تھے بلکہ ادب کی منتخب زبان میں لکھی گئی تھیں انہوں نے یونان اور روم کی اعلےٰ زبانیں نہیں سیکھی تھیں۔ وہ ان پارچوں کو جن پر وہ کتابیں لکھی گئی تھیں ردی کے کاغذ سمجھتے تھے اور ان پر اپنے زمانہ کے سستے اور سطحی ادب کو ترجیح دیتے تھے جب یورپ کے کئی ممالک نے اپنی واضح مگر غیر مہذب زبانیں اپنا لیں جو ان کے ابھرتے ہوئے ادب کے مقاصد کے لئے کافی تھیں۔ اس وقت قدیم علم و دانش کو بحال کر دیا گیا اور علما بڑی مدت کے بعد قدامت کے ان خزانوں کی قدر و قیمت پہچاننے کے قابل ہوئے۔ جن کتابوں کو روم اور یونان کے عوام

الناس سُن نہیں پائے تھے۔ ان کو کئی صدیاں گذر جانے کے بعد چند دانشوروں نے پڑھا اور اب چند ہی دانشور پڑھ رہے ہیں۔

ہم مقرر کی جادو بیانی کی لاکھ تعریفیں کریں۔ لیکن مقدس ترین تحریری الفاظ عام طور پر تیزی سے بولے جانے والے الفاظ سے اتنے ہی پیچھے یا ان سے اُتنے ہی اُوپر ہیں۔ جتنا آسمان اپنے تاروں سمیت بادلوں سے پیچھے یا اُوپر ہے۔ تارے آپ کے سامنے ہیں ماہرین نجوم ہمیشہ ان پر اپنی رائے دیتے ہیں اور ان کا مشاہدہ کرتے رہتے ہیں۔ وہ ہماری روزمرہ کی گفتگو اور سانس کی دھوئیں کی طرح محض مُنہ کی بھاپ نہیں ہیں۔ جسے جادو بیانی یا روانی کہا جاتا ہے وہ مطالعہ کرنے پر وہ محض خطابت نکلتی ہے۔ مقرر ایک عارضی موقع پر جوش میں آجاتا ہے اور اپنے سامنے بیٹھے ہوئے لوگوں کے شعور کے مطابق باتیں کرتا ہے اس کی تقریر صرف ان لوگوں کے لئے ہوتی ہے جو اُسے سُن رہے ہوتے ہیں۔ لیکن مصنف جس کے لئے اُس کی پوری زندگی ایک موقع ہوتی ہے جو مجمع اور مقرر کو جوش دلانے والے عارضی لمحہ سے گریزاں ہوتی ہے وہ انسانیت کے دل و دماغ سے مخاطب ہوتا ہے یعنی ان تمام لوگوں سے جو کسی بھی زمانہ میں اس کی بات سمجھ سکیں۔

یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے کہ سکندر اپنی فتوحات کی مہموں میں کتاب ایلیڈ کی ایک جلد بیش قیمت ڈبے میں ساتھ رکھتا تھا۔ ایک تحریری لفظ بہترین یادگار ہوتا ہے۔ وہ ہم سے بیک وقت زیادہ قریب اور آرٹ کی کسی دوسری تخلیق کی نسبت زیادہ آفاقی ہوتا ہے۔ اُس کا ہر زبان میں ترجمہ کیا جاسکتا ہے۔ وہ صرف پڑھا ہی نہیں جاسکتا بلکہ اُسے تمام انسانیت کے ہونٹوں پر لایا جاسکتا ہے۔ اُسے صرف کینوس پر یا مرمر ہی میں منتقل نہیں کیا جاسکتا بلکہ اُسے خود زندگی کے تنفس سے تراشا جاسکتا ہے۔ ایک قدیم انسان کے فکر و خیال کی علامت جدید انسان

کی تصویر بن جاتی ہے ۔ دو ہزار برسوں نے ۔۔۔۔۔ یونانی ادب پر اس کے مجسموں کی
طرح ایک زیادہ پختہ سنہری اور شفقی رنگ چڑھا دیا ہے ۔ اس لئے کہ یونانی ادب جس
ملک میں بھی پہنچتا ہے وہاں وہ اپنے ساتھ اپنی لطیف اور آسمانی فضا لے جاتا ہے
اور اس کے باعث زمانہ کی دست برد سے محفوظ رہتا ہے ۔ کتابیں دنیا کی دولت کا خزانہ
اور نسلوں اور قوموں کا شاندار ورثہ ہیں ۔ ہر مکان کے شیلفوں پر بہترین اور قدیم کتابوں
کی موجودگی قدرتی اور جائز ہے ۔ اُن کو اپنا ڈھنڈورا پیٹنے کی ضرورت نہیں کیونکہ جب
تک وہ قاری کو روشنی اور استحکام بخشتی ہیں تب تک قاری کی عقل ان کو پڑھنے سے انکار
نہیں کرے گی ۔ ان کتابوں کے مصنف ہر معاشرے میں قدرتی اور ناقابل مزاحمت رہنما
ہیں ۔ بادشاہوں اور شہنشاہوں سے بھی زیادہ بہتر ۔ کیونکہ وہ ساری انسانیت کو متاثر
کرتے ہیں ۔ جب کوئی ان پڑھ یا غالباً کوئی تاجر اپنی ہم جوئی اور مشقت سے اپنی مرغوب
ترین فرصت اور آزادی حاصل کر لیتا ہے تو وہ بالآخر ناگزیر طور پر عقل و ذہانت کے
اُن بلند ترین مگر دشوار گزار حلقوں کی طرف رجوع کرتا ہے اور ایسے اُن سے پتہ چلتا
ہے کہ اس کی ثقافت ابھی نامکمل ہے ۔ اس کا غرور اور اسکی دولت ناکافی ہے ۔ اور وہ
تکلیف اُٹھا کر اپنے سمجھدار ہونے کا مزید ثبوت یہ دیتا ہے کہ وہ اپنے بچوں کے لئے
وہ ذہنی ثقافت مہیا کرتا ہے جس کی ضرورت وہ خود بڑی شدت سے محسوس کرتا ہے
اور اس طرح ایک خاندان کا بانی بن جاتا ہے ۔

جن لوگوں نے قدیم کلاسیکی ادب کی کتابیں اس زبان میں نہیں پڑھی ہیں جس میں وہ
لکھی گئی تھیں ۔ وہ انسانی نسل کی تاریخ کا ادھورا علم رکھتے ہیں ۔ کیونکہ یہ ایک عجیب بات
ہے کہ اُن کو ابھی تک کسی جدید زبان کے رسم الخط میں نہیں لکھا گیا ۔ البتہ ہم اپنی تہذیب
کو ان کتابوں کا چربہ سمجھ سکتے ہیں ۔ ابھی تک نہ ہومر کی کتابوں کو انگریزی میں چھاپا گیا اور نہ
اسکائیلس اور ورجل کی کتابوں کو ۔ حالانکہ یہ وہ کتابیں ہیں جو صبح کی طرف پاکیزہ ۔

ٹھوس اور دلآویز ہیں۔ ہم اُن کے بعد آنے والے مصنفوں کی ذہانت کی کتنی ہی تعریف کیوں نہ کریں لیکن وہ قدما کی حسن آفرینی آراستگی اور عمر بھر کی پُر شجاعت ادبی کاوشوں کی برابری نہیں کر سکتے۔ صرف وہی لوگ اُن کو بھول جانے کی باتیں کرتے ہیں جو اُن کو جانتے نہیں ہیں۔ جب ہم اُن کے برابر علم حاصل کر لیں گے اور ہماری ذہانت اتنی بڑھ جائے گی کہ ہم ان پہ توجہ دے سکیں اور اُن کے خیالات کی صحیح قدر و قیمت سمجھ سکیں، تب ہم اس قابل ہوں گے کہ ان کو بُھلا سکیں۔ وہ زمانہ واقعی علم و دانش سے مالا مال ہوگا۔ جب ان قدیم یادگاروں کو جنہیں ہم کلاسیکی کتابیں کہتے ہیں۔ اور ان سے زیادہ قدیم کتابوں اور دیگر اقوام کے کم جانے پہچانے مذہبی صحیفوں کو زیادہ تعداد میں جمع کرائیں گے، جب روم میں ویٹیکن پہاڑی پر واقع ساری عمارتیں ویدوں، ژند اوستاؤں، بائبلوں اور ہومروں، دانتے اور شیکسپیئر کی کتابوں سے بھر جائیں گی۔ اور آنے والی ساری صدیاں اس جلسہ گاہ عالم میں یکے بعد دیگرے اپنے ممتاز کارنامے لا کر رکھ دیں گی۔ اتنا ذخیرہ جمع ہو جانے پہ ہم اُمید کر سکتے ہیں کہ ہم بالآخر جنت میں پہنچ جائینگے

دُنیا نے ابھی تک عظیم شاعروں کی تخلیقات نہیں پڑھی ہیں، کیونکہ عظیم شاعر ہی ان کو پڑھ سکتے ہیں۔ ان کتابوں کو اس طرح پڑھا گیا ہے جس طرح عوام الناس ستاروں کا مشاہدہ کرتے ہیں یعنی ماہرین نجوم کی طرح نہیں۔ بیشتر لوگوں نے اپنی صرف تھوڑی سی آسانی کے لئے پڑھ لیا ہے جیسے انہوں نے حساب کتاب رکھنے اور بیوپار میں دھوکا نہ کھانے کے لئے علم ریاضی سیکھ لیا ہے۔ لیکن ایک اعلیٰ دماغی ورزش کی حیثیت سے مطالعہ نہیں کیا ہے یا اس کے بارے میں بہت کم جانتے ہیں یا کچھ بھی نہیں جانتے ہیں۔ اعلیٰ درجہ کا مطالعہ یہی ہے اور وہ نہیں ہے جو ذہنی عیاشی بن کر ہمیں غافل کر دیتا ہے۔ اور ہماری اعلیٰ درجہ کی صلاحیتوں کو تھپک کر سُلا دیتا ہے۔ اعلیٰ درجہ کا مطالعہ وہ ہے جس میں پنجوں کے بل کھڑے ہو کر پڑھنا پڑتا ہے اور جس میں بیداری اور

اَور ہوشیاری کے اوقات صرف کرنے پڑتے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ ہمیں حروف ابجد سیکھ لینے کے فوراً بعد بہترین ادبی کتابیں پڑھنی چاہییں اور چوتھی یا پانچویں جماعتوں میں سب سے اگلی یا سب سے پچھلی نشستوں پر بیٹھ کر ہمیشہ ا۔ب یا ایک ہی رکن ہجی والے الفاظ نہیں رٹتے چاہییں بیشتر لوگ اگر ایک ہی اچھی کتاب یعنی بائبل پڑھ لیتے ہیں یا کسی سے پڑھوا کر سن لیتے ہیں اَور حسن اتفاق سے اس کی عقل و دانش کے معتقد ہو جاتے ہیں۔ تو وہ اس پر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ اَور پھر اپنی باقی زندگی بیکار رہ کر گذار دیتے ہیں۔ اَور اپنی ذہنی صلاحیتوں کو سہل اَور آسان کتابیں پڑھنے میں ضایع کر دیتے ہیں ہماری گشتی لائبریری میں کئی جلدوں پر مشتمل ایک کتاب ہے جس کا نام ہے "لٹل ریڈنگ" (مختصر مطالعہ) میرا خیال تھا کہ وہ کتاب اس نام کے قصبے سے متعلق ہے جہاں میں نہیں گیا تھا۔ کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو حواصل اَور شتر مرغ کی طرح شکم سیر ہو کر گوشت اَور ترکاری کھانے کے بعد ہر طرح کی دوسری چیزیں کھا جاتے ہیں کیونکہ وہ کسی چیز کا ضایع جانا برداشت نہیں کر سکتے سا گر دوسرے لوگ اس طرح کا چارہ فراہم کرنے کی مشینیں ہیں تو یہ لوگ ان کو نگل جانے والی مشینیں ہیں۔ وہ لوگ ۹ ہزار بار زیبولون اَور سوفرونیا کی داستان پڑھتے ہیں کہ کیسے وہ دونوں ایک دوسرے سے ایسی محبت کرتے تھے۔ جیسی دُنیا میں کہیں کسی نے نہیں کی۔ اَور کیسے ان کی محبت طرح طرح کی رکاوٹیں پڑنے کے باوجود تیزی سے بڑھتی رہی۔ اُس محبت نے کیسے ٹھوکر کھائی اَور پھر کیسے سنبھل گئی کیسے ایک بے چارہ بدنصیب شخص کلیسا کے مینار پر چڑھ گیا جسے گرجا کے گھنٹہ گھر تک، نہیں چڑھنا چاہیے تھا اَور جب ناول نویس اُس بدنصیب کو بلا وجہ وہاں پہنچا دیتا ہے۔ تو زور زور سے گھنٹہ بجاتا ہے تاکہ ساری دُنیا آکر دیکھے اَور سُنے۔ اوہ بچارہ۔ دیکھو

تو کیسے وہاں سے نیچے چلا آیا! جہاں تک میرا سوال ہے میں سمجھتا ہوں کہ دنیا بھر کے ناولوں کے اس قسم کے ہیروؤں کو موسم کا حال بتانے والے مرغ میں تبدیل کر دینا چاہیئے۔ جس طرح قدیم ایام کے ہیروؤں کو ستارے بنا دیا جاتا تھا۔ اور وہیں زنگ لگنے تک لٹکائے رکھنا چاہیئے۔ تاکہ اُن کو نیچے آکر اپنی احمقانہ حرکتوں سے شریف آدمیوں کو پریشان کرنے کا موقع ہی نصیب نہ ہو۔ اب کے اگر ناول نگار نے لفظی بجائی تو میں اپنی جگہ سے بالکل نہیں ہلوں گا۔ چاہے جلسہ گاہ جل کر راکھ ہو جائے "ٹپ۔ ٹو۔ ہاپ!" ازمنۂ وسطیٰ کی ایک رومانی داستان "ٹٹل۔ ٹول۔ ٹان" کے نامور مصنف کے قلم سے۔ ہر مہینے اقساط میں شایع ہو گی۔ بڑی مانگ ہے۔ سب ایک ساتھ تشریف نہ لائیں! لوگ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر، کھڑے کھڑے جاہلوں جیسے استعجاب سے یہ کہانی پڑھتے ہیں۔ اسے نگل کر پرندوں کی طرح جن کی ہڑی ہوئی چونچ کو تیز کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی اپنے دوسرے معدے میں ڈالے جاتے ہیں۔ وہ اس کہانی کو اس طرح پڑھتے ہیں جس طرح چار سال کا بچہ اپنی دو سلیٹ اور سنہری جلد والی کہانی سنڈریلا پڑھتا ہے میں دیکھتا ہوں کہ یہ کہانی پڑھنے کے بعد نہ تو اُن کے تلفظ میں کوئی اصلاح ہوتی ہے نہ اُن کے لب و لہجہ میں نہ عبارت پڑھنے کے انداز میں۔ اور نہ کوئی اخلاقی سبق حاصل کرنے یا کوئی اخلاقی سبق اس کہانی میں تلاش کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی بینائی دُھندلا جاتی ہے۔ ان کے اعضا میں دورانِ خون رُک جاتا ہے۔ اس کی تمام ذہنی قوتیں رقیق ہو کر کیچڑ بن جاتی ہیں۔ اس طرح ادرک ملی روٹی خالص گندم اور رئی کی روٹی کی نسبت زیادہ انہماک سے روزنہ پکائی جاتی اور منڈی میں یقیناً بک جاتی ہے۔

جو لوگ بڑے پڑھنے والے کہلاتے ہیں وہ بھی اچھی کتابیں نہیں پڑھتے ہیں۔ ہمارے کنکارڈ کا ثقافتی معیار کیا ہے؟ اس قصبہ میں چند لوگوں کے سوا ایسے لوگ موجود ہی نہیں

ہیں جو بہترین کتابیں یا انگریزی ادب کی اچھی کتابیں پڑھنے کا شوق رکھتے ہوں۔ کالج کے تعلیم یافتہ اور نام نہاد اچھے پڑھے لکھے لوگ بھی انگریزوں کی کلاسیکی کتابوں سے بہت کم یا بالکل واقفیت نہیں رکھتے۔ اور جہاں تک انسانیت کی عقل و دانش کے تحریری خزانہ کا تعلق ہے یعنی قدیم کلاسیکی ادب اور بائبل جن کو ہر شخص حاصل کر سکتا ہے ان سے بھی کوئی واقف نہیں ہے۔ اور ان سے واقفیت حاصل کرنے کیلئے کہیں کوشش بھی نہیں کی جاتی۔ میں ادھیڑ عمر کے ایک لکڑہارے کو جانتا ہوں جو کینیڈا میں پیدا ہوا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ وہ فرانسیسی زبان کا اخبار منگاتا ہے خبریں پڑھنے کے لئے نہیں جن سے وہ بے نیاز ہے بلکہ فرانسیسی زبان کی مشق جاری رکھنے کے لئے۔ جب میں نے اُس سے پوچھا "تمہارا کیا خیال ہے تم اس دنیا میں کونسا اچھا کام کر سکتے ہو؟" تو اُس نے جواب دیا "میں فرانسیسی زبان کی مشق کے علاوہ اپنے انگریزی کے علم میں بھی اضافہ کرنا چاہتا ہوں۔" کالج کا تعلیم یافتہ بھی بس یہی کرتا ہے یا کرنے کی خواہش رکھتا ہے۔ اور وہ بھی اسی مقصد سے انگریزی کا اخبار منگاتا ہے۔ اگر کوئی شخص ابھی ابھی غالباً انگریزی کی کوئی بہترین کتاب پڑھ کر آیا ہے تو ایسے کتنے اشخاص ملیں گے جن سے وہ اس کتاب کے بارے میں بات چیت کر سکے؟ یا فرض کیجئے کہ وہ کوئی یونانی یا لاطینی کلاسیکی کتاب اصل زبان میں پڑھ کر آرہا ہے۔ جس کی تعریف نام نہاد ان پڑھ لوگ بھی کرتے ہیں۔ تو اُسے ایک شخص بھی ایسا نہیں ملے گا جس سے وہ اس کے بارے میں گفتگو کر سکے۔ اُسے اس کتاب کے بارے میں خاموش ہی رہنا پڑے گا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ ہمارے کالج میں ایک بھی ایسا پروفیسر نہیں ہے جس نے اگر زبان کی دشواریوں پر قابو پا لیا ہے تو اسی تناسب سے کسی یونانی شاعر کے کلام کی بذلہ سنجی کی دشواریوں پر بھی دسترس حاصل کر لی ہو اور وہ اتنی صلاحیت بھی رکھتا ہو کہ اُس بذلہ سنجی کو ایک ہوشیار اور حوصلہ مند قاری کے ذہن نشین کرا سکے۔ جہاں تک مذہبی صحیفوں یا انسانیت کی انجیلوں کا تعلق ہے

اس قصبے میں کون سا ایسا شخص ہے جو مجھے ان کے نام بتا سکے ؟ بہت سے لوگ یہ بھی نہیں جانتے کہ یہودیوں کے علاوہ کوئی دوسری قوم بھی مقدس کتاب رکھتی ہے۔ ایک شخص کیا بلکہ ہر شخص اپنے راستے سے ہٹ کر بھی چاندی کا پڑا ہوا ڈالر اٹھانے کے لئے لپکے گا۔ لیکن یہاں سنہری الفاظ پڑے ہیں جو عہدِ قدیم کے عقلمند ترین انسانوں نے کہے ہیں اور جن کے بارے ہیں ایک کے بعد ایک آنے والے زمانے نے یقین دلایا ہے کہ وہ کھرے سکے ہیں۔ لیکن اس پر بھی ہم آسان مطالعے سے متعلق کتابیں قاعدے، اور اسکول کی کتابیں پڑھتے ہیں جو لڑکوں یا مبتدیوں کے لئے ہوتی ہیں۔ ہمارا مطالعہ ہماری گفتگو اور ہمارا تفکر بہت ہی پست ہے۔ جو صرف بونوں اور بالشتیوں کیلئے موزوں ہے۔

میں کنکارڈ میں پیدا ہونے والے عقلمند انسانوں کی نسبت زیادہ عقلمند انسانوں سے واقفیت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ جن کا یہاں مشکل کوئی نام تک جانتا ہو۔ کیا میں صرف افلاطون کا نام سن لوں اور اس کی کتابیں کبھی نہ پڑھوں ؟ یہ تو ایسا ہی ہوگا جیسے افلاطون میرے قصبہ کا رہنے والا ہو اور میں نے اسے کبھی نہ دیکھا ہو۔ وہ میرا ہمسایہ ہو اور میں نے نہ اسے بولتے سنا ہو اور نہ کبھی اس کی عالمانہ گفتگو سمجھنے کی کوشش کی ہو۔ لیکن حقیقت کیا ہے ؟ اس کے "مکالمے" جن میں اس کے غیر فانی اجزا رہیں ساتھ والے شیلف پر پڑے ہیں۔ لیکن میں انہیں کبھی نہیں پڑھتا۔ ہم غیر مہذب، پست ذہن اور ان پڑھ ہیں۔ میں اس معاملہ میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں اپنے اُن ہم قصبہ لوگوں کے درمیان جو پڑھے ہوئے نہیں ہیں اور ان خواندہ لوگوں کے درمیان کوئی لمبا چوڑا فرق نہیں سمجھتا۔ جو پڑھ لکھ کر بھی صرف وہی کتابیں پڑھتے ہیں جو بچوں یا کمزور ذہن والے آدمیوں کے لئے ہوتی ہیں۔ ہمیں عہدِ قدیم کے لوگوں جیسا بننا چاہیئے لیکن ہم اُن جیسے قابل اسی صورت میں بن سکتے ہیں جب ہمیں یہ معلوم ہو کہ وہ کس قدر قابل اور ذہین تھے۔ ہم چھوٹے چھوٹے پرندوں کی نسل سے ہیں، ہم روزانہ اخبار کے کالموں کی پروازِ تخیل سے زیادہ بلند نہیں اُڑ سکتے۔

ساری کتابیں اتنی بے کیف نہیں ہوتیں جتنی ان کے قارئین کند ذہن ہوتے ہیں۔ غالباً ان میں ایسے الفاظ بھی ہوتے ہیں جو ہمارے حالات سے مطابقت رکھتے ہیں۔ ہم ان الفاظ کو واقعی سُن سکتے۔ اور انہیں سمجھ سکتے تو وہ ہماری زندگی میں صبح یا بہار کی وہ کرنیں لاتے اور غالباً ہمارے لیے ہر بات کو ایک نئی شکل دے دیتے۔ اور کتنے ہی ایسے لوگ ہیں جن کی زندگی میں کوئی کتاب پڑھنے سے ایک نیا باب کھل گیا۔ ہمارے لیے کتابیں موجود ہیں جو غالباً میرے معجزوں کی وضاحت کر سکتی ہیں۔ اور نئے معجزے دکھا سکتی ہیں ہوسکتا ہے کہ جو الفاظ آج تک منہ سے ادا نہیں کئے گئے ان کو کہیں ادا کر دیا گیا ہو۔ جو سوالات ہمیں پریشان کرتے ہیں۔ الجھاتے ہیں۔ ورطۂ حیرت میں ڈالتے ہیں۔ وہ سوالات بار بار عقلمند انسانوں کو سوجھتے رہے ہیں۔ ایک سوال کو بھی نظرانداز نہیں کیا گیا ہے اور ہر عقلمند انسان نے اپنی صلاحیت کے مطابق اپنے الفاظ اور اپنی زندگی سے ان کا جواب دیا ہے۔ اس کے علاوہ عقل و دانش کی بدولت ہم فراخدلی سیکھیں گے۔ کنکارڈ کے مضافات میں کسی فارم پہ تنہا مزدور جو اس بات کا دعوےٰ کرتا ہے کہ اس نے دوبارہ جنم لیا ہے اور اسے ایک خاص مذہبی تجربہ ہوا ہے اور یہ یقین رکھتا ہے کہ وہ اپنے عقیدہ کی بدولت خاموش اور سنجیدہ بن گیا ہے۔ ممکن ہے یہ سوچتا ہو کہ یہ درست نہیں ہے لیکن زرتشت بھی ہزاروں برس پہلے اسی راستہ پہ چلا تھا اور اسے بھی یہی تجربہ ہوا تھا لیکن وہ عقلمند تھا۔ اس لیے جانتا تھا کہ یہ کیفیت عالمگیر ہے۔ لہٰذا اس نے اس کے مطابق اپنے پڑوسیوں سے سلوک کیا۔ یہاں تک کہ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایک مذہب کا موجد بنا۔ اور اس نے لوگوں میں عبادت کا رواج جاری کیا۔ اس لیے اس شخص کو چاہئے کہ وہ عجز و انکساری کے ساتھ زرتشت سے ہمکلام ہو۔ اور تمام برگزیدہ شخصیتوں کے فراخدلانہ اثرات کے ذریعہ حضرت مسیح سے بھی دلی یگانگت پیدا کرے۔

اور" کلیسا" کو نظر انداز کر دے۔ ہم اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم اُنیسویں صدی کے لوگ ہیں اور ہم دنیا کے ہر ملک سے زیادہ برق رفتاری کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں۔ لیکن ذرا اس بات پر غور کیجئے کہ یہ چھوٹا سا گاؤں اپنی ثقافتی ترقی کے کتنا کم کام کر رہا ہے۔ میں اپنے ہم قصبہ لوگوں کی خوشامد نہیں کرنا چاہتا۔ اور یہ بھی خواہش نہیں رکھتا کہ وہ میری خوشامد کریں۔ کیونکہ ایسا کرنے سے نہ مجھے فائدہ پہنچے گا نہ ان کو۔ ہمیں بیلوں کی طرح گوڑے جانے کی ضرورت ہے۔ ہمارے ہاں معمولی اسکولوں میں صرف بچوں کے لئے اسکولوں کا مقابلتہً ایک اچھا نظام موجود ہے لیکن موسم سرما میں جو نیم فاقہ کش "لائسیم" (درسگاہ) کھولی گئی تھی اور جدا ازاں حکومت نے جو چھوٹی سی لائبریری قائم کی ہے۔ اُس کے سوا ہمارے لئے کوئی اسکول نہیں ہے۔ ہم اپنی جسمانی بیماری کے لئے ہر قسم کی دوا پر اپنی ذہنی بیماری کی نسبت زیادہ روپیہ صرف کرتے ہیں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ہمارے غیر معمولی اسکول ہوں اور ہم اپنی تعلیم کو اُس وقت بھی ترک نہ کریں۔ جب مرد اور عورت بننا شروع کر دیں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ دیہات یونیورسٹیاں ہوں اور دیہات کے سن رسیدہ باشندے ان یونیورسٹیوں کے فیلو ہوں۔ اگر وہ واقعی خوشحال ہیں۔ تو ان کو اتنی فرصت میسر آ سکتی ہے کہ وہ اپنی بقیہ زندگیاں ان کتابوں کے مطالعہ میں صرف کر دیں جن سے فراخدلی پیدا ہوتی ہے۔

کیا دُنیا ہمیشہ کے لئے صرف ایک پیرس یا ایک آکسفورڈ پر انحصار رکھے گی! کیا کنکارڈ کے آسمان کے نیچے طلبا کو کھانا اور فراخدلانہ تعلیم میسر نہیں آ سکتی؟ کیا ہم کسی ایبیلارڈ کی خدمات حاصل نہیں کر سکتے۔ جو ہمیں لیکچر دے؟ افسوس کا مقام ہے کہ مویشیوں کو چارہ دینے اور دوکان میں کام کرنے کی وجہ سے ہمیں بڑی مدت تک اسکول سے دور رکھا جاتا ہے۔ اور ہماری تعلیم کو بہت بری

طرح نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اس ملک میں گاؤں کو بعض معاملات میں یورپ کے
رئیس کی جگہ لے لینی چاہیئے۔ گاؤں کو فنون لطیفہ کا سرپرست ہونا چاہیئے۔ گاؤں
کافی دولت مند ہے۔ اسے صرف اولوالعزمی اور شائستگی کی ضرورت ہے۔ یہ گاؤں
اُن چیزوں پر جن کی قدر کسان اور تاجر کرتے ہیں کافی روپیہ صرف کر سکتا ہے۔
اس بات کو محض ایک خیال سمجھا جائے گا۔ اگر ایسی چیزوں پر روپیہ صرف کیا جائے
جنہیں اُن لوگوں سے زیادہ عقلمند لوگ ناقابلِ قدر سمجھتے ہیں۔ کہ دولت یا سیاست
کے طفیل اس قصبہ نے سترہ ہزار ڈالر خرچ کر کے ایک ٹاؤن ہال بنایا ہے۔
لیکن غالباً وہ سو سال تک بھی پوست میں حقیقی گوشت ڈالنے یعنی کسی زندہ عقلمند
انسان پر اتنا روپیہ ہرگز صرف نہیں کرے گا۔ موسم سرما کی درسگاہ کے لیئے ہر برس
جو ایک سو پچیس ڈالر چندہ دیا جاتا ہے اس سے بہتر اس ساری رقم سے زیادہ
اچھا کام لیا جاتا ہے جو اس قصبہ میں جمع کی جاتی ہے۔ اگر ہم اُنیسویں صدی میں
رہتے ہیں تو اُن فوائد سے کیوں نہ لطف ہوں جو انیسویں صدی پیش کرتی ہے؟
ہماری زندگی کسی لحاظ سے صوبہ پرست کیوں رہے؟ اگر ہم اخبارات پڑھنا چاہتے
ہیں تو بوسٹن کی گپوں کو چھوڑ کر فوراً ہی دنیا کا کوئی بہترین اخبار کیوں نہ جاری کرائیں؟
ہمیں نیو انگلینڈ کے "غیر جنبدار خاندانوں" کے اخبارات کی چوسنی نہیں چوسنی چاہیئے
اور "آلو برانچز" اخبار کی گھاس نہیں چرنی چاہیئے۔ تمام علمی حلقوں کی ساری خبریں
ہم تک آنی چاہیئں۔ پھر ہم دیکھیں گے کہ وہ حلقے کچھ جانتے بھی ہیں یا نہیں۔ ہم
ہارپر اور ریڈنگ اینڈ کمپنی پر یہ بات کیوں چھوڑ دیں کہ وہ ہمارے مطالعہ کے لیئے
کتب منتخب کریں؟ جس طرح ایک با مذاق رئیس اپنے ارد گرد ایسی چیزیں جمع کرتا ہے
جو اس کی ثقافت کی تسکین کرتی ہیں۔ مثلاً ذہانت، علم، لطائف، کتابیں، تصویریں،
مجسمے، موسیقی، فلسفے کی کتابیں وغیرہ اسی طرح گاؤں کو کرنا چاہیئے۔ ہمیں محض اس لیئے

بچوں کے ایک اُستاد، ایک پادری، ایک محافظ کلیسا کی ایک لائبریری۔ اور تین منتخب شخصوں پر قانع نہیں رہنا چاہیئے کہ ہمارے آباؤ اجداد کبھی یہ سب چیزیں لے کر موسم سرما کی تکالیف برداشت کرتے ہوئے اس دھندلی چٹان پر پہنچے تھے۔ اجتماعی طور پر کام کرنا ہمارے اداروں کی اصل غرض وغایت کے عین مطابق ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ اب ہمارے حالات زیادہ بہتر ہیں۔ اسی لئے ہمارے ذرائع بھی اُس رئیس کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہیں۔ نیو انگلینڈ دنیا کے تمام دانشمند لوگوں کی خدمات حاصل کر سکتا ہے کہ وہ یہاں آئیں اور اُسے تعلیم دیں۔ وہ ان کے طعام و قیام کا بندوبست کر سکتا ہے۔ اور ہرگز ہرگز صوبہ پرست نہیں بن سکتا۔ ہم اس طرح کا غیر معمولی اسکول چاہتے ہیں۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم رؤسا کی بجائے عوام کے دولت سند دیہات قائم کریں۔ اگر ضروری ہو تو دریا پر ایک پل کی تعمیر بند کرا دیجئے۔ اُسے ذرا اور چکر لگا کر پار کر لیجئے۔ لیکن جہالت کی تاریک خلیج پر جس نے ہمیں چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے کم سے کم ایک محراب تعمیر کر دیجئے۔

آوازیں

لیکن جب تک ہم اپنے آپ کو کتابوں تک محدود رکھیں گے۔ خواہ وہ نہایت منتخب اور قدیم ہوں اور صرف خاص تحریری زبانیں پڑھیں گے جو کہ بجائے خود صوبجاتی اور محض بولیاں ہیں تب تک ہمیں یہ خطرہ لاحق ہوگا کہ ہم اس زبان کو بھول جائیں گے جس میں ہر بات اور ہر واقعہ استعارے کے بغیر بیان کیا جاتا ہے۔ اور جو واحد طور پر کثیر اللغات اور معیاری ہے۔ شائع تو بہت کچھ کیا جاتا ہے۔ لیکن چھاپا بہت کم جاتا ہے۔ جو کرنیں چلمن سے چھن کر آتی ہیں۔ چلمن کے مکمل طور سے ہٹا دیئے جانے پر بالکل بھلا دی جائیں گی۔ ہمیشہ چوکس رہنے کی ضرورت پر کسی طریقۂ کار یا ضابطہ کو فوقیت نہیں دی جا سکتی۔ جو چیز دیکھنی چاہیئے اُسے ہمیشہ دیکھتے رہنے کے ضابطہ کے مقابلہ میں تاریخ یا فلسفہ یا شاعری خواہ وہ کتنی ہی نفیس کیوں نہ ہو یا بہترین سماج یا لائق تحسین طرز زندگی کی عام روش کیا وقعت رکھتی ہے؟ کیا آپ محض ایک قاری اور طالب علم بنیں گے یا مشاہد؟ آپ اپنا نوشتۂ تقدیر پڑھیئے۔ جو کچھ آپ کے سامنے ہے اُسے دیکھئے اور مستقبل کی دنیا میں قدم رکھیئے۔

میں نے اس موسم گرما میں کتابیں نہیں پڑھیں۔ میں سیم کا کھیت گوڑتا رہا۔ نہیں میں نے اکثر اوقات اس سے بھی اچھا کام کیا۔ ایسے اوقات بھی آئے جب میں حال کی شگفتگی کو دماغ اور ہاتھوں کے کسی کام پر قربان نہ کر سکا۔ مجھے اپنی کتاب پر ایک چوڑا حاشیہ بہت عزیز ہے۔ میں بعض اوقات موسم گرما کی صبح کو حسبِ معمول نہا کر طلوعِ آفتاب سے لے کر دوپہر تک صنوبر، ہکوری اور سماق کے درختوں کے درمیان اپنے خیالات میں منہمک اپنے دھوپ سے روشن دروازے پر لے خلل خاموشی اور تنہائی میں بیٹھا رہتا میرے اردگرد پرندے چہچہاتے رہتے یا چپکے چپکے میرے گھر پر سے اڑتے ہوئے گزر جاتے۔ بالآخر سورج میری مغربی کھڑکی پر غروب ہونے لگتا۔ یا دور شاہراہ پر کسی مسافر کی گاڑی کی آواز پیدا ہوتی اور مجھے یاد آتا کہ کافی وقت بیت چکا ہے۔ میں ان موسموں میں اس طرح پروان چڑھا جس طرح رات کو غلہ نشو و نما پاتا ہے۔ اس طرح صرف کئے ہوئے اوقات ہاتھوں کے کام کی نسبت کہیں زیادہ مفید تھے۔ یہ اوقات میری زندگی کی میعاد میں سے گھٹائے نہیں گئے تھے بلکہ میری زندگی کی مدت کے علاوہ تھے۔ میری طے شدہ زندگی سے زائد۔ مجھے اس وقت یہ پتہ چلا کہ مشرق کے علما جسے ترکِ عمل اور استغراق کہتے تھے۔ اس سے ان کی کیا مراد تھی۔ مجھے اس بات کی زیادہ فکر نہ تھی کہ میرے اوقات کس طرح گزر رہے ہیں۔ دن آگے بڑھتا تھا جیسے میری کسی کام کے لئے شمع راہ بننا چاہتا ہو۔ ابھی صبح تھی اور لیجئے اب شام بھی ہو گئی۔ کوئی یادگاری کام نہ ہوا۔ پرندوں کی طرح چہچہانے کی بجائے میں اپنی اسی خوش نصیبی پر چپکے سے مسکراتا۔ جس طرح کوئی چڑیا میرے دروازے کے سامنے ہکوری کے پیڑ پر بیٹھی چہچہاتی تھی۔ اسی طرح میں زیرِ لب گنگناتا تھا اس کے جواب میں اپنے گھونسلے میں بیٹھا ہوا دبی آواز میں چہکتا تھا۔ میرے دن ہفتہ کے

دن نہیں تھے ۔ جن پر کسی کا فرد یوی کی مہر لگی ہوتی ہے ۔ نہ ان کو کاٹ کاٹ کر ان کو گھنٹوں میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ یعنی وہ کلاک کی ٹک ٹک کے ساتھ نہیں بیت رہے تھے کیونکہ ہم "ہگن ناتھ پوری" کے ہندوستانیوں کی طرح زندگی بسر کر رہا تھا۔ جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کے لئے گذرے ہوئے کل آج اور آنے والے کل کے لئے صرف ایک ہی لفظ ہے اور وہ "س لفظ" کل کے مختلف معانی کو پیچھے یا آگے کی طرف اشارہ کر کے ظاہر کرتے ہیں۔ یعنی گذرے ہوئے کل کے لئے پیچھے کی طرف اشارہ ۔ اور آنے والے کل کے لئے آگے کی طرف اشارہ ۔ اور آج کے لئے آسمان کی طرف اشارہ ۔ بیشک میرے قصبہ کے لوگوں کے لئے یہ قطعاً کاہلی اور سستی تھی ۔ لیکن اگر پرندوں اور پھولوں نے مجھے اپنے معیار سے جانچا ہوتا تو میں ان کے معیار سے ہرگز کم ثابت نہ ہوتا۔ یہ سچ ہے کہ انسان کو اپنے اندر ہی اپنے مواقع تلاش کرنے چاہئیں قدرتی دن بہت پرسکون ہوتا ہے اور انسان کی کاہلی پر کبھی سرزنش نہیں کرتا۔ مجھے اپنی طرزِ زندگی میں ان لوگوں کی نسبت جو باہر کی دنیا میں تفریح ڈھونڈنے پر مجبور ہو کر لوگوں سے ملتے جلتے ہیں۔ کم سے کم یہ فائدہ ضرور ہے کہ میری زندگی ہی میرے لئے تفریح بن گئی تھی اور ہر لمحہ انوکھی نظر آتی تھی ۔ میری زندگی ایسا بہت سا منظر والا ڈرامہ تھی جس کا کوئی اختتام نہ تھا ۔ اگر ہمیں حقیقتاً ہمیشہ روزی میسر آتی رہے ۔ اور اگر ہم اپنی زندگیوں کو تازہ ترین اور بہترین طریقے سے جو ہم نے سیکھ رکھا ہے بسر کرتے رہیں تو ہمیں بیزاری اور بددلی اور کبھی تکلیف نہ ہو۔ آپ اپنی ذہانت کی بڑی سنجیدگی سے پیروی کیجئے ۔ وہ آپ کو ہر گھڑی ایک نیا منظر دکھانے میں ہرگز کوتاہی نہیں کرے گی ۔ میرے لئے گھر کا کام ایک دلآویز تفریح تھا ۔ جب میرا فرش گندہ ہو جاتا تو میں صبح سویرے اٹھتا اور اپنا سارا فرنیچر جو صرف بستر اور پلنگ یعنی ایک ہی شے پر مشتمل تھا ۔ گھر کے باہر

گھاس پر رکھ دیتا اور فرش پر پانی ڈالتا۔ اور تالاب سے بالو لاکر اس پر چھڑکتا اور جھاڑو لے کر اسے خوب رگڑ رگڑ کر صاف اور سفید کر دیتا تھا اور جس وقت گاؤں کے لوگ ناشتہ کر رہے ہوتے تو سورج میرے مکان کو اتنا خشک کر دیتا تھا کہ میں اس پر دوبارہ چل پھر سکتا تھا اور میرے غور و فکر میں کوئی خلل نہ پڑ سکتا تھا۔ اپنے گھر کا سارا سامان گھاس پر باہر پڑا ہوا دیکھنا بہت ہی کیف انگیز مناظر ثابت ہوتا تھا۔ ایسا دکھائی دیتا تھا جیسے کسی خانہ بدوش کے سامان کا پشتارہ پڑا ہو۔ میری تین ٹانگوں والی میز جس پر سے میں نے اپنی کتابیں اور قلم دوات نہیں اٹھائی تھیں، صنوبر اور ہکوری کے پیڑوں کے درمیان پڑی تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ خود بھی باہر آکر خوش ہوں اور اندر آنے کے لئے آمادہ نہ ہوں۔ بعض اوقات میرا جی چاہتا تھا کہ ان پر شامیانہ تان دوں اور خود بھی وہاں جا بیٹھوں۔ ان پر سورج کو چمکتا اور آزادی سے ہوا کو چلتا ہوا دیکھنا وقت کا صحیح مصرف تھا۔ روزمرہ کے استعمال کی معمولی چیزیں گھر کے باہر جاکر بہت دلچسپ اور جانی پہچانی معلوم ہونے لگتی ہیں۔ ساتھ والی شاخ پر ایک چڑیا بیٹھی ہے اور میز کے نیچے سبزہ اُگ رہا ہے۔ میز کی ٹانگوں سے سیاہ گونہنی کی بیلیں لپٹی ہوئی ہیں صنوبر کے پھل، شاہ بلوط کے پھول اور اسٹرابری کی پتیاں اس میز کے اردگرد بکھری پڑی ہیں۔ مجھے ایسا دکھائی دیتا تھا کہ یہی وہ صورتیں ہیں جو ہمارے فرنیچر یعنی میزوں، کرسیوں اور پلنگوں میں تبدیل ہوگئی ہیں۔ کیونکہ یہ چیزیں موجودہ شکل میں تبدیل ہونے سے پہلے اسی ماحول میں استادہ تھیں۔

میرا مکان پہاڑی کے ایک طرف بڑے جنگل کے عین کنارے پر سیاہ صنوبر اور ہکوری کے پیڑوں کے نوخیز جنگل میں تالاب سے نصف درجن جریبوں کی وادی میں واقع تھا۔ اس سے ایک چھوٹی سی پگڈنڈی پہاڑی تک جاتی تھی۔ مکان کے آگے

دالان میں اسٹرابری، سیاہ گوندنی، امربیل، جانسورٹ گولڈن راڈ، جھاڑدار شاہ بلوط، بالو گوندنی اور مونگ پھلی اُگی ہوئی تھی۔ مئی کے آخر میں راستے کے دونوں پہلوؤں پر آلو بالو کے نازک پھولوں کے ارغوانی جھنڈے چھوٹے چھوٹے تنوں پر چھا جاتے تھے۔ اور جب موسم خزاں آتا تھا تو خوبصورت بڑے بڑے پھل ان کو جھکا کر زمین کے گلے میں اُن کا ہار ڈال دیتے تھے اور وہ کرنوں کی طرح چارسو چمکتے دکھائی دیتے تھے۔ اگرچہ اُن کو زبان پر نہیں رکھا جا سکتا تھا لیکن میں قدرت کے پاس خاطر سے انہیں چکھ لیتا تھا۔ گھر کے ارد گرد کاف کی جھاڑیاں کثرت سے لگی ہوئی تھیں۔ اور اس باڑھ کو بھی توڑ کر نکل آئی تھیں۔ جو میں نے لگائی تھیں اور پہلے ہی موسم میں پانچ چھ فٹ اونچی ہو گئی تھیں۔ اگرچہ اُس کی چوڑی چوڑی، چاکی مانند گرم خطوں والی پتی عجیب سی تھی مگر یہ بہت بھلی معلوم ہوتی تھی۔ موسم بہار میں سوکھی اور بظاہر مردہ ٹہنیوں میں شگوفے نکل آتے تھے اور وہ بڑے سحر انگیز انداز میں بڑھ کر ایک ایک انچ موٹی سرسبز اور خوبصورت شاخیں بن جاتی تھیں۔ وہ اس قدر بیباکی سے بڑھتی تھیں اور اپنے کمزور جوڑوں پر اتنا بوجھ ڈال دیتی تھیں کہ میں اپنی کھڑکی میں بیٹھا بیٹھا ایک نرم اور تازہ شاخ کے ٹوٹ کر ایک پنکھ کی طرح زمین پر گرنے کی آواز سنتا تھا وہ اپنے بوجھ ہی سے ٹوٹ کر گر پڑتی تھیں۔ اُس وقت ہوا بالکل نہیں چل رہی ہوتی تھی۔ اگست میں ڈھیروں گوندنیاں جن کا رس پینے کے لئے ہزاروں شہد کی مکھیاں جمع رہتی تھیں۔ سرخ مخملیں رنگ کی ہو جاتی تھیں۔ اور اپنے بوجھ سے نازک ٹہنیوں کو جھکا کر توڑ دیتی تھیں۔

اس وقت موسم گرما کی سہ پہر ہے اور میں اپنی کھڑکی میں بیٹھا ہوا ہوں۔ میرے مکان کے سامنے کھلے میدان میں شاہ باز چکر کاٹ رہے ہیں۔ وہ دو تین تین کے غولوں میں جنگلی کبوتر میرے سامنے سے اڑتے ہوئے گذر جاتے ہیں یا مکان کے عقب میں سفید

صنوبروں کی شاخوں پر مضطربانہ انداز میں بیٹھے رہتے ہیں ۔ ان کی چیخ و پکار سے فضا گونج رہی ہے ۔ مچھلیوں کا شکار کرنے والا شکرا تالاب کی سطح پر جھپٹ کر پانی میں تموّج پیدا کر دیتا ہے اور ایک مچھلی چونچ میں دبا کر لے جاتا ہے ۔ ایک جنگلی نیولا میرے دروازے کے سامنے والی دلدل سے دھیرے دھیرے باہر آتا ہے اور تالاب کے کنارے آکر ایک مینڈک پکڑ لیتا ہے ۔ کنارے کی گھاس اِدھر سے اُدھر اُڑنے والے پرندوں کے بوجھ سے دبی جا رہی ہے ۔ تقریباً آدھ گھنٹہ سے میں بوسٹن سے دیہات میں مسافروں کو لانے والی ریل گاڑی کی کھڑکھڑاہٹ سن رہا ہوں جو تیتروں کی آواز کی طرح کبھی دھیمی پڑ جاتی ہے اور کبھی پھر تیز ہو جاتی ہے اس لئے کہ میں قصبہ سے زیادہ دُور مقیم نہیں ہوں ۔ میری حالت اُس لڑکے جیسی نہیں ہے جس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ اُسے قصبہ کے مشرقی حصّے میں ایک کسان کے ہاں ملازم رکھا گیا تو وہ چند روز کے بعد خستہ حال اور پھٹے جوتے پہنے ہوئے گھر بھاگ آیا ۔ اُس نے ایسا بے کیف مقام کبھی نہیں دیکھا تھا وہ مقام دُنیا سے بالکل جدا تھا ۔ ایسا نظر آتا تھا کہ وہاں کوئی رہتا ہی نہیں ۔ وہاں کبھی ریل کی سیٹی بھی سنائی نہیں دیتی ۔ مجھے شک ہے کہ اب میساچیوسیٹس میں ایسی کوئی جگہ باقی نہیں رہی ہے ۔

"سچ تو یہ ہے کہ اب ہمارے گاؤں کے پاس سے
ایک تیز رفتار ریل گاڑی گذرتی ہے ۔
اور ہمارے پُرسکون میدان پر ریل گاڑی کی تسکین بخش
آواز کنکارڈ بن گئی ہے ۔"

میں جہاں مقیم ہوں وہاں سے جنوب میں تقریباً سو جریبوں کے فاصلہ پر فچبرگ ریل کی پٹڑی تالاب کو چھوتی ہوئی گزرتی ہے ۔ اس ریل کی پٹڑی کے

ساتھ ساتھ جو راستہ بنایا گیا ہے۔ مَیں اُس پر سے ہوتا ہُوا گاؤں جاتا ہوں جیسے یہ گاؤں اسی کڑی کے ساتھ سماج سے وابستہ ہو۔ مال گاڑیوں پر کام کرنے والے لوگ جو سارا ریل کی پٹڑی پر سفر کرتے ہیں۔ مجھے ایک پُرانے ملاقاتی کی طرح جھک کر سلام کرتے ہیں۔ وہ اکثر اوقات میرے قریب سے گزرتے ہیں۔ اور بظاہر وہ ایسا سمجھتے ہیں کہ مَیں بھی کوئی ریلوے ملازم ہوں۔ مَیں بھی اپنے آپ کو اس طرح ظاہر کرتا ہوں جیسے میں اس زمین کے مدار میں کہیں راستہ کی مرمت کرنے والا ہوں۔

انجن کی سیٹی گرمیوں اور جاڑوں میں کسی کسان کے احاطہ کے اُوپر سے اُڑتے ہوئے شاہین کی آواز کی مانند پرے جنگلوں کی فضا میں داخل ہوتی ہے۔ اور مجھے یہ اطلاع دیتی ہے کہ شہر کے بہت سے مضطرب تاجر اس قصبے کے حلقہ میں پہنچ رہے ہیں یا مہم باز دیہاتی بیوپاری اُس پار سے اِس پار آ رہے ہیں۔ وہ چونکہ ایک ہی افق کے سایہ میں آتے ہیں۔ اس لئے وہ چیخ چیخ کر دوسروں کو خبردار کرتے ہیں کہ وہ راستہ پر سے ہٹ جائیں۔ اور اُن کی یہ ڈانٹ ڈپٹ بعض اوقات دونوں قصبوں کے حلقوں میں سنائی دیتی ہے اے گاؤں والو تمہاری اشیائے خوردنی آ گئیں اے دیہات کے لوگو تمہارا راشن آ گیا!! کوئی شخص اپنے کھیت پر اتنا آزاد نہیں ہے جو اِن سے کہہ سکے مفہوم یہ ہوتا ہے۔ نہیں صاحب مجھے نہیں چاہیئے!! برعکس اس کے دیہاتی کی سیٹی۔ "یہ رہی ان چیزوں کی قیمت!! تعمیرات منہدم کرنے والے لمبے لمبے لٹھوں کی طرح کے شہتیر بیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے شہر کی دیواروں کے سامنے سے گزرتے جا رہے ہیں۔ جن سے اتنی کرسیاں بن سکتی ہیں کہ اُن پر شہر کے سارے درماندہ اور بوجھ سے لدے ہوئے لوگ بیٹھ سکتے ہیں۔ اتنی وسیع اور بھدّی شائستگی سے دیہات ایک کرسی شہر کے حوالے کرتے ہیں۔ مشکل بری پیڑوں والی ساری انڈین پہاڑیاں ان پیڑوں سے خالی ہو گئی

ہیں۔ اور کرندوں سے لدی ہوئی چراگاہیں سمٹ کر شہر میں پہنچا دی گئی ہیں۔
جب کپاس کی فصل آتی ہے۔ تو بُنے ہوئے کپڑے کی قیمت گھٹ جاتی ہے۔ جب ریشم کے
بھاؤ بڑھتے ہیں تو اُونی کپڑے کے بھاؤ گر جاتے ہیں۔ جب کتابیں بکثرت آتی ہیں۔
تو اُن ذہانتوں کی قیمت کم ہو جاتی ہے جو یہ کتابیں لکھتی ہیں۔

جب میں انجن کو اور اُس کے پیچھے لگے ہوئے ستاروں بلکہ دُمدار ستارے
کی طرح حرکت کرتے ہوئے دیکھتا ہوں تو مجھے خیال آتا ہے کہ اب یہ ہرگز واپس نہیں آئے
گا کیونکہ دُمدار ستارے کے حلقۂ گردش میں کوئی خم نہ دیکھ کر ہر نظارگی کو یہ شک ہوتا ہے
کہ کیا یہ اس تیزی سے اور اسی سمت میں پھر کبھی نظر آئے گا؟ جب میں انجن کو بخارات
کے بادل لیئے ہوئے اور اپنے عقب میں سنہرے اور روپہلے ہاروں کا پرچم لہراتے
دیکھتا ہوں (جس طرح میں نے آسمان میں اُڑتے ہوئے اکثر بادلوں کے جھرمٹ کو
روشنی میں چمکتے دیکھے ہیں) مجھے محسوس ہوتا ہے کہ یہ مسافر ابر انگیز دیوتا بہت جلد شفق
کو اپنے جنگی وردیوں کے طور پر استعمال کرنے لگے گا۔ جب میں اس آہنی گھوڑے کو
بجلی کی کڑک کی طرح نتھنوں سے آواز نکال کر پہاڑوں میں گونج پیدا کرتے ہوئے سُنتا
ہوں۔ اور جب وہ اپنی ٹاپوں سے زمین کو لرزا دیتا ہے اور اپنے نتھنوں سے آگ
اور دھواں چھوڑتا ہے تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ زمین کو اس کے موزوں
باشندوں کی نسل میسر آگئی ہے۔ (اس بات کا مجھے کوئی علم نہیں ہے کہ نئی
دیومالا میں اسے کس قسم کا اُڑتا گھوڑا یا آگ اُگلنے والا اژدہا بنا کر پیش کیا جائے گا)
اے کاش وہ چیز جو نظر آتی ہے ایک حقیقت ہوتی۔ اور لوگ قدرتی عناصر کو اعلےٰ
مقاصد کے لیئے اپنا غلام بنا سکتے۔ اگر بخارات کا بادل جو انجن پر اُٹھتا ہے پُرشکوہ
کارناموں کا پسینہ ہوتا یا وہ کسان کے کھیت پر منڈلانے والے ابر کی طرح مفید ہوتا تو قدرت
خود انسان کے مقاصد میں اُس کے ہمرکاب ہوتی اور اُس کا ساتھ دیتی۔

میں صبح کے وقت گزرنے والی گاڑیوں کو اسی نظر سے دیکھتا ہوں جس سے
سورج طلوع ہوتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ جو بمشکل ان ٹرینوں سے وقت کا زیادہ پابند ہوگا۔ ریل
گاڑیاں تو سٹیشن جاتی ہیں لیکن ان کے اڑاتے ہوئے بادلوں کا قافلہ دور دور تک پھیلتا اور بلند
ہوتا ہے اور آسمان کی طرف جاتا ہے۔ بادلوں کا یہ قافلہ ایک منٹ کے لئے سورج کو چھپا
لیتا ہے اور میرے دور افتادہ کھیتوں پر چھاؤں مسلط کر دیتا ہے اور ایک ایسی آسمانی ٹرین
بن جاتا ہے جس کے سامنے زمین کے سینے پر چلنے والی ریل گاڑی محض نیزے کی نوک معلوم ہوتی
ہے۔ آہنی گھوڑے کا سائیس اس پہاڑی جگہ کی سردیوں میں صبح سویرے تاروں کی چھاؤں میں
اپنے گھوڑے کو چارہ دیتے اور اسے گاڑی میں جوتنے کے لئے بیدار ہوتا ہے۔ آگ
بھی منہ اندھیرے روشن کی جاتی ہے تاکہ وہ اسے گرمی پہنچائے اور اس میں چلنے کی طاقت
پیدا کرے۔ کاش یہ مہم جتنی تڑکے شروع کی جاتی ہے اتنی ہی معصوم بھی ہوتی۔ اگر ریل
کی پٹڑی پہ گہری برف جم جاتی ہے تو بکنگ کے پیروں سے برف کا جوتا باندھ دیا جاتا ہے اور
ایک بہت بڑے ہل سے پہاڑوں سے لے کر سمندر کے کنارے تک ایک نالی بنا دی جاتی
ہے جس میں پیچھے پیچھے چلنے والے کھدائی کے تھیلوں کی طرح ریل کے ڈبے تمام مضطرب
انسانوں اور تجارت کے سامان کو ملک میں بیج کی طرح بکھیر دیتے ہیں۔ دن بھر یہ آتشیں
گھوڑا ملک کا دورہ کرتا ہے۔ وہ رکتا ہے اور صرف اس لئے رکتا ہے کہ اس کا مالک ذرا
سستا لے۔ میں آدھی رات کو اس کی ٹاپوں کی آواز اور سرکشانہ شاں شاں سے اس
گھڑی جاگ اٹھتا ہوں جب وہ جنگل کی کسی دور افتادہ تنگ گھاٹی میں برف سے ڈھکے
ہوئے عناصر سے دوچار ہوتا ہے۔ وہ ستارۂ سحر کے ساتھ ساتھ اپنے اصطبل میں پہنچتا
ہے۔ اور سستائے اور سوئے بغیر پھر اپنے سفر پہ روانہ ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی ایسا اتفاق
بھی ہوتا ہے کہ میں اسے شام کو بھی دن بھر کی فاضل قوت خارج کرتے ہوئے سنتا ہوں
تاکہ اس کے اعصاب میں سکون پیدا ہو جائے۔ وہ اپنے کلیجے اور دماغ کو ٹھنڈا کرے

اَور چند گھنٹوں کے لئے آہنی نیند سو لے۔ کاش یہ مہم جتنی طویل اَور اَن تھک ہے اتنی ہی پُر شجاعت اَور قابلِ احترام بھی ہوتی!

قصبوں کی سرحدوں پر جنگلوں میں جہاں کوئی نہیں جاتا اَور کبھی کبھی کوئی شکاری ہی دن کو چلا جاتا ہے۔ یہ جگمگاتے ہوئے ڈبے تاریک ترین راتوں میں دوڑتے پھرتے ہیں۔ اَور جنگل کے باشندوں کو خبر تک نہیں ہوتی۔ یہ کسی شہر یا قصبہ کے روشن ریلوے اسٹیشن پر ایک لمحہ کے لئے رُکتے ہیں جہاں مہذب لوگ جمع ہو جاتے ہیں اور دوسرے لمحہ تیرہ و تار دلدل میں سے گذر رہے ہوتے ہیں۔ جہاں وہ اُلو اَور لومڑی کو ڈرا دیتے ہیں۔ ریل گاڑیوں کا آنا اَور روانہ ہونا اب تک دیہات کے اہم ترین واقعات ہیں۔ یہ ریل گاڑیاں خلیج وقت پر پابندی کے ساتھ آتی جاتی رہتی ہیں۔ اَور اَن کی سیٹی اتنی دُور تک سنائی دیتی ہے کہ کسان اپنی گھڑیوں کا وقت ٹھیک کرنے لگتے ہیں۔ اگر کوئی ادارہ خوش اسلوبی سے چلایا جاتا ہے تو وہ سارے ملک کو باقاعدہ بنا دیتا ہے۔ کیا جب سے ریل گاڑی کی پٹڑی بنی ہے تب سے لوگ وقت کے زیادہ پابند نہیں ہو گئے؟ کیا لوگ عام طور سے گاڑیوں کے دفتر کی نسبت اسٹیشنوں پر زیادہ تیزی سے باتیں نہیں کرنے لگتے ہیں؟ اسٹیشنوں کے ماحول میں ایک برقی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ اس نے جو معجزے دکھلائے ہیں ان پر مجھے بہت حیرت ہوتی ہے۔ کیونکہ میرے بعض پڑوسی جن کے متعلق مَیں نے ہمیشہ یہ پیشگوئی کی تھی کہ وہ کبھی بوسٹن اتنی پابندئ وقت کے ساتھ نہیں جا سکیں گے۔ گھنٹی کے بجتے ہی اسٹیشنوں پر موجود ہوتے ہیں۔ اب تو یہ عام کہاوت بن گئی ہے "ریل کے ڈھنگ سے کام کیجئے"! اب کسی طاقت کے بار بار اَور خلوص کے ساتھ یہ انتباہ دینا کہ اس کے راستہ سے ہٹ کر چلو ایک کارآمد فقرہ بن گیا ہے۔ اب راستے میں رُک کر نہ قانون بلوہ پڑھنے کی ضرورت ہے اَور نہ ہجوم کو منتشر کرنے کے لئے ہوا میں گولی چلانے کی۔ ہم نے خود ہی اپنا مقدر ڈھال لیا ہے۔ یا اپنے آپ کو انٹروپوس

(قسمت کی دیوی) بنالیا ہے۔ جو اپنے راستہ سے کبھی نہیں ہٹا کرتی۔ (آپ انجن کا نام اتھ ولیوس رکھ دیجئے) لوگوں کے لئے یہ مشتہر کیا جاتا ہے کہ فلاں گھنٹے اور منٹ پہ یہ تیر قطب نما کے خاص نقطوں کی طرف سرکتے جائیں گے۔ اس کے باوجود یہ کسی انسان کے کاروبار میں رخنہ اندازی ہی نہیں کرتے۔ بچے دوسرے راستوں سے اسکول آتے جاتے رہتے ہیں۔ ہم ان کی بدولت زیادہ استحکام سے زندگی بسر کرنے لگے ہیں۔ ہم سب کو اس طرح "ٹیل" کے بیٹے بننے کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ہوا میں سینکڑوں ان دیکھے تیر اڑ رہے ہیں۔ آپ کے راستہ کے سوا ہر راستہ تقدیر کا راستہ ہے۔ اس لئے آپ اپنے ہی راستہ پہ چلئے۔

میری نظر میں تجارت کو جو چیز پسندیدہ بناتی ہے وہ مہم جوئی اور بہادری ہے۔ وہ اپنے ہاتھ جوڑ کر جوپیٹر (برق و باراں کا دیوتا) کی پرستش نہیں کرتی۔ میں ان لوگوں کو ہر روز کم یا زیادہ قناعت اور ہمت کے ساتھ اپنے کام پہ جاتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ بیشتر لوگ ایسے کام کر رہے ہیں جن کا ان لوگوں کو گمان تک نہیں۔ شاید وہ اس سے بہتر کام میں مصروف ہیں جسے وہ ارادتاً اپنے لئے مخصوص کرتے ہیں۔ میں ان لوگوں کی بہادری سے بالکل متاثر نہیں ہوتا۔ جو بیونا وستا میں اگلے مورچوں پہ آدھ گھنٹہ تک کھڑے رہے تھے بلکہ ان کی جرأت سے زیادہ متاثر ہوتا ہوں جو موسم سرما میں برفانی وادی کو اپنا مسکن بنا لیتے ہیں۔ جو نہ صرف صبح کے تین بجے والی ہمت رکھتے ہیں جس کے بارے میں نپولین بوناپارٹ نے کہا تھا کہ یہ بہت ہی نایاب ہے بلکہ جلد نہ سو جانے والی ہمت رکھتے ہیں۔ وہ اس وقت سوتے ہیں جب طوفان سو جاتا ہے یا جس کے آہنی گھوڑے کے اعضا برف کی طرح منجمد ہو جاتے ہیں۔ شدید برفباری کی اس صبح کو جو غالباً اب بھی ہو رہی ہے۔ اور انسان کی رگوں میں لہو جما رہی ہے۔ میں ان کے انجن کی گھنٹی کی بھرائی ہوئی آواز سن رہا ہوں۔ جو اُن کی

ٹھنڈی سانسوں کے کہرے سے نکل کر میرے کانوں تک پہنچ رہی ہے۔ یہ آواز اعلان کر رہی ہے کہ نیو انگلینڈ کے شمال مشرقی برفانی طوفان کے حکم امتناعی کے باوجود ریل گاڑیاں بلا تاخیر آ رہی ہیں۔ اور میں ہل چلانے والوں کو دیکھتا ہوں جو برف اور کہرے میں لپٹے ہوئے اپنے ہل کی بھالی کے اوپر سے جھانکتے ہیں۔ اور جو ڈینڈیلوں (پھول)، اور کھیت کے چوہوں کے بلوں کے علاوہ ہر اس چیز کو جو اس کائنات کی بیرونی جگہ گھیرے ہوئے ہے اکھاڑ کر پھینک دیتے ہیں۔ چاہے وہ چیز ہیرا نوادا کی چٹان کیوں نہ ہو۔

تجارت غیر متوقع طور پر خود اعتماد، متحمل مزاج، چوکس، مہم جو اور ان تھک ہے۔ اس کے طریقہ ہائے کار بہت ہی فطری ہیں۔ یعنی بیشتر مضحکہ خیز مہموں اور جذباتی تجربوں سے زیادہ قدرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسے نمایاں طور پر کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ جب کوئی مال گاڑی میرے قریب سے لڑکھڑاتی ہوئی گزرتی ہے تو میں تازگی اور وسعت محسوس کرتا ہوں۔ میں اس سامان کی خوشبو سونگھتا ہوں جو لانگ وہارف سے جھیل چمپلین تک فضا میں عطر بکھیرتا چلا جاتا ہے اور مجھے غیر ممالک کی، مونگے کی پہاڑوں کی، بحر ہند کی، گرم مرطوب ملکوں کی اور اس دنیا کی وسعتوں کی یاد دلاتا ہے جب میں کھجور کے ان پتوں کو دیکھتا ہوں جو آنے والی گرمیوں میں نیو انگلینڈ کے باشندوں کے کتنے ہی بھورے سروں کو ڈھانپیں گے۔ اور جب میں منیلا کا سن اور ناریل کی چھال، شکستہ چیزیں، اثاث کی بوریاں، ٹوٹا پھوٹا لوہا اور زنگ آلود کیل دیکھتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں سارے عالم کا شہری ہوں۔ گاڑی میں بھرے ہوئے پھٹے پرانے بادبان کاغذ اور چھپی ہوئی کتابوں میں تبدیل ہو جانے کی نسبت اس وقت زیادہ آسانی سے پڑھے جا سکتے اور زیادہ دلچسپ ہوتے ہیں۔ کون ان کے پھٹے ہوئے ٹکڑوں سے زیادہ وضاحت کے ساتھ ان طوفانوں کی تاریخ لکھ سکتا ہے۔ جن کا انہوں نے مقابلہ کیا ہے؟ یہ بادبان تو پروفوں کے وہ تاؤ ہیں۔ جن کو تصحیح کی ضرورت نہیں رہی۔ یہ دیکھئے مین کے

جنگلوں سے شہتیر چلے آ رہے ہیں جو پہلی دفعہ دریا میں بہا کر نہیں کھینچے گئے ہیں۔ جن کا بھاؤ فی ہزار چار ڈالر اس لئے بڑھ گیا کہ تیز دھارے میں بہا دیئے جانے کے باعث اُن میں سے کچھ شہتیر ضائع ہو گئے اور پھٹ گئے تھے۔ یہ صنوبر اور مختلف اقسام کے دیوداروں کے شہتیر یعنی اوّل، دوئم، سوئم اور چہارم اقسام کے شہتیر چند روز پہلے ایک ہی قسم کے تھے اور بھالو، موس ہرن اور برفانی ہرن کریبو کے سروں پر لہراتے تھے۔ اس کے بعد آنے والی گاڑی میں تھوماسٹن کا ان بجھا چونا بھاری تعداد میں جا رہا ہے۔ اسے دُور لے جا کر پہاڑیوں پر بجھایا جائے گا۔ گٹھڑیوں میں رنگ برنگے چیتھڑے ہیں۔ یہ ایسی حالت کو پہنچ چکے تھے جو روئی اور سنی کپڑے کی بُری طرح پھٹ جانے پر ہو جاتی ہے۔ یہ لباس کا آخری انجام ہیں۔ یہ ایسے نمونے ہیں جن کو اب مل والوں کے سوا کہیں بھی یہ تو رہا کر نہیں بیچا جا سکتا کہ یہ بہترین انگریزی، فرانسیسی اور امریکی ململ اور بیل بوٹوں والے کپڑے ہیں۔ ان چیتھڑوں کو امیروں اور غریبوں سے جمع کیا گیا ہے۔ ان سے ایک رنگ یا کئی رنگوں کا کاغذ بنایا جائے گا جس پر خدا جھوٹ نہ بلوائے تو اعلیٰ اور ادنیٰ طبقہ کے لوگوں کی حقیقی زندگی کے حقائق پر مبنی افسانے لکھے جائیں گے۔ اس بند گاڑی سے نمکین مچھلیوں کی بو آ رہی ہے۔ یہ نیو انگلینڈ کی تجارت کی تیز بو ہے جو مجھے گرینڈ بینکس اور ماہی گیری کے ٹھوں کی یاد دلاتی ہے۔ کس نے نمکین مچھلی نہیں دیکھی ہے۔ جسے اس دُنیا کے لئے اس طرح تیار کیا جاتا ہے کہ کوئی چیز اسے خراب نہیں کر سکتی۔ ان کے سامنے رشیوں منیوں کا استقلال بھی شرماتا ہے۔ آپ اس سے سڑک صاف کر سکتے ہیں یا اس کا فرش بنا سکتے ہیں۔ اس پر اپنی چپتیاں توڑ سکتے ہیں جس سے گاڑیبان اپنے اور اپنے مال کے لئے سائبان بنا سکتا ہے تاکہ بارش اور دھوپ سے بچ سکے۔ اور بیوپاری کنکارڈ کے ایک تاجر کے قول کے مطابق اُسے کاروبار شروع کرتے وقت شناخت کے لئے اپنے دروازے پر ٹانگ جا

سکتا ہے۔ وہ مچھلی اس حالت میں اتنے دن تک ٹنگی رہتی ہے کہ دوکان کا پرانے سے پرانا گاہک تک یہ نہیں بتا سکتا کہ یہ کوئی جانور ہے اتر کاری ہے یا کوئی دھات ہے اتنی مدت کے بعد بھی وہ برف کے گچھے کی طرح صاف رہتی ہے۔ اگر اسے کسی برتن میں ڈال کر ابالا جائے تو ایک ہلکے بھورے رنگ کی مچھلی تیار ہو جائے گی۔ جسے سنیچر کی رات کے کھانے پر کھایا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد کی گاڑی میں اسپین کی کھالیں ہیں۔ ان کے دموں میں ابھی تک بل باقی ہیں۔ اور ان کے نزدیک یہ کا وہی پہلو برقرار ہے جب وہ بیل جن کی یہ دمیں ہیں اسپینی مین کے گیا ستھانوں میں دوڑتے پھرتے تھے۔ یہ اینٹھی ہوئی دُمیں سو طرح کی اکڑ کا نمونہ ہیں اور اس بات کا ثبوت جیسا کرتی ہیں کہ جسمانی اور پیدائشی نقائص بڑی حد تک اصلاح کے قابل نہیں ہیں۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں جب عملی طور پر کسی کا صحیح مزاج جان جاتا ہوں۔ تو اسے بھلا یا بُرا بنانے کی کوئی اُمید نہیں رکھتا۔ مشرق کے لوگ کہتے ہیں کہ "کتے کی دُم کو لاکھ گرم کیجئے۔ اس پر لاکھ استری کیجئے یا اسے باندھ کر رکھئے پھر بھی بارہ برس کی شدید محنت کے بعد وہ اپنی اصلی حالت میں رہے گی!" یہ دُمیں جس قسم کی سختی ظاہر کرتی ہیں۔ اس کا واحد علاج یہ ہے کہ ان کی گوند بنائی جائے اور میرے خیال میں عام طور پر ان سے گوند ہی بنائی جاتی ہے۔ پھر یہ بالکل سیدھی ہو جائیں گی اور ایک جگہ چپکی ہوئی پڑی رہیں گی۔ یہاں شیری یا برانڈی سے بھرا ہوا ایک پیپا بھی ہے۔ جسے گرین ماؤنٹین کے تاجر جان اسمتھ کٹنگس و لے ورماؤنٹ کے نام بھیجا گیا ہے جو اپنی دوکان کے قریب رہنے والے کسانوں کے لئے اشیا درآمد کرتا ہے اور شاید وہ اس وقت بھی اپنے مال کے اوپر کھڑا سوچ رہا ہے کہ ساحل پر جو نئی نئی چیزیں آئی ہیں ان کا پلڑ نے مال کی قیمتوں پر کیا اثر پڑیگا۔ اور وہ اس لمحہ اپنے گاہکوں سے کہہ رہا ہوگا کہ جیسا کہ بیسیوں دفعہ کہہ چکا ہے کہ اگلی ریل گاڑی

سے بہترین چیزیں آ رہی ہیں۔ کلنگسس وِلے ٹائمز (اخبار) میں اس قسم کا اشتہار بھی شائع ہوتا ہے۔

جہاں ان چیزوں کے بھاؤ چڑھ جاتے ہیں وہاں دوسری چیزوں کے بھاؤ گر جاتے ہیں۔ زناٹے دار آواز سنتے ہی میں اپنی کتاب پر سے آنکھیں اٹھا کر دیکھتا ہوں کہ صنوبر کے لمبے لمبے پیڑ جن کو شمالی پہاڑیوں میں کاٹا گیا تھا۔ گرین ماؤنٹین اور کنکٹی کٹ کا راستہ طے کرتے ہوئے آئے ہیں۔ دس منٹ میں اس قصبے سے بھی یوں گزر جاتے ہیں کہ میرے سوا شاید ہی کسی دوسری آنکھ نے انہیں دیکھا ہو۔

"یہ کسی بڑے امیر البحر کے جہاز کا مستول بنیں گے"!

اور سنئے ــــ وہ سامنے مولشیوں سے بھری ہوئی ٹرین آ رہی ہے۔ ان کو ہزاروں پہاڑیوں، بھیڑوں کی پرورش گاہوں، اصطبلوں اور گائے بھینسوں کے باڑوں سے لایا جا رہا ہے۔ میری نظر کے سامنے محض ایک دست چرواہوں اور سانپوں کے ریوڑوں کے درمیان گذر رہے لڑکوں کی تصویر اس طرح پھر جاتی ہے جس طرح ستمبر کی آندھیوں میں پہاڑوں سے پتے اڑتے ہوئے آتے ہیں۔ بھیڑوں کے ممیانے اور بچھڑوں کے ڈکارنے، اور بیلوں کے دھکم پیل کی آواز سے فضا گونج رہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے چراگاہوں والی کوئی وادی قریب سے گزر رہی ہو۔ جب ان کے آگے مینڈھا جس کے گلے میں گھنٹی بندھی ہوتی ہے گھنٹی بجاتا ہے تو پہاڑ مینڈھوں کی طرح اچھلتے ہیں۔ اور چھوٹی پہاڑیاں میمنوں کی طرح پھدکتی ہیں۔ چرواہوں سے بھرا ہوا ایک ڈبہ ان کے درمیان میں ہے۔ ان کی حالت بھی ان کے ریوڑوں کی مانند ہے۔ ان کا دھندا ختم ہو چکا ہے لیکن وہ اپنے بے کار لاٹھیوں سے جو ان کے منصب کا نشان ہیں ابھی تک بے سود چمٹے ہوئے ہیں۔ لیکن ان کے کتے کہاں ہیں؟ ان کے لئے تو مولشیوں میں بھگدڑ مچ گئی ہے۔ وہ پیچھے رہ گئے ہیں اب تو وہ

ان مویشیوں کی بُو تک نہیں سونگھ سکتے۔ میرا خیال ہے کہ وہ پیڑ لوبو پہاڑیوں کے عقب میں بھونک رہے ہیں یا ہانپتے ہوئے گرین پہاڑیوں کی مغربی ڈھلان پہ چڑھ رہے ہیں۔ جب ان کی بھیڑوں کو ذبح کیا جائے گا تو وہ اس وقت وہاں موجود نہ ہوں گے۔ وہ بھی اپنا پیشہ کھو بیٹھے ہیں۔ اب ان کی وفاداری اور عقلمندی عام سطح سے بھی کم ہو گئی ہے۔ وہ نادم ہو کر اپنے اپنے سگ خانوں میں لوٹ جائیں گے یا شاید پھر وحشی ہو جائیں گے۔ اور بھیڑیے یا لومڑی سے جا ملیں گے۔ اس انداز سے چراگاہ والی زندگی آپ کے سامنے سے گزرتی ہے اور اوجھل ہو جاتی ہے۔ لیکن گھنٹیاں بجتی ہیں۔ مجھے پٹڑی سے ایک طرف ہٹ جانا چاہیئے تاکہ گاڑی گزر سکے۔

"میرے لئے ریل کی پٹڑی کی اہمیت کیا ہے۔
میں کبھی یہ دیکھنے کے لئے نہیں جاتا کہ
وہ کہاں ختم ہوتی ہے —
ریل کی پٹڑی چند گڑھوں کو پُر کر دیتی ہے۔
اور ابابیلوں کے لئے ٹیلے بناتی ہے —
ریت اڑاتی ہے — اور
سیاہ گوندنی اُگاتی ہے —"

لیکن میں اس پٹڑی سے یوں گزر جاتا ہوں جس طرح جنگل میں سے بیل گاڑی کی پگڈنڈی گزرتی ہے۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ اس کے دھوئیں، بھاپ اور اس کی شاں شاں سے میری آنکھیں اندھی اور میرے کان بہرے ہو جائیں۔

اب جبکہ ریل گاڑیاں جا چکی ہیں۔ اور ان کے ساتھ ساتھ مضطرب لوگ بھی چلے گئے ہیں۔ اور تالاب میں مچھلیاں ان ریل گاڑیوں کی گڑگڑاہٹ نہیں سن سکتیں۔ میں

میں اپنے آپ کو پہلے سے زیادہ تنہا محسوس کرتا ہوں۔ اس کے بعد طویل سہ پہر کے باقی حصے میں میرے انہماک میں شاہراہ پر کسی گاڑی کی کھڑکھڑاہٹ یا بیلوں کی جوڑی کے گذرنے ہی سے خلل پڑتا ہے۔

بعض اوقات میں اتواروں کو جب ہوا ذرا موافق ہوتی ہے۔ ننکن، ایکٹن، ایبٹس فورڈ یا کنکارڈ کی گھنٹیوں کی آواز سنتا ہوں۔ ہلکی ہلکی، شیریں شیریں جیسے کوئی قدرتی نغمہ جنگل میں در آمد کرنے کے لیے مفید ہو۔ جنگل میں خاصہ فاصلہ طے کرنے کے بعد یہ آواز ایک مرتعش گنگناہٹ بن جاتی ہے۔ جیسے افق میں صنوبر کے نکیلے پتے کسی بربط کے تار ہوں۔ اور ان پر ہوا کی انگلیاں دوڑ رہی ہوں۔ جو آواز حد ممکن تک دور تک سنائی دیتی ہے وہ ایک اور صرف ایک قسم کا تاثر پیدا کرتی ہے۔ ایک ہمہ گیر ساز کے ارتعاش کی مانند جیسے کسی دور کے ٹیلے کو درمیانی فضا نیلگوں رنگ عطا کر کے ہمارے لیے فرحت بخش بنا دیتی ہے۔ مجھے یہاں ایک ایسا نغمہ سنائی دیتا تھا۔ جیسے ہوا چھان کر صاف کر دیتی تھی جس نے جنگل کے ہر کانٹے اور ہر پتی سے بات کی تھی۔ یہ نغمہ اس آواز کا حصہ ہوتا تھا۔ جس میں عناصر نے زیر و بم پیدا کر دیا تھا۔ اور جو ایک وادی سے دوسری وادی میں گونج رہا تھا صدائے بازگشت بھی کسی حد تک حقیقی آواز ہوتی ہے۔ اور اس میں اس کی دلکشی اور سحر آفرینی مضمر ہے۔ وہ گھنٹی کے قابل تکرار حصوں کی تکرار نہیں بلکہ جزوی طور پر جنگل کی آواز ہوتی ہے۔ وہی معمولی الفاظ اور گیت جنہیں جنگل کی پری گا رہی تھی۔

شام کو جنگل کے اس پار دور افق سے کسی گائے کے ڈکرانے کی دلکش اور شیریں آواز آئی اور میں نے ابتدا میں یہ سمجھا کہ یہ آواز پہاڑی اور وادی میں بھٹکنے والے مغنیوں کی آواز ہے جن کے نغمے میں کبھی کبھی سنتا رہتا ہوں۔ لیکن جب وہ نغمہ طول پکڑ کر گائے کے ڈکرانے کی معمولی آواز میں تبدیل ہو گیا تو مجھے حقیقت سے آگاہ ہونے پر رنج ہوا۔ جب میں یہ کہتا ہوں کہ مجھے نوجوانوں کا گانا گائے کے ڈکرانے کی آواز کے

مترادف معلوم ہوتا ہے تو میں کوئی طنز نہیں کرتا۔ بلکہ نوجوانوں کو داد دیتا ہوں کیونکہ دونوں قدرت کی نغمہ سرائی کا ساتھ دیتے ہیں۔

گرمیوں کے ایک حصہ میں شام کی ٹرین جب باقاعدگی سے ساڑھے سات بجے جا چکی ہوتی تھی تو ابابیلیں میرے دروازے کے سامنے ایک ٹنڈ پر یا گھر کے باڑھ والے کھمبے پر بیٹھ کر مجھے آدھے گھنٹہ تک شام کی عبادت کے نغمے سنایا کرتی تھیں۔ وہ لوگ کی طرح غروب آفتاب کے ٹھیک پانچ منٹ بعد گانا شروع کر دیتی تھیں۔ مجھے ان کی عادتوں سے واقف ہونے کا نادر موقع میسر آیا۔ بعض اوقات میں چار یا پانچ ابابیلوں کو جنگل کے مختلف حصوں میں ایک ساتھ گاتا ہوا سنتا تھا۔ کوئی ایک تال پیچھے اور کوئی ایک تال آگے۔ وہ مجھ سے اس قدر قریب ہوتی تھیں۔ کہ ہر سُر کے بعد والی کٹ کٹ بھی میں سن لیتا تھا۔ میرے کانوں میں اس بھنبھناہٹ کی آواز بھی آتی تھی جو مکڑی کے جالے میں پھنسی ہوئی مکھی کی آواز سے ملتی جلتی ہے۔ لیکن یہ آواز نسبتاً زیادہ بلند ہوتی تھی۔ بعض اوقات کوئی ابابیل جنگل میں چند فٹ کے فاصلے پر میرے گرد لوں چکر کاٹتی رہتی تھیں۔ جیسے اُسے ڈوری سے کھینچا جا رہا ہو۔ غالباً یہ بات اسوقت ہوتی تھی جب میں اُس کے انڈوں کے قریب جا نکلتا تھا۔ وہ رات بھر تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد بولتی رہتی تھیں۔ اور پو پھٹنے سے پہلے یا اُس کے قریب ہمیشہ کی طرح مترنم ہو جاتی تھیں۔

جب دوسرے پرندے خاموش ہو جاتے ہیں تو بین کرنے والی عورتوں کے قدیم نغمہ اور نوحہ گر کی طرح اُلو اپنا راگ چھیڑ دیتے ہیں۔ اُن کی دلخراش چیخیں حقیقتاً بن مانس کی چیخوں کی مانند ہوتی ہیں۔ آدھی رات کی عقلمند چڑیلیں! یہ شاعروں کی نظم کی ہوئی صاف اور سیدھی ٹو ہو۔ ٹو ہو نہیں ہوتیں بلکہ مذاق کئے بغیر بڑی سنجیدگی سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ قبرستان کی المیہ راگنی ہوتی ہیں۔ خودکشی کر لینے والے عاشق و معشوق کی باہم تشفیاں ہوتی ہیں۔ جو جہنمی گوشوں میں سماوی عشق کی تکالیف اور مسرتوں

کو یاد رکھتے ہوئے خودکشی کرتے ہیں۔ اس کے باوجود میں ان کا شیدا ہوں اُن کے درد انگیز
نالے سننے کا شیدائی ہوں۔ جو وہ جنگل کے گوشوں میں الاپتے ہیں۔ اور وہ بعض اوقات
مجھے موسیقی اور نغمہ سرا پرندوں کی یاد دلاتے ہیں۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ موسیقی کے
تاریک اور اداس پہلو ہوں۔ وہ حسرتیں اور آہیں جن کا اظہار گانے کے پیرائے میں کیا جاتا
ہو اُن گنہگار روحوں کے غمگین اور حسرت ناک پچھتاوؤں کی پرچھائیاں ہیں۔ جو انسانی شکل
میں کبھی راتوں کو اس روئے زمین پر گھوم کر کالی کرتوتیں کیا کرتی تھیں۔ اور اب اپنے مقام گناہ
پر آہ و زاری کرکے اور ماتمی گیت گا کر گناہ کا کفارہ کر رہی ہیں۔ ان سے قدرت کے تنوع اور
اس کی صلاحیت کا ایک نیا شعور ملتا ہے۔ جو ہم سب کی اقامت گاہ ہے۔ اوہ ۔۔۔ اوہ ۔۔۔
کاش میں کبھی پیدا ہی نہ ہوا ہوتا۔ ! تالاب کے کنارے پر ایک اُلو سرد آہ بھر کر کہتا ہے۔
اور مایوسی اور اضطراب کے عالم میں چکر کاٹتا ہوا شاہ بلوط کے پرانے درخت کی کسی اور
شاخ پر جا بیٹھتا ہے۔ اس کے بعد کوئی دوسرا اُلو دور بیٹھا ہوا بڑی حسرت سے یہ بات
دہراتا ہے "کاش میں کبھی پیدا نہ ہوا ہوتا" پے۔ پے پیدا کی کمزور سی آواز لنکن
کے جنگل سے آتی ہے۔

مجھے ہُو ہُو کرنے والے اُلو نے بھی نغمے سنائے ہیں۔ اگر آپ اُسے قریب سے
سنتے ہیں تو آپ کو ایسا خیال گزرتا ہے کہ یہ قدرت کی بہت ہی غمگین آواز ہے۔ جیسے
قدرت نے جانکنی کے عالم میں انسان کی کراہوں کو مستقل اور غیر متبدل حالت میں
برقرار رکھنے کے لئے یہ آواز بنائی ہو۔ ایک ایسے غریب اور کمزور فانی انسان کی کراہ جس
کے ہاتھ سے امید کا دامن چھوٹ گیا ہو اور جو تاریک وادی میں قدم رکھتے ہی وحشیوں کی
طرح چیختا ہو۔ لیکن انسان کی طرح سسکیاں بھرتا ہو۔ ان سسکیوں کو غرغراہٹ کا ترنم اور بھی
ہولناک بنا دیتا ہے۔ میں جب اس آواز کی نقل کرتا ہوں تو میں اُسے گ م کے حروف سے
شروع کرتا ہوں۔ یہ غالباً اس دماغی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے جو اتنی گل سڑ گئی ہے کہ پہلے

لگی ہے اور اس سے تمام صحت مند اور پُر شجاعت خیالات میں پھپھوندی لگ گئی ہے۔
یہ آواز مجھے مخبولوں احمقوں اور مجنونانہ چیخوں کی یاد دلاتی ہے۔ لیکن اب دُور جنگل میں
کوئی اُلّو ایک ایسی لے میں بول رہا ہے کہ دُوری نے اس کی آواز کو واقعی ترنم ریز بنا دیا ہے
ہُو ہُو۔ ہُو۔ ہُوسر۔ ہُو رر۔ اسے سُن کر اچھے اچھے خیالات سُوجھتے ہیں۔ چاہے یہ دِن کو
سنائی دے یا رات کو، موسم سرما میں سنائی دے یا موسم گرما میں۔

مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ دُنیا میں اُلّو بھی ہیں۔ ان کو انسانوں کے لئے احمقانہ
اور مجنونانہ چیخیں بلند کرنی چاہئیں۔ یہ آواز دلدلوں اور جنگلوں کے لئے جن کو دن کبھی
روشن نہیں کرتا نہایت موزوں ہے۔ اور یہ آواز اس وسیع اور کم ترقی یافتہ قدرت
کی طرف اشارہ کرتی ہے جس کو انسانوں نے ابھی تک پہچانا ہی نہیں ہے۔ یہ آوازیں
اس شدید دھندلکے اور ان غیر مطمئن خیالات کی نمائندگی کرتی ہیں جو سب کے دلوں میں
موجود ہیں۔ سارا دن سورج ایک ایسی جنگلی دلدل پر چمکتا رہا ہے جہاں کائی سے لتھڑا ہوا
صنوبر کا تنہا درخت کھڑا ہے چھوٹے چھوٹے شہباز اس کے اوپر چکر لگا رہے ہیں۔ اور
پیکاڈی سدا بہار پیڑوں میں بول رہا ہے۔ اور تیتر اور خرگوش اس کے نیچے دبکے بیٹھے
ہیں۔ لیکن اب ایک زیادہ تاریک۔ اور موزوں دن نکلتا ہے۔ اور مخلوقات کی ایک مختلف
نسل قدرت کے معانی بیان کرنے کے لئے بیدار ہو جاتی ہے۔

میں نے بہت رات گئے پُلوں پر ریل کے ڈبوں کی دُور سے آتی ہوئی کھڑکھڑاہٹ
کی آواز سُنی۔ یہ وہ آواز ہے جو رات کو دوسری تمام آوازوں سے زیادہ دُور تک سنائی
دیتی ہے کبھی کبھی کتوں کے بھونکنے اور دُور افتادہ باڑے سے کسی [illegible] کے
ڈکرانے کی آواز بھی سنائی دے جاتی۔ دریں اثنا سارے ساحل مینڈکوں [illegible]
سے گونجنے لگے۔ یہ مینڈک شاید پرانے شرابیوں اور پیکڑوں کی بھاری بھرکم روحیں
جو ابھی تک پشیمان نہیں [illegible]۔ بلکہ تاریک جھیل میں گانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ [illegible]

کہ والڈن کی جھیل پر پانی اور ہوا نہ کا بُرا نہیں مانیں گی کیونکہ اس جھیل میں اگر جھاڑ جھنکار نہیں ہے تو مینڈک ضرور ہیں۔ کون ان کی ضیافتوں کے شور انگیز نغموں کو برقرار رکھ سکتا ہے۔ کیونکہ ان کی آوازیں بیٹھ چکی ہیں اور سنجیدگی سے ہنسی اڑاتے اڑاتے انتہائی بیہودہ ہو گئی ہیں۔ اور شراب اپنا ذائقہ کھو کر ایسی شراب بن گئی ہے جس کے پینے سے توند پھول آتی ہے۔ اور کیف آفریں نشہ ماضی کی یاد بھلا دینے میں مددگار ثابت نہیں ہوتا۔ اب تو وہ سرتاپا شرابور ہیں، پانی میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اور پھولتے جا رہے ہیں۔ ان میں سے ایک مینڈک جس کی صورت ایلڈرمین جیسی ہوتی ہے اپنی ٹھوڈی ایک دل نما پتی پر ٹکا لے (جو اس کے جبڑوں کے لئے جھالر کا کام دیتی ہے)۔ شمالی ساحل میں اس پانی کا ایک لمبا گھونٹ بھرتا ہے جسے وہ کبھی نفرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور "ٹر۔ ٹر۔ ٹرونک۔ ٹر۔ ٹر۔ ٹرونک!" کی صدا لگاتا ہوا پیالہ آگے بڑھا دیتا ہے اور کسی کھاڑی سے پانی کے اوپر سے ہوتی ہوئی یہی آواز پھر آتی ہے۔ کیونکہ رتبہ اور جسامت کے اعتبار سے دوسرے درجہ پر فائز مینڈک منہ میں پانی انڈیل کر یہی صدا لگاتا ہے کہ سارے کناروں پر یہ آواز دہرائی جاتی ہے۔ اس کے بعد ناظم تقریب بڑے اطمینان سے "ٹر۔ ٹر۔ ٹرونک" کی صدا لگاتا ہے۔ پھر ہر کوئی باری باری حتیٰ کہ سب سے کم پھیلا ہوا، رستا ہوا اور سب سے چھوٹی توند والا مینڈک بھی یہ آواز اس لئے دہراتا ہے کہ کوئی غلطی نہ رہ جائے۔ جام کا دور بار بار یوں ہی چلتا رہتا ہے یہاں تک کہ سورج صبح کی دھند کو منتشر کر دیتا ہے۔ اس کے بعد صرف برگزیدہ مینڈک تالاب پر رہ جاتا ہے اور کبھی کبھی "ٹر۔ ٹرونک" کی رٹ لگا کر اپنے باقی ساتھیوں کے جواب کا منتظر رہتا ہے۔

میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ میں نے اپنے میدان سے کسی مرغ کو بانگ دیتے ہوئے بھی سنا ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ مجھے ایک مرغ گانے والے پرندہ کی حیثیت سے صرف اس کی موسیقی کی خاطر پال لینا چاہیئے۔ مرغ جو کسی زمانہ میں جنگلی انڈین تیتر تھا۔ اس کی آواز یقیناً ہر پرندے سے زیادہ انوکھی ہے۔ اگر ان کو پالتو جانور بنانے کی بجائے قدرتی

طور پر آزاد چھوڑ دیا جائے تو شاید اس کی آواز بہت جلد جنگل کی سب سے نمایاں آواز بن جائے۔ بطخوں کی قائیں قائیں اور اُلو کی ہُوہُو سے بازی لے جائے۔ اور پھر ذرا یہ سوچیے کہ مرغیوں کی کُڑکُڑاہٹ وقفوں میں کتنی دلآویز ہوگی جب اُن کے خاوند اپنے بگل بجا چکے ہوں گے! اسی وجہ سے انسان نے اپنے پالتو جانوروں کے جھنڈ میں اس پرندے کو شامل کر لیا۔ اس پر طرہ یہ ہے کہ انڈے اور اُن کی ٹانگیں کھانے کو ملتی ہیں۔ ذرا خیال تو کیجیے آپ کو کتنا مزا آتا اگر اُس جنگل میں موسم سرما کی صبح کو گھومتے جس میں مرغ بکثرت ہوتے اور جنگلی مرغوں کو درختوں پر بانگ دیتے ہوئے سنتے۔ گونجتی ہوئی زمین پر اُن کی صاف اور میٹھی بانگ جس میں دوسرے پرندوں کے نغمے دب کر رہ جاتے۔ یہ آواز ملکوں کو چوکس کر سکتی ہے۔ بھلا کون ایسا شخص ہے جو صبح سویرے نہیں اُٹھنا چاہے گا۔ اور اپنی عمر کے ہر نئے آنے والے دن اس سے بھی تڑکے اُٹھ کر صحت مند، دولت مند اور عقلمند بننا نہیں چاہے گا؟ تمام ملکوں کے شاعروں نے اس غیر ملکی پرندے کی بانگ کی اپنے وطن کے پرندوں کے نغموں کے ساتھ ساتھ تعریف کی ہے اس جری مرغ کو ہر طرح کی آب و ہوا راس آجاتی ہے۔ وہ ملک کے پرندوں سے بھی زیادہ دیسی ہے۔ اُس کی صحت ہمیشہ اچھی رہتی ہے۔ اس کے پھیپھڑے تندرست ہیں اور اُس کے جوش و خروش میں کبھی کمی واقع نہیں ہوتی۔ بحر اوقیانوس اور بحر الکاہل کا ملاح بھی اس کی آواز پر بیدار ہو جاتا ہے لیکن اُس کی تیکھی آواز نے مجھے کبھی خواب غفلت سے بیدار نہیں کیا میں نے کوئی کتا، بلی، گائے، سؤر اور مرغی نہیں پالی تھی۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ میرے ہاں گھریلو آوازوں کی کمی تھی۔ میرے ہاں جی بہلانے کے لئے نہ چھاچھ بلونے والی مَتھنی تھی اور نہ چرخہ تھا، نہ گنگناتی ہوئی کیتلی تھی اور نہ سی سی کی آواز پیدا کرنے والا چولھا تھا۔ نہ بچوں کا شور تھا۔ ایک پرانے خیال کا آدمی کبھی کا پاگل ہو گیا ہوتا یا اس بے کیفی کے باعث مر گیا ہوتا۔ میری دیواروں میں چوہے تک نہیں تھے۔ یا تو وہ فاقہ کشی کے مارے بھاگ گئے تھے یا ان کو لالچ دے کر اندر لانے والی کوئی چیز ہی نہیں تھی۔ چھت کے اوپر یا نیچے صرف گلہریاں تھیں

ایڑے کھمبے پہ ایک ابابیل تھی۔ کھڑکی کے نیچے شور مچانے والا نیل کنٹھ تھا۔ مکان کی
اساس میں ایک خرگوش یا گلہری۔ یا مکان کے پیچھے ایک اُلو تھا۔ جنگلی بطوں کا ایک جھنڈ
تھا یا تالاب پہ قہقہہ کرنے والی مرغابی تھی اور رات کو ایک لومڑی چلاتی تھی۔ کرلی
لوا یا اور ریول (سیاہ پرندوں والا پرندہ) یعنی وہ حلیم الطبع پرندے جو آبادیوں
میں رہتے ہیں۔ میرے صاف کئے ہوئے جنگل کے میدان میں کبھی نہیں آئے تھے۔
میرے صحن میں کوئی مرغ بانگ نہیں دیتا تھا اور نہ مرغیاں کڑکڑاتی تھیں۔ آپ
گھر میں کبھی صحن رکھئے ہی نہیں۔ قدرت کو بلا روک ٹوک اپنی دہلیز تک آنے دیجئے۔
آپ اپنی کھڑکیوں کے نیچے ایک نوخیز جنگل اُگنے دیجئے۔ اپنے تہہ خانہ میں جنگلی
سماق اور سیاہ گوندنی کی بیلیں آنے دیجئے۔ گر کی تنگی کے باعث لینے شہتیروں
اور سیاہ صنوبروں کو آپس میں رگڑ کھانے دیجئے۔ ان کی جڑوں کو مکان کے نیچے
تک آنے دیجئے۔ اس کی بجائے کہ آندھی سے آپ کے مکان کا روشن دان یا کھڑکی
کا پٹ ٹوٹ کر گرے آپ اپنے مکان کے پیچھے کسی صنوبر کے درخت کو ٹوٹنے یا جڑ سے
اکھڑنے دیجئے تاکہ وہ آپ کے لئے ایندھن مہیا کرے۔ اس کی بجائے کہ شدید برفباری
میں آپ کے گھر کے پھاٹک تک جاتا ہوا صحن کا راستہ ہی باقی نہ رہے۔ آپ کوئی پھاٹک
کوئی سامنے کا صحن اور مہذب دنیا تک جانے والا کوئی راستہ ہی نہ رکھئے۔
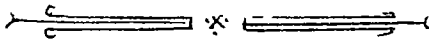
تنہائی

یہ شام بہت ہی خوشگوار ہے ۔ سارا جسم صرف ایک ہی حس بن گیا ہے اور یہ تمام
ہر رگ و پے میں مسرت کی لہر دوڑ رہی ہے ۔ میں قدرت کی گود میں عجیب آزادی کے
ساتھ آ جا رہا ہوں جیسے میں قدرت ہی کا جزو ہوں ۔ میں تالاب کے پتھریلے کنارے
پر صرف پوری آستینوں والی قمیص میں ٹہل رہا ہوں ۔ اگرچہ ٹھنڈک بھی ہے ، ابر بھی ہے اور
ہوا بھی تیز چل رہی ہے اور مجھے اپنی طرف کھینچنے والی کوئی خاص چیز بھی نظر نہیں
آ رہی ہے لیکن پھر بھی سارے عناصر خلافِ معمول مجھ سے بڑے تپاک کے ساتھ پیش
آ رہے ہیں ۔ بڑے مینڈک رات کی آمد کا اعلان کرنے کے لئے اپنے بگل بجاتے ہیں ۔
اور تالاب پر سے آتی ہوئی اٹھلاتی ہوئی ہوا کے دوش پر سوار ابابیل کا نغمہ مجھ تک
پہنچتا ہے ۔ بید اور درخت حور ک کھڑکھڑاتی پتیوں سے اظہار ہمدردی کے لئے میرا
دل بھی تھپیڑے تو کھاتا ہے مگر مسئلہ ختم نہیں ہوتا ۔ شام کی ہوا سے جو چھوٹی چھوٹی
لہریں ابھرتی ہیں ۔ وہ طوفان سے اتنی ہی مختلف ہیں جتنی چمکتی ہوئی ہموار سطح ۔ اگرچہ
اس وقت اندھیرا ہو چکا ہے لیکن ہوا ہے کہ پھر بھی چل رہی ہے اور جنگل میں شور پیدا کر رہی
ہے ۔ ... میں جیسی ٹکرا رہی ہیں ۔ اور لطف یہ ہے کہ دوسرے جانداروں کو لوریاں دے کر

سلامت رہے ہیں۔ آرام کبھی مکمل نہیں ہوتا۔ زیادہ تر تو جانور آرام نہیں کرتے۔ وہ اس وقت اپنے شکار کی تلاش میں نکلتے ہیں۔ لومڑی، جنگلی بلی اور خرگوش اب کھیتوں اور جنگلوں میں بلا خوف و خطر گھومتے ہیں۔ قدرت کے پہریدار ہیں وہ ان سلسلہ ہائے ایام کی کڑیاں ہیں۔ جب پہلے پہل وجود میں آئے تھے۔

جب میں اپنے مکان میں واپس آتا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں کہ چند لوگ میرے ہاں آئے تھے اور اپنے ملاقاتی کارڈ چھوڑ گئے ہیں، پھولوں کا ایک گچھا یا پھولوں کا ہار، یا انردٹ کے پیڑ کے زرد پتے یا لکڑی کے ٹکڑے پر پنسل سے لکھا ہوا نام۔ جو لوگ جنگل میں کبھی کبھار آتے ہیں۔ وہ جنگل کی کوئی نہ کوئی چھوٹی سی چیز ہاتھ میں اٹھا لیتے ہیں۔ تاکہ وہ راستہ میں اس سے کھیلتے رہیں۔ اور جہاں جاتے ہیں وہاں جان بوجھ کر یا اتفاقاً اسے چھوڑ آتے ہیں۔ ایک نے بید کی چھال چھیل کر اس سے ایک انگوٹھی بنالی تھی اور اسے میری میز پر گرا گیا تھا۔ میں ہمیشہ یہ بات بتا سکتا ہوں کہ میری غیر حاضری میں لوگ مجھ سے ملنے آئے تھے۔ یا ٹہنیاں یا گھاس مڑی تڑی ہوتی تھی یا ان کے جوتوں کے نشان ابھرے ہوئے تھے۔ وہ ریل کی پٹڑی پر آدھے میل تک کوئی نہ کوئی نشان ضرور چھوڑ جاتے تھے جس سے ان کی جنس، یا عمر یا ان کی حیثیت کا پتہ چل جاتا تھا۔ یعنی وہ کوئی نہ کوئی پھول گرا جاتے تھے گھاس کا گچھا نوچ کر پھینک جاتے تھے۔ سگار یا پائپ کی بو چھوڑ جاتے تھے۔ یہی نہیں اگر کوئی مسافر ساٹھ جریب کے فاصلے پر بنا ہوا شاہراہ سے گذرتا تھا تو اس کی بو سے مجھے کبھی کبھی اس کی آمدورفت کا علم ہو جاتا تھا۔

عام طور سے ہمارے اردگرد کافی جگہ ہوتی ہے۔ ہمارا افق ہماری کہنی کے قریب نہیں ہوتا۔ گھنا جنگل یا تالاب عین ہمارے دروازے کے سامنے نہیں ہوتا۔ ہمیں کچھ نہ کچھ ہمیشہ کاٹ کر صاف کرنا پڑتا ہے۔ جس کے ہم خوگر ہو جاتے ہیں۔ اور جسے ہم استعمال میں لاتے، قدرت سے چھین لیتے اور اس پر قبضہ جما لیتے ہیں۔ اس کے گرد کوئی نہ

کوئی باندھ لگا دیتے ہیں۔ کیا سبب ہے کہ اتنا وسیع علاقہ اور حلقہ یعنی چند مربع میل کا جنگل جہاں کوئی نہیں آتا لوگوں نے میرے لئے چھوڑ رکھا ہوا ہے۔ میرا نزدیکی پڑوسی مجھ سے ایک میل کے فاصلہ پہ رہتا ہے۔ میرے مکان سے آدھے میل کے فاصلہ پہ کوئی مکان دکھائی نہیں دیتا تھا۔ البتہ پہاڑی کی چوٹی پہ چڑھنے سے کچھ مکانات نظر آتے ہیں۔ جنگلات سے گھرا ہوا میرا افق صرف میرا ہے۔ ایک طرف دور ریل کی پٹڑی تھی۔ جہاں وہ تالاب کو چھوتی ہے اور دوسری طرف جنگل والی سڑک کے گرد باڑھ نظر آتی ہے۔ میں جہاں رہتا ہوں وہاں اکثر اتنی تنہائی ہوتی ہے جتنی گیاستھانوں میں ہوتی ہے۔ یہ مقام نیو انگلینڈ ہے اور ایشیا اور افریقہ۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میرا اپنا سورج اپنا چاند اور اپنے ستارے ہوں۔ اور یہ چھوٹی سی دنیا میری اور صرف میری ہے۔ رات کو میرے گھر کے قریب سے کوئی مسافر نہیں گذرتا تھا یا میرے دروازے پہ دستک نہیں دیتا تھا جیسے میں اس دنیا کا پہلا اور آخری انسان تھا۔ ہاں موسم بہار میں لمبے لمبے وقفوں کے بعد کوئی نہ کوئی شخص گاؤں میں پاؤٹ مچھیوں کا شکار کھیلنے کے لئے آجاتا ہے۔ ایسے لوگ اپنی فطرتوں کے والڈن تالاب ہی میں شکار کھیلتے ہیں۔ اور اپنی ہنسی کے کانٹے میں اپنی جہالت کا چارہ لگاتے ہیں۔ لیکن فوراً ہی اپنے ساتھ ہلکی ہلکی ٹوکریاں لے کر چلے جاتے ہیں۔ اور دنیا کو میرے یا تاریکی کے حوالے کر جاتے ہیں۔ اور رات کے مرکز کو کوئی انسان ہمسایہ کبھی متعفن نہیں کرتا۔ مجھے یقین ہے کہ انسان ابھی تک تاریکی سے ذرا ڈرتا ہے تاہم جادوگرنیوں کو پھانسی دی جا چکی ہے اور عیسائیت اور موم بتیاں رائج ہو چکی ہیں۔

اس کے باوجود بعض اوقات یہ بات میرے تجربہ میں آئی ہے کہ انسانی صحبت سے اور نہایت ہی افسردہ لوگوں کو فطرت کی کسی نہ کسی چیز میں انتہائی شیریں، نرم و نازک نہایت ہی معصوم اور حوصلہ افزا رفاقت میسر آتی ہے۔ جس

شخص کے ہوش و حواس ابھی تک برقرار ہیں۔ اور جو قدرت کے درمیان رہتا ہے کبھی
اس قدر افسردہ نہیں ہو سکتا۔ کوئی ایسا طوفان کبھی نہیں اٹھتا جو ایک معصوم اور صحت مند
کان کو ایولین کی موسیقی کی طرح بھلا نہ لگتا ہو۔ کو [illegible] سادہ اور جری انسان کو کوئی
طاقت ادنیٰ قسم کی افسردگی پر مجبور نہیں کر سکتی۔ جب تک مجھے موسموں کی
دوستی حاصل ہے تب تک کوئی طاقت میری زندگی کو میرے لئے بوجھ نہیں بنا
سکتی۔ یہ ہلکی بارش جو میرے سیم کے کھیتوں کی سینچائی کر رہی ہے اور جس کی
وجہ سے میں آج گھر کے اندر رہنے پر مجبور ہوں بے کیف نہیں بلکہ میرے لئے
بہت اچھی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ مجھے کھیت کی گوڑائی سے روکتی ہے لیکن یہ اس
کھیت کی گوڑائی سے زیادہ بیش قیمت ہے۔ اگر یہ بارش اتنے دن بھی جاری رہے کہ زمین میں
بیج اور کیاریوں میں آلو گل سڑ جائیں تو بھی وہ بالائی میدانوں کی گھاس کے لئے مفید ہوگی اور جب
گھاس کو فائدہ پہنچے گا تو مجھے بھی فائدہ ہوگا۔ بعض اوقات جب میں دوسرے لوگوں سے اپنا موازنہ
کرتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دوسروں سے دیوتا مجھ پر ان سے زیادہ مہربان ہیں۔ جتنا میرا حق
ہے اس سے بھی زیادہ۔ جیسے انہوں نے اپنے ہاتھوں سے مجھے ایک ایسا اقرار نامہ لکھ دیا ہے
جیسا دوسروں کے پاس نہیں ہے۔ وہ میری رہنمائی کرتے ہیں اور حفاظت بھی۔ میں
اپنے منہ میاں مٹھو نہیں بن رہا ہوں لیکن اگر ایسا ہے تو دیوتا میری قصیدہ خوانی
کر رہے ہیں۔ [illegible] تنہائی نے مجھے کبھی اتنا پریشان نہیں کیا۔ صرف ایک بار
جنگل میں آنے کے چند ہفتے بعد ایک گھنٹہ کے لئے میرے دل میں شک پیدا ہوا تھا
کہ کیا ایک پرسکون اور صحت مند زندگی کے لئے کسی انسان کی قربت ضروری نہیں
ہے؟ تنہا رہنا خوشگوار نہیں ہوتا۔ لیکن اس وقت مجھے یہ احساس بھی تھا کہ میرے
مزاج میں تھوڑا سا پاگل پن ہے۔ اور ایسا بھی دکھائی دیتا تھا کہ میرا یہ مرض بہت
جلد ختم ہو جائے گا۔ بارش میں سب ان خیالات کا تانتا بندھا ہوا تھا [illegible] قدرت کی

گود میں شیریں اور فائدہ مند ملازم کا احساس ہوا۔ رم جھم بوندوں، گھر کے چار سُو ہر منظر
اور ہر آواز میں مجھے ایک لامحدود اور بے غرض دوستی کا احساس ہوا۔ گویا پورا ماحول مجھے
اس طرح سنبھالے ہوئے تھا اور مجھے یوں قوت عطا کر رہا تھا کہ اس کے مقابلہ میں انسان
کی ہمسائگی کے مفروضہ فوائد غیر حقیقی معلوم ہونے لگے اور اس کے بعد مجھے کبھی اس قسم کا خیال
نہیں آیا۔ صنوبر کا چھوٹا کانٹا بھی میری ہمدردی اور دوستی سے پھیل کر پھول جاتا۔ وہ مناظر
بھی جن کو ہم عام طور سے وحشتناک اور بے کیف کہتے ہیں۔ مجھے اس چیز کا احساس دلاتے
تھے جس سے میرا روحانی رشتہ تھا۔ میں یہ بھی محسوس کرتا تھا کہ مجھ پر سب سے زیادہ
مہربان اور میرا نزدیکی عزیز جس سے میرا خون کا رشتہ ہو کوئی انسان نہیں تھا۔ میرا کوئی
ہم قصبہ نہیں تھا بلکہ خود فطرت تھی۔ چنانچہ کوئی مقام میرے لئے اجنبی نہ رہا۔

"اے ٹاسکر کی حسین و جمیل بیٹی!
غم زدہ لوگوں کو رنج و غم بے وقت ہی کھا جاتے ہیں۔
زندہ انسانوں کی دنیا صرف چند روزہ ہے"

موسم بہار یا موسم خزاں میں طویل طوفانی بارشوں کے دوران میں میرے لئے وہ چند
گھنٹے سب سے زیادہ کیف آفریں ہوتے تھے جب مجھے سہ پہر تک مجبوراً گھر میں رہنا
پڑتا تھا۔ ایسے لمحات میں مجھے بوندوں کے ٹپ ٹپ گرنے اور ان کے شور سے
بڑی تسکین ہوتی تھی۔ وقت سے پہلے دھندلکا پھیل جانے کے بعد جب شام آتی تو
بہت سے خیالات میرے ذہن میں آکر جاگزیں ہو جاتے اور ان میں برگ و بار آجاتے
تھے۔ ان مشرقی بارشوں کی بوچھاروں میں جو گاؤں کے مکانوں کے لئے پوری آفت ہوتی
تھیں اور جن میں دو دوشیزہ لڑکیاں ہاتھ میں جھاڑو اور بالٹی لئے ہوئے اس لئے دروازے
پر تیار رہتی تھیں کہ بارش کا پانی اندر نہ آنے پائے۔ میں اپنے چھوٹے سے مکان میں،
جو بس دروازے پر ہی مشتمل تھا، دروازے کے پیچھے بیٹھا رہتا تھا اور اس طرح

جو تحفظ ملتا تھا اُس سے بہت لطف اندوز ہوتا تھا۔ ایک دفعہ جب بادل زور سے گرج گرج کر برس رہے تھے تالاب کے اُس پار ایک کالے صنوبر پر بجلی گری اور اُس نے درخت میں تقریباً ایک انچ لمبا اور چار انچ چوڑا ایک بہت ہی نمایاں اور چکردار شگاف بنا دیا۔ جیسا سیر کے لئے استعمال ہونے والی چھڑیوں میں بنایا جاتا ہے۔ چند روز ہوئے میں اُدھر سے گزرا اور اس شگاف کو جو پہلے سے بھی زیادہ نمایاں ہو گیا تھا تعجب سے دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ یہ وہی مقام ہے جہاں پر اب سے آٹھ برس پہلے بے ضرر آسمان سے ایک ہولناک اور ناقابلِ مزاحمت بجلی گری تھی۔ لوگ مجھ سے اکثر یہ کہتے ہیں ”میرا خیال ہے آپ وہاں تنہائی محسوس کرتے ہوں گے۔ آپ کا جی چاہتا ہوگا کہ آپ لوگوں کے نزدیک رہیں۔ خاص طور پر بارش اور برف کے دنوں میں اور راتوں کو۔“ میں ایسے لوگوں کو جواب دینا چاہتا ہوں — یہ ساری دُنیا جس میں ہم رہتے ہیں خلا میں صرف ایک نقطہ ہے۔ آپ دُور اُس ستارے کو لیجیئے جس کی قوس کی وسعت کا اندازہ ہمارے آلات نہیں لگا سکتے اور بتایئے کہ آپ کے خیال میں اس کے دو انتہائی دُور رہنے والے ایک دوسرے سے کتنی دُور رہتے ہوں گے؟ میں تنہائی کیوں محسوس کروں؟ کیا ہمارا ستارہ کہکشاں میں نہیں ہے؟ آپ مجھ سے جو سوال پُوچھتے ہیں وہ مجھے زیادہ اہم سوال معلوم نہیں ہوتا۔ بھلا وہ جگہ کیا ہو سکتی ہے جو ایک انسان کو اپنے ساتھیوں سے جُدا کر کے تنہائی سے دوچار کر دیتی ہے؟ میں نے یہ دیکھا ہے کہ ٹانگوں کو کتنی ہی زحمت کیوں نہ دی جائے وہ دو انسانوں کو ایک دوسرے سے زیادہ قریب نہیں لا سکتیں۔ ہم کس چیز کے زیادہ قریب رہنا چاہتے ہیں؟ یقیناً بہت زیادہ آدمیوں، ریلوے اسٹیشن، ڈاک خانہ، شراب خانہ، جلسہ گاہ، اسکول کی عمارت، پنساری کی دوکان، بیکن ہل یا فائیو پوائنٹس کے قریب نہیں رہنا چاہتے۔ جہاں لوگ بہت زیادہ جمع ہوتے ہیں بلکہ ہمیشہ رواں دواں رہنے والے اور حیات بخش چشمہ کے قریب

رہنا چاہتے ہیں کیونکہ مجھے تجربہ سے یہی معلوم ہوا کہ ہم ہمیشہ سرچشمہ حیات کی طرف راجع ہوتے ہیں جس طرح پانی کے قریب کھڑا بید کا درخت پانی کی طرف ہی اپنی جڑیں پھیلاتا ہے۔ مختلف فطرتوں کے لوگوں کے سلسلے میں یہ مقام بدلتا رہتا ہے۔ لیکن یہ وہی مقام ہے جہاں ایک عقلمند آدمی اپنا تہہ خانہ کھودے گا . . . . . . ایک دن شام کو میں نے اپنے ایک ہم قصبہ کو والڈن روڈ پر پیچھے سے جا لیا۔ اُس نے لوگوں کے کہنے کے مطابق "اچھی خاصی جائیداد" پیدا کر لی تھی۔ گو میں نے اس کی جائداد کو اچھی طرح نہیں دیکھا تھا۔ وہ بیلوں کی جوڑی منڈی لے جا رہا تھا۔ اُس نے مجھ سے پوچھا کہ میرا ذہن زندگی کے اتنے آرام چھوڑنے کے لئے کیسے تیار ہو گیا؟ میں نے جواب دیا "مجھے یقین ہے کہ میں ان آراموں کو ترک کر دینا ہی زیادہ پسند کرتا ہوں" میں کوئی مذاق نہیں کر رہا تھا۔ میں گھر چلا آیا اَور اپنے بستر پر دراز ہو گیا۔ اَور اسے کیچڑ اَور تاریکی میں برائٹن یا برائٹ ٹاؤن کی طرف اپنا رستہ ناپتا ہوا چھوڑ آیا جہاں وہ کسی وقت صبح پہنچا ہو گا۔

مرنے والے شخص کو اگر یہ توقع ہو کہ وہ پھر بیدار ہو گا یا دوبارہ جنم لے گا تو اُس کے لئے سارے اوقات اَور مقامات میں کوئی فرق نہیں رہے گا۔ یہ بیداری جس جگہ ظہور میں آئے گی وہ ہمیشہ ایک ہی اَور ہمارے تمام احساسات کے لئے ناقابلِ بیان طور پر خوشگوار ہو گی۔ ہم بیشتر اوقات ظاہری اَور عارضی حالات کو اپنی زندگی کے مواقع بنا لیتے ہیں۔ تمام چیزوں کے نزدیک ایک ایسی قوت ہے جو اِن کو وجود میں لاتی ہے۔ ہمارے نزدیک ہی عظیم ترین قوانین کو مسلسل بروئے کار لایا جا رہا ہے۔ ہمارے نزدیک وہ مزدور نہیں ہے جسے ہم نے اُجرت پر رکھا ہے اَور جن سے باتیں کرنا ہمیں بہت مرغوب ہے۔ بلکہ وہ اخلاق ہمارے نزدیک ہے جس کی صناعی کے نمونے ہم سب لوگ ہیں۔

"آسمان اَور زمین کی پُراسرار طاقتوں کا اثر
کتنا وسیع اَور گہرا ہے!"

"ہم انہیں دیکھنا چاہتے ہیں لیکن انہیں نہیں دیکھتے،
ہم انہیں سننا چاہتے ہیں مگر سنتے نہیں ہیں۔ وہ
اشیا کا جوہر ہیں اس لئے ان کو ان سے جُدا
نہیں کیا جا سکتا۔"

"ساری کائنات میں انسان انہیں کی بدولت اپنے دلوں کو پاک
اور صاف کرتے ہیں۔ اور تہوار کے کپڑے پہن کر اپنے آباؤ اجداد
پر بانی چڑھاتے اور قربانی دینے کے لئے جاتے ہیں۔ یہ پراسرار ذہانتوں
کا سمندر ہیں۔ وہ ہر جگہ ہم سے بالاتر ہیں۔ ہماری بائیں طرف۔ ہماری
دائیں طرف۔ انہوں نے ہم کو ہر طرف سے گھیر رکھا ہے۔"

ہم ایک ایسے تجربہ کے موضوعات ہیں جو میرے لئے کافی دلچسپ ہیں۔ کیا ہم ان حالات جیسے کہ بار تھوڑی دیر کے لئے سماج کی خوش گپیوں کے بغیر گذر بسر نہیں کر سکتے؟ جب اور اپنے ہی خیالات سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے؟ کنفوشس نے کتنی سچی بات کہی ہے۔ "نیکی ایک لاوارث یتیم کی طرح تنہا نہیں رہتی بلکہ اُسے لازمی طور پر پڑوسی میسر آنے چاہئیں" خیال کی مدد سے ہم اپنے آپ کو اپنے وجود سے الگ کر سکتے ہیں۔ دماغ کی باشعور کوششوں سے ہم اعمال اور ان کے نتائج سے الگ رہ سکتے ہیں۔ تمام باتیں چاہے وہ بُری ہوں یا بھلی سیلاب کے بہاؤ کی طرح ہمارے قریب سے گزر جاتی ہیں۔ ہم مکمل طور سے قدرت کے غلام نہیں ہیں۔ میں دریا میں بہتا ہوا تنکا بھی ہو سکتا ہوں۔ اور اندر دیوتا بھی جو آسمان سے اس تنکے پر نیچے نگاہ ڈالتا ہے۔ ممکن ہے میں ایک طرف تھیٹر کے تماشے سے متاثر ہوں اور دوسری طرف شاید اصل واقعہ سے بالکل متاثر نہ ہوں جس کا بظاہر مجھ سے زیادہ گہرا تعلق ہو سکتا ہے۔ میں صرف یہ جانتا ہوں کہ میں ایک انسانی فرد ہوں یا یوں کہیے کہ میں خیالات و جذبات کا ایک منظر ہوں۔ اور مجھے ایک طرح کی دوئی کا احساس ہوتا ہے

جس کی بدولت میں اپنے آپ سے ابھی اتنا دُور رہ سکتا ہوں جتنا کسی دوسرے سے۔
میرا تجربہ چاہے کتنا ہی شدید کیوں نہ ہو مجھے اب اس امر کا شعور ہے کہ میرا ہی کوئی حصّہ ایسا ہے
جو میرے حالات پہ نکتہ چینی کر رہا ہے۔ جیسے وہ میرا کوئی حصّہ نہ ہو بلکہ ایک تماشائی ہو
جو میرے تجربہ میں شریک نہیں ہے۔ اور اُسے صرف دیکھتا چلا جا رہا ہے۔ اور میرا وہ حصّہ
اُتنا ہی نہیں ہے۔ جتنا "آپ"۔ یہ ناٹک خواہ زندگی کا المیہ ہی کیوں نہ ہو جب ختم ہو
جاتا ہے تو تماشائی اپنے راستہ پہ ہو لیتا ہے۔ جہاں تک اُس تماشائی کا تعلق ہے یہ اس
کے لئے محض ایک قصّہ تھا۔ تصوّر کا کارنامہ۔ بعض اوقات یہ دوئی ہمیں بڑی آسانی سے
بڑے ہمسائے اور دوست بنا سکتی ہے۔

مَیں دیکھ رہا ہوں کہ زیادہ دیر تک تنہا رہنا میرے لئے بہت صحت مند ہے۔
بہترین آدمیوں کی صُحبت بھی تھکا اور گھلا دیتی ہے۔ مجھے تنہا رہنا بہت مرغوب ہے۔
مجھے ایسا کوئی رفیق نہیں ملا جو تنہائی سے بہتر رفیق ہو۔ جب ہم اپنے کمروں میں بیٹھتے ہیں
تو اتنی تنہائی محسوس نہیں کرتے جتنی باہر جا کر اور لوگوں کے درمیان رہ کر محسوس کرتے ہیں۔
وہ آدمی تو سوچ بچار اور کام کر رہا ہوتا ہے ہمیشہ تنہا ہوتا ہے چاہے وہ کہیں کیوں نہ ہو۔
وہ تنہائی میلوں کے فاصلہ سے نہیں ناپی جا سکتی جو انسان اور اس کے ساتھیوں میں حائل
ہے حقیقی معنوں میں سچا طالب علم کیمبرج کالج کے پُر ہجوم چھتّوں میں بھی اسی طرح تنہا ہوتا ہے
جس طرح صحرا میں درویش۔ کسان دن بھر کھیت یا جنگلوں میں تنہا کام کر سکتا ہے۔
وہ گوڑائی کرتے یا لکڑیاں کاٹتے ہوئے تنہائی محسوس نہیں کرتا۔ کیونکہ وہ کام کر رہا ہے۔
لیکن جب وہ رات کو گھر واپس آتا ہے تو اپنے خیالات کے رحم و کرم پہ کمرے میں تنہا نہیں
بیٹھ سکتا۔ وہ ایسی جگہ جائے گا جہاں لوگوں سے مل سکے، اور تفریح کر سکے اور جیسا کہ اس
کا خیال ہے اُسے دن بھر کی تنہائی کا معاوضہ ملنا چاہیئے۔ اُسے حیرت ہوتی ہے کہ ایک
طالب علم رات بھر اور دن کے بیشتر حصّہ میں کیسے گھر میں تنہا رہ سکتا ہے۔ اور کوئی بیزاری کے

افسردگی محسوس نہیں کرتا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ طالب علم گھر میں تو بیٹھا ہے لیکن کسان کی طرح اپنے میدان میں کام کر رہا ہے اور اپنی لکڑی کاٹ رہا ہے اور وہ بھی اپنی باری پر تفریح اور رفاقت کی تلاش میں ہے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ طالب علم کی تفریح عمیں کسان کی تفریح کا تجزیہ نہیں عام طور سے سماج بہت پست ہوتا ہے۔ ہم تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد ایک دوسرے سے ملتے جلتے رہتے ہیں۔ اور ہمیں اتنا وقت ہی نہیں ملتا کہ ہم ایک دوسرے کے لئے نئی اقدار حاصل کر سکیں۔ ہم دن میں تین چار بار کھانے کی میز پر ملتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کو پھپھوندی لگے پنیر کا مزہ دیتے ہیں۔ ہمیں مجبور ہو کر کچھ قواعد و ضوابط پر اتفاق کر لینا پڑتا ہے جنہیں ہم آداب مجلس یا اخلاق کہتے ہیں۔ ہم ایسا اس لئے کرتے ہیں کہ بار بار کی ملاقات قابل برداشت رہے اور ہم میں کھلم کھلا جنگ نہ چھڑ جائے۔ ہم ڈاک خانوں میں ملتے ہیں، پارٹیوں میں ملتے ہیں اور رات کو آتشدان کے پاس ملتے ہیں ہم بہت ہی گھتم گتھا زندگی بسر کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کا راستہ روکے رہتے ہیں۔ اور ایک دوسرے سے الجھ کر گر پڑتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس طرح ہم ایک دوسرے کی نگاہ میں ذلیل ہو جاتے ہیں۔ اگر آپس کا ملنا جلنا ذرا کم ہو تو یقیناً ساری اہم اور پُرخلوص ملاقاتوں پر بھاری ہوگا۔ ایک فیکٹری میں کام کرنے والی لڑکیوں کے بارے میں ذرا سوچئے۔ وہ کبھی تنہا نہیں ہوتی ہیں حتیٰ کہ اپنے خوابوں میں بھی نہیں۔ میری اقامت گاہ کی طرح اگر فی مربع میل میں صرف ایک آدمی رہے تو بہت ہی اچھا ہے۔ انسان کی قدر و قیمت اس کی جلد میں مضمر نہیں ہے کہ ہمیں اس کو چھونا ہی پڑے۔

میں نے ایک شخص کے بارے میں سُنا ہے کہ وہ جنگل میں راستہ بھول گیا اور بھوک اور تھکن سے ایک درخت کے نیچے گر کر مرنے لگا۔ جسمانی کمزوری کے باعث اس کے بیمار تخیلات نے اس کی تنہائی دور کرنے کیلئے کئی تصویریں اسکی آنکھوں کے سامنے پیش کر دیں اور وہ ان تصویروں کو حقیقی خیال کرتا رہا۔ اس طرح دماغی و جسمانی صحت اور

قوت کی بدولت ہم نسبتاً زیادہ اعتدال پسند اور قدرتی میل جول سے مسلسل لطف اندوز ہو سکتے ہیں اور یہ جان سکتے ہیں کہ ہم کبھی تنہا نہیں ہیں۔

میرے مکان میں خاصہ ہجوم رہتا ہے۔ خاص طور پر صبح کے وقت جب کوئی نہیں آتا۔ مجھے چند مثالیں پیش کرنے کی اجازت دیجئے ہو سکتا ہے ان میں سے کوئی مثال میری صورت حال کی وضاحت کر سکے۔ میں تالاب کی اس پن ڈبی سے زیادہ تنہا نہیں ہوں جو زور زور سے قہقہے لگاتی ہے یا میں خود والڈن تالاب سے زیادہ تنہا نہیں ہوں۔ اس تنہا جھیل کو آخر کونسی ہمدمی میسر آتی ہے؟ اس کے باوجود اس میں نیلے شیطان نہیں بلکہ نیلے دیوتا ہیں جنہوں نے اس کے پانی کو نیلگوں بنا دیا ہے۔ برسات کے سوا سورج تنہا ہوتا ہے اور بادل چھائے ہوں تو دو سورج نظر آتے ہیں لیکن ان میں سے ایک چھوٹا سورج ہوتا ہے۔ خدا بھی تنہا ہے لیکن شیطان تنہا نہیں ہے اسے بہت سے ہمدم میسر آجاتے ہیں۔ میں اتنا ہی تنہا ہوں جتنا چراگاہ میں کوئی مولین یا ڈینڈیلیں (پھولوں کے نام) یا سیم کی ایک پتی یا ہرن یا گھریلو مکھی یا شہد کی بڑی مکھی۔ میں اتنی تنہائی محسوس کرتا ہوں جتنی مل کا چشمہ یا ایک موسم کا مرغ یا قطب شمالی یا جنوبی کی ہوا یا اپریل کی بارشیں یا جنوری میں برف یا ایک نئے مکان میں پہلی مکڑی۔ موسم سرما کی طویل شاموں میں جب شدید برفباری ہوتی ہے اور جنگل میں ہوا سرسراتی ہوئی پھرتی ہے تو کبھی کبھی اس علاقہ کا ایک پرانا آباد شدہ اور اصل مالک مجھ سے ملنے کے لئے چلا آتا ہے۔ اس کے بارے میں یہ بات مشہور ہے کہ اس نے والڈن تالاب کھود کر اس میں پتھر جمائے تھے اور اس کے کناروں پر صنوبر کے درخت لگائے تھے۔ وہ مجھے ماضی اور ابدیت کی کہانیاں سناتا ہے اور ہم سیب اور سیب کی شراب کے بغیر بھی ہنس ہنس کر مختلف امور پر اپنی اپنی رائے ظاہر کر کے شام کا وقت بڑی مسرت سے کاٹ لیتے ہیں۔ وہ ایک عقلمند اور خوش طبع دوست ہے۔ میں اس سے بہت محبت کرتا ہوں۔ وہ اپنے

آپ کو بہت پُراسرار بنائے رکھتا ہے۔ حالانکہ لوگ اُسے مُردہ سمجھتے ہیں۔ لیکن کوئی نہیں بتا سکتا کہ وہ کہاں دفن ہے۔ میرے پڑوس میں ایک معمر خاتون بھی رہتی ہے جو بیشتر لوگوں کو دکھائی نہیں دیتی۔ مَیں اس کی خوشبودار جڑی بوٹیوں کے باغ میں ٹہلتا ہُوا جڑی بوٹیاں بٹورتا اور اس سے قدیم حکایات سُننا بہت پسند کرتا ہوں۔ کیونکہ وہ بے مثال تخلیقی صلاحیت رکھتی ہے۔ اس کے حافظہ میں دیومالاؤں سے بھی زیادہ قدیم حکایات بھری پڑی ہیں۔ اور ہر قدیم کہانی کا ماخذ بتا سکتی ہے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ سکتی ہے کہ اُن میں سے کون سی کس حقائق پر مبنی ہے۔ کیونکہ ان سے متعلق تمام واقعات اس وقت ظہور میں آئے تھے جب وہ جوان تھی وہ ایک سرخ و سپید اور تیز و طرار خاتون ہے جو ہر موسم اور ہر فصل سے لطف اندوز ہوتی ہے اور اپنے تمام بچوں کی نسبت زیادہ دیر تک زندہ رہے گی۔

قدرت کی ناقابلِ بیان معصومیت اور فیض رسانی۔ یعنی وہ سورج ہو یا بارش، موسم گرما ہو یا سرما کیسی تندرستی اور کیسی خوشی فراہم کرتے ہیں۔ یہ نسلِ انسانی سے ایسا رشتہ رکھتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کسی صحیح مقصد کی خاطر بھی رنجیدہ اور مغموم ہو جائے تو ساری قدرت اُس سے متاثر ہو گی۔ سورج کی آب و تاب ماند پڑ جائے گی اور ہوائیں سسکیاں بھرنے لگیں گی۔ ابر آنسو بہائے گا اور جنگل وسطِ سرما میں سبز پتیوں کا جوڑا اُتار کر ماتمی لباس پہن لے گا۔ کیا مجھ میں اور زمین میں باہمی پیغام رسانی کا کوئی رابطہ نہیں ہونا چاہیئے؟ کیا مَیں خود کسی حد تک پتیوں اور ترکاریوں کا بنا ہُوا نہیں ہوں؟

دوا کی وہ کونسی گولی ہے جو ہمیں تندرست اور قانع رکھے گی؟ میری اور آپ کے آباؤ اجداد کی گولی نہیں۔ بلکہ ہماری پڑنانی قدرت کی سبزہ و گیاہ کی وہ گولی جس کے ذریعہ اس نے اپنے آپ کو سدا جوان رکھا ہے۔ جو بہت سے بوڑھے پاروں سے زیادہ دیر تک، زندہ رہ چکی ہے۔ اور ان کی پگھلتی ہوئی چربی کھا کر اپنی صحت برقرار رکھتی ہے۔ مجھے بازحکیموں کی ان شیشیوں کی بجائے جو دریائے عقرن اور بحرِ لوط میں

ڈبو کر کسی مرکب سے تیار کی جاتی ہیں اور جن کی بوتلیں کالے دو مستولوں والے جہازوں جیسی گاڑیوں میں لدی ہوئی ہمیں اکثر دکھائی دیتی ہیں۔ مجھے اکسیرِ اعظم کے طور پر نسیم صبح کا ایک جرعہ دید یجیئے جس میں کوئی آمیزش نہ ہو۔ اگر انسان دن کے سرچشمہ سے نسیم سحر کا جرعہ نہیں پئینگے۔ اور اگر انہوں نے اس دنیا میں اس صبح کی غذا کا ٹکٹ گم کر دیا ہے تو ان کے فائدے کے لئے ہمیں چاہیئے کہ ہم نسیم سحر کو بوتلوں میں بند کر کے دکانوں میں رکھ دیں۔ لیکن یہ یاد رکھئے کہ ٹھنڈے سے ٹھنڈے تہ خانے میں بھی نسیم سحر صرف دوپہر تک اپنی اصل حالت میں رہتی ہے۔ پھر سیپی کا ڈاٹ اڑ جائے گا۔ اور وہ مغرب میں سورج کے پیچھے پیچھے چلنے لگے گی۔

میں اس ہائجیا (صحت کی دیوی) کا پجاری نہیں ہوں۔ جو جڑی بوٹیوں کے ماہر بوڑھے ایسکیو لاپس کی بیٹی ہے۔ اور جو یادگاری مجسموں میں ایک ہاتھ میں سانپ اور دوسرے میں ایک ایسا پیالہ لیئے ہوئے دکھائی جاتی ہے جس میں سے کبھی کبھی سانپ بھی ایک گھونٹ بھر لیتا ہے۔ میں ہی بے کا پجاری ہوں جو جیوپٹر کی ساقی ہے اور جونو اور جنگلی کاہو کی بیٹی ہے اور جس کو یہ کمال عطا کیا گیا ہے کہ وہ دیوتاؤں اور انسانوں کو پھر سے شباب کی قوت بخش سکتی ہے۔ غالباً وہی [illegible] مضبوط تنومند اور نوجوان خاتون ہے جس نے اس دنیا کی سیر کی اور جہاں گئی وہیں بہار آگئی۔
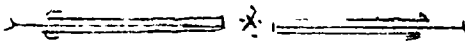
مہمان

میرا خیال ہے کہ اکثر لوگوں کی طرح مجھے انسانوں کی ہمدمی بہت مرغوب ہے اور اگر مجھے کوئی پُرجوش اور توانا آدمی مِل جائے تو میں اُس سے کچھ عرصہ کے لئے جونک کی طرح چمٹ جانے کے لئے بالکل تیار ہوں۔ میں قدرتاً کوئی تارک الدنیا نہیں ہوں۔ بلکہ اگر میرا کاروبار مجھے کسی شراب خانہ میں لے جائے تو میں وہاں دیر تک بیٹھنے والوں سے بھی زیادہ دیر تک بیٹھ سکتا ہوں۔

میرے گھر میں تین کرسیاں تھیں۔ ایک عزلت نشینی کے لئے دوسری دوستی کے لئے۔ اور تیسری پورے سماج کے لئے۔ جب میرے ہاں غیر متوقع طور پر بھاری تعداد میں مہمان آجاتے تھے تو تیسری کرسی اُن سب کے لئے ہوتی تھی۔ لیکن وہ عام طور پر کمرے سے زیادہ کفایت کے ساتھ کام لیتے اور کھڑے ہی رہتے۔ یہ بات کتنی تعجب خیز ہے کہ ایک چھوٹے سے کمرے میں کتنی عظیم عورتیں اور مرد سما جاتے ہیں۔ میری چھت کے نیچے ایک وقت پچیس یا تیس روحیں اپنے اجسام سمیت موجود رہتی تھیں اور اکثر جدا ہوتے وقت ہمیں اس بات کا پتہ نہ ہوتا تھا کہ ہم ایک دوسرے کے اتنے قریب آچکے تھے۔ ہمارے بہت سے مکانات پبلک اور نجی عمارات دونوں ہی اپنے لاتعداد کمروں، وسیع و عریض ہالوں اور

شراپوں اور زمانۂ امن کا سامان رکھنے کے لئے تہ خانوں کے ساتھ اپنے مکینوں کے لئے بہت بڑے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ اتنی وسیع اور شاندار ہیں۔ کہ ان کے مکین ان میں محض کیڑے مکوڑے دکھائی دیتے ہیں۔ اگر کوئی لقیب سٹری مونٹ یا ایسٹریا مڈل سیکس ہاؤس کے سامنے اپنا بنگلہ بنائے تو مجھے کوئی تعجب نہیں ہوگا کہ ان کے مکینوں کی بجائے کوئی رینگتا ہوا مضحکہ خیز چوہا مجھے پر باہر نکلے اور پھر فوراً ہی پیٹڑی کے کسی بل میں جا چھپے۔

مجھے اس چھوٹے سے مکان میں ایک تکلیف ضرور ہوتی تھی کہ جب ہم بڑے بڑے الفاظ میں بڑے بڑے خیالات ظاہر کرتے تھے تو مجھے اپنے مہمان سے کافی دور بیٹھنے میں دشواریاں پیش آتی تھیں بڑے خیالات کے پرواز کرنے کے لئے کافی جگہ چاہیئے تاکہ منزل تک پہنچنے سے پہلے وہ راستہ کے ایک یا دو موڑ پار کر لیں۔ آپ کے خیالات کی گولی کو سننے والے کے کان تک پہنچنے سے پہلے دائیں بائیں مڑنے کی حرکت اور راہ کی رکاوٹوں پر قابو پا کر اپنی صحیح چال پر آ جانا چاہیئے ورنہ وہ اس کے سر کی دوسری طرف سے نکل جائے گی۔ ہمارے فقروں کو بھی درمیانی وقفہ میں پھیلنے اور قطار باندھنے کے لئے جگہ چاہیئے۔ افراد کو بھی ممالک کی طرح وسیع تر قدرتی سرحد بلکہ ایک دوسرے کے درمیان کافی غیر جانبدار علاقہ چاہیئے۔ مجھے [illegible] تالاب کو درمیان میں رکھ کر اس پار کے اپنے ساتھی سے باتیں کرنے میں بڑی لذت ملی ہے۔ [illegible] گھر میں ہم ایک دوسرے کے اتنے قریب ہوتے تھے کہ ہم کچھ سننا شروع ہی نہیں کر پاتے تھے ہم اتنے آہستہ نہیں بول سکتے تھے کہ ایک دوسرے [illegible] بات سن سکیں، جیسے آپ جب دو پتھروں کو ٹھہرے ہوئے پانی میں قریب قریب پھینکتے ہیں تو وہ ایک دوسرے کی پیدا کی ہوئی لہروں کو توڑ کر رکھ دیتے ہیں اگر ہم [illegible] زبان اور چیخ چیخ کر باتیں کرنے والے ہیں۔ تو ایک دوسرے کے گال سے گال ملا کر کھڑا ہونا گوارا کر سکتے ہیں اور ایک دوسرے کا سانس محسوس

کر سکتے ہیں اور اگر ہم متانت سے سوچ سمجھکر باتیں کرنے والے ہیں تو ہمارے لئے
یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم ایک دوسرے سے ذرا دُور رہیں تاکہ ہمارے الفاظ سے
ساری حیوانی حرارت اور رطوبت کو بخارات بن کر اڑ جانے کا موقع ملے۔ اگر ایک دوسرے
کی حقیقی ہمدردی کا لطف اٹھانا چاہتے ہیں جو ہر قسم کی گفتگو اور تکلم سے بہتر اور افضل ہے
تو ہمیں صرف خاموش ہی رہنا چاہیئے اور جسمانی اعتبار سے اتنے فاصلہ پہ ہونا چاہیئے کہ ہم
کسی طرح ایک دوسرے کی آواز نہ سُن سکیں اس معیار کے اعتبار سے تکلم صرف ان لوگوں
کی سہولت کے لئے ہے جو بہرے ہوں۔ لیکن بہت سی ایسی اچھی باتیں ہیں جو کبھی چیخ
کر نہیں کہی جاسکتیں ہماری بات چیت میں جیسے جیسے بلندی اور عظمت آتی جاتی ہے
ویسے ویسے ہم دھیرے دھیرے اپنی کرسیاں اور کھسکاتے چلے جاتے ہیں حتیٰ کہ وہ
آمنے سامنے کی دیواروں سے جالگتی ہیں۔ اس کے باوجود ہمارے درمیان فاصلہ
کافی نہیں ہوتا

"میرا بہترین" یعنی میری خلوت نشینی کا کمرہ جو مہمانوں سے ملنے جُلنے کے لئے
تیار رہتا تھا اور جس کے قالین پہ سُورج کی کرنیں شاذونادر ہی پڑتی تھیں۔ دراصل چیڑ
کے درختوں کا جنگل تھا جو میرے مکان کے عقب میں واقع تھا۔ میں موسم گرما میں معزز
مہمانوں کو اسی جگہ لے جایا کرتا تھا۔ اس کے فرش پہ ایک بے نظیر ملازمہ جھاڑو
لگاتی تھی اور اس کے فرنیچر کو اُجلا اور اس کی ہر چیز کو بڑے قرینہ سے رکھتی تھی۔
اگر صرف ایک ہی مہمان آتا تو وہ میرے روکھے سوکھے کھانے میں شامل ہو جاتا
اور بیچ بیچ میں حلوے میں چمچے چلانے یا بھوبل میں روٹی کو پکتے اور سرخ ہوتے ہوئے
دیکھنے سے گفتگو میں خلل نہیں پڑتا تھا۔ لیکن اگر بیس آدمی میرے گھر آکر بیٹھ جاتے
تو چاہے دو آدمیوں کے لئے روٹی موجود ہوتی لیکن کھانے کے ذکر سے اس طرح گریز
کیا جاتا جیسے سب نے کھانے کی عادت چھوڑ دی ہو۔ ہم سب کا یہ گریز بالکل قدرتی

ہوتا تھا۔ کبھی کسی نے اس کو میزبانی کے طریقہ کے خلاف نہ سمجھا بلکہ اسے درست اور اخلاقی طریقہ کار تصور کیا جسمانی حیات انحطاط پذیر ہے۔ اس کی مرمت کی اکثر ضرورت پڑتی ہے لیکن اس معاملہ میں مجھے ایسا دکھائی دیتا تھا کہ اس کی مرمت میں تاخیر ہونے کے باوجود وہ عجیب و غریب طور سے اپنی اصلی حالت پر قائم تھی۔ اس طرح میں دس بیس تو کیا ایک ہزار انسانوں کی خاطر و مدارات کر سکتا تھا۔ اگر کوئی میرے گھر سے میری موجودگی میں بھوکا یا مایوس لوٹا ہو تو آسے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ کم سے کم میری ہمدردی ضرور اس کے ساتھ تھی۔ اگرچہ بہت سی گھریلو عورتوں کو اس بارے میں شک ہو سکتا ہے لیکن پرانے رسم و رواج کی جگہ کوئی نیا اور بہتر طریقہ اختیار کرنا زیادہ آسان ہوتا ہے آپ کو اپنی شہرت اس دعوت پر نہیں مبنی کرنی چاہیئے جو آپ دیتے ہیں۔ مجھے تو کسی شخص کے در جانے سے کسی سیربرس نے اس ڈھنگ سے نہیں روکا جس ڈھنگ سے مکان کے مالک کی اس نمود و نمائش نے کہ اس نے خاص طور سے میری دعوت کا اہتمام کیا ہے۔ میرے نزدیک اسکی یہ دعوت اس امر کا اشارہ ہوتی ہے کہ میں آئندہ اُسے پھر ایسی زحمت نہ دوں۔ میں اپنی جھونپڑی کے لئے اسپنسر کے اُن اشعار کا کتبہ بنانا باعثِ فخر کہوں گا جو ایک ملاقاتی نے اپنے کارڈ کے طور پر اخروٹ کی زرد پتی پر لکھ دیئے تھے۔

"وہ لوگ وہاں پہنچکر چھوٹے سے گھر کو بھر دیتے ہیں،
وہاں خاطر و مدارات کی اُمید نہیں رکھتے کیونکہ
وہاں خاطر و مدارات کے لئے کوئی چیز ہوتی ہی نہیں ہے
وہاں جاکر آرام کرنا ہی اُن کی ضیافت ہے — ہر کام
اُن کی مرضی کے مطابق ہوتا رہتا ہے —
شریف آدمیوں کے دل بہترین قناعت سے لبریز ہوتے ہیں!"

جب ونسلو جو بعد میں بلائی ماوتھ کا گورنر بنا اپنے ایک رفیق کے ساتھ جنگلوں میں سے پیدل گذر کر ماسا ساوئٹ سے شرفِ ملاقات حاصل کرنے کے لئے گیا تو اس کے دولت کدہ پر تھکا ماندہ اور بھوکا پہنچا۔ بادشاہ نے ان کا بہت اچھی طرح خیر مقدم کیا اور اس دن کھانے کے بارے میں کچھ نہ کہا۔ جب رات آئی تو اس کے الفاظ یہاں درج کرتے ہیں۔ "اس (بادشاہ) نے ہمیں اپنے اور اپنی بیوی کے ساتھ بستر پر سلا دیا۔ ایک کنارے پر ہم تھے اور دوسرے کنارے پر وہ۔ یہ بستر صرف تختوں کا بنا ہوا تھا اور زمین سے ایک فٹ اونچا تھا ان تختوں پر ایک پتلی سی چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ جگہ کی تنگی کی وجہ سے اس کے دو سردار بھی ہمارے ساتھ سو گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم اپنی جائے قیام پہ سفر سے بھی زیادہ تھک گئے۔" اگلے روز ماساسائٹ ایک بجے دو مچھلیاں لایا جو اس نے شکار کی تھیں۔ وہ بریم مچھلی سے تگنی بڑی تھیں۔ جب ان کو ابالا گیا تو وہاں کم سے کم چالیس آدمی ان کے حصے بخرے کرنے کے لئے موجود تھے ان میں سے بیشتر لوگ وہ مچھلیاں کھا بھی گئے۔ دو راتوں اور ایک دن میں ہمیں یہی غذا میسر آئی۔ اگر ہم میں سے ایک شخص نے ایک تیتر نہ خریدا ہوتا تو ہم نے فاقہ کشی کرتے ہوئے سفر طے کیا ہوتا۔ اس ڈر سے کہ وہ کہیں بھوک اور کم خوابی کے باعث اور وحشیانہ گیت گانے کی وجہ سے (وہ اپنے آپ کو میٹھی نیند سلانے کے لئے گیت گایا کرتے تھے) پاگل نہ ہو جائیں۔ اور اس خیال سے کہ جب تک ان میں طاقت ہے تب تک شاید اپنے گھر پہنچ جائیں وہ وہاں سے چل پڑے۔ جہاں تک جائے قیام کا تعلق ہے یہ درست ہے کہ ونسلو اور اس کے ساتھی کی اچھی خاطر تواضع نہیں ہوئی۔ لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ جس بات کو انہوں نے تکلیف سمجھا اس کا دراصل مقصد ان کی عزت افزائی تھا جہاں تک غذا کا تعلق ہے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ انڈین اس سے بہتر اور کیا خدمت انجام دے سکتے تھے۔ خود ان کے پاس اپنے کھانے کے لئے کچھ نہ تھا۔ اور وہ یقینی طور پر زیادہ عقلمند

تھے۔ اُن کے خیال میں مہمانوں سے معذرت طلبی غذا کی جگہ لے سکتی تھی۔ اس لئے انہوں نے اپنی پیٹی کس کر باندھ لی۔ اور غذا کا ذکر تک نہ کیا۔ ونسلو جب ایک بار پھر اُن سے ملنے گیا تو اس وقت اُن کے ہاں ہر چیز کی افراط کا موسم تھا اور خوراک کی کوئی کمی نہ تھی۔

جہاں تک انسانوں کا تعلق ہے وہ کہیں بھی ملنے کے لئے آ سکتے ہیں۔ زندگی کی کسی دوسری مدت میں اتنے لوگ کبھی مجھ سے ملنے نہیں آئے تھے۔ جتنے جنگل میں میرے ہاں آئے۔ میرا مطلب ہے کہ چند لوگ مجھ سے ضرور ملنے آئے۔ میں وہاں چند لوگوں سے زیادہ سازگار حالات میں ملا۔ لیکن بہت کم ایسے لوگ تھے جو مجھ سے چھوٹے چھوٹے کاموں کی غرض سے ملنے آئے۔ اس لحاظ سے قصبہ سے دُور میرا قیام میرے ملاقاتیوں کو چھانٹ کر بھیجتا تھا۔ میں تنہائی کے عظیم سمندر (جس میں سماج کے سارے دریا آ کر گرتے ہیں) کی اس گہرائی تک چلا گیا تھا کہ میری ضرورتوں کے مطابق زیادہ تر تلچھٹ ہی میرے گرد آ کر جمع ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ مجھ تک ایسی شہادتیں بھی پہنچی تھیں جن سے معلوم ہوتا تھا کہ دوسری طرف ایسے براعظم ہیں جن کو ابھی دریافت نہیں کیا گیا اور جہاں ابھی کاشت نہیں ہوئی۔

آج صبح میری جھونپڑی میں آیا بھی تو کون —— ایک ہومری یا پافلاگونی آدمی۔ اس کا نام اتنا موزوں اور شاعرانہ ہے کہ مجھے افسوس ہے کہ میں اسے یہاں ظاہر نہیں کر سکتا۔ وہ کینیڈا کا باشندہ تھا۔ لکڑہارا۔ لکڑی کے کھمبے بنانے والا۔ وہ ایک دن میں پچاس کھمبے سوراخ کھود کر گاڑ سکتا تھا۔ اس نے کل رات ایک جنگلی گلہری کھائی تھی جو اُسکے کتے نے پکڑی تھی۔ اس نے بھی ہومر کا نام سن رکھا تھا۔ اگر اس کے پاس کتابیں نہ ہوتیں تو اسکی سمجھ میں یہ بات نہ آتی کہ وہ برسات میں کیا کرتا۔ اس کے باوجود اس نے کئی برساتوں میں ایک بھی کتاب شاید پوری نہ پڑھی۔ اس کے وطن میں کلیسائی حلقہ کے ایک پادری نے جو یونانی الفاظ پڑھ لیتا تھا اُسے اتنی یونانی زبان پڑھا دی تھی کہ وہ بائبل کے چند جملے پڑھ

سکے ۔ اور اب وہ کتاب ہاتھ میں لئے یہ چاہتا تھا کہ میں پیٹروکلس کے غمزدہ چہرہ بنانے پر
الیکلیس نے اسے جو ڈانٹ پلائی تھی اس کا ترجمہ کر کے اسے سناؤں ۔

"پیٹروکلس تم ایک جوان لڑکی کی طرح آنسو کیوں بہا رہے ہو ۔؟"
"یا صرف تم نے بھتیا سے آنے والی کوئی خبر سنی ہے ۔؟
لوگ کہتے ہیں کہ مینوٹس ہیکٹر کا بیٹا ابھی
تک زندہ ہے ۔
اور پیلیس ایکس کا بیٹا بھی مرمیڈنوں کے
درمیان زندہ ہے ۔
ان میں سے اگر ایک بھی مر جاتا تو ہم یقیناً بہت
رنجیدہ ہوتے ۔"

وہ کہتا ہے "کتنی اچھی بات کہی ہے ۔" اس نے ایک بیمار کے لئے اپنی بغل میں شاہ بلوط کی چھال کی ایک گٹھڑی دبا رکھی ہے ۔ جو اس نے آج اتوار کی صبح جمع کی ہے ۔ وہ کہتا ہے "میرا خیال ہے کہ آج کے دن ایسا کام کرنے میں کوئی خرابی نہیں ہے" اس کے نزدیک ہومر ایک بہت بڑا ادیب تھا لیکن ہومر نے جن باتوں کے بارے میں لکھا تھا ان کا اسے کوئی علم نہ تھا ۔ ایسا سادہ اور فطری انسان پانا محال ہے ۔ بدی اور بیماری جو دنیا پر اخلاقی رنگ کا پردہ ڈالے ہوئے ہیں اس کے نزدیک ان کا کوئی وجود ہی نہیں تھا ۔ اس کی عمر ۲۸ برس کے لگ بھگ تھی ۔ اس نے بارہ سال پہلے کینیڈا اور اپنے باپ کا گھر اس امید پر چھوڑا تھا کہ وہ امریکہ آ کر کام کرے گا ۔ اور اتنا روپیہ کمائے گا کہ اپنے وطن میں جا کر کوئی فارم خرید سکے ۔ اس کی جسمانی ساخت بہت زیادہ بھدی تھی مضبوط اور بے ڈھنگا جسم ۔ چال میں نفاست ۔ موٹی ہوئی اور دھوپ میں جلی ہوئی گردن سیاہ اور کھردرے بال ، دھندلی خواب آلود نیلی آنکھیں جو کبھی کبھی قوت اظہار

سے بھاپ اُٹھتی تھیں۔ اُس نے بھورے رنگ کے کپڑے کی سپاٹ ٹوپی پہن رکھی تھی اُس کا بڑا کوٹ میلا اور اُونی کالروالا تھا۔ اُس کے بُوٹ گائے کی کھال کے بنے ہوئے تھے۔ وہ گوشت نہیں کھاتا تھا۔ وہ عام طور سے اپنا کھانا میرے گھر سے دو میل دُور اپنے کام کی جگہ پر ایک بالٹی میں لے جاتا تھا۔ وہاں وہ سارے موسم گرما میں لکڑیاں کاٹتا تھا۔ اُس کے کھانے میں ٹھنڈا گوشت اور ٹھنڈی گلہریاں ہوتی تھیں اور پتھر کی بوتل میں کافی ہوتی تھی جسے وہ اپنی پیٹی میں ایک رسی سے باندھ کر لٹکا لیتا تھا۔ کبھی کبھی وہ مجھے بھی کافی پلاتا تھا۔ وہ صبح سویرے ہی چلا آتا تھا۔ میرے سیم کے کھیت پار کرتا اور امریکہ کے لوگوں کی طرح اپنی چال سے اس کا مظاہرہ کرتا جیسے اُسے کام پر پہنچنے کی کوئی فکر یا کوئی جلدی نہ ہو۔ وہ کام کے لئے اپنے آپ کو کوئی گزند نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔ بس کھانے کو مل جائے اُسے صرف اتنی ہی فکر رہتی تھی۔ اکثر اوقات وہ اپنا کھانا کسی جھاڑی میں چھوڑ جاتا تھا۔ جب اُس کا کتا راستہ میں کوئی گلہری پکڑ لیتا تھا تو وہ اُسے صاف کرنے اور اپنے تہہ خانے میں محفوظ رکھنے کے لئے ڈیڑھ میل دُور واپس اپنے گھر چلا جاتا تھا جہاں وہ کھانا کھاتا تھا اور آدھ گھنٹہ تک یہ سوچتا رہتا تھا کہ کیا وہ اس گلہری کو رات تک تالاب کے پانی میں ڈوبا ہُوا نہیں رکھ سکتا۔ اُسے اِن باتوں کے بارے میں دیر تک سوچتے رہنا بہت مرغوب تھا۔ وہ صبح اپنے کام پر جاتے ہوئے کہا کرتا "یہ کبوتر کتنے موٹے ہیں! اگر ہر روز کام پر جانا میرا دھندہ نہ ہوتا تو میں شکار کی بدولت ہی اتنا ہی گوشت حاصل کر لیتا جتنے کی مجھے ضرورت ہے۔ کبوتر، گلہریاں، خرگوش، تیتر اور خدا کی قسم میں اپنے لئے ہفتہ بھر کا گوشت ایک ہی دن میں حاصل کر لیتا!"

وہ ایک ماہرِ فن لکڑہارا تھا۔ وہ اپنی فنکاری میں بڑی زیبائش اور صناعی سے کام لیتا تھا۔ وہ درخت کو زمین کے برابر ہموار کاٹتا تھا تاکہ بعد میں جو شاخیں نکلیں وہ زیادہ جاندار ہوں اور برف گاڑیاں اُن کے ٹھنٹھ پر آسانی کے ساتھ گزر جایا کریں۔

وہ اس کی بجائے کہ سارے درخت کو اپنی رسی سے بندھی ہوئی لکڑیوں کو سہارا دینے کے لئے چھوڑ دے۔ اُس درخت کے تنے کی ایک ایسی پتلی کھونٹی بنا لیتا تھا کہ وہ ہاتھ سے ٹکڑے ٹکڑے کی جا سکتی تھی

مَیں اُس سے اس لئے دلچسپی رکھتا تھا کہ وہ بہت ہی خاموش اَور تنہا ہوتے ہوئے خوش تھا۔ وہ ظرافت اَور قناعت کا منبع تھا۔ ظرافت و قناعت اُس کی آنکھوں سے چھلکتی تھی۔ اس کی ہنسی میں کوئی کھوٹ نہ تھا۔ میں بعض اوقات اسے جنگل میں کام کرتا ہوا اَور درخت کاٹ کاٹ کر گراتا ہوا دیکھتا تھا۔ وہ ایک ناقابل بیان طمانیت کے ساتھ ہنس کر میرا خیر مقدم کرتا تھا۔ وہ انگریزی اچھی طرح بول لیتا تھا لیکن کینیڈا کے لہجہ میں۔ اَور مجھ سے فرانسیسی زبان میں علیک سلیک کیا کرتا تھا۔ میں اس کے قریب چلا جاتا تو وہ اپنا کام چھوڑ دیتا تھا اَور زیر لب ہنسی کے ساتھ صنوبر کے تنے کے ساتھ ساتھ لیٹ جاتا تھا جو اس نے کاٹ کر گرایا ہوتا تھا۔ وہ صنوبر کا اندرونی چھلکا نکال کر اس کی ایک گیند سی بنا لیتا تھا۔ اَور اُسے چباتے چباتے مجھ سے ہنس ہنس کر باتیں کرتا رہتا تھا۔ اس کی رگ و پے میں اس قدر حیوانی زندہ دلی تھی کہ وہ ذرا سی بات پر ہنسی کے مارے زمین پر لوٹ پوٹ ہو جاتا اَور اپنے چاروں پھیلے ہوئے درختوں پر نظر دوڑاتے ہوئے کہتا تھا کہ "خدا کی قسم! مجھے یہاں درخت کاٹنے میں بہت مزہ آتا ہے۔ مجھے اس سے بہتر اَور کوئی تفریح نہیں چاہیئے"۔ جب بعض اوقات اُسے فرصت ہوتی تو وہ جنگل میں جیبی پستول سے سارادن جی بہلاتا اَور چلتے چلتے تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد اس پستول سے اپنے لئے سلامی داغا کرتا۔ وہ موسم سرما میں آگ جلاتا اَور اس پر کیتلی رکھ کر اپنی کافی گرم کرتا اَور جب وہ درخت کے تنے پر بیٹھ کر کھانا کھاتا تو کبھی کبھی چڑیوں کے بچے اس کے بازو پر آ بیٹھتے اَور اُسکی انگلیوں میں پکڑے ہوئے آلو پر چونچ مارنے لگتے تھے۔ وہ کہتا تھا "میں ان ننھے

مُنے پرندوں کو اپنے اِردگرد دیکھ کر بہت خوش ہوتا ہوں !"

اس کے اندر حیوانی انسان کافی نشو ونما پا چکا تھا ۔ جہاں تک جسمانی قوت برداشت اور قناعت کا تعلق تھا وہ صنوبر اور چٹان کا بھائی تھا ۔ ایک روز میں نے اُس سے پوچھا کہ رات کو تھکان تو محسوس نہیں کرتا ؟ اس نے میری طرف خلوص اور قناعت سے دیکھتے ہوئے جواب دیا " خدا کی قسم ! میں اپنی ساری زندگی میں کبھی نہیں تھکا " لیکن اس کے اندر ذہنی انسان جسے ہم روحانی انسان کہتے ہیں ایک شیر خوار بچے کی طرح سویا پڑا تھا ۔ اُس کی تعلیم اسی معصوم اور بے اثر انداز میں ہوئی تھی جس سے کیتھولک پادری غیر مہذب باشندوں کو تعلیم دیتے ہیں ۔ یعنی اُس انداز سے جس سے طالب علم کا شعور بیدار نہیں ہوتا ، صرف اعتقاد اور عزت و توقیر کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے ۔ اس طرح بچے کو مرد نہیں بنایا جاتا بلکہ بچہ ہی رہنے دیا جاتا ہے ۔ جب قدرت نے اس لکڑہارے کو بنایا تو اس نے اُسے ایک مضبوط جسم دیا اور اُس کے حصے کی قناعت دی اور اس کے چاروں طرف اعتقاد اور احترام کا سہارا لگا دیا تاکہ وہ ستر برس تک بچہ رہ کر ہی زندگی بسر کر سکے ۔ وہ اس قدر سچا اور تصنع سے پاک تھا کہ آپ کے لئے اپنے پڑوس سے اس کا تعارف کرانا اتنا ہی مشکل تھا جتنا اُس سے ایک گلہری کا تعارف کرانا آپ کی طرح آپ کے ہمسایہ کو بھی اُسے ڈھونڈنا پڑے گا ۔ وہ بناوٹ سے کام نہیں لیتا تھا لوگ اس کے کام کی اُسے اُجرت دیتے تھے اور اس طرح اس کے لئے غذا اور لباس مہیا کرنے میں معاون ہوتے ۔ لیکن وہ ان سے کبھی تبادلہ خیال نہیں کرتا تھا ۔ اگر ہم کسی ایسے شخص کو منکسر المزاج کہہ سکیں جو برتری کی خواہش نہیں کرتا ۔ وہ سادگی اور قدرتی اعتبار سے اتنا منکسر المزاج تھا کہ عجز و انکسار اس کی کوئی نمایاں خوبی نہ تھی اور نہ وہ اس خوبی کا تصور کر سکتا تھا ۔ وہ اپنے سے زیادہ عقلمند لوگوں کو دیوتا سمجھتا تھا اگر آپ اس کو یہ بتاتے کہ کوئی عقلمند شخص آرہا ہے تو اس کو

یہ خیال آتا کہ ایسا شخص اس سے کوئی توقع نہیں رکھ سکتا اور وہ ساری ذمہ داری اپنے اوپر لیتے ہوئے اسے بھلا دے گا۔ اس نے تحریف کا کوئی کبھی لفظ ہی نہیں سنا تھا۔ وہ وہ ادیبوں اور مبلغوں کا خاص طور سے احترام کرتا تھا۔ اس کے نزدیک ان کے کام معجزوں کے مترادف تھے۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میں بہت لکھتا ہوں تو وہ دیر تک یہ سوچتا رہا کہ شاید میری مراد صرف خوش خطی سے تھی۔ کیونکہ اس کا خط بھی بہت اچھا تھا۔ بعض اوقات میں اس کے وطن کا نام شاہراہ پر پڑی ہوئی برف پر بہت ہی خوش خطی سے لکھا ہوا دیکھتا تھا جس کے فرانسیسی ہجے بالکل ٹھیک ہوتے تھے۔ میں جان جاتا تھا کہ وہ ادھر سے گزرا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا اپنے خیالات قلمبند کرنے کے لئے کبھی اس کا جی نہیں چاہتا۔ اس نے جواب دیا کہ اس نے ان لوگوں کے خط پڑھے تھے اور لکھے تھے جو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ لیکن آج تک اس نے کبھی اپنے خیالات کو ضبطِ تحریر میں لانے کی کوشش نہیں کی کیونکہ وہ یہ کام کر ہی نہیں سکتا۔ اسے یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ پہلے کیا کچھ لکھا ہوتا ہے۔ ایسا کرنے سے تو اس کا دم ہی نکل جاتا۔ کیونکہ لکھنے کے ساتھ ساتھ ہجوں کی طرف بھی دھیان دینا پڑتا ہے۔

میں نے سنا ہے کہ ایک نامور دانشور نے اس سے سوال کیا کہ کیا وہ یہ نہیں چاہتا کہ اس دنیا کو تبدیل ہونا چاہیئے۔ اگرچہ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس سے پہلے ہی اس سے یہ سوال پوچھا جا چکا ہے۔ اس نے کینیڈا کے لب و لہجہ میں ہنستے ہوئے جواب دیا — "نہیں۔ مجھے یہ دنیا اس صورت میں بہت پسند ہے۔" اگر کسی فلسفی کا اس سے واسطہ پڑا ہوتا تو اس سے فلسفی کو بہت سے نکات معلوم ہو جاتے۔ ایک اجنبی کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کچھ بھی نہیں جانتا ہے۔ لیکن میں اس کے اندر ایک ایسا انسان دیکھتا تھا کہ جو مجھے پہلے کبھی نظر نہیں آیا تھا اور میں یہ طے نہ کر پایا کہ وہ شکسپیر کی طرح عقلمند ہے یا ایک بچے کی طرح لاعلم ہے۔ یعنی میں اس میں ایک اعلیٰ درجہ کا شعور دیکھوں یا جہالت۔

میرے قصبہ کے ایک شخص نے مجھے بتایا کہ جب وہ اُسے اپنی تنگ ٹوپی اوڑھے ہوئے سیٹی بجاتا ہوا گاؤں میں گھومتا دیکھتا ہے تو وہ اسے ایسا شہزادہ دکھائی دیتا ہے جس نے بھیس بدل رکھا ہو۔

اُس کے پاس صرف دو کتابیں تھیں ۔ ایک جنتری اور دوسری علم حساب سے متعلق کتاب ۔ آخرالذکر علم حساب کا وہ اچھا ماہر تھا ۔ اول الذکر جنتری اس کے نزدیک ایک قاموس (انسائیکلو پیڈیا) کی حیثیت رکھتی تھی ۔ اس کی نظر میں جنتری میں تمام انسانی علوم کا نچوڑ موجود تھا ۔ حقیقتاً یہ خیال بڑی حد تک صحیح بھی ہے ۔ مجھے اُس سے زمانہ کی مختلف اصلاحات کے بارے میں سوالات پوچھنا بہت مرغوب تھا ۔ وہ کبھی ان اصلاحات میں انتہائی سادہ اور عملی روشنی ڈالنے سے نہیں چوکتا تھا ۔ اس نے ایسی باتیں کبھی نہیں سنی تھیں ۔ میں نے اس سے پوچھا "کیا آپ فیکٹریوں کے بغیر کام چلا سکتے ہیں ؟" اس نے کہا ۔ "میں نے تو گھر کا بنا ہوا یہ سرخی مائل بھورے رنگ کا کپڑا پہنا ہے اور یہ کپڑا بہت اچھا ہے ۔" "کیا آپ چائے اور کافی کے بغیر گزارا کر سکتے ہیں ؟" "کیا اس ملک میں پینے کے پانی کی بجائے کوئی اور مشروب بھی استعمال ہو سکتا ہے ؟" اس نے شیکران کی پتیں بھگو کر اُن کا عرق پیا تھا ۔ اور اس کا خیال تھا کہ موسم گرما میں وہ پانی سے بھی اچھا ہوتا ہے ۔ جب میں نے اس سے یہ پوچھا کہ کیا روپے کے بغیر اس کا کام چل سکتا ہے تو اس نے روپے پیسے کی سہولتوں پر اس انداز سے روشنی ڈالی جو اس ادارہ کے وجود میں آنے کی سب سے زیادہ فلسفیانہ دلیلوں سے منطبق ہو گئی اور یہ بات بھی روشن ہو گئی کہ لفظ "پیکونیا" کہاں سے اخذ کیا گیا ہے ۔ اگر کوئی بیل اس کی جائداد ہوتا اور وہ دوکان سے دھاگا یا سوئی لینا چاہتا تو اس کا خیال تھا کہ اس کے لئے یہ امر انتہائی تکلیف دہ اور ناممکن ہوتا کہ ان چیزوں کے لئے بیل کا کوئی نہ کوئی حصہ مسلسل رہن رکھتا چلا جائے ۔ وہ بہت سے اداروں کی حمایت میں فلسفیوں سے زیادہ بہتر دلائل پیش کر سکتا تھا اس

لئے کہ جب وہ ان کو اپنے سے وابستہ کر کے بیان کرتا تھا کہ ان کے رائج ہونے کے اصل اسباب پیش کرتا تھا یعنی ایسے اسباب بیان نہیں کرتا تھا جو غور و فکر نے اُسے سمجھائے ہوں۔ ایک اور موقع پر جب اُسے یہ بتایا گیا کہ افلاطون نے جب انسان کی یہ تعریف کی کہ وہ دو ٹانگوں والا حیوان ہے جس کے بال و پر نہیں ہوتے " تو ایک شخص نے ایک مُرغ کے پر نوچ کر اُسے دکھائے اور کہا کہ یہ افلاطون کا انسان ہے۔ لکرہارے نے یہ سُن کر کہا کہ " دونوں میں یہ اہم فرق ہے کہ مُرغ کے گھٹنے غلط انداز میں مڑتے ہیں " وہ بعض اوقات کہہ اُٹھتا تھا " باتیں کرنا مجھے بہت مرغوب ہے۔ خدا کی قسم میں دن بھر باتیں کر سکتا ہوں " ایک روز جب مجھے اس سے ملے ہوئے کئی مہینے ہو چکے تھے میں نے اس سے پوچھا " کیا اس موسم گرما میں کوئی نیا خیال سُوجھا ہے " اُس نے جواب دیا " خدا کی قسم! میری طرح کام کرنے والا شخص اگر ان خیالات کو بھول نہ جایا کرے جو اُس کے ذہن میں آتے ہیں۔ تو وہ بہت ترقی کر جائے۔ ممکن ہے جس شخص کے ساتھ آپ کھیت کی گُڑائی کر رہے ہوں وہ آپ سے کھیت گوڑنے میں مقابلہ کرنا چاہتا ہے۔ اس حالت میں خدا کی قسم! آپ کو جی لگا کر کام کرنا چاہیئے۔ آپ اس وقت صرف جھاڑ جھنکار کے بارے ہی میں سوچتے ہیں " ایسے مواقع پر وہ مجھ سے پہلا سوال یہ کرتا تھا " کیا آپ نے کچھ ترقی کی ہے " ایک دن موسم سرما میں یہ سوچ کر کہ میں اس کے خارجی پادری کی جگہ اس کے باطن میں کوئی متبادل پادری پیدا کر دوں۔ میں نے اس سے پوچھا " کیا آپ ہمیشہ مطمئن رہتے ہیں؟ " اس نے کہا " مطمئن۔ بعض لوگ ایک چیز اور بعض لوگ دوسری چیز سے مطمئن ہوتے ہیں۔ ایک شخص جس کے پاس بہت دولت ہے غالباً اس سے مطمئن ہو جائے گا کہ وہ دن بھر آگ کی پیٹھ اور میز کی طرف پیٹ کئے ہوئے بیٹھا رہے " اس کے باوجود میں کسی تدبیر سے اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا کہ وہ چیزوں کو روحانی نقطۂ نظر سے دیکھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس کا جو بلند ترین خیال محض مصلحت

نصیب ہوتی تھی۔ میرے مہمانوں میں کچھ لوگ بہت ہی عجیب ہوتے تھے۔ خیرات خانوں سے اور دوسری جگہوں سے نیم پاگل لوگ مجھ سے ملنے آتے تھے لیکن میں کوشش کرتا تھا کہ وہ اپنی زبان بھی عقل استعمال کریں۔ اور میرے سامنے اپنے دل کی باتیں کہیں۔ ایسے معاملات میں عقل ہی ہماری گفتگو کا موضوع بنتی تھی۔ اس طرح میرا جو وقت ضائع ہوتا تھا میں اس کا پورا معاوضہ وصول کر لیتا تھا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ ان میں بعض ایسے لوگ بھی مل جاتے تھے جو غریبوں کے نام پر نگرانوں اور قصبہ کے منتخب لوگوں کی نسبت زیادہ عقلمند ہوتے تھے۔ اور میں سوچنے لگتا تھا کہ پانسہ پلٹ دینے کا وقت آ گیا ہے۔ جہاں تک عقل کا سوال ہے مجھے پتہ چلا کہ نصف اور کل میں زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ ایک دفعہ خاص طور پر ایک مسکین اور بدنصیب مفلس شخص مجھ سے ملنے آیا۔ جسے میں نے اکثر دوسرے لوگوں کے ساتھ باڑھ لگانے کا کام کرتے ہوئے دیکھا تھا اور جو ... مویشیوں کو بھٹکنے سے روکنے کے لئے کھیت میں ایک ڈھیر پر لیٹا یا بیٹھا ہوتا تھا۔ اس نے اس ... خواہش کا اظہار کیا کہ وہ میری طرح زندگی بسر کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اس ... اور کمتری سے کام لئے بغیر جیسے ... انتہائی سادگی اور سچائی سے بتایا کہ وہ کم عقل ہے۔ اس کے الفاظ یہ تھے "حضرات مجھے ایسا ہی بنایا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ خدا دوسروں کی طرح میرا بھی خیال رکھتا ہے" وہ کہنے لگا "میں اپنے بچپن سے ہمیشہ ایسا ہی رہا ہوں۔ میں زیادہ عقل کا مالک نہیں تھا۔ میں دوسرے بچوں کی طرح نہیں تھا۔ میرا دماغ کمزور ہے۔ میرا خیال ہے کہ خدا کی یہی مرضی تھی" اور وہ اپنے الفاظ کی صداقت ثابت کرنے کے لئے خود موجود تھا۔ میرے لئے وہ ایک مابعد الطبیعاتی معمہ بن گیا۔ میں ایسی امید افزا سطح پر شاذ ہی کسی انسان سے ملا ہوں۔ جو کچھ اس نے کہا تھا اس میں کتنی سادگی اور کتنی سچائی تھی اور کتنا خلوص تھا۔ اور سچ تو ہے کہ وہ جس قدر اپنے آپ کو حقیر ظاہر کرتا تھا اتنا ہی بلند و برتر ہوتا جاتا تھا۔ میں پہلے نہیں جان سکا تھا۔ لیکن بعد میں مجھے پتہ چلا کہ اس کی باتیں

دانشمندانہ حکمت عملی کا نتیجہ تھیں۔ صاف ظاہر تھا کہ جس سچائی اور بے باکی کی بنیاد اُس غریب اور کم عقل شخص نے پیش کی تھی، اُس سے آگے بڑھ کر ہمارا باہمی میل جول اُس منزل تک پہنچ سکتا ہے جہاں وہ ریشمی ملبوں کے میل جول سے زیادہ بہتر ثابت ہو۔

میرے ہاں کچھ ایسے مہمان بھی آتے جن کو عام طور سے قصبہ کے غریب لوگوں میں شمار نہیں کیا جاتا مگر ان کو شمار ضرور کیا جانا چاہیئے۔ وہ لوگ تھے جو کم سے کم دنیا کے غریب لوگوں میں سے تھے۔ یہ وہ مہمان تھے جو آپ سے ان نوازش کی توقع نہیں رکھتے تھے بلکہ آپ کی نوازش دینے والی قوت کو اکساتے تھے۔ جو بڑے شوق سے اس خواہش کا اظہار کرتے تھے کہ ان کی مدد کی جائے۔ اور وہ اپنی التجا کے ساتھ یہ معلومات بہم پہنچاتے تھے کہ انہوں نے یہ تہیہ کر رکھا ہے کہ وہ ہرگز اپنی مدد آپ نہیں کریں گے۔ میں اپنے ملاقاتی سے یہ توقع ضرور رکھتا ہوں کہ وہ واقعی بھوکا نہیں مر رہا ہے۔ گو اسے دنیا میں سب سے زیادہ بھوک لگتی ہے۔ اور اس کے پیٹ کے بھارہ بھر کم ہونے کے اسباب چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔ جو لوگ خیرات پر زندہ رہتے ہوں وہ مہمان نہیں ہو سکتے۔ مجھ سے ایسے لوگ بھی ملنے آتے تھے جن کو یہ علم ہی نہیں ہوتا تھا کہ ان کی ملاقات [illegible] اپنے کام میں دوبارہ جٹ جانا تھا۔ اور [illegible] زیادہ سے زیادہ دور ہٹ کر ان کی باتوں کا جواب دینے لگتا تھا۔ اس موسم میں جب پرندے ہجرت شروع کرتے ہیں، مجھ سے ہر درجہ کی عقل رکھنے والے لوگ ملنے آتے تھے۔ ان میں کچھ لوگ ایسے ہوتے تھے جن کو یہ خبر تک نہیں ہوتی تھی کہ ان کو اپنی عقل سے کیا کام لینا ہے۔ ان لوگوں میں وہ غلام ہوتے تھے جو فرار ہو کر آتے تھے۔ اور باغات میں مزدوری کرنے والے لوگوں جیسے اطوار رکھتے تھے۔ وہ وقتاً فوقتاً اس طرح باتیں سنتے تھے جس طرح کوئی افسانوی لومڑی سنتی تھی۔ اور ان کو اب بھی یہ کھٹکا لگا ہوا تھا کہ ان کے پیچھے شکاری کتے بھونکتے ہوئے آ رہے ہیں۔ اور میری طرف التجائی نظروں سے دیکھتے تھے جیسے کہہ رہے ہوں۔

آئے ، سچے عیسائی — کیا تو مجھے اُن کے پاس بھیج دے گا؟

ان میں ایک اتنی منفرد ۔ عالم کتابت میں نے شمالی قطب کے راستے کی طرف آگے بڑھنے میں مدد دی تھی ۔ ان میں ایسے لوگ بھی تھے جیسے ایک چوزے والی مرغی یا ایک بچے والی بطخ ۔ کچھ سے ایسے لوگ بھی ملنے آتے تھے جو بند اور دل خیالات رکھتے تھے ۔ اُن مرغیوں کی طرح جن کو سو چوزوں کی دیکھ بھال سپرد کی گئی ہو اور وہ سب ایک ہی کھٹمل کا پیچھا کر رہے ہوں ۔ ان میں سے بیسیوں چوزے صبح کی شبنم میں غائب ہو جاتے ہیں ۔ وہ اس تگ و دو میں خود پستی بن جاتے ہیں اور ان کے بال اکڑ اکڑ کر سڑے ہو جاتے ہیں ، وہ انسان جو ٹانگوں کی خیالات رکھتے ہیں ۔ ایک طرح کے ذہنی کھجوے ہیں جو اپنے آپ کو رینگنے پر مجبور کر دیتے ہیں ۔ ایک شخص نے تجویز پیش کی کہ میں ایسی کتاب رکھوں جس میں ملاقات کے لئے آنے والے لوگ اپنے نام لکھ دیا کریں ۔ یعنی ایسی کتاب جو والے کی میز پر رکھی ہوتی ہے ۔ مجھے افسوس ہے کہ میرا حافظہ اس قدر تیز ہے کہ ایسی کتاب رکھنے کی ضرورت ہی نہیں ہے ۔

میں آنے والے مہمانوں کی خصوصیات کو یاد رکھے بغیر نہیں رہ سکتا ۔ عام طور سے لڑکیاں لڑکے اور نوجوان عورتیں جنگل میں آ کر بہت خوش نظر آتی تھیں ۔ وہ تالاب میں جھانکتیں اور پھولوں کو دیکھتیں اور اپنا وقت بہت اچھی طرح گزارتی تھیں ۔ بیوپاری لوگ حتیٰ کہ کسان لوگ بھی صرف تنہائی اور کام کے بارے میں سوچتے تھے اور یہ ذکر ضرور کرتے تھے کہ ان کو جنگل میں گھومنا بہت پسند ہے ۔ لیکن صاف ظاہر تھا کہ وہ اس کو پسند نہیں کرتے تھے ۔ مجھ سے انتہائی مصروف بے چین لوگ بھی ملنے آتے جن کا سارا وقت روزی حاصل کرنے یا روزی برقرار رکھنے میں صرف ہوتا تھا ۔ مذہبی پیشوا آتے تھے جو خدا کی باتیں ایسے کرتے تھے جیسے اس موضوع پر بات کا صرف انہیں کو حق ہو ۔ وہ کسی قسم کے دلائل برداشت نہیں کر سکتے تھے ۔ ڈاکٹر آتے ، وکیل آتے اور مضطرب گھریلو عورتیں آتیں ۔ میری عدم موجودگی میں میری الماریوں اور بستر کو ٹٹولتی رہتیں ورنہ مسز ایس کو کیسے پتہ چل سکتا تھا کہ میرے بستر کی چادریں اس کے بستر کی چادروں

سے زیادہ روشن نہیں تھیں۔ وہ نوجوان لوگ بھی آتے جو نوجوان نہیں رہے تھے اور جنہوں نے یہ تہیہ کر لیا تھا کہ سب سے محفوظ طریقہ یہی تھا کہ کسی نہ کسی پیشے کے پامال راستہ پر چلا جائے۔ یہ سب لوگ عام طور سے یہی کہتے تھے کہ جیسی زندگی میری ہے ویسی زندگی بسر کرنے میں کوئی فائدہ نہیں۔ ہاں یہی تو مشکل تھی۔ بوڑھے اپاہج اور شدید بیمار لوگ بھی مجھ سے ملنے آتے تھے۔ ان کی عمر اور جنس خواہ کچھ بھی ہوتی وہ ہمیشہ بیماری، کسی اچانک حادثے یا موت کے بارے میں باتیں کیا کرتے تھے ان کے نزدیک زندگی خطرہ سے پر تھی۔ اگر آپ کسی خطرے کا خیال ہی نہ کریں تو پھر کون سا خطرہ باقی رہ جاتا ہے؟ ان کا خیال تھا کہ ہر مدبر شخص اپنے قیام کے لیے سب سے محفوظ جگہ بڑی احتیاط سے منتخب کرتا ہے جو ڈاکٹر کی ضمانت، ایک محکمے کے اندر اندر حاصل کی جا سکتی ہیں۔ ان کے نزدیک قسمت اجتماعی جانے پہچانے ... تھی یعنی باہمی حفاظت کی انجمن۔ آپ یہ فرض کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ ایسے لوگ گھر سے دواؤں کے بکس ہاتھ لیے بغیر جنگل میں لوبیر چننے کے لیے نہیں نکل سکتے۔ ان تمام باتوں کا مطلب یہ ہے کہ اگر انسان زندہ ہے تو اسے ہمیشہ موت کا خطرہ رہے گا۔ اگرچہ یہ خطرہ بہت کم ہے کیونکہ وہ ابتدا ہی سے نیم مردہ ہوتا ہے۔ آدمی کو دوڑتے ہوئے اتنے ہی خطرے لاحق ہوتے ہیں جتنے بیٹھے ہوئے۔ مجھ سے کچھ خود راحت قسم کے اصلاح پسند لوگ بھی ملنے آیا کرتے تھے۔ ان کی باتیں سب سے زیادہ آزار دینے والی ہوتی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ میں یہ گیت گا رہا ہوں

"یہ وہ مکان ہے جو میں نے خود تعمیر کیا ہے۔
یہ وہ آدمی ہے جو اس گھر میں رہتا ہے جسے میں نے بنایا ہے"

— لیکن انہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ اس گیت کا تیسرا مصرع یہ ہے:۔

"یہ وہ لوگ ہیں جو اس شخص کو
تنگ کرتے ہیں جو اس گھر میں رہتا ہے جسے میں نے بنایا ہے"

میرا ان لوگوں سے ہمیں رشتہ جو مریضوں کو پریشان کرتے ہیں۔ کیونکہ میں نے مرغیاں پالی

ہیں۔ لیکن میں ان لوگوں سے فرو۔ تر ہیں جو انسان کو ستاتے ہیں۔

آخر الذکر مہمانوں کی نسبت میرے ہاں زیادہ مسرت بخش مہمان آتے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو گوندنیاں چننے آتے تھے۔ ریل کی پٹڑی پہ کام کرنے والے لوگ تھے جو صاف ستھری قمیصیں پہن کر اتوار کی صبح سیر کو نکلتے تھے، ماہی گیر، شکاری، شاعر اور فلسفی تھے۔ قصہ مختصر وہ تمام ایماندار سیاح تھے جو آزادی کی فضا میں جنگل کی سیر کو نکلتے تھے۔ اور گاؤں کو صحیح معنوں میں پیچھے چھوڑ آتے تھے۔ میں ان کا یوں خیر مقدم کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتا تھا۔ "انگریزو خوش آمدید۔ خوش آمدید انگریزو!"۔ اس لئے کہ یہ وہ نسل تھی جس سے میں تبادلہ خیالات کر چکا تھا۔
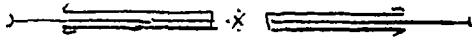
سیم کا کھیت

اس عرصہ میں میری سیم (جس کی قطاروں کو سیدھا جوڑا جاتا تو اُن کی کُل لمبائی سات
میل ہو جاتی) گوڑے جانے کی منتظر تھی۔ کیونکہ ابتدائی فصل آخری فصل سے بہت زیادہ بڑھ چکی
تھی۔ اس سیم کی گوڑائی آسانی سے ٹالی نہیں جا سکتی تھی۔ اس پُراستقلال، خود دار اور ہرکولیس
جیسی مختصر سی مشقت کے معنی آخر کیا تھے؟ یہ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ میں اپنی فصل کی
قطاروں اور سیم کو بہت عزیز رکھنے لگا تھا۔ اگرچہ وہ میری ضرورت سے بہت زیادہ تھی۔ اُنہوں
نے مجھے زمین سے وابستہ کر دیا تھا اور اس طرح مجھ میں "اینٹیوس" جیسی طاقت آگئی تھی۔ لیکن
میں سیم کیوں اُگاتا ہوں! خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ میں سارے موسم میں یہی عجیب و غریب محنت
کرتا رہا۔ میری خواہش تھی کہ سطح زمین کے اس حصہ کو جس میں ابتک صرف تیج پتیا، کالی گوندنی
جڑی بوٹیوں جیسی چیزیں، میٹھے جنگلی پھل اور دلکش پھول ہی پیدا ہوتے تھے۔ ایسا بناؤں کہ
کہ اس میں دال پیدا ہو سکے۔ میں سیم کیا سیکھوں گا اور سیم مجھ سے کیا سیکھے گی؟ مجھے اس کی کاشت
مرغوب ہے۔ اس کی گوڑائی کرتا ہوں، دیر سویر ان کی نگرانی کرتا ہوں اور یہی میرا دن کا کام ہے۔ شبنم
اور بارش میرے معاون ہیں جو اس خشک زمین کی سینچائی کرتی ہیں۔ زمین میں جو قوت نمو ہے
وہ بہت ہی کم اور ناقص ہے۔ میرے دشمن کیڑے، ٹھنڈے دن اور گلہریاں ہیں۔ آخرالذکر
دشمن نے ایک چوتھائی ایکڑ زمین پر فصل کتر کر تباہ کر دی ہے۔ آخر مجھے اس بات کا کیا حق تھا

کہ میں "جانسورٹ" اور دیگر پھولوں کو بے دخل کر دوں اور جڑی بوٹیوں کے پرانے باغ کو اکھاڑ پھینک دوں؟ بہرکیف بہت جلد باقی سیم اُن کے لئے بہت سخت ہو جائے گی اور نئے دشمنوں کا مقابلہ کر سکیں گی۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میری عمر چار برس کی تھی اُس وقت مجھے ان ہی جنگلوں سے اور اس کھیت سے تا بہ تک یعنی میرے اس مقامی قصبے تک لایا گیا تھا۔ یہ وہ قدیم ترین منظر ہے جو ابھی تک میری قوتِ حافظہ پر ثبت ہے۔ اور آج رات کو میری بانسری نے اس پانی پر وہی صدائے بازگشت پیدا کر دی ہے۔ صنوبر کے درخت اسی طرح کھڑے ہیں جو مجھ سے زیادہ معمر ہیں۔ اور اگر اُن میں سے کچھ بیٹھ گر چکے ہیں تو میں نے ان کی تختوں سے اپنا کھانا پکا لیا ہے اور ان کی جگہ نئے درخت چاروں طرف اُگ رہے ہیں اور نئے بچوں کی آنکھوں کے لئے نئے مناظر تیار کر رہے ہیں۔ زیادہ تر وہی جانسورٹ اس چراگاہ میں سدا ہری بھری رہنے والی جڑ سے پھوٹ رہی ہیں۔ اور میں نے خود بھی اپنے بچپن کے خوابوں کی وسیع و عریض سرزمین کو نیا لباس پہنانے میں مدد دی ہے۔ یہ میری موجودگی اور میرے اثر و رسوخ کا نتیجہ ہے جو سیم کی ان پتیوں، اناج کی بالیوں اور آلوؤں کی بیلوں میں نظر آ رہا ہے۔

میں نے اونچائی پر دا تقریباً ڈھائی ایکڑ زمین میں سیم لگائی ہے۔ چونکہ اس زمین کو صاف کئے ہوئے پندرہ برس بیت چکے ہیں۔ اور میں نے خود جڑوں کی دو تین قطاریں اکھاڑ کر نکالی تھیں اس لئے میں نے کوئی کھاد نہیں ڈالی اور موسم گرما میں گوڑائی کے وقت جب زمین کو الٹا پلٹا تھا۔ اس میں جب تیر کے پھل نکلے تو صاف ظاہر ہو گیا کہ گزرے لوگوں سے پہلے ایک ایسی قوم رہتی تھی جو نیست و نابود ہو چکی ہے۔ اس قوم نے یہاں غلہ بویا تھا اور سیم بھی اور اس طرح ایک حد تک اس زمین کو سیم کی کاشت کے لئے بیکار بنا دیا تھا۔

کسی جنگلی یا دوسری گلہری کے سڑک پار کرنے سے پہلے یا سورج کے جھاڑ والے
شاہ بلوط کے پیڑوں کے اوپر بلند ہونے سے پہلے جب ساری شبنم موجود ہوتی تھی کسانوں
کے اشتباہ کے باوجود میں آپ کو یہی مشورہ دوں گا کہ اگر ہو سکے تو شبنم کے موجود رہنے تک
اپنے سارے کام ختم کر لیجیئے۔ میں نے خود گھاس کی قطاروں کو کاٹنا اور ان کے سروں
پر مٹی ڈالنا شروع کر دیا۔ میں سے ننگے پاؤں کام کرتا تھا اور پلاسٹک کی مورتیاں
ڈھالنے والے فنکاروں کی طرح شبنم اور ریت سے اَٹ جاتا تھا۔ دن چڑھنے پر سورج
کی تمازت سے پاؤں میں چھالے پڑ جاتے تھے۔ اب میں سورج کی روشنی میں پندرہ جریب
لمبی دو سبز قطاروں کے درمیان نرم کنکریلی بلند زمین پہ آہستہ آہستہ آگے پیچھے چل
کر اپنی سیم گوڈتا تھا۔ ان قطاروں کا ایک سرا شاہ بلوط کی جھاڑیوں کے جھنڈ میں ختم
ہوتا تھا جہاں میں سائے میں دم لیتا تھا۔ دوسرا سرا گوندنیوں سے بھرے ہوئے کھیت
پر ختم ہوتا تھا جہاں ہری گوندنیوں کا رنگ میرے دوبارہ دوپہر تک گہرا ہونے
لگتا تھا۔ گھاس کاٹنا سیم کی جڑوں میں تازہ مٹی ڈالنا اور سیم کی نشوونما کرتے رہنا جیسے
میں نے لے لیا تھا۔ جیسے سیم کو سیم کی پتیوں کے ذریعہ موسم گرما کا خیال ظاہر کرنے دینا کھٹے
کیٹا اور مکئی گھاس کی زمین کو سیم اگلنے پہ مجبور کرنا میرا روز کا کام تھا۔ چونکہ مجھے گھوڑوں
یا مویشیوں یا اجرتی مزدوروں یا لڑکوں یا کاشتکاری کے بہتر اوزاروں کی امداد حاصل
نہ تھی۔ اس لئے میرا کام نسبتاً بہت دھیرے دھیرے ہوتا تھا۔ اور اپنی سیم کے ساتھ میرا
کلی رشتہ قائم ہو گیا تھا۔ ہاتھوں کی محنت کو چاہے بیگار کی حد تک کیوں نہ پہنچا دیا جائے
پھر بھی وہ بدترین قسم کی بیکاری کے مترادف نہیں ہوتی۔ اس سے ایک پائیدار اور
غیر فانی سبق ملتا ہے جو دانشور کے لئے ایک کلاسیکی نتیجہ ثابت ہوتا ہے۔ میں ان مسافروں
کو جو لنکن اور ویلینڈ سے ہو کر مغرب کی طرف نہ جانے کہاں کہاں جاتے تھے۔ ایک
بہت ہی محنتی کاشتکار نظر آتا تھا۔ وہ اپنی اپنی گاڑیوں میں بڑے آرام سے بیٹھے

ہوتے تھے۔ اُن کی کہنیاں اُن کے گھٹنوں پہ ہوتی تھیں اور ڈھیلی ڈھالی لنگائیں ہاروں کی طرح لٹکی ہوئی ہوتی تھیں۔ میں اُن کو خانہ نشین قسم کا محنتی اور زمین سے وابستہ کسان دکھائی دیتا تھا۔ لیکن بہت ہی جلد میری جھونپڑی ان کی آنکھوں اور خیالوں سے اوجھل ہو جاتی تھی۔ یہی سڑک کے دونوں طرف دُور تک پھیلا ہوا مزرعہ کھیت تھا۔ اس لئے وہ اس کا جی بھر کر نظارہ کرتے تھے۔ بعض اوقات کھیت میں کام کرنے والا شخص اُن کے ایسے فقرے اور اُن کی ایسی گفتگو بھی سُن لیتا تھا جو کسی کو سُنانے کے لئے نہیں کی جاتی تھی۔ "اس موسم میں سیم کم رہے۔ اور پھر اتنی دیر سے۔" دراصل میں سیم اس وقت بھی بویا تھا جب دوسرے لوگ اُس کی گوڈائی شروع کر دیتے تھے۔ ناصح کاشتکار کو اس کا شبہ تک نہیں ہوتا تھا کہ ایسا بھی ہوسکتا ہے۔ کالے کوٹ والا بھورے کوٹ والے سے پوچھتے "میرے بچے ۔ اناج چارہ کے لئے ۔ اناج چارے کے لئے" "کیا یہیں رہتا ہے؟" کرخت خدوخال والا کسان نالیوں میں کھاد نہ دیکھ کر یہ پوچھنے کے لئے اپنے ہل چلانے والے ممنون گھوڑے کی باگ کھینچ لیتا ۔ "کیا کرتے تو اس میں کھاد ڈال کر تھوڑا سا کوڑا کرکٹ اور بیدہ پیڑیں ڈال دیتے۔ وہ رکھیا دلوار تو اتنا ہو پلستر نہ ہو۔" لیکن یہاں تو ڈیڑھ ایکڑ زمین میں نالیاں تھیں۔ صرف ایک سیلچہ تھا اور گاڑی کھینچنے کے لئے دو ہاتھ تھے۔ گاڑیوں اور گھوڑوں سے گریز کیا جاتا تھا۔ اور کوڑا کرکٹ بہت دُور تھا۔ میرے کھیت کے قریب سے گزرتے ہوئے میرے ساتھی کسان جب اپنی گاڑیاں کھڑکھڑاتے ہوئے گزرتے تھے تو میرے کھیت کا اُن دوسرے کھیتوں سے بلند آواز میں موازنہ کیا کرتے تھے۔ جن کے قریب سے وہ گزر کر آیا کرتے تھے۔ اس طرح مجھے پتہ چل جاتا تھا کہ میں زراعت کی دنیا میں کہاں کھڑا ہوں۔ یہ وہ کھیت تھا جس کا ذکر مسٹر کولمین نے اپنی رپورٹ میں نہیں کیا تھا۔ میں یوں ہی آپ سے پوچھتا ہوں کہ اس سے بھی زیادہ جنگلی کھیتوں میں جو فصل قدرت اگاتی ہے اس کا اندازہ کون لگاتا ہے؟ انگریز

گھاس کی فصل کو بڑی احتیاط سے تولا جاتا ہے۔ اس کی نمی کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ اور اس بات کا بھی کہ اس میں کتنا نمک اور کتنی پوٹاس ہے۔ لیکن تمام گھاٹیوں میں، تالاب کے گڑھوں میں، گیپ سھاٹوں میں، اور دلدلوں میں قسم قسم کی اچھی فصلیں ہوتی ہیں۔ اور کوئی انسان انہیں کاٹتا تک نہیں۔ میرا کھیت جیسا بھی تھا جنگلی اور مزروعہ کھیتوں کے درمیان ایک کڑی تھا۔ جس طرح بعض ممالک مہذب اور بعض نیم مہذب اور باقی وحشی یا جنگلی ہوتے ہیں۔ بالکل اسی طرح میرا کھیت (دوسرے معنی میں نہ سہی) ایک نیم مزروعہ کھیت تھا۔ میں نے جن سیموں کی کاشت کی تھی وہ خوشی خوشی اپنی وحشیانہ اور ابتدائی حالت کی طرف لوٹ رہی تھیں۔ اور میرا بیلچہ انکے ملاپ کا نغمہ بجا رہا تھا۔

بہت ہی قریب بید کے درخت کی سب سے بالائی ٹہنی پر ایک پرندہ براؤن تھریشر (جسے بعض لوگ سرخ طرقہ کے نام سے پکارنا زیادہ پسند کرتے ہیں) بیٹھا ساری صبح تک گاتا رہتا ہے جیسے وہ آپ کی محبت میں بہت خوش ہو۔ اگر یہ کھیت یہاں نہ ہوتا تو وہ کسی دوسرے کسان کا کھیت ڈھونڈ نکالتا۔ جب میں بیج ڈال رہا ہوتا ہوں تو وہ چیختا ہے "اسے ڈال دو۔ اسے ڈال دو۔ اسے ڈھک دو۔ اسے ڈھک دو۔ اسے باہر نکال لو۔ باہر نکال لو۔ باہر نکال لو" لیکن سیم اناج نہیں۔ اس لئے وہ اس جیسے دشمنوں سے محفوظ رہتی تھی۔ آپ کو تعجب ہو سکتا ہے کہ اس کی لے وسروپا نغمہ سرائی اور غیر پیشہ ورانہ یکاینی وائلن نوازی کا خواہ وہ ایک تار والے یا بیس تاروں والے وائلن پر ہو آپ کی بوائی سے کیا تعلق ہے۔ اس کے باوجود آپ اس کے نغمہ کو راکھ یا پلستر پر ترجیح دیتے ہیں۔ یہ سستی قسم کی سطحی کھاد دینے کی کارروائی تھی جس پر مجھے مکمل اعتماد تھا۔

جب میں اپنے بیلچے سے قطاروں میں زیادہ تازہ مٹی کھینچتا تھا تو میں اس وقت بے نام قوموں کی راکھ کریدتا تھا جو اس آسمان تلے ابتدائی زمانوں میں رہا کرتی تھیں۔ ان کے چھوٹے چھوٹے آلاتِ جنگ اور شکار کے ہتھیار جدید زمانہ کے منظرِ عام پر آجاتے تھے۔ وہ دوسرے

پتھر کے ٹکڑوں کے بنے ہوئے پڑے رہتے تھے۔ ان پر ایسے نشانات ہوتے تھے جیسے ان کو انڈینوں کے چولھوں نے پکایا ہو۔ اور بعض کو سورج نے تپایا ہو۔ برتنوں اور شیشوں کے ٹکڑے کبھی نکلتے تھے۔ جو ماضی قریب کے کاشتکار یہاں لائے تھے۔ جب میرا بیلچہ پتھروں سے ٹکراتا تو جنگل اور آسمان اسکی موسیقی سے گونج اٹھتے۔ یہ نغمہ میری اس محنت کے ساتھ تان دیتا تھا۔ جس کا فوری اور بے حد انعام مل جاتا تھا۔ اس کے بعد میں سیم نہیں گوڑتا تھا۔ اور موڈ کبھی سیم گوڑنے والا نہیں رہتا تھا۔ اس وقت اگر وہ قیمتی کچھ یاد کر رہا ہوتا تھا تو بڑی ہمدردی اور فخر سے اپنے ان شناساؤں کو یاد کر رہا ہوتا تھا۔ جو شہر میں کوئی مذہبی ناٹک دیکھنے گئے ہوتے تھے۔ دھوپ سے چمکتی ہوئی سہ پہروں میں رات کو شکار کرنے والا شکرہ میرے اوپر منڈلاتا تھا۔ وہ شکرہ بار بار اس طرح جھپٹا اور ایسی آواز پیدا کرتا جیسے آسمان پھٹ پڑا اور چرچرا کر چیتھڑے چیتھڑے ہو گیا ہو اور اس کے باوجود ایک سالم گنبد ہو یہ چھوٹے چھوٹے شریر پرندے جو فضا پر چھائے رہتے ہیں۔ اور زمین پر آکر ریت یا پہاڑوں کی چوٹیوں کے پتھروں پر جہاں لوگوں کی رسائی نہ ہو انڈے دیتے ہیں۔ یہ ایسے نازک اور پتلے ہوتے ہیں جیسے تالاب میں ابھرنے والی چھوٹی چھوٹی لہریں یا وہ پتیاں جنہیں ہوا اڑا کر آسمان پر پہنچا دیتی ہے۔ قدرت میں اس قسم کی قرابت موجود ہے شکرہ لہر کی ہوائی بہن ہے جس کے اوپر وہ اڑتا رہتا ہے۔ اور اس کی پیمائش کرتا رہتا ہے۔ اس کے ہوا میں پھیلے ہوئے شہپر سمندر کی ان لہروں کا جواب ہوتے ہیں۔ میں بعض اوقات دو شکروں کا جوڑا آسمان میں چکر کاٹتا ہوا دیکھتا ہوں وہ کبھی اڑ کر بہت اونچے اٹھ جاتے ہیں۔ اور کبھی بہت نیچے آجاتے۔ ایک دوسرے سے قریب ہو جاتے۔ اور پھر جدا ہو جاتے ہیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ میرے ہی خیالات ہوں۔ جو مجسم ہو گئے ہوں یا جنگلی کبوتروں کا ایک غول اس جنگل سے اس جنگل میں قاصدوں کی سی تیز رفتاری کے ساتھ دھیرے

دھیرے پھڑپھڑاتا ہوا اڑ جاتا۔ اور مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے یا ایک گلے سڑے ٹھنٹھ کے نیچے سے میرا بیلچہ ایک کاہل، منحوس، عجیب الخلقت چھپکلا "سلامانڈر" نکال دیتا ہے۔ جو مصر اور دریائے نیل کی یاد دلانے کے باوجود پھر بھی ہمارا ہم عصر ہوتا ہے۔ جب میں سیم کی قطاروں میں کدال کے سہارے دم لینے کے لئے کھڑا ہو جاتا تو جو آوازیں سنتا اور جو مناظر دیکھتا ہوں وہ دیہات کی لامحدود تفریح کا جزو ہوتے ہیں۔

تہوار کے دنوں میں قصبہ بڑی بڑی توپیں داغتا ہے جن کی صدا جنگل میں پٹاخے دار پستولوں کی طرح سنائی دیتی تھی۔ فوجی موسیقی کی تانیں بھی کبھی کبھی اتنی دور تک پہنچ آتی ہیں۔ قصبے سے اتنی دور اپنے سیم کے کھیت میں مجھے بڑی بڑی توپوں کے دھماکے یوں سنائی دیتے ہیں جیسے کوئی غبارہ پھٹ گیا ہو اور جب بھی کوئی ایسی فوجی پریڈ ہو رہی ہوتی ہے جس کا مجھے کوئی علم نہیں ہوتا تو بعض اوقات دن بھر اس قسم کا مبہم سا احساس رہتا ہے جیسے افق میں ایک طرح کی کھجلی ہو رہی ہو یا جیسے وہاں کوئی لاوا پھٹ پڑے گا یا قرمزی بخار یا سرخ بادہ کی وبا پھوٹ پڑے گی۔ یہاں تک کہ آخر کار ہوا کا کوئی مہربان جھونکا کھیتوں سے تیزی کے ساتھ گزرتا ہوا اور وینڈ سڑک پر پھرتی سے چڑھتا ہوا میرے پاس یہ اطلاع لئے ہوئے پہنچتا ہے کہ یہ فوجی مشق ہو رہی ہے۔ دور کی بھنبھناہٹ سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی کی شہد کی مکھیاں اڑ گئی ہیں اور اس کے پڑوسی ورجل کی ہدایت کے مطابق اپنے سب سے زیادہ گونجنے والے برتن بجا کر دوبارہ چھتے کے اندر بلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جب یہ آواز ڈوب جاتی اور بھنبھناہٹ بند ہو جاتی ہے اور بہترین ہوائیں مجھ سے کوئی کہانی نہیں کہتیں تو مجھے پتہ چل جاتا ہے کہ شہد کی آخری مکھی بھی مڈل سیکس کے چھتے میں بحفاظت تمام پہنچ چکی ہے اور اب اس کا دل شہد دینے میں لگا ہوا ہے۔

میں یہ جان کر بہت فخر محسوس کرتا تھا کہ میسے چوسیٹس اور ہمارے وطن کی آزادیاں محفوظ ہاتھوں میں ہیں اور جب دوبارہ گوڑائی شروع کرتا تھا تو میرے دل میں ایک ناقابلِ بیان اعتماد پیدا ہو جاتا تھا اور میں بڑی شگفتہ دلی اور بڑے اطمینان سے مستقبل پر بھروسا کرتے ہوئے اپنے کام میں جٹ جاتا تھا۔

جب موسیقاروں کے متعدد بینڈ بجنے لگتے تھے تو ایسی آواز آتی تھی جیسے سارا گاؤں ایک بہت بڑی دھونکنی ہو اور ساری عمارتیں سال سال کر کے پھیلتی اور سکڑتی ہوں لیکن بعض اوقات اس جنگل تک موسیقی کی واقعی نفیس اور دلکش دھنیں پہنچتی تھیں اور میں اس بگل کی آواز سنتا تھا جو فتح و نصرت کے گیت گاتا تھا۔ تو مجھے محسوس ہوتا تھا کہ میں خوشی خوشی میکسیکو کے کسی باشندے کے دو ٹکڑے کر سکتا ہوں۔ ہم چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال کرتے ہوئے اپنے قدم کیوں روکیں؟ اور پھر میں کسی جنگلی گلہری یا جنگلی بلی کو ڈھونڈنے لگتا تاکہ ان پر اپنی بہادری آزما سکوں۔ موسیقی کی دھنیں مجھے جتنی دور معلوم ہوتیں۔ اور گاؤں کے اوپر چھائے ہوئے شاہ بلوط کے درختوں کے چھناروں پر اپنی کپکپاتی اور مرتعش حرکت سے مجھے افق پر صلیبی مجاہدوں کے مارچ کی یاد دلاتی تھیں۔ یہ ایک بہت شاندار دن ہوتا تھا اگرچہ جب میدان سے آسمان ہر روز کی طرح ابدی طور پر عظیم الشان نظر آتا تھا۔ پھر بھی اس دن میں اس میں کوئی خاص فرق نہیں دیکھتا تھا۔

سیموں سے میرا طویل رشتہ یعنی ان کو گوڑنا، ان کی نلائی کرنا، ان کی فصل کاٹنا ان کا گاہنا ان کی چھان پھٹک کرنا، ان کو چننا اور پھر انہیں بیچنا (آخر الذکر سب سے مشکل کام تھا) اور ان کاموں میں اگر سیم کھانا بھی شامل کر لیا جائے تو یہ ایک بے مثال تجربہ ہوتا تھا۔ میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ میں سیم سے اچھی طرح واقفیت حاصل کر لوں گا۔ جب سیم کی فصل بڑھ رہی تھی تو میں صبح پانچ بجے سے سہ پہر تک گوڑائی کرتا رہتا تھا۔ اور عام طور سے باقی دن دوسرے کاموں میں صرف کیا کرتا تھا۔ آپ نے

سوچئے آپ بھی کہ انسان کو مختلف اقسام کے جھاڑ جھنکار سے کتنی گہری اور عجیب واقفیت ہو جاتی ہے ۔ اس روداد میں ان کا اعادہ اتنا مشکل نہیں ہے جتنا محنت کر کے اُن کا اکھاڑ پھینکنا۔ کیونکہ اُن کے نازک نظام کو بڑی سنگدلی سے اتھل پتھل کرنا پڑتا ہے ۔ اور انسان کو اپنے بیلچے سے ان کے درمیان ایک غیر مناسب امتیاز کرنا پڑتا ہے ۔ یعنی وہ اس جھاڑ جھنکار کی ایک نوع کی ساری ہی قطاریں تو کاٹ ڈالتا ہے ۔ لیکن بڑی عرق ریزی سے اُن کی دوسری نوع کی پرورش کرتا ہے ۔ وہ رومی افسنتین ہے ۔ وہ گورگا ... ہے ۔ وہ کنٹی گھاس ہے ۔ اور وہ چچڑا ہے ۔ اس پر جھپٹ پڑو اسے کاٹ ڈالو۔ اُس کی جڑیں اکھاڑ کر اُن کا منہ سورج کی طرف کر دو۔ اس کا کوئی ریشہ چھاؤں میں پڑا نہ رہنے دو۔ اگر آپ ایسا کریں گے تو وہ کروٹ بدل لے گا۔ اور دو دن کے اندر پھر ہرا بھرا ہو جائے گا۔ یہ طویل جنگ ہے سارسوں سے نہیں بلکہ جھاڑیوں سے جو ٹروجن کے باشندوں کی طرح ہیں جن کے ساتھ سورج تھا۔ بارش تھی اور شبنم تھی۔ میری سیمیں ہر روز مجھے اپنی حفاظت کے لئے بیلچہ سے مسلح آتے، دشمنوں کی قطاروں کو کاٹتے اور ان کی نعشوں سے خندقوں کو پاٹتے ہوئے دیکھا کرتی تھیں۔ ان میں سے اکثر کلغی دار ہیکٹر (ٹرائے کے پہلوان) جن کا قد اپنے ساتھیوں سے پورا ایک فٹ اونچا ہوتا تھا۔ میرے ہتھیار سے کٹ کر گر پڑتے اور خاک میں لوٹنے لگتے تھے۔

موسم گرما کے ایام میں جب میرے چند ہم عصر بوسٹن یا روم میں فنونِ لطیفہ پر اپنی توجہ مرکوز کرتے تھے اور ہندوستان میں غور و فکر میں مصروف رہتے تھے اور میرے دوسرے ہم عصر لندن یا نیویارک میں کاروبار کرتے تھے ۔ اس وقت میں نیو انگلینڈ کے دیگر کسانوں کی طرح کاشتکاری میں جٹا رہتا تھا ۔ یہ بات نہیں تھی کہ میں سیم کھانا چاہتا تھا کیونکہ میں اپنی فطرت کے اعتبار سے فیثا غورث کا پیرو ہوں۔

جہاں تک سیموں کا تعلق ہے ان سے چاہے دلیہ کھانے کو چلے یا ووٹ ملیں بہر حال کے بدلے میں چاول لے لیا کرتا تھا۔ میں سیم پہ اتنی محنت صرف اس غرض سے کیا کرتا تھا کہ مجھے کھیت میں کام کرنے کا موقع ملتا تھا اور اگر کچھ اور نہ سہی تو میں اس لیے سیم پہ محنت کرتا تھا کہ میں کنایوں میں بات کر سکوں۔ اور نئے نئے جملے وضع کر سکوں۔ اور ایک دن تمثیلی گفتگو کرنے والا تصور کیا جاؤں۔ مجموعی طور پہ یہ ایک عجیب تفریح تھی۔ اگر اسے بہت دنوں تک جاری رکھا جاتا تو یہ عیاشی بن جاتی۔ اگرچہ میں نے اپنی سیموں میں کھاد نہیں ڈالی۔ اور یکبارگی ان کی گوڈائی نہیں کی پھر میں جہاں تک کر سکا۔ میں نے غیر معمولی طور پہ ان کی گوڈائی کی اور مجھے آخر میں اس کام کا اچھا معاوضہ ملا۔ ایولن کے قول کے مطابق "اس بات میں کچھ صداقت ضرور ہے کہ کوئی قسم کی مرکباتی کھاد یا کھاد بیلچے سے مٹی کی مسلسل الٹ پلٹ کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔" اس نے کہیں اور یہ بات لکھی ہے "مٹی خصوصاً اگر تازہ ہو تو اس میں مقناطیسی قوت ہوتی ہے جس سے وہ نمک اور طاقت کو اپنی طرف کھینچتی ہے جو اسے زندگی بخشتی ہے اور یہی وجہ ہے اس ساری محنت اور جانفشانی کی جو ہم اس پہ کرتے ہیں تاکہ وہ ہمیں زندہ و سلامت رکھ سکے اس میں گوبر اور دوسری گندی چیزوں کا ڈالنا اس تربیت اور پرداخت کے تابع ہے" اس کے علاوہ میرا کھیت ان کھیتوں میں تھا جو بنجر رہنے کے باعث خالی پڑے رہتے ہیں اور اس نے کینیلم ڈگبی کے قول کے مطابق ہوا سے بڑی قوت نمو حاصل کر لی تھی۔ میں نے سیم کی بارہ بشل فصل کاٹی۔

اس امر کی شکایت کی گئی ہے کہ مسٹر کولمین نے خاص طور سے دولتمند لوگوں کے قیمتی تجربات کی رپورٹ قلمبند کی ہے۔ میرے اخراجات یہ تھے :-

بیلچے کے لیے ۰ ڈالر ۵۴ سینٹ

جتائی، ہمواری، ریگھاری ۷ ڈالر ۵۰ سینٹ (یہ رقم بہت زیادہ تھی)

بیج کے لئے سیم	۲ ڈالر ۱۲½ سینٹ
آلو	۱ ڈالر ۳۳ سینٹ
مٹر	۱ ڈالر ۴۰ سینٹ
شلجم کے بیج	۰ ڈالر ۰۶ سینٹ
کووں سے بچنے کیلئے سفید رسی	۰ ڈالر ۰۲ سینٹ
گھوڑا ہل اور زمین گھنٹے کیلئے لڑکے کی خدمات	۱ ڈالر ۰
فصل لانے کیلئے گھوڑا اور گاڑی	۰ ۷۵ سینٹ
کل	۱۴ ڈالر ۷۲½ سینٹ

میری آمدنی (خاندان کے سردار کو پانچ سے زیادہ مشتری ہونا چاہیئے) حسب ذیل تھی۔

نو بشل اور ۱۲ کوارٹ سیم فروخت کی گئی	۱۶ ڈالر ۹۴ سینٹ
پانچ بشل بڑے آلو	۲ ڈالر ۵۰ سینٹ
نو بشل چھوٹے آلو	۲ ڈالر ۲۵ سینٹ
گھاس	۱ ڈالر ۰
ڈنٹھل	۰ ڈالر ۷۵ سینٹ
کل	۲۳ ڈالر ۴۴ سینٹ

جیسا کہ میں بتا چکا ہوں مجھے نفع ہوا ۸ ڈالر

سیم پیدا کرنے پر میرا تجربہ یہ تھا۔ عام اور چھوٹی جھاڑیوں والی

سفید ہیں یکم جون کے لگ بھگ تین فٹ مربع اٹھارہ انچ دور قطاروں میں لگائیے اور اتنی احتیاط کیجئے کہ تازہ تولی اور صاف بیج چنئے۔ سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ کیڑے کتنے بیج کھا گئے ہیں اور ان کیڑوں کی حرکتوں سے جو جگہیں خالی ہو جائیں وہاں پھر سے بیج بو دیجیے۔ اور اگر کھیت کسی کھلی جگہ میں ہے تو فصل کو ہوا کے ریلے سے بچایئے۔ اس لئے کہ وہ چلتے پھرتے پیلی اور نازک پتیوں کو جڑ سے کتر ڈالتی ہیں۔ تازہ شگوفے نکلے ہوئے ہوں تو ٹڈیاں گلہریاں ان کو کلیوں اور چھوٹی چھوٹی پھلیوں کے ساتھ عام گلہریوں کی طرح اکڑوں بیٹھ کر کاٹ دیتی ہیں لیکن سب سے اہم بات یہ ہے کہ اگر آپ فصل کو کہرے سے بچانا چاہتے ہیں اور یہ بھی خواہش رکھتے ہیں کہ فصل اچھی اور جلد فروخت ہو جانے والی ہو تو جہاں تک ممکن ہو اس فصل کو جلد سے جلد کاٹ لیجیے۔ اس طرح آپ بہت سی نقصان سے بچ جائیں گے

میں نے یہ مزید تجربہ بھی حاصل کیا کہ میں نے اپنے دل میں سوچا کہ میں اگلی زمین میں سیم اور اناج نہیں بوؤں گا اور اگر بیج کھو نہ گئے ہوں۔ خلوص، سچائی، سادگی، ایمان اور معصومیت وغیرہ بوؤں گا اور دیکھوں گا کہ یہ بیج اس مٹی میں نسبتاً کم محنت اور کھاد کے بغیر پھوٹتے ہیں یا نہیں۔ اور میرے لئے خوراک کا کام دیتے ہیں یا نہیں مجھے یقین ہے کہ اس مٹی میں یہ فصل پیدا کرنے کی صلاحیت ابھی تک موجود ہے۔ لیکن افسوس میں نے یہ بات صرف سوچی تھی۔ دوسرا موسم گزر گیا۔ ایک اور پھر ایک اور۔ اور قارئین حضرات! میں آپ سے یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ وہ بیج جو میں نے بوئے تھے۔ اگر وہ نیکیوں کے بیج تھے گویا کرم خوردہ تھے یا ان میں قوت نمو نہیں رہ گئی تھی کہ وہ پھوٹتے ہی نہیں۔ عام طور سے لوگ ایسے ہی بہادر ثابت ہوتے ہیں۔ جیسے ان کے آباؤ اجداد بہادر یا بزدل ہوتے ہیں۔ موجودہ نسل اناج اور سیم ہر سال ٹھیک اسی طرح بوتی ہے جس طرح انڈین صدیوں پہلے بوتے تھے اور جس طرح انہوں نے

گورے نوآبادکاروں کو سکھایا تھا۔ یہ بالکل اسی طرح کرتے ہیں جس طرح قسمت میں لکھا
ہوتا ہے۔ میں نے حال ہی میں ایک بوڑھے شخص کو بیلچے سے کم سے کم سترھویں بار
گڑھا کھودتے ہوئے دیکھا۔ وہ یہ گڑھا اپنے لیٹنے کے لیے کھود رہا تھا لیکن نیو انگلینڈ
کا باشندہ نئی چیزوں کا تجربہ کیوں نہ کرے اور اپنے اناج، آلو، گھاس اور اپنے پھلوں
کے باغ پر اس قدر زور دینے کی بجائے دوسری طرح کی پیداوار کی کاشت کیوں نہ کرے۔
ہمیں سیم کے بیجوں کی اتنی فکر کیوں ہو۔ ہم انسانوں کی نسل کی فکر کیوں نہ کریں۔ اگر ہم
ایک ایسے شخص سے ملتے ہیں جس میں وہ تمام صفات موجود ہیں جن کا میں نے ذکر کیا ہے
اور جن کو ہم سب پیداواروں سے زیادہ قیمتی سمجھتے ہیں یعنی جو ہواؤں میں موجود ہیں۔ اور
فضا میں اڑتی رہتی ہیں۔ اور یہ صفات اس شخص میں جڑ پکڑ گئی ہیں اور اگ رہی ہیں۔
تو اس شخص کو دیکھتے ہی ہمارا پیٹ واقعی بھر جاتا ہے اور ہمیں مسرور ہو جانا چاہیے کہ
صداقت یا انصاف جیسی نفیس اور ناقابل بیان صفات راستہ پر آ رہی ہیں چاہے
وہ کم مقدار میں یا نئی قسم کی ہوں۔ ہمیں اپنے سفیروں کو ہدایت کر دینی چاہیے کہ وہ ایسے بیج
گھر بھیجیں اور امریکی کانگریس سارے ملک میں ان کی تقسیم کا انتظام کرے۔ ہمیں خلوص کے
سلسلے میں کبھی تکلف نہیں برتنا چاہیے۔ اگر ہم میں شرافت اور دوستی کا بیج موجود ہے تو
ہمیں ایک دوسرے کو دھوکا نہیں دینا چاہیے۔ اور ایک دوسرے کی توہین نہیں کرنی
چاہیے اور اپنے کمینہ اطوار کی وجہ سے ایک دوسرے کو اپنے دلوں سے نہیں نکالنا
چاہیے۔ ہمیں اس طرح جلدی میں نہیں ملنا چاہیے۔ میں بیشتر آدمیوں سے ملتا ہی
نہیں ہوں کیونکہ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پاس وقت ہی نہیں ہے۔ وہ بیچارے
اپنی سیموں کی فکر میں رہتے ہیں۔ اس لیے اگر ہم کسی شخص کو پاؤں گھسیٹ کر اور اپنے بیلچے
پر چھڑی کی طرح ٹیک لگا کر بیٹھے دیکھیں تو ہمیں اس سے اس طرح کا سلوک نہیں کرنا چاہیے
جیسے وہ کوئی سانپ کی چھتری ہو بلکہ اس کے ساتھ ایسا برتاؤ کرنا چاہیے جیسے وہ بھی

زمین سے آدھا نکلا ہو اور ابھی اچھی طرح سیدھا بھی نہیں ہونے پایا ہو، یا بالکل اُس
ابابیل کی طرح ہو جو ابھی ابھی زمین پر اُتری ہو اور اُس پر چل رہی ہو۔

”اور جب وہ بول رہا تھا تو اُس کے پَر بار بار پھیل جاتے تھے
جیسے وہ اُڑنا چاہتا ہو لیکن وہ اپنے پر دوبارہ
سمیٹ لیتا تھا۔“

تاکہ ہمیں یہ گمان ہو کہ ہم کسی فرشتے سے بات چیت کر رہے ہیں۔ روٹی شاید ہمیشہ ہماری پرورش نہ کر سکے لیکن اس سے ہمیشہ فائدہ ضرور ہوتا ہے۔ یہ ہمارے جوڑوں سے سختی دور کر دیتی ہے اور ہمیں لچکیلا اور ہلکا بنا دیتی ہے۔ جب ہمیں معلوم نہ ہو کہ ہمیں کیا دکھ ہے اس وقت ہمیں انسان یا قدرت کے ہر احسان کو ماننا چاہئے اور ہر خالص اور بہادرانہ مسرت میں دوسروں کو شریک کرنا چاہئے۔

قدیم شاعری اور دیو مالا سے کم سے کم اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ کھیتی باڑی کبھی ایک مقدس فن تھی۔ لیکن ہم بے احترامانہ جلدی اور بے پروائی سے کھیتی باڑی کا کام کرتے ہیں۔ ہمارا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ ہمارے پاس بڑے بڑے فارم ہوں اور ہمیں بھاری مقداروں میں فصلیں میسر آئیں۔ ہمارے ہاں صرف مویشیوں کے میلوں اور یوم تشکر کے سوا نہ تو ایسے تہوار ہیں، نہ ایسے جلوس ہیں اور نہ ایسی تقریبات ہیں جن کے ذریعہ کسان اپنے پیشے کی تقدیس ظاہر کرتا ہے یا جو اسے اپنے مقدس جنم کی یاد دلاتی ہیں۔ یہ منافع اور ضیافتیں ہی اسے لالچ دیتی ہیں۔ وہ سیریز اور ارضی جوو کی بجائے جہنمی پلوٹس کو قربانی پیش کرتا ہے۔ ہم لالچ اور خود غرضی اور اپنے کو ذلیل کرنے کی عادت کے باعث (جس سے ہم میں سے کوئی بھی مبرا نہیں ہے) زمین کو اپنی ملکیت یا ملکیت حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھ کر ارضی منظر کو تباہ و برباد اور کاشتکاری کو ذلیل کرتے ہیں چنانچہ کاشتکار نہایت ہی ذلیل زندگی بسر کرتا ہے۔ وہ قدرت کو ایک ڈاکو کی حیثیت سے برتتا ہے۔

کیٹو کہتا ہے "کاشتکاری کے منافع مقدس اور جائز ہیں۔ وارو کے قول کے مطابق قدیم رومی
اسی زمین کو ماں اور سیریز کہتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ جو لوگ زمین کی کاشت کرتے ہیں مقدس
اور مفید زندگی بسر کرتے ہیں اور بادشاہ سیٹرن (زحل) کی نسل سے صرف وہی لوگ باقی
رہ گئے ہیں۔"

ہم یہ بھول جانے کی عادت ہے کہ سورج ہمارے مزروعہ کھیتوں، گیاہستانوں
اور جنگلوں پر بلا امتیاز نظر ڈالتا ہے۔ وہ سب یکساں طور پر سورج کی کرنوں کو منعکس اور
جذب کرتے ہیں۔ اور یہ کھیت اُس شاندار تصویر کا ایک حصہ ہوتی ہے۔ جسے سورج اپنے
روزمرہ سفر میں دیکھتا ہے۔ اس کی نظر میں پوری زمین یکساں طور پر ایک باغ کی طرح
ہے۔ لہٰذا ہمیں چاہیئے کہ ہم اسکی روشنی اور گرمی کے فوائد اتنے ہی اعتماد اور بلند حوصلگی
سے حاصل کریں۔ اگر ہم نے ان سیم کے بیجوں کی قدر کی اور انہیں موسم گرما میں کاٹا
لیکن اس کا کیا فائدہ ہوگا؟ یہ وسیع و عریض کھیت جس پر میں مدت سے نگاہ رکھ رہا ہوں
مجھے اپنا کاشتکار نہیں سمجھتا بلکہ میرے سوا اپنے سے قریب تر ان اثرات کو کاشتکار
تسلیم کرتا ہے جو اسے پانی دیتے ہیں۔ اور سرسبز و شاداب رکھتے ہیں۔ ان سیموں کی
ایسی فصلیں بھی ہوتی ہیں جن کی میں کٹائی [illegible] کیا یہ فصل جزوی طور پر
صرف گلہریوں کیلئے نہیں اُگتی؟ کاشتکار کی واحد امید صرف گندم کی بالی نہیں ہونی چاہیئے
اس کا مغز یا دانہ ہی اس کی واحد پیداوار نہیں ہے۔ پھر ہماری فصل برباد کیونکر ہوسکتی
ہے؟ کیا مجھے جڑی بوٹیوں کی فراوانی پر خوش نہیں ہونا چاہیئے جن کے بیج پرندوں
کیلئے ذخیرہ ہوتے ہیں؟ یہ بات مقابلتًہ کوئی اہمیت نہیں رکھتی کہ کھیت کسان کے اناج گھر بھر دیتے
ہیں یا نہیں۔ سچا کاشتکار فکر اور تشویش سے آزاد ہوتا ہے۔ چونکہ گلہریوں کو کبھی یہ فکر نہیں ہوتی
کہ جنگلوں میں اس برس بلوط ہوگا یا نہیں اسی طرح سچے کاشتکار کو بھی اپنے دل سے یہ وسوسہ نکال دینا
چاہیئے اپنی ہر روز کی محنت کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا چاہیئے اور اپنے کھیتوں کی فصل پر اپنے حق سے دستبردار
ہو جانا چاہیئے۔ اور اپنے دل میں نہ صرف پہلی بلکہ آخری پیداوار کی بھی قربانی کر دینی چاہیئے۔

گاؤں

میں دوپہر سے پہلے کھیت گوڈنے یا تو پڑھنے اور لکھنے کے بعد عام طور سے تالاب میں دوبارہ نہایا کرتا تھا۔ اور تالاب کی کسی کھاڑی کو پار کر کے وہاں تک تیرا کرتا تھا۔ اور اس طرح اپنے بدن پر پڑی ہوئی محنت کی گرد دھو ڈالتا تھا یا اپنی پیشانی پر سے وہ آخری تھکن دور کر ڈالتا تھا جو مطالعہ نے پیدا کی ہوتی تھی۔ مجھے سہ پہر کو مکمل طور سے فرصت ہو جاتی تھی۔ میں ہر روز یا دوسرے دن ٹہلتا ہوا گاؤں چلا جاتا تھا تاکہ وہ چند گپیں سن سکوں جو وہاں مسلسل جاری رہتی ہیں۔ اور ایک منہ سے دوسرے منہ تک پہنچتی رہتی ہیں یا ایک اخبار سے دوسرے اخبار میں منتقل ہوتی رہتی ہیں۔ اگر ان گپوں کو ہومیوپیتھی کی دوا کی طرح استعمال کیا جائے تو وہ اتنی ہی تازگی بخش ہوتی ہیں جتنی جنگل میں پتیوں کی سرسراہٹ یا مینڈکوں کی تاک جھانک۔ میں جنگل میں جس طرح پرندوں اور گلہریوں کو دیکھنے کے لئے جایا کرتا تھا اسی طرح گاؤں میں آدمیوں اور لڑکوں کو دیکھنے جایا کرتا تھا۔ میں صنوبر کے درختوں میں ہوا کی سرسراہٹ کی بجائے گاڑیوں کی کھڑکھڑاہٹ سنا کرتا تھا۔ میرے گھر سے ایک سمت دریا کی چراگاہوں میں بحری چھچھوندروں کی ایک بستی تھی اور دوسرے افق میں بید کے درختوں اور بٹن ووڈ درختوں کے جھنڈ میں مصروف کار انسانوں کا گاؤں تھا۔ وہ لوگ مجھے

اتنے ہی الّو کے معلوم ہوتے تھے جتنے ریگستان کے چوہے جو اپنے اپنے بلوں پہ بیٹھے رہتے تھے یا گپ لڑانے کے لئے اپنے پڑوسی کے پاس چلے جاتے تھے۔ میں اس گاؤں میں جا کر اکثر لوگوں کی عادات و خصائل کا مشاہدہ کیا کرتا تھا۔ گاؤں مجھے اخبار کا ایک بہت بڑا دفتر معلوم ہوتا تھا جس کی ایک طرف (جہاں کبھی اسٹیٹ سٹریٹ پہ ریڈنگ اینڈ کمپنی واقع تھی) وہ بادام اور کشمش یا نمک، اور آٹا اور دوسری اشیائے خوردنی رکھتے تھے۔ لیکن بعض لوگ خبروں کے اس قدر بھوکے ہوتے ہیں اور ان کا معدہ اتنا مضبوط ہوتا ہے کہ وہ عام گذرگاہوں پہ ہر وقت بیٹھے رہ سکتے ہیں تاکہ ہر دم کی ہلکی ہواؤں کی طرح خبریں کنکھیاں اور سرگوشیاں کرتی ہوئی ان کے کانوں تک پہنچ جائیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ان لوگوں نے ایتھر سونگھ لیا ہے جس سے ان کے سارے احساسات سن ہو گئے ہیں اور تکلیف کا احساس موجود ہی نہیں رہا۔ ورنہ اکثر خبریں سن کر دکھ ہو سکتا ہے۔ میں جب کبھی گاؤں میں سیر کرنے جاتا تو مجھے بہت سے ایسے معززین نظر آیا کرتے تھے جو کسی سیڑھی پہ بیٹھے دھوپ کھا رہے ہوتے تھے۔ ذرا آگے کی طرف جھک کر ادھر ادھر دیکھتے یا کبھی کبھی چہرے پر شہوت کے آثار پیدا کرتے ہوئے ہاتھ جیبوں میں ڈال کر غلّہ گودام کی پیٹھ سے اس طرح ٹیک لگائے ہوئے دکھائی دیتے تھے جیسے وہ غلّہ گودام کو سہارا دے رہے ہوں۔ چونکہ وہ عام طور سے گھروں کے باہر رہتے تھے اس لئے ہوا میں اڑتی ہوئی ہر خبر سن لیتے تھے۔ یہ لوگ بھدی چکیاں ہیں جن میں تمام افواہوں کو پہلے موٹا موٹا دلا جاتا ہے۔ اور پھر ان کو گھروں کے اندر عموماً باریک پیسا جاتا ہے۔ میں نے یہ دیکھا کہ گاؤں کی اہم چیزیں یہ تھیں اشیائے خوردنی، شراب خانہ، ڈاک خانہ اور بینک۔ اور مشینری کے ضروری پرزے ہونے کی حیثیت سے ایک گھنٹی، ایک بڑی توپ اور ایک آگ بجھانے والا انجن مناسب جگہوں پہ رکھے ہوئے تھے۔ مکانوں کو گلیوں میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے اس ترتیب سے بنایا گیا تھا کہ ان میں زیادہ سے زیادہ آدمی سما سکیں۔

چنانچہ ہر مسافر کو دوڑ کر یہ ہفت خوان پار کرنی پڑتی تھی۔ اور گاؤں کا ہر مرد، عورت اور بچہ اُن سے رگڑ کھا سکتا تھا۔ دراصل جو لوگ نکڑ پہ رہتے تھے یعنی جو زیادہ دیکھ سکتے اور زیادہ نظر آ سکتے تھے وہی سب سے پہلے مسافر سے متصادم ہوتے تھے۔ اور اپنی جائے قیام پر سب سے زیادہ خرچ کرتے تھے۔ لیکن وہ اِکّا دُکّا شہری جو مضافات میں رہتے ہیں جہاں مکانوں کی قطاروں میں کافی فاصلہ پیدا ہونے لگتا ہے۔ وہ جن سے مسافر دیوار پھاند کر اور مویشیوں کی پگڈنڈی پر سے ہو کر بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ ان کو زمین یا کھڑکی کا بہت کم ٹیکس دینا پڑتا تھا۔ مسافروں کو ترغیب دینے کے لئے گاؤں میں جا بجا سائن بورڈ لگائے جاتے تھے۔ کچھ سائن بورڈ اس کے شوق کو تیز کر کے پھانسنا چاہتے تھے۔ مثلاً شراب خانے اور اشیائے خوردنی کی دکانیں۔ کچھ سائن بورڈ شوق کو ابھارتے تھے۔ جیسے خشک میووں اور جواہرات کی دکانیں۔ بعض سائن بورڈ بالوں، چہروں اور پنڈلیوں کی نمائش کرتے تھے۔ مثلاً حجاموں کی دکانیں، جوتوں یا درزیوں کی دکانیں۔ ان کے علاوہ ایک خطرناک ترغیب یہ تھی کہ مجھے ان تمام گھروں سے دعوتیں مستقل طور پر موصول ہوتی تھیں کہ میں وہاں ضرور جاؤں کیونکہ [illegible] اس وقت وہاں آنے والے تھے۔ بڑی حیرت انگیز طرح سے ان خطروں سے میں بچ نکلتا تھا۔ یا تو بے دھڑک [illegible] سیدھا بغیر جھجکے بڑھتا رہتا۔ جیسا کہ منزلِ مقصود پہ پہنچ جانے والا۔ آرفیس کی طرح اپنے [illegible] اٹھاتا ہے۔ یا تو [illegible] پر مرکوز رکھتا تھا۔ آرفیس اپنے رباب پر بلند آواز میں دیوتاؤں کی حمد و ثنا کے گیت گاتا اور جل دیوں کی آوازیں دبا دیتا۔ وہ اس طرح اپنے آپ کو خطرے سے دور رکھتا تھا۔ بعض اوقات میں اچانک کھسک جاتا۔ اور کوئی یہ نہ بتا سکتا کہ میں کہاں ہوں۔ کیونکہ میں اپنے وقار کی پرواہ کئے بغیر بلا تامل کسی باڑھ کے اندر گھس جاتا تھا۔ میری یہ بھی عادت تھی کہ میں بعض گھروں میں جا گھستا تھا جہاں میری خوب خاطر و مدارات ہوتی تھی۔ اور آخری اور منتخب خبریں سننے کے بعد مثلاً کون سا ہنگامہ فرو ہو گیا۔ [illegible] قسم کا [illegible] ہے

یا دُنیا دیر تک قائم رہ سکے گی یا نہیں وغیرہ۔ مجھے عقبی دروازوں میں سے نکال دیا جاتا تھا۔ اور اس طرح میں دوبارہ جنگل میں چلا جاتا تھا۔

میں جب کبھی قصبے میں دیر تک ٹھہرتا تھا تو مجھے رات کو باہر نکلنے میں بڑا مزا آتا تھا۔ خاص طور پر اگر رات تاریک اور طوفانی ہوتی۔ ایسے وقت میں کندھے پر اناج کی ایک بوری لاد کر کبھی بڑ بڑاتی ہوئی بیٹھک یا لیکچر ہال سے نکل کر اپنی آرام دہ جنگلی بندرگاہ کی طرف لے جانے میں بڑا مزا آتا تھا۔ ایسے موقع پر میں پانی سے بچ کر گویا جہازی بیڑوں میں اپنے خوشگوار خیالات کے ملاحوں کے پورے گروہ کے ساتھ پناہ لے کر اور صرف اپنے وجود کے باہر آدمی کو جہازرانی کے لئے چھوڑ کر یا غیر طوفانی حالات میں کشتی لنگر سے باندھ کر اس طرح چلتا تھا کہ مجھے کسی قسم کی فکر نہیں رہتی تھی۔ اور اُس حالت میں جب میرے خیالات کی ۔۔ آراستہ ہو جاتی۔ اور میرا باہری جسم راستے پر تیرتا ہوا چلنے لگتا تو مجھے کبھی کبھی نہایت پر لطف باتیں سوجھتی تھیں۔ میں کسی موسم میں راستے سے بھٹکا اور نہ بددل ہوا۔ اگرچہ مجھے کئی طوفانوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لوگوں کو تو اس بات کا قطعاً کوئی اندازہ نہیں ہے کہ جنگلوں میں بستیوں کی نسبت معمولی راتوں میں بھی بہت زیادہ اندھیرا ہوتا ہے۔ مجھے اکثر اپنا راستہ پہچاننے کے لئے اپنے سر کے اوپر درختوں کے درمیان کھلی ہوئی جگہوں میں سے دیکھنا اور جہاں کسی گاڑی کی گذار نہیں ہوتی تھی وہاں اپنے پیروں سے اپنے قدموں کے سابق نشانات کو ٹٹولنا پڑتا تھا۔ کبھی کبھی مختلف درختوں کے محل وقوع سے بھی میں انہیں ٹٹول ٹٹول کر راستے کا پتہ لگا لیتا تھا۔ مثلاً اندھیری راتوں میں جنگل کے بیچ میں صنوبر کے دو درختوں کے درمیان میں سے گذرتا جو ایک دوسرے سے اٹھارہ انچ سے زیادہ فاصلہ پر واقع نہ ہوتے تھے۔ میں کبھی کبھی کسی تاریک اور دُھند سے بھری ہوئی رات کو دیر سے بیٹھ اپنے خیالات میں کھویا ہوا جب اپنی آنکھوں کی بجائے اپنے قدموں کے سہارے گھر واپس آتا تو کنڈی کھولنے کے لئے ہاتھ اُٹھاتے ہی میرے خیالات کا سلسلہ

لوٹ جاتا تھا اور مجھے اپنی اس پیدل مسافت کا ایک قدم بھی یاد نہ رہتا تھا۔ اور خیال ہوتا تھا
کہ جس طرح ہاتھ خود بخود نوالہ اٹھا کر منہ تک لے جاتا ہے۔ اسی طرح میرا جسم بھی کسی تحریک یا
کسی اشارے یا رہنمائی کے بغیر مجھے گھر تک پہنچا ہی دے گا۔ کبھی کبھی جب کوئی شخص ملنے کے لئے
آتا اور شام تک میرے ہاں ٹھہرا رہتا اور رات [illegible] گاڑیوں کی [illegible]
پہنچ آنے پر مجبور ہو جاتا اور پھر اسے کو وہ راستہ [illegible] پر آتے ہوئے [illegible] اور یقین
کرتا کہ اسے اپنی آنکھوں کی بجائے اپنے قدموں کی رہنمائی پر بھروسہ کرنا ہوگا۔ میں نے
ایک بہت ہی تاریک رات کو دو نوجوانوں کو جو والڈن تالاب میں مچھلی کا شکار کھیلنے آئے
تھے اسی طرح راستہ بتایا تھا۔ یہ لوگ میرے مکان سے جنگل کے راستے تقریباً ایک میل کے فاصلے
پر رہتے تھے۔ اور وہ راستہ سے اچھی طرح واقف تھے لیکن ایک دو روز کے بعد جب میری
ان میں سے ایک نوجوان سے ملاقات ہوئی تو اس نے مجھے بتایا کہ وہ اپنے مکان کے بالکل
قریب رات بھر بھٹکتے رہے اور صبح سے پہلے اپنے گھر نہ پہنچ سکے۔ اس دوران میں چونکہ
ایک دو بار بارش بھی ہو گئی تھی اور پتیاں بہت بھیگ گئی تھیں اس لئے وہ دونوں پانی میں
تر بتر بھی ہو گئے تھے۔ میں نے سن رکھا ہے کہ جب اندھیرے کی چادر بہت دبیز ہوتی ہے
اور کسی شخص کے قول کے مطابق اسے چاقو سے کاٹا جا سکتا ہے تو بعض لوگ گاؤں کی سڑکوں
پر بھی بھٹکتے پھرتے ہیں۔ چنانچہ نواحی بستیوں میں رہنے والے لوگ جو اپنی گاڑیوں میں
گاؤں کے بازار سے چیزیں خریدنے آتے رہتے تھے۔ رات کو گاؤں ہی میں رکنا پڑتا تھا۔
گاؤں کے شریف مرد اور خواتین جو ایک دوسرے سے ملنے کے لئے باہر نکلتے تھے انہیں بھی
تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ وہ اپنے راستے سے بھٹک جاتے تھے۔ اپنا راستہ اپنے
قدموں سے محسوس کرتے تھے اور ان کو یہ خبر نہیں ہوتی تھی کہ ان کے پاؤں کس طرف
مڑ رہے ہیں۔ جنگل میں راستہ بھول جانا حیرت انگیز ناقابل فراموش اور دلچسپ ہے۔ جب
اکثر دن کو بھی برف کے طوفان میں کوئی شخص جانی پہچانی سڑک پر [illegible] نہیں سکتا

کہ کون راستہ گاؤں کو جاتا ہے۔ اگرچہ وہ اس سڑک پر ہزاروں بار چلا ہوتا ہے۔ لیکن وہ اس کے نشانات پہچان نہیں سکتا۔ یہ سڑک اس کے نزدیک اتنی ہی اجنبی ہوتی ہے جتنی سائبیریا جانے والی سڑک۔ بہرحال رات کو یہ اجنبیت اور یہ پریشانی بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ معمولی ساختوں میں ہمارا دماغ مسلسل غیر شعوری طور پر ہی ہی۔ جہاز رانوں کی طرح بعض جانی پہچانی روشنیوں اور سامنے کی سرزمینوں کے باعث آگے بڑھتا ہے۔ اور اگر ہم اپنے عام راستے سے آگے نکل جاتے ہیں تو پھر بھی کسی نہ کسی قریبی ٹیلے کا نقشہ ذہن میں محفوظ رکھتے ہیں۔ اور جب تک ہم مکمل طور سے راستہ نہیں بھول جاتے یا پلٹ نہیں پڑتے (کیونکہ آدمی کا دنیا میں کھو جانے کے لئے آنکھیں بند کر کے ایک بار ہی چکر کافی ہوتا ہے) تب تک ہم کو قدرت کی وسعت اور اجنبیت کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ ہر آدمی کو خواب کی دنیا سے نکلنے اور کسی انہماک سے بیدار ہونے کے بعد اپنے رخ اور اپنی سمت کو واضح اور متعین کرنا پڑتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں جب تک ہم گم نہ ہو جائیں یعنی اپنی اس دنیا کو گم نہ کر بیٹھیں، تب تک ہم نہ اپنے آپ کو پا سکتے ہیں اور نہ ہمارے دل میں اس احساس کی ابتدا ہو سکتی ہے کہ ہم کہاں ہیں اور ہمارے تعلقات کس قدر لامحدود ہیں۔

میں پہلے موسم گرما کے آخر میں جب ایک سہ پہر کو گاؤں میں ایک موچی سے جوتا لانے کے لئے گیا تو مجھے گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا گیا۔ کیونکہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ میں کوئی ٹیکس نہیں دیتا تھا یا ریاست کی حکومت کو تسلیم نہیں کرتا تھا۔ جو اپنے قانون ساز ایوان کے دروازے پر مویشیوں کی طرح مردوں عورتوں اور بچوں کو فروخت کرتی اور خریدتی ہے۔ میں جنگل میں کسی اور مقصد سے گیا تھا۔ لیکن انسان جہاں کہیں جاتا ہے دوسرے انسان اس کا پیچھا کرتے ہیں اور اپنے غلیظ اداروں کے ذریعے دباؤ ڈال کر اس کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ ان کے بے ہنگم سماج کا ممبر بن جائے۔ یہ درست ہے کہ میں چاہتا تو بہت مؤثر انداز میں طاقت سے مزاحمت کر سکتا تھا یعنی پاگل ہو کر سماج پر حملہ بول دیتا لیکن

میں نے اس بات کو ترجیح دی کہ خود سماج پاگل ہو کر مجھ پر حملہ کرے۔ کیونکہ سماج ہی دراصل سنگدل حریف ہے۔ بہرکیف اگلے روز مجھے رہا کر دیا گیا۔ میں نے اپنا مرمت شدہ جوتا حاصل کیا اور اپنے وقت پر جنگل میں پہنچ گیا کہ "فیر ہیون ہل" پر کوندنیوں کا کھانا کھا سکوں۔ ریاست کے نمائندوں کے سوا کسی شخص نے کبھی مجھے تنگ یا زدوکوب نہیں کیا۔ جس میز میں میرے کاغذات تھے میں نے کبھی اسے تالا یا کنڈی نہیں لگائی تھی۔ میں نے کنڈی یا کھڑکی میں کبھی کوئی کیل نہیں ٹھوکی تھی۔ میں رات ہو یا دن اپنا دروازہ کبھی بند نہیں کرتا تھا گو میں کئی کئی دنوں تک غیر حاضر بھی رہتا تھا۔ میں نے پچھلے موسم خزاں میں بھی دروازہ بند نہیں کیا تھا۔ حالانکہ مین کے جنگلوں میں پورے دو ہفتے بسر کئے تھے۔ اس پر بھی میرے گھر کا اثاثہ فوجی پہرے کی نسبت زیادہ محفوظ رہا۔ کوئی تھکا ماندہ مسافر میرے گھر آتش دان کے پاس بیٹھ کر آرام کر سکتا تھا اور آگ تاپ سکتا تھا۔ اور میز پر پڑی ہوئی کتابوں سے لطف اندوز ہو سکتا تھا اور اگر وہ زیادہ متجسس ہوتا تو میری الماری کا دروازہ کھول کر یہ دیکھ سکتا تھا کہ میری [illegible] سے کیا بچ رہا ہے اور [illegible] کا پتہ بھی چلا سکتا تھا کہ میں کیا کچھ کھاتا ہوں۔ اگرچہ ہر طبقے کے لوگ اس راستے سے تالاب تک آتے۔ پھر بھی ان کی وجہ سے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ میری کبھی کوئی چیز گم نہیں ہوئی۔ البتہ ہومر کی ایک کتاب جس کی جلد مناسب ڈھنگ سے نہیں باندھی گئی تھی کہیں ادھر ادھر ہو گئی۔ اور مجھے یقین ہے کہ میرے کیمپ کا کوئی سپاہی اسے اب تک ڈھونڈ چکا ہوگا۔ مجھے یقین کامل ہے کہ اگر تمام لوگ اتنی سادگی سے زندگی بسر کرنے لگیں جیسے میں اس زمانہ میں بسر کیا کرتا تھا تو چوری اور ڈاکے کا کہیں نام و نشان نہ رہے۔ چوری اور ڈاکہ صرف ان برادریوں میں ہوتے ہیں جہاں کچھ لوگوں کے پاس کافی سے زیادہ اور کچھ لوگوں کے پاس ناکافی دولت ہوتی ہے۔

پوپ کی ترجمہ کی ہوئی ہومر کی کتاب مناسب طریق سے جلد ہی تقسیم کر دی جائیگی
"جب صرف لکڑی کے پیالوں کا رواج تھا۔"

انسان جنگ کی تباہ کاریوں سے محفوظ تھا۔"

"عوام کے امور کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں رکھنے والے لوگو! تمہیں مجرم کو سزا دینے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ نیکی سے پیار کرو، لوگ خود بخود ٹھیک ہو جائیں گے۔ ایک عظیم و برتر انسان کی نیکیاں ہوا کی طرح ہیں۔ عام آدمی کی نیکیاں گھاس کی طرح ہیں۔ جب ہوا گھاس پر سے گزرتی ہے تو گھاس جھک جاتی ہے۔"
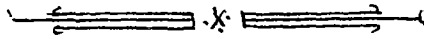
تالاب

بعض اوقات میں انسانوں کی ہمدمی اور گپ شپ سے اُکتا کر اور اپنے گاؤں کے دوستوں سے بیزار ہو کر اُس جگہ سے جہاں عادتاً رہا کرتا تھا مزید مغرب کی جانب زیادہ ویران حصوں یعنی جنگلوں اور نئی چراگاہوں میں نکل جاتا تھا یا سورج کے ڈھلتے ڈھلتے "فیر ہیون ہل" پر گوندنیوں پر مشتمل رات کا کھانا کھایا کرتا تھا۔ اور کبھی دنوں کے لئے گوندنیاں جمع بھی کر لیا کرتا تھا۔ پھلوں کا صحیح ذائقہ حاصل کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے لیکن بہت کم لوگ اس طریقہ سے کام لیتے ہیں۔ اگر آپ گوندنیوں کا صحیح ذائقہ معلوم کرنا چاہتے ہیں تو کسی گڈریے لڑکے سے یا تیتر سے دریافت کیجئے۔ آپ ایک بھونڈی غلطی کرتے ہیں۔ اگر آپ یہ فرض کر لیتے ہیں کہ گوندنیوں کو اپنے ہاتھ سے توڑے بغیر آپ نے ان کا ذائقہ معلوم کر لیا ہے۔ گوندنی کبھی بوسٹن پہنچی ہی نہیں ہے اور بوسٹن کے اُس وقت سے جب وہ اپنی تین پہاڑیوں پر پھیلی ہوئی تھی۔ تب سے ذائقہ سے واقف بھی نہیں ہوئے ہیں۔ اس پھل کا خوشبودار اور ضروری حصہ منڈی کو جانے والی گاڑی میں رگڑ کھا کر غائب ہو جاتا اور صرف چارہ بن کر رہ جاتا ہے۔ جب تک ابدی انصاف کی حکومت قائم ہے تب تک ایک بھی معصوم گوندنی دیہات کی پہاڑیوں سے

وہاں نہیں لے جائی جا سکتی۔

میں جب کبھی کبھی دن بھر کی گوڑائی کے بعد اپنے کسی بے قرار ساتھی سے جا ملتا جو صبح سے تالاب پر مچھلی کا شکار کھیل رہا ہوتا یا پانی پر تیرتے سوئے پتے کی طرح خاموش اور ساکت ہوتا تو میرے وہاں پہنچنے تک وہ کئی اقسام کے فلسفہ کی ورزش کر چکا ہوتا اور عام طور سے اس نتیجے پر پہنچ چکا ہوتا تھا کہ وہ کونو بائٹس کے قدیم فرقے کا رکن ہے وہاں ایک سن رسیدہ شخص تھا جو بہت ہی اچھا ماہی گیر تھا اور لکڑی کے ہر قسم کے کام کا ماہر تھا۔ وہ میرے مکان کی طرف دیکھ کر بہت خوش ہوتا تھا جیسے وہ عمارت ماہی گیروں کی سہولت کیلئے ہی تعمیر کی گئی تھی۔ میں بھی بہت خوش ہوتا تھا جب وہ میرے دروازے میں بیٹھ کر اپنی بنسیوں کو درست کیا کرتا تھا۔ کبھی کبھی ہم مل کر تالاب پر بھی بیٹھا کرتے تھے۔ وہ کشتی کے ایک کنارے پر بیٹھتا اور میں دوسرے کنارے پر۔ لیکن ہمارے درمیان زیادہ بات چیت نہیں ہوتی کیونکہ وہ کچھ عرصہ سے ذرا بہرہ ہو گیا تھا۔ لیکن کبھی کبھی زبور گنگنانے لگتا تھا جو میرے فلسفہ سے بہت ہم آہنگی رکھتی ہے۔ اس طرح ہماری ملاقات ایک اٹوٹ آہنگ بن جاتی اور اس ملاقات کو یاد کر کے ان ملاقاتوں کی یادوں سے زیادہ خوشی ہوتی ہے۔ جن میں باتیں کی جاتی ہیں۔ اگر کوئی باتیں کرنے کے لئے موجود نہ ہوتا جیسے کہ عام طور پر ہوتا تھا۔ تو میں ایک چپو سے کشتی کے ایک پہلو کو کھٹکھٹا کر گونج پیدا کر دیتا تھا۔ یہ صدا جنگل میں چاروں طرف چکر کاٹتی اور پھیل جاتی تھی۔ جس طرح کٹہرے میں بند جنگلی جانور اپنے رکھوالوں کی دستک پر بیدار ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح جنگل بھی جاگ اٹھتا۔ اور ہر جنگلی وادی اور پہاڑی گونج اٹھتی۔

میں موسم گرما کی شاموں کو اکثر کشتی میں بیٹھ کر بانسری بجایا کرتا تھا۔ اور ان مچھلیوں کو اپنے گرد تیرتا ہوا دیکھتا تھا جن کو میں نے اپنے خیال میں اپنے نغموں سے مسحور کر دیا ہوتا تھا۔ چاند تالاب کی ریتلی تہہ پر یوں چمکتا تھا کہ اس میں جنگل کی لکڑی کے

پڑے ہوئے ٹکڑے صاف دکھائی دینے لگتے تھے۔ اس سے پہلے میں ہم جوئی کی خاطر وقتاً فوقتاً گرمیوں کی اندھیری راتوں کو اپنے ایک ساتھی کے ہمراہ تالاب پہ آیا کرتا تھا۔ اور ہم پانی کے کنارے اس غرض سے آگ جلاتے تھے کہ وہ ہمارے خیال کے مطابق مچھلیوں کو اپنی طرف متوجہ کرے گی۔ ہم ایک دھاگے میں کیڑوں کا گچھا لٹکا کر پاؤٹ مچھلیاں پکڑا کرتے تھے۔ اور جب بہت رات گئے تک ہم کافی مچھلیاں پکڑ چکتے تھے تو جلتی ہوئی لکڑیوں کو ہوائیوں کی طرح فضا میں اچھال دیتے تھے۔ یہ لکڑیاں نیچے آکر تالاب میں گرتی تھیں اور سرسراتی ہوئی آواز پیدا کر کے بجھ جاتی تھیں۔ ہم گہری تاریکی میں اچانک راستہ ٹٹولنے لگتے ہم سیٹی بجاتے ہوئے پھر انسانوں کی اقامت گاہ کی طرف چل پڑتے تھے۔ لیکن اس وقت تک میں نے اس ساحل پہ اپنا مکان بنا لیا تھا۔

بعض اوقات گاؤں میں کسی کمرے میں اس وقت تک ٹھہرنے کے بعد جب اس خاندان کے سارے افراد سونے کے لئے چلے جاتے تھے میں بنگلے میں واپس آجاتا اور ایک حد تک اگلے روز کے کھانے کا بندوبست کرنے کے لئے چاندنی میں آدھی رات کا وقت کشتی میں بیٹھ کر مچھلیوں کا شکار کھیلنے میں صرف کر دیتا تھا۔ میں الّو اور لومڑیوں کا نغمہ سنتا تھا۔ اور کبھی کبھی مجھے کسی گمنام پرندے کی چیں چیں کرنے کی آواز سنائی دے جاتی تھی جو کہیں قریب ہی ہوتا تھا۔ یہ تجربے میرے لئے ناقابلِ فراموش اور بیش بہا تھے۔ میں چالیس فٹ گہرے پانی میں ساحل سے بیس یا تیس جریب دور لنگر انداز ہوتا تھا۔ بعض اوقات ہزاروں پرچ مچھلیوں اور ٹڈیوں سے گھرا رہتا۔ جن کی دموں کے ہلنے سے سطحِ آب پہ چاندنی میں ہلکی ہلکی لہریں پڑ جاتیں۔ پھر سوت کی لمبی ڈور سے ان پُراسرار مچھلیوں سے رابطہ قایم کرتا جو چالیس فٹ نیچے ہوتی تھیں یا بعض اوقات ہلکی ہلکی ہوا کے ساتھ پانی پہ بہتی ہوئی ساٹھ فٹ لمبی ڈور کو تالاب میں کھینچتے رہتا۔ اور کبھی کبھی اس میں جنبش محسوس کرتا جس سے پتہ چلتا تھا کہ کوئی مچھلی اس کے سرے پہ چارہ ڈھونڈنے کے لئے آپہنچی ہے۔ اور اس کی سمجھ میں نہیں

آ رہا ہے کہ وہ کیا کرے۔ آخرکار آپ آہستہ آہستہ ڈور کو اُوپر اُٹھاتے ہیں۔ اور اُسے ہاتھوں سے کھینچ کر ایک پھڑکتی ہوئی اور چوں چوں کرتی ہوئی مینگھن باہر نکال لیتے ہیں۔ خاص طور سے اندھیری راتوں میں جب آپ کے خیالات کا موضوع یہ وسیع ترین نظام کائنات ہوتا ہے اور آپ دوسری دُنیاؤں کی سَیر کر رہے ہوتے ہیں تو ایسی حالت میں ایک ہلکے سے جھٹکے کو محسوس کرنا اور ضرب سے اچانک چونک کر اپنے آپ کو پھر اسی قدرت سے وابستہ پانا واقعی ایک انوکھا تجربہ ہوتا ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے پانی کے نیچے اور اس کے ساتھ ساتھ ہوا میں بھی اپنی بنسی کی ڈور پھینکنی چاہیئے اس لئے پانی اور آسمان تاریکی میں ہم رنگ ہو جاتے ہیں۔ میں اس طرح ایک کانٹے میں دو مچھلیاں پھنسا لیتا تھا۔

اگرچہ والڈن کا منظر کچھ زیادہ وسیع نہیں ہے۔ لیکن بہت ہی حسین ہے۔ یہ منظر اُس شخص کو زیادہ دلچسپ معلوم نہیں ہو سکتا جو ایک مدّت سے یہاں نہیں آیا یا اس کے کنارے پر نہیں رہا۔ اس کے باوجود والڈن تالاب اپنی گہرائی اور اپنے پانی کی صفائی کے اعتبار سے غیر معمولی اور خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ یہ ایک صاف شفاف گہرا اور سبز کنواں ہے اور جو نصف میل لمبا ہے اس کا قطر پونے دو میل ہے۔ یہ ساڑھے اکسٹھ ایکڑ زمین پر پھیلا ہوا ہے۔ صنوبر اور شاہ بلوط کے پیڑوں کے جنگل میں یہ ہمیشہ جاری و ساری رہنے والا سرچشمہ ہے۔ بادلوں اور بخارات کے سوا اس کے اندر پانی آنے اور پانی کے باہر جانے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ چاروں طرف سے اسے جن پہاڑیوں نے گھیر رکھا ہے۔ وہ پانی کی سطح سے چالیس سے لے کر اسی فٹ تک بلند ہیں۔ جنوب مشرقی اور مشرقی سمت میں یہ پہاڑیاں بالترتیب چوتھائی اور تین چوتھائی میل کے اندر سو فٹ سے لے کر ۱۵۰ فٹ تک اونچی چلی گئی ہیں۔ ان پر صرف جنگل ہی اُگے ہوئے ہیں۔ ہمارے کن کارڈ کے سارے پانی کے کم سے کم دو رنگ ہیں۔ ایک رنگ تو وہ ہے جو دور سے نظر آتا ہے۔ اور دوسرا وہ

حقیقی رنگ ہے جو قریب سے دکھائی دیتا ہے۔ نیلے رنگ کا دارومدار روشنی پر ہے۔
اور وہ آسمان کے رنگ جیسا ہے۔ موسم گرما میں جب مطلع صاف ہوتا ہے تو وہ تھوڑی دور سے
نیلا نظر آتا ہے۔ خاص طور سے جب پانی کی سطح کو ہلا دیا جائے۔ زیادہ دور سے دونوں
ایک ہی رنگ کے نظر آتے ہیں۔ بعض اوقات وہ طوفانی موسم میں گہرے سلیٹی رنگ
کے ہو جاتے ہیں۔ لیکن سمندر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ موسم کی تبدیلی کے بغیر ایک
دن نیلا اور دوسرے دن سبز دکھائی دیتا ہے۔ میں نے اپنا دریا کبھی دیکھا ہے۔
جب گرد و نواح کا منظر برف سے ڈھک جاتا ہے تو پانی اور برف دونوں گھاس کی طرح
سبز نظر آتے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ خالص پانی کا رنگ نیلگوں ہوتا ہے۔
چاہے وہ رقیق ہو یا منجمد لیکن اگر آپ ایک کشتی میں بیٹھ کر سارے تالاب پر نظر ڈالیں تو
وہ مختلف رنگ کا دکھائی دے گا۔ ایک ہی جگہ سے دیکھنے میں والڈن کا پانی ایک وقت
نیلا ہوگا تو دوسرے وقت سبز۔ زمین اور آسمان کے درمیان لیٹے لیٹے وہ دونوں رنگ
اپنا لیتا ہے۔ اگر آپ پہاڑ کی چوٹی سے اسے دیکھیں تو وہ آسمان کا ہم رنگ ہوگا۔
لیکن کنارے سے قریب جہاں ریت نظر آتی ہے اس پانی کا رنگ زردی مائل ہوگا۔ پھر ہلکا سبز
اور دھیرے دھیرے آگے بڑھ کر اصل تالاب میں یکساں طور پر سبز ہو جاتا ہے۔ پہاڑی
پر سے بعض روشنیوں میں دیکھنے سے کنارے کے قریب کا پانی بھی تازہ سبزہ نظر آتا
ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ سبزے کا عکس اس کا سبب ہے۔ لیکن ریل کی پٹڑی کے
ریت والے ٹیلے کے پاس اور موسم بہار میں جب پتیاں زیادہ نکلی اور پھیلی نہیں ہوتی ہیں وہ
ایسا ہی دکھائی دیتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ ریت کی زردی اور عام پھیلی ہوئی نیلاہٹ
کے آپس میں مل جانے سے یہ رنگ پیدا ہوتا ہے۔ یہی اس کی آنکھ کی پتلی کا رنگ ہے
یہی وہ جگہ ہے جہاں موسم بہار میں سورج کی گرمی سے جو تہہ میں منعکس ہوتی ہے اور
اس حرارت سے جو زمین کے اندر سے نکلتی ہے برف پگھل جاتی ہے اور تالاب کے بیچوں

بیچ واقع منجمد حصے کے اردگرد ایک پتلی سی نہر بنا دیتی ہے۔ صاف موسم میں دیگر پانیوں کی
طرح جب اس میں تموج ہوتا ہے اور موجوں پر آسمان کا عکس زاویہ قائمہ پر پڑتا ہے۔
یا اس وجہ سے کہ پانی میں زیادہ روشنی شامل ہو جاتی ہے۔ تھوڑی دور سے دیکھنے پر
آسمان زیادہ گہرا نیلا نظر آتا ہے۔ میں چونکہ اس وقت تالاب کی سطح پر موجود ہوتا تھا۔ اور
اس کے رنگ اور آسمان کے عکس کو دو نگاہوں سے دیکھ رہا ہوتا تھا اس لئے میں نے ایسا
بے مثال اور ناقابل بیان ہلکا نیلا رنگ دیکھا جس کی جھلک جھلکتے ہوئے اور رنگ بدل لینے
والے ریشمی کپڑے یا تلوار کے پھلوں میں ملتی ہے۔ اور جو آسمان سے بھی زیادہ نیلگوں
ہوتا ہے اور لہروں کے مخالف رُخ والے اصل گہرے سبز رنگ سے بدلتا رہتا ہے۔ جو اس
کے مقابلے میں پھیکا معلوم ہوتا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے وہ سورج کے ڈوبنے سے
پہلے مغرب میں بادلوں کے منظر سے دکھائی دینے والے دوسرا کے آسمان کی طرح
شیشہ نما سبزی مائل نیلا ہوتا ہے۔ اگر آپ اس کا پانی ایک گلاس میں بھر کر روشنی میں
دیکھیں تو وہ اتنی مقدار میں ہوا کے برابر بے رنگ ہوتا ہے۔ یہ بات جانی پہچانی ہے کہ
اگر آپ شیشے کی ایک بڑی پلیٹ دیکھیں تو شیشہ گروں کے قول کے مطابق اس کی جسامت
کی وجہ سے اس میں ہلکا سا سبز رنگ دکھائی دے گا۔ لیکن اگر آپ اس شیشے کا
ایک چھوٹا سا ٹکڑا لے لیں گے تو وہ بے رنگ ہوگا۔ میں نے اس کا کوئی تجربہ نہیں کیا ہے
کہ والڈن تالاب پر پانی کی کونسی مقدار سے اس کو ہرا پن نمایاں ہوگا۔ اگر کوئی شخص ہمارے
دریا کے پانی پر نظر ڈالے تو اس کا پانی سیاہ یا سیاہی مائل بھورا دکھائی دے گا۔ اور
اس میں نہاتا ہوا جسم پیلے رنگ کا نظر آئے گا۔ لیکن یہ پانی بلور کی طرح اتنا شفاف ہے
کہ اس میں غسل کرنے والے کا بدن سیل کھڑی کی طرح سفید نظر آتا ہے اور زیادہ غیر فطری معلوم
ہوتا ہے۔ چونکہ پانی میں اعضا بڑے اور بگڑے دکھائی دیتے ہیں اس لئے اس سے عجیب الخلقت
شکلیں پیدا ہوتی ہیں جو مائیکل اینجلو (ایک مصور) کیلئے مصوری کے موزوں نمونے ثابت ہو سکتے ہیں

پانی اتنا شفاف ہے کہ ۲۵ سے لے کر ۳۰ فٹ کی گہرائی تک بالکل صاف نظر آتا ہے
آپ اس پر چپوؤں سے کشتی چلاتے ہوئے سطح کے بیسیوں فٹ نیچے پرچ کی چھوٹی ٹکڑیاں
اور چلوا مچھلیاں دیکھ سکتے ہیں جو بمشکل ایک انچ لمبی ہوتی ہیں۔ اوّل الذکر کو آپ ان کے چھوٹے
قد کے باوجود پہچان جائیں گے کیونکہ ان کی پشت پر دھاریاں ہوتی ہیں اور آپ سوچ میں ڈوب
جائیں گے کہ شاید یہ سنیاسی مچھلیاں ہیں جو اپنی بقا یہاں تلاش کر رہی ہیں۔ کئی برس ہوئے ایک
دفعہ موسم سرما میں جب میں مچھلیاں پکڑنے کے لئے برف میں گڑھا کھود رہا تھا تو میں نے
کنارے پر پاؤں رکھتے ہی اپنی کلہاڑی برف پر پھینک دی اور وہ چار پانچ جریب تک یوں
پھسلتی ہوئی چلی گئی جیسے کوئی شیطان اس سے کھیل رہا ہو اور یہاں تک کہ ایسے گڑھے میں جا گری
جہاں پانی ۲۵ فٹ گہرا تھا۔ میں نے یہ دیکھنے کی غرض سے وہ کہاں پہنچی ہے۔ برف پر لیٹ کر گڑھے
میں جھانکا۔ وہ سوراخ سے ذرا ہٹ کر سر کے بل کھڑی تھی۔ اس کا دستہ سیدھا کھڑا تھا اور
تالاب کی نبض کی دھڑکن سے ہلکا ہلکا ہل رہا تھا۔ اگر میں نے اس کو اس کی حالت پر چھوڑ دیا ہوتا تو
وہ یونہی ہلتا رہتا تاآنکہ امتداد زمانہ اس کے دستہ کو گلا دیتا۔ میرے پاس برف کاٹنے کی جو
چھینی تھی اس کے ذریعہ میں نے ٹھیک کلہاڑے کے اوپر ایک اور سوراخ بنایا اور گرد و نواح میں
جو سب سے بڑا بید کا درخت ملا اسے کاٹ لایا۔ میں نے بید کے سرے پر ایک پھندا بنا کر باندھ
دیا اور اسے بڑی احتیاط سے پانی میں ڈال کر پھندے کو دستہ کی موٹھ میں پھنسا دیا۔ اور
ڈور سے کلہاڑی کو بید کے متوازی کھینچ کر پانی سے نکال لیا۔

ساحل ایک دو چھوٹے اور ریتیلے پٹنوں کے سوا ان گول ہموار اور سفید پتھروں
کی پٹڑی بنا ہوا ہے جن سے سڑک بنائی جاتی ہے۔ اور وہ اتنا اونچا ہے کہ کئی جگہوں پر ایک بار
چھلانگ لگانے سے آپ اپنے سر کے اوپر تک پانی میں پہنچ سکتے ہیں۔ اگر وہ اس قدر شفاف نہ ہوتا تو
شاید دوسری سمت کے کنارے تک پہنچے بغیر تہہ دکھائی نہ دیتی۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ والڈن
تالاب اتھاہ ہے۔ اس میں کیچڑ کہیں نہیں ہے اور سرسری نگاہ ڈالنے والا کہے گا کہ اس میں

گھاس پھوس بھی نہیں ہے۔ ان چھوٹے چھوٹے سبزہ زاروں کے جو حال ہی میں پانی میں ڈوبے ہیں اور جو اصل تالاب کا حصّہ نہیں ہیں کہیں ایسے قریب قریب پودے دکھائی نہیں دیتے جن کو اس میں ہونا نہیں چاہیے۔ غور سے دیکھئے پر بھی کوئی فلیگ ایرس یا زرد اور سفید سوسن کے پھول دکھائی نہیں دیتے۔ صرف ہارٹ لیف، پوٹا موجیٹن اور غالباً ایک دو واٹرگیٹ ہی ہیں۔ شاید کوئی نہانے والا ان سب کو نہ دیکھ سکے۔ یہ سارے پودے اُس عنصر کی طرح جس میں یہ اُگتے ہیں صاف اور چمکیلے ہوتے ہیں پتھر پانی کے اندر ایک دو جریب تک چلے جاتے ہیں۔ اُن کے بعد خالص ریت کی تہہ آجاتی ہے۔ عام طور سے بہت گہرے حصّوں میں تھوڑا سا پیڑ ہوتا ہے۔ یہ غالباً گلی سڑی پتیاں ہوتی ہیں جو یکے بعد دیگرے خزاں کے کئی موسموں نے وہاں تک اڑا کر پہنچائی ہوتی ہیں۔ اور موسم سرما کے وسط میں بھی لنگروں کے ساتھ ساتھ سبز اور چمکیلا جھاڑ جھنکار چلا آتا ہے۔

ہمارے ہاں اس جیسا ایک اور تالاب ہے۔ سفید تالاب جو نوائکڑ کے "گوشے" میں واقع ہے اور مغرب میں ڈھائی میل دور ہے۔ لیکن اگرچہ میں اس مرکز سے بارہ میل کے اندر بیشتر تالابوں سے واقف ہوں پھر بھی اس کنوئیں جیسے صاف تالاب سے آگاہ نہیں ہوں۔ ایک کے بعد ایک آنے والی قوموں نے اس کا پانی پیا ہے۔ اس کی تعریف کی ہے اور اس کی پیمائش کی ہے۔ اور پھر یہ اس سے گزر گئی ہیں اور ابھی تک اس کا پانی سبز ہے اور ہمیشہ کی طرح صاف ہے۔ یہ کوئی موسمی چشمہ نہیں ہے۔ غالباً اس صبح بہار سے بھی جب آدم اور حوا کو جنت سے نکالا گیا۔ والڈن تالاب پہلے سے موجود تھا۔ اس وقت بھی ہلکی ہلکی بوندا باندی کے بعد کہرا چھٹ رہا تھا اور جنوبی ہوا چل رہی تھی اور تالاب ہزاروں لطوں اور ہنسوں سے ڈھک گیا تھا جنہوں نے خزاں کا نام تک نہیں سنا تھا۔ اور اس وقت یہی صاف جھیلیں ان کے لئے کافی ہوتی تھیں۔ اس زمانہ میں بھی اس میں جوار بھاٹا آنا شروع ہو گیا تھا اور اس نے پانی کو صاف بنا کر وہ رنگ دے دیا تھا جو آج بھی اُس میں پایا جاتا ہے۔ اس

نے اپنے لئے آسمانی رنگ کا حق محفوظ کرا لیا تھا تاکہ وہی دنیا میں والڈن تالاب ہے اور صرف وہی شبنم کو معطر رکھے گا۔ کون جانتا ہے کہ یہ کتنی بھولی بسری اقوام کے ادب میں کسٹالین چشمہ رہا ہے؟ یا سنہرے زمانہ میں کونسی جل پریاں اس پر راج کرتی تھیں؟ یہ کنکارڈ کا پہلا آبدار موتی ہے جو کنکارڈ نے اپنے تاج میں لگا رکھا ہے۔

پھر بھی اتفاق سے پہلے پہل جو لوگ یہاں آئے تھے اپنے قدموں کے نشان چھوڑ گئے ہیں۔ مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا ہے کہ تالاب کے کنارے پر جہاں گھنا جنگل ابھی ابھی کاٹا گیا ہے ستوال پہاڑی میں ایک پتلی دار تنگ پگڈنڈی ہے جو مسلسل اوپر چڑھتی اور اترتی ہے اور دور ہٹتی اور قریب آ جاتی ہے۔ یہ پگڈنڈی غالباً اتنی ہی پرانی ہے جتنی انسان کی نسل۔ اس کو ابتدائی دور کے شکاریوں کے قدموں نے نقش کر دیا تھا اور موجودہ زمانہ کے لوگ بھی کبھی کبھی نادانستہ طور پر چل لیتے ہیں۔ اگر کوئی شخص موسم سرما میں تالاب کے بیچوں بیچ کھڑا ہو جائے تو یہ راستہ اسے صاف طور سے دکھائی دے گا اگرچہ موسم سرما میں یہ پگڈنڈی نزدیک سے بھی نہیں دکھائی دیتی ہے۔ لیکن سردیوں میں ہلکی ہلکی برف کے پڑتے ہی ایک غیر منقطع سفید لکیر کی طرح دکھائی دینے لگتی ہے۔ اور جھاڑ جھنکاڑ اور چھوٹی چھوٹی شاخیں بھی اسے نظر آنے سے روک نہیں سکتی ہیں بلکہ بعض جگہوں پر تو وہ ایک چوتھائی میل دور سے بھی صاف دکھائی دیتی ہے۔ برف اس کے خدوخال پھر سے واضح کر دیتی ہے۔ ایک دن یہاں جو بنگلے بنائے جائیں گے ان کے آراستہ احاطوں میں اس کے کچھ نشانات پھر بھی باقی رہ جائیں گے۔

تالاب کا پانی بڑھتا اور اترتا رہتا ہے لیکن کس موسم میں اور باقاعدگی کے ساتھ یا بلا قاعدگی کے بغیر یہ کوئی نہیں جانتا۔ اگرچہ حسب معمول بہت سے لوگ ادعا کرتے ہیں کہ وہ جانتے ہیں کہ عام طور پر موسم سرما میں اس کا پانی چڑھ جاتا ہے اور موسم گرما میں اتر جاتا ہے لیکن ایسا موسم کی خشکی اور تری کے تناسب سے نہیں ہوتا۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں وہاں رہتا تھا تو کب وہ ایک یا دو فٹ نیچا ہوتا اور کب کم سے کم پانچ فٹ اونچا ہو جاتا

تھا۔ ایک تنگ پتلی پٹی تالاب تک جاتی ہے۔ اس کے ایک طرف گہرا پانی ہے۔ اصل ساحل
سے تقریباً چھ جریب کے فاصلہ پر میں نے ۱۸۵۶ء کے لگ بھگ کشتی میں مرتبہ ابالنے کے لئے ایک
شخص کا ہاتھ بٹایا تھا لیکن اب پچیس برس ہو چکے ہیں میں پھر ایسا نہیں کر سکا۔ برعکس اس کے جب
میں نے یہ بتایا کہ اس واقعہ کے چند برس بعد میں ان کی جان پہچان کے ساحل سے پندرہ
جریب دُور جنگل کے ایک تنہا گوشہ میں کشتی میں بیٹھ کر مچھلی کا شکار کھیلا کرتا تھا تو میرے
دوست میری بات اس طرح سُن رہے ہوتے تھے جیسے اُن کو یقین نہ آ رہا ہو کیونکہ مدت
سے وہ جگہ ایک سبزہ زار میں تبدیل ہو چکی ہے لیکن گذشتہ دو برس سے تالاب کا پانی
برابر اونچا جا رہا ہے اور اب ۱۸۵۲ء میں اُس زمانے کی نسبت جب میں وہاں رہا کرتا تھا
ٹھیک پانچ فٹ اونچا ہو گیا ہے۔ یعنی اتنا ہی اونچا جتنا تیس برس پہلے تھا۔ اس سبزہ زار
میں مچھلی کا شکار پھر کھیلا جا رہا ہے۔ اس طرح واضح طور پر پانی کی سطح میں چھ سات فٹ
کا فرق پڑ گیا ہے۔ اردگرد کی پہاڑیوں سے جو پانی تالاب میں آتا ہے وہ مقدار میں بہت
کم ہوتا ہے۔ اس لئے پانی کے اس قدر بڑھنے کے اسباب یقیناً گہرے چشموں کو اثر انداز
کرنے والے ذرائع سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس بار گرمیوں میں پانی پھر کم ہونا شروع ہو گیا ہے یہ
بڑی عجیب بات ہے کہ پانی کا گھٹنا یا بڑھنا خواہ کسی لحاظ سے ہو سالانہ ہوتا ہو لیکن اسے
پایۂ تکمیل تک پہنچنے میں کئی برس لگتے ہیں۔ میں نے ایک بار پانی کو بڑھتے ہوئے دیکھا ہے
اور دو بار پانی کے گھٹنے کا کچھ حصہ دیکھا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ آج سے ایک درجن یا پندرہ
برس کے بعد پانی اتنا کم ہو جائے گا جتنا میں نے پہلے کبھی کم نہیں دیکھا۔ مشرق میں
ایک میل دور فلنٹس تالاب ہے جس میں پانی اندر آنے اور باہر جانے سے کبھی کبھی گڑبڑ
پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کے درمیان واقع چھوٹے تالاب والڈن تالاب کے معاون ہیں
اور حال ہی میں ان کا پانی بھی والڈن تالاب کے ساتھ ساتھ زیادہ بلند ہو گیا ہے۔ جہاں
تک وائٹ تالاب کا تعلق ہے اس کے بارے میں بھی میرا مشاہدہ اتنا ہی درست ہے۔

والڈن تالاب میں طویل وقفوں کے بعد پانی کے اتار چڑھاؤ کا کم سے کم اتنا فائدہ ضرور ہے کہ پانی ایک برس یا اس سے زائد مدت کے لئے اس بلندی پر ٹکا رہتا ہے اور اگرچہ تالاب کے گرد گھومنا دشوار ہو جاتا ہے پھر بھی یہ پانی جھاڑ جھنکار اور درختوں کو جو آخری چڑھاؤ کے بعد سے اُگ آتے ہیں مثلاً کالے صنوبر، بید، اسفیدے وغیرہ اور دیگر درختوں کو نیست و نابود کر دیتا ہے اور جب پانی اتر جاتا ہے تو سارا ساحل صاف ستھرا رہ جاتا ہے کیونکہ ان تمام تالابوں، دریاؤں اور سمندروں کے برعکس جن میں روزانہ مدو جزر آتا ہے والڈن تالاب کے کنارے پانی کے کم ہو جانے پر بہت زیادہ صاف ہوتے ہیں۔ میرے گھر کے ساتھ تالاب کا جو کنارا ہے اس پہ پندرہ فٹ اونچے صنوبر کے درختوں کی قطار اس طرح گر گئی ہے جیسے انہیں لیور (بیرم) سے گرایا گیا ہو اس طرح ان درختوں کا بڑھنا روک دیا گیا ہے اور ان کے قد سے پتہ چلتا ہے کہ پانی کے اس بلندی تک پہنچنے کے بعد کتنے برس گزر چکے ہیں۔ پانی کے اس اتار چڑھاؤ سے تالاب کنارے پر اپنا حق جماتا رہتا ہے۔ اور اس طرح کنارے کی صفائی کرتا رہتا ہے۔ اور درخت حقِ قبضہ کے ذریعہ تالاب کو چڑھنے سے نہیں روک سکتے۔ کنارے جھیل کے ہونٹ ہیں جن پہ ڈاڑھی نہیں اگتی ہے۔ وقتاً فوقتاً تالاب اپنے ہونٹ چاٹتا رہتا ہے جب پانی چڑھا ہوا ہوتا ہے تو بید، اسفیدے اور چیت کے درخت اپنے آپ کو قائم رکھنے کے لئے ان ریشہ دار سرخ جڑیں جو سات فٹ لمبی ہوتی ہیں زمین سے تین چار فٹ اوپر اپنے تنوں کے ہر پہلو سے پانی کے اندر پھیلا دیتے ہیں۔ میں نے کنارے کے قریب نیلی گونبیوں کی جھاڑیاں دیکھی ہیں جن میں عام طور سے کوئی پھل نہیں لگتا۔ مگر ان حالات میں پھلوں سے لد جاتی ہیں۔

بعض لوگ یہ بتاتے ہوئے حیران رہ جاتے ہیں کہ کنارے پر اتنی باضابطگی سے پتھر کیسے لگ جاتے ہیں۔ میرے قصبے کے لوگوں نے یہ روایت ضرور سنی ہوگی۔ بڑے بوڑھے

بتاتے ہیں کہ انہوں نے اپنی جوانی میں یہ کہانی سُنی تھی کہ قدیم ایام میں انڈین لوگ اس پہاڑی پر جشن منایا کرتے تھے وہ پہاڑی اتنی ہی اُونچی تھی جتنا تالاب اس وقت گہرا ہے۔ کہانی کے مطابق ان انڈینوں نے گالی گلوچ سے کام لیا۔ اگرچہ یہ بدعت ایسی تھی جس کا ارتکاب انڈینوں نے کبھی نہیں کیا تھا۔ جب وہ گالیاں دے رہے تھے پہاڑی میں زلزلہ آیا۔ اور وہ غرق ہو گئی۔ صرف ایک بوڑھی انڈین عورت زندہ بچی جس کا نام والڈن تھا اور اُسی کے نام پر اس تالاب کا نام رکھدیا گیا۔ یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ جب یہ پہاڑیاں لرزنے لگیں تو پتھر ان پر سے نیچے لڑھک آئے اور اس طرح موجودہ کنارا بن گیا۔ بہرکیف یہ یقینی امر ہے کہ پہلے اس جگہ کوئی تالاب نہیں تھا۔ لیکن اب یہاں ایک تالاب ہے۔ یہ انڈین کہانی اس قدیم آبادکار کے بیان سے متضاد نہیں ہے جس کا میں ذکر کر چکا ہوں۔ اور جسے یہ بات اچھی طرح یاد ہے کہ جب وہ پہلے پہل یہاں پانی کا کھوج لگانے والی لکڑی لئے ہوئے آیا تو اس نے سبزہ زار سے ہلکے ہلکے بخارات اُٹھتے ہوئے دیکھے اور کھوج لگانے والی لکڑی برابر نیچے کی طرف اشارہ کرتی رہی۔ وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ اُسے یہاں کنواں کھودنا چاہیئے۔ جہاں تک پتھروں کا تعلق ہے بہت سے لوگ ابھی تک یہ خیال کرتے ہیں کہ ان پہاڑیوں سے موجوں کے ٹکرانے کی وجہ سے نیچے نہیں آئے لیکن جہاں تک میرے مشاہدہ کا تعلق ہے یہ پہاڑیاں حیرت انگیز طور پر اس قسم کے پتھروں سے بھری پڑی ہیں۔ اسی قسم کے پتھر ریل کی پٹڑیوں کے دونوں پہلوؤں پر ان جگہوں میں ڈھیر کر دیئے گئے ہیں جہاں پٹڑیاں تالاب کے قریب سے گذرتی ہیں۔ اس کے علاوہ پتھر زیادہ ہیں جہاں کنارا زیادہ عمودی ہے۔ اس لئے بدقسمتی سے پتھروں کا وجود میرے لئے کوئی معمہ نہیں رہ گیا ہے میں نے پتھر جڑنے والے کو پہچان لیا ہے۔ اگر والڈن کا نام کسی انگریز آبادی سے مثلاً سیفرن والڈن سے اخذ نہیں کیا گیا ہے تو کوئی شخص یہ فرض کر سکتا ہے کہ اصل میں اس کا نام والڈ۔ ان۔ پونڈ تھا یعنی دیواروں سے گھرا ہوا تالاب۔

یہ تالاب میرا کھدا کھدایا کنواں تھا۔ سال کے چار مہینوں میں اس کا پانی اتنا ہی
ٹھنڈا ہوتا ہے جتنا ہمیشہ صاف ہوتا ہے۔ میرے خیال میں اگر وہ قصبہ کے پانیوں سے
اُس وقت اچھا نہیں ہوتا تو کسی سے خراب بھی نہیں ہوتا۔ موسم سرما میں جو پانی کھلی ہوا میں
ہوتا ہے ان چشموں اور کنوؤں کے پانی سے زیادہ ٹھنڈا ہوتا ہے جو ڈھکے رہتے ہیں۔
۶ مارچ ۱۸۴۶ء کو جب تھرمامیٹر میرے کمرے میں ۶۵ یا ۷۰ درجہ کی حرارت اس
وجہ سے دکھا رہا تھا کہ سورج بعض اوقات بالکل سر پر ہوتا تھا تالاب کے اس پانی کی حرارت
جو میں نے سہ پہر کے پانچ بجے سے لے کر اگلے روز کی دوپہر تک رکھ چھوڑا تھا ۴۲ درجہ
تھی یعنی قصبہ کے سب سے ٹھنڈے کنوؤں سے جو تازہ پانی نکالا گیا تھا۔ اُس سے
ایک درجہ زیادہ ٹھنڈا تھا۔ اُبلتے چشمہ کے پانی کا درجہ حرارت اس روز ۴۵ تھا یعنی تمام
پانیوں کی نسبت زیادہ گرم تھا۔ ... موسم گرما میں بھی پانی بشرطیکہ پاس کے اتھلے اور ساکن
یہ ستور سطح کا پانی اُس میں نہ آکر ملے سب سے زیادہ ٹھنڈا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ
موسم گرما میں والڈن تالاب کا پانی اپنی گہرائی کی وجہ سے اُن دوسرے پانیوں کی نسبت
اتنا گرم نہیں ہوتا جن پر دھوپ پڑتی ہے۔ جب بہت زیادہ گرمی پڑتی تھی تو
میں عام طور سے بالٹی پانی سے بھر کر تہہ خانے میں رکھ دیا کرتا تھا جہاں وہ رات
میں ٹھنڈا ہو جاتا تھا۔ اور دن بھر بہت ٹھنڈا رہتا تھا۔ اگرچہ میں کبھی کبھی پاس کے
چشمہ سے بھی پانی لاتا تھا۔ ایک ہفتہ تک رکھے رہنے کے بعد بھی والڈن کا پانی اتنا
ہی اچھا رہتا تھا جتنا تازہ نکالنے کے وقت ہوتا تھا اور اُس سے لوہے اور برتن
کی کوئی بو تک نہیں آتی تھی۔ اگر کوئی شخص موسم گرما میں کسی تالاب کے کنارے ایک ہفتہ
کے لئے خیمہ زن ہوتا ہے اور چاہتا ہے کہ وہ برف کی عشرت سے بے نیاز رہے تو اُسے
چاہیے کہ وہ اپنے خیمہ کے چھاؤں میں پانی کی بالٹی چند فٹ کی گہرائی میں دفن کر دے۔
والڈن تالاب میں سمیکہ مچھلیاں بھی پکڑی گئی ہیں اُن میں سے ایک کا وزن

سات پونڈ تھا۔ اُن مچھلیوں کا تو ذکر ہی چھوڑ دیے۔ جو بڑی تیزی کے ساتھ چرخی لے کر بھاگ کھڑی ہوئیں۔ ماہی گیر کے کہنے کے مطابق ان کا وزن آٹھ پونڈ ہوگا کیونکہ وہ انہیں دیکھ نہیں پایا تھا۔ ان کے علاوہ خاردار مچھلیوں، پاوٹ مچھلی جن میں سے بعض کا وزن دو دو پونڈ تھا اور۔ نشا ئسزرنہ، اچونئہ، بار وتع، چند بہ میمز اور دو بام جن میں سے ایک چار کی تھی وا لڈن تالاب میں پائی جاتی ہیں۔ میں یہ تفاصیل اس لئے بیان کر رہا ہوں کہ عموماً مچھلی کا وزن ہی اسکی شہرت کا باعث ہوتا ہے۔ صرف یہی بام مچھیاں ہیں جن کے متعلق میں نے یہاں سُن رکھا ہے۔ اور مجھے کچھ کچھ یہ بھی یاد ہے کہ پانچ انچ لمبی چھوٹی سی مچھلی ہوتی تھی جس کے پہلو نقرئی اور پیٹھ سبزی مائل تھی۔ وہ اپنے کردار کے اعتبار سے ایک ڈیو کے مشابہ تھی۔ اس کا ذکر میں خاص طور سے اس لئے کر رہا ہوں کہ اپنے حقائق کو کہانی کی لڑی سے جوڑ دوں۔ ان تمام باتوں کے باوجود اس تالاب میں مچھلیاں زیادہ نہیں ہیں۔ سمیکہ مچھلی جو افراط سے نہیں ہوتی ہے اس کی قابل فخر پیداوار ہے۔ ایک دفعہ میں نے برف پر تین اقسام کی سمیکہ مچھلیاں پڑی ہوئی دیکھی تھیں۔ ایک لمبی اور پتلی تھی فولاد جیسے رنگ کی۔ یہ بیشتر سمیکہ مچھلیاں اُن سمیکہ مچھلیوں سے ملتی جلتی تھیں۔ جو دریا میں پکڑی جاتی ہیں۔ دوسری چمکیلی سنہرے رنگ کی تھی۔ اُن سے گہرے سبز رنگ کی چمک پیدا ہوتی تھی۔ یہ مچھلیاں یہاں بہت عام ہیں۔ تیسری بالکل سنہری تھی اور اسکی شکل و صورت دوسری قسم کی سمیکہ مچھلی جیسی تھی۔ لیکن اس کے گہرے پہلوؤں پر گہرے بھورے رنگ کی بندیاں تھیں۔ جن میں خون کے ہلکے رنگ کی ٹراوٹ مچھلی جیسی چتیاں پڑی ہوئی تھیں۔ اُن پر ریٹی کولیٹس نام کا اطلاق نہیں ہوتا تھا بلکہ ان کو گوٹاٹس ہی کہنا چاہیئے یہ سب مچھلیاں بہت ہی طاقتور۔ اور اپنے قد کی نسبت زیادہ وزنی ہوتی ہیں۔ اس تالاب میں جتنی اقسام کی مچھلیاں ہوتی ہیں وہ سب یہاں کے شفاف پانی کے باعث دریا اور دیگر تالابوں کی مچھلیوں سے زیادہ صاف، خوبصورت اور ٹھوس گوشت

کی ہوتی ہیں۔ اور ان کو بڑی آسانی سے پہچانا جاسکتا ہے۔ غالباً ماہر سماک ان میں سے بعض کو نئی نئی قسموں میں تقسیم کریں گے۔ اس تالاب میں ایک نسل زیادہ صاف مینڈکوں اور کچھوؤں کی بھی ہے کچھ صدف دار بھی ہیں چھچھوندروں اور منک کے نشانات بھی اس کے قریب ملتے ہیں اور کبھی کبھی کوئی دلالی سنگ پشت بھی گھومتا پھرتا آ نکلتا ہے۔ بعض اوقات جب میں صبح سویرے اپنی کشتی پانی میں کھیتا تو ایک سبز دلالی سنگ پشت جو رات کو کشتی میں آکر چھپ جاتا تھا ہڑبڑا کر باہر نکل پڑتا تھا۔ اس میں موسم خزاں اور بہار میں ہنس اور بطیں آتی ہیں۔ سفید پیٹ والی ابابیلیں اس کے پانی کو چھوتی ہوئی اڑتی ہیں اور سارے موسم گرما میں اس کے پتھریلے ساحل پر کالے سر والی مرغابیاں ٹرٹراتی رہتی ہیں۔ میں نے کبھی کبھی مچھلی کا شکار کرنے والے بگلے کو پانی پر جھکے ہوئے صنوبر کی ڈال پر بیٹھے دیکھا ہے اور اسے اڑایا ہے۔ لیکن فیئر ہیون" کی طرح شاید ہی کبھی اس تالاب کو چھوٹے بگلے نے غلیظ بنایا ہو۔ یہ تالاب سال بھر میں زیادہ سے زیادہ ایک پن ڈبی کو برداشت کر لیتا ہے یہی وہ اہم جانور ہیں جو اس تالاب میں آکر بسرا کرتے ہیں۔ غیر طوفانی موسم میں مشرق کے ریتیلے کنارے کے قریب جہاں پانی آٹھ یا دس فٹ گہرا ہے اور تالاب کے دوسرے حصوں میں بھی ایک کشتی میں بیٹھ کر نصف درجن فٹ گول اور ایک فٹ اونچا ایک پتھریلا ڈھیر دیکھیں گے جو مرغی کے انڈوں کے برابر چھوٹے چھوٹے پتھروں سے بنا ہوگا۔ اس ڈھیر کے چاروں طرف صرف ریت ہی ریت نظر آئے گی۔ پہلے تو آپ کو یہ خیال ہوگا کہ شاید ان پتھروں کو انڈینوں نے کسی مقصد سے برف پر اکٹھا کیا ہوگا اور جب برف پگھل گئی ہوگی تو وہ تہہ میں بیٹھ گئے ہونگے لیکن یہ پتھر بڑے قرینے اور ترتیب سے رکھے گئے ہیں اور ان میں سے بعض پتھر بالکل تازہ ہیں۔ وہ اس طرح کے ہیں جیسے دریاؤں میں ملتے ہیں۔ لیکن اس تالاب میں تو دیل مچھلی کے بچے ہیں اور نہ موریہ ہیں۔ اس لئے مجھے معلوم نہیں ہے کہ یہ

ڈھیر کس مچھلی نے لگائے ہیں۔ غالباً یہ چون مچھلیوں کے گھونسلے ہیں۔ ان کی وجہ سے ایک خوشگوار سا زیر سر بستہ پیدا ہو گیا ہے۔

کنارا اتنا بے ترتیب ہے کہ اس میں اکتا دینے والی یکسانیت نہیں ہے۔ میرے ذہن میں ان کناروں کی جو تصویر محفوظ ہے۔ اس میں گہری خلیجوں نے مغربی ساحل کو توڑ پھوڑ رکھا ہے۔ شمالی حصّہ زیادہ اُبھرا ہوا ہے۔ جنوبی حصّہ خوبصورت اور آراستہ ہے۔ اس طرف ایک کے اوپر دوسرا چھجہ بنتا چلا گیا ہے اور یہ چھجے اپنے درمیان ایسی گھاٹیوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں جن کو ابھی دریافت نہیں کیا گیا ہے۔ جنگل نہ اتنا خوش منظر اور نہ اتنا خوبصورت ہے جتنا وہ ایک جھیل کے وسط سے نظر آتا ہے جو ایسی پہاڑیوں کے درمیان واقع ہو جو اس کے پانی کی سطح سے بلند ہوتی ہوں۔ وہ پانی جس میں اس جنگل کا عکس پڑتا ہے نہ صرف بہت ہی اچھا منظر پیش کرتا ہے بلکہ اپنے پیچ در پیچ کناروں کے باعث اس کی بہترین اور خوشنما سرحد بھی بن جاتا ہے۔ اس کے کناروں میں نہ تو کوئی کھردرا پن ہے اور نہ کوئی ایسا نقص جو ان مقامات پر ہوتا ہے۔ جہاں کلہاڑیوں نے کسی جنگل کو صاف کر دیا ہو یا جہاں مزروعہ زمین اسکے نزدیک گھس آتی ہے۔ درختوں کو پانی کی طرف بڑھنے کی بڑی گنجائش میسر آتی ہے اور ہر درخت اپنی مضبوط ترین شاخ کا اس پر سائبان سا لگا دیتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے قدرت نے خود ایک قدرتی حاشیہ بُن دیا ہو اور نگاہیں ٹھیک کنارے کی نیچی نیچی جھاڑیوں سے ہوتی ہوئی زینہ بہ زینہ اونچے سے اونچے درخت تک پہنچ جاتی ہیں۔ جہاں انسان کے ہاتھوں کے تصرفات بہت کم پائے جاتے ہیں۔ پانی کنارے کو اب بھی اسی طرح چومتا ہے جس طرح ہزاروں برس پہلے چومتا تھا۔

جھیل ارضی منظر کی سب سے زیادہ خوبصورت اور پُر اثر خصوصیت ہوتی ہے وہ زمین کی آنکھ ہے۔ اس میں گھور کر دیکھنے والا خود اپنی فطرت کی گہرائیوں

سے واقفیت ہو جاتا ہے۔ کنارے سے ملحقہ پانی سے نکلنے والے درخت اس کی نازک پلکیں اور جنگلات سے بھری ہوئی پہاڑیاں اور چٹانیں اس کی آنکھوں پر چھا لئے ہوئے ابرو ہوتے ہیں۔

میں نے تالاب کے مشرقی کونے کے ہموار ریتیلے ساحل پر کھڑے ہو کر ستمبر کی پُر سکون سہ پہر کو جب ہلکا کہرا بھی دوسرے ساحل کو دھندلا بنا دیتا ہے یہ محسوس کیا "جھیل کی بلّوریں سطح" کا جملہ کہاں سے اخذ کیا گیا ہے۔ جب آپ اپنے سر کو نیچے کی طرف جھکاتے ہیں تو جھیل ایک بڑے نازک جالے کا تار معلوم ہوتی ہے۔ یعنی وہ جالا جو ساری وادی میں تان دیا گیا ہے اور جو دُور افتادہ صنوبر کے جنگلوں کے مقابل چمک کر فضا کے ایک حصّے کو دوسرے سے جدا کر دیتا ہے آپ ایسا محسوس کرینگے جیسے آپ مقابل کی پہاڑیوں تک اس کے نیچے نیچے کسی قسم کے وسوسے کے بغیر چلے جائیں گے اور جو ابابیلیں اس کی سطح کو چھوتی ہوئی اڑ رہی ہیں وہ بڑی آسانی کے ساتھ اس پر بیٹھ سکتی ہیں۔ کبھی کبھی وہ غلطی سے اس خط کے نیچے غوطہ لگا جاتی ہیں۔ لیکن جلد ہی ان کا واہمہ دُور ہو جاتا ہے۔ جب آپ تالاب کے اس پار مغرب کی سمت میں دیکھتے ہیں تو آپ اپنی آنکھوں کو اصل سورج اور عکس سے بچانے کے لئے دونوں ہاتھ ان پر رکھنے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ وہ دونوں ہی تابندہ ہوتے ہیں۔ اگر آپ ان دونوں آفتابوں کے درمیان دیکھیں تو ان جگہوں کے سوا جہاں برف سے پیدا ہونے والے کیڑے تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر ساری سطح پر پھیلے ہوئے دھوپ میں اُڑ اُڑ کر بہت ہی لطیف چنگاری کی طرح چمکتے ہیں یا شاید کوئی بطخ پر کھجلانے لگتا ہے یا جیسا کہ پہلے میں کہہ چکا ہوں کوئی ابابیل اتنی نیچے اُڑنے لگتی ہے کہ پانی کو چھو لیتی ہے جھیل کی سطح واقعی شیشے کی طرح جگمگاتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ اور کوئی مچھلی اچھلتی ہے اور ایک قوس ہوا میں بنا دیتی ہے اور جہاں سے وہ ابھرتی ہے وہاں بھی چمک پیدا ہو جاتی ہے۔ اور جا بجا گو کھرو سطح پر بہہ رہا ہوتا ہے۔ مچھلیاں اس پر جھپٹتی ہیں۔

اور پانی میں بھنور بنالیتی ہیں۔ پانی پگھلے ہوئے شیشہ کی طرح ہے جو ٹھنڈا تو ہو چکا ہے لیکن منجمد نہیں ہوا ہے اور خاک کے جو چند ذرّے اس میں موجود ہیں اسی طرح صاف اور خوشنما نظر آتے ہیں۔ آپ اکثر اوقات اس سے بھی زیادہ ہموار اور پانی کے تاریک حصّے دیکھیں گے جیسے کسی اور باریک تر جالے نے اُسے دوسرے حصوں سے الگ کر دیا ہو اور جل پریوں کا اکھاڑہ ہو۔ آپ کسی پہاڑ کی چوٹی پر سے ہر حصّے میں مچھلیوں کو پھڑکتے ہوئے دیکھ سکتے ہیں کیونکہ جب ایک بھی مچھلی یا چلوا مچھلی کوئی کیڑا پکڑ لیتی ہے تو جھیل کا توازن بگڑ جاتا ہے تعجب کی بات تو یہ ہے کہ یہ اور کوئی دوسرا واقعہ کتنی تفصیل کے ساتھ نمایاں کیا جاتا ہے جہاں لہریں نصف جریب کے قطر کے برابر ہو جاتی ہیں۔ وہاں میں دور ہی سے پہچان جاتا ہوں کہ کوئی مچھلی کیڑا کھا گئی ہے۔ آپ ایک چوتھائی میل کے فاصلہ سے ایک جل بھونرے کو پانی کی سطح پر تیرتے ہوئے دیکھ سکتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ پانی میں ایک ہلکی سی دھاری بنا دیتا ہے جس سے ایک پتلی سی لہر پیدا ہوتی ہے اور اس کے دونوں کنارے ایک دوسرے سے دور ہٹتے جاتے ہیں۔ لیکن سطح پر پھسلنے والے اسپائڈر کیڑے کوئی نمایاں ہر پیدا کئے بغیر پانی پر تیرتے ہوئے چلتے ہیں۔ جب پانی میں تموّج پیدا ہوتا ہے تو اس پر نہ جل بھونرے رہ جاتے ہیں اور نہ جل مکڑے۔ بظاہر پرسکون حالات میں وہ اپنی اپنی جائے پناہ سے نکل پڑتے ہیں۔ اور کنارے سے پھیلتے ہوئے لہروں کے اندر آجاتے ہیں اور پوری جھیل کو چھان ڈالتے ہیں موسم سرما کے ایسے دنوں میں جب سورج نکلا ہوا ہوتا ہے اور اس کی تمازت لذت انگیز محسوس ہوتی ہے ایسی کسی بلندی سے جہاں سے تا حدِ نظر کے مقابل ہو کسی ٹھنٹھ پر بیٹھنا اور لہروں کے چھوٹے چھوٹے حلقوں کا مطالعہ کرنا جو تالاب کی سطح پر بنتے رہتے ہیں اور جن سے سطح کا کوئی حصّہ خالی نہیں ہوتا بہت ہی اطمینان بخش مشغلہ ہوتا ہے۔ اس وسیع جھیل میں اگر کہیں کوئی ہنگامہ یا اضطراب برپا ہوتا ہے تو وہ فوراً اسی طریقے سے دھیرے دھیرے فرو اور کم بھی ہو جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح پانی کا بڑا پیالہ چھلک جائے تو

کانپتے ہوئے چھوٹے چھوٹے دائرے کناروں کی آغوش میں پناہ لیتے ہیں اور پھر سب کچھ ساکن ہو جاتا ہے۔ اگر تالاب میں ایک بھی مچھلی اچھلتی ہے یا ایک بھی پتّہ گرتا ہے تو وہ ایک کے اوپر دوسرا دائرہ بناکر اور خوبصورت لکیر کھینچکر اس واقعہ کی اطلاع دے جاتا ہے گویا چشمہ سے پانی برابر ابھرتا ہوا آتا ہو یا اس کی نبض آہستہ آہستہ دھڑک رہی ہو یا اس کی سانس سے اس کے سینہ میں زیر و بم پیدا ہو۔ مسرت اور دکھ کی لہروں میں امتیاز نہیں کیا جا سکتا۔ جھیل کی یہ فضا کتنی پُرسکون ہے! آدمی کے کام موسم بہار کی طرح پھر چمکنے لگتے ہیں۔ ہاں ہر پتّا ہر ڈالی، ہر پتھر اور ہر جالا لہر کے وسط میں اس طرح جگمگاتا ہے جس طرح وہ موسم بہار کی کسی صبح کو شبنم سے بھیگ کر چمکتا ہے۔ چپّو سے لے کیڑوں کی ہر حرکت تک چمک پیدا کرتی ہے۔ اور اگر کوئی چپو پانی میں گر پڑتا ہے تو بہت ہی میٹھی گونج سنائی دیتی ہے۔

والڈن ستمبر اور اکتوبر کے ایام میں جنگل کا مکمل آئینہ بن جاتا ہے۔ جس کے گرد ایسے پتھر جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ جو میری نظر میں اتنے ہی بیش بہا ہیں جتنے وہ کم اور نایاب ہونے کی صورت میں ہوتے۔ دھرتی کے سینے پر شاید ایک جھیل سے زیادہ خوبصورت اور صاف اور ساتھ ہی ساتھ اس سے بڑی کوئی اور چیز نہیں۔ یہ جھیل آسمانی پانی ہے۔ اسے باڑھ کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ قومیں آتی ہیں اور اسے غلیظ بنائے بغیر چلی جاتی ہیں۔ یہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں کسی پتھر سے کوئی بال نہیں پڑ سکتا یا جس کی چمک دمک کبھی زائل نہیں ہو سکتی۔ اور قدرت جس پر برابر جلا کرتی رہتی ہے۔ کوئی طوفان یا آندھی اس کی تر و تازہ سطح کو دھندلا نہیں سکتی۔ اس آئینے پر پڑنے والی ہر کثافت اس میں جذب ہو جاتی ہے۔ سورج کی جھاڑو یا اس کی روشنی کے جھاڑن ساری گرد صاف کر دیتا ہے۔ اس پر سانس کا کوئی نشان نہیں رہتا بلکہ وہ اپنا سانس اوپر بھیجتا ہے جو بادلوں کی طرح اس کی سطح پر اڑتا رہتا ہے اور اس کے باوجود اس کے سینے میں اس کا عکس ہوتا ہے۔ پانی کا کھیت اس کیفیت کو ظاہر کرتا ہے جو ہوا میں موجود ہے۔ وہ اوپر سے لگاتار

نئی زندگی اور نئی حرکت حاصل کرتا رہتا ہے۔ وہ اپنی فطرت کے اعتبار سے زمین اور آسمان کے درمیان کی کوئی چیز ہے۔ زمین پہ درخت اور گھاس ملتے ہیں لیکن پانی خود ہوا سے ملتا ہے میں ان مقامات کو روشنی کی دھاریوں اور کرنوں کی بدولت دیکھ لیتا ہوں جہاں ہوا پانی سے ٹکراتی ہے۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ ہم اس کی سطح پر نگاہ ڈال سکتے ہیں۔ ہم شاید اس طرح ہوا کی سطح کو بھی بالآخر دیکھ سکیں گے جہاں اس سے بھی لطیف تر شے اس پہ بہتی ہے۔

اکتوبر کے آخر میں جل بھنورے اور جل پھندے آخر کار غائب ہو جاتے ہیں۔ جب شدید قسم کا کہرا پڑتا ہے۔ اور پھر عام طور سے نومبر میں جب دن پرسکون ہوتا ہے تو سطح پر شکن ڈالنے والی کوئی چیز باقی نہیں رہتی۔ نومبر میں ایک دن سہ پہر کو جب کئی دن کی طوفانی بارش کے بعد بالکل سکون ہو گیا تھا اور آسمان ابر آلود اور فضا میں کہرا بھرا ہوا تھا میں نے دیکھا کہ وہ اس قدر ہموار تھا کہ اس کی سطح میں امتیاز کرنا مشکل تھا۔ اگرچہ اس وقت اس کی سطح سے اکتوبر کے شوخ رنگ نہیں جھلک رہے تھے لیکن اردگرد کی پہاڑیوں کے نومبری رنگ ضرور نمایاں تھے۔ اگرچہ میں اس کی سطح پر سے بڑی نرمی کے ساتھ گذر رہا تھا لیکن پھر بھی میری کشتی سے جو ہلکی لہریں پیدا ہو رہی تھیں میرے حدِ نظر تک پھیلی ہوئی تھیں اور عکس میں دھاریاں ڈال رہی تھیں۔ جب میں سطح کی طرف دیکھ رہا تھا تو تھوڑے فاصلہ پر جا بجا ایک ہلکی سی چمک نظر آ رہی تھی جیسے کہ کہرے سے بچے ہوئے کچھ جل پھندے جمع ہو گئے ہوں یا شاید سطح کے زیادہ ہموار ہونے کے باعث وہ جگہیں نمایاں ہو گئی تھیں جہاں تہہ سے پانی اُبھر کر باہر آتا ہے۔

جب میں دھیرے دھیرے چپو چلا کر ان میں سے ایک جگہ پہ پہنچا تو میں نے اپنے آپ کو سینکڑوں چھوٹی چھوٹی مچھلیوں سے گھرا ہوا پایا۔ یہ مچھلیاں تقریباً پانچ پانچ انچ لمبی تھیں اور سبز پانی میں کانسی کے رنگ کی دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ وہاں کھیل رہی تھیں۔ سطح پہ اُبھرتیں اس میں سلوٹیں ڈال دیتیں اور کبھی کبھی بلبلے چھوڑ جاتیں۔ ایسے شفاف پانی میں جس کی بظاہر کوئی تھاہ نہیں تھی اور جس میں بادلوں کا عکس پڑ رہا تھا اُسے دیکھ کر مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے

میں غبارے میں بیٹھ کر اڑا چلا جا رہا ہوں اور مچھلیاں تیرنے کی بجائے اس طرح اڑتی اور منڈلاتی ہوئی نظر آ رہی ہوں جیسے وہ پرندوں کا جھنڈ۔ اور میری سطح سے کچھ ہی نیچے دائیں بائیں گزر رہا ہو۔ اور پر ماہی ان کے چاروں طرف بادبان کی طرح پھیلے ہوئے ہوں۔ اس سے قبل کہ موسم گزر کر ان کے ہواؤں پر برف کی چلمنیں ڈال دے وہ بظاہر اس مختصر سی مدت میں رنگ رلیاں منا لینا چاہتی تھیں۔ بعض اوقات ان کی ان حرکتوں سے ایسی صورت ہو جاتی تھی جو دھیمی دھیمی ہوا چلنے یا چند بوندیں پڑنے سے ہو جاتی ہے اگر میں احتیاط سے کام نہ لیتے ہوئے ان تک پہنچتا تو وہ ڈر جاتیں اور پانی پر اپنی دم اس طرح مارتیں جیسے کسی نے سطح آب پر جھاڑو جیسی شاخ دے ماری ہو۔ اس کے بعد وہ گہرائیوں میں پناہ لینے کے لئے چلی جاتیں۔

آخر کار ہوا تیز ہوئی، کہرا بڑھا اور موجیں تیز ہونے لگیں اور ہر طرح مچھلی پہلے سے زیادہ اونچی اچھلنے لگی۔ ابھی پانی میں اور ابھی پانی سے آدھی باہر اور باہر والے تین انچ لمبے حصے میں سینکڑوں کالی کالی چتیاں ۔ ایک برس میں نے دسمبر کی پانچویں تاریخ کو سطح آب پر کچھ لہریں دیکھیں چونکہ فضا پر کچھ کہرا چھایا ہوا تھا میں سمجھا کہ فوراً ہی تیز بارش ہونے والی ہے۔ میں نے جلدی سے چپو اٹھا لیا اور کشتی گھر کی طرف موڑ دی۔ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ بارش تیز تر ہوتی جا رہی ہے اور میں ڈر رہا تھا کہ میں بھیگ کر شرابور ہو جاؤں گا حالانکہ میرے گال پر ایک بوند تک نہیں ٹپکی تھی لیکن اچانک سطح پر سے لہریں غائب ہو گئیں۔ ایسا مچھلیوں کی وجہ سے ہوا اور وہ میرے چپو کی آواز سن کر گہرائی میں چلی گئیں۔ میں نے ان کی کئی ٹولیوں کو غائب ہوتے ہوئے دھندلا دھندلا دیکھا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے ایک خشک سہ پہر کاٹی۔

ایک بوڑھے شخص نے جو اس تالاب پر اب سے ساٹھ برس پہلے اس وقت آیا تھا جب یہ تالاب اردگرد پھیلے ہوئے جنگلوں سے سیاہ ہو رہا تھا مجھے بتایا کہ اس نے ساٹھ برس پہلے بعض اوقات اسے بطوں اور دوسرے آبی پرندوں سے بھرا دیکھا تھا اور اس کے گرد عقاب بھی چکر کاٹا کرتے تھے۔ وہ یہاں مچھلیوں کا شکار کھیلنے آتا تھا اور اس کے ایک کنارے کی

کشتی استعمال کرتا تھا جو اُسے یہیں کنارے پڑی ملی تھی۔ یہ کشتی دو سفید صنوبر کے شہتیروں سے بنائی گئی تھی جن کو بیچ میں سے کھوکھلا کر کے دونوں حصوں کو جوڑ کر کونوں پر جو کچھ کاٹ دیا گیا تھا وہ بہت بھاری تھی لیکن بہت دیر تک کام دیتی رہی۔ بعد میں اس میں پانی بھر گیا۔ اور وہ غالباً ڈوب کر تہہ میں بیٹھ گئی۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ وہ کس کی تھی۔ دراصل وہ تالاب ہی کی تھی۔ وہ ہکوری کی چھال کے ٹکڑے باندھ کر اپنے لنگر کے لئے رسے بنا لیا کرتا تھا۔ ایک بوڑھے کمہار نے جو انقلاب سے پہلے تالاب کے قریب رہا کرتا تھا اُس نے ایک بار کہا تھا "تالاب کی تہہ میں لوہے کا ایک صندوق ہے جسے میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ بعض اوقات یہ صندوق خود بخود بہتا ہوا کنارے تک آجاتا ہے لیکن اگر آپ اس کے پاس جانے کا ارادہ کر لیں تو وہ فوراً گہرے پانی میں جا کر آنکھوں سے اوجھل ہو جائے گا۔" مجھے اُس پرانے شہتیر والی کشتی کی رُوداد سن کر مسرت ہوئی جس نے بالکل ایک انڈین کشتی کی جگہ لے لی تھی لیکن اس کی ساخت خوبصورت تھی۔ یہ کشتی غالباً کنارے کا کوئی درخت تھی۔ جو پانی میں گر گیا تھا اور ایک زمانہ تک تیرتا رہا۔ جھیل کے لئے سب سے درست اور صحیح کشتی وہی پیڑ ہو سکتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ جب پہلی بار میں نے گہرے پانی میں جھانک کر دیکھا تو مجھے بہت بڑے بڑے تنے دھندلے دھندلے سے تہہ میں پڑے ہوئے دکھائی دیئے تھے۔ اُن کو یا تو آندھیوں نے اڑا کر یہاں پہنچایا تھا یا وہ کاٹ کر برف پر اس لئے چھوڑ دیئے گئے تھے کہ اُس زمانے میں لکڑی بہت زیادہ سستی تھی۔ اب یہ سب زیادہ تر غائب ہو چکے ہیں۔

جب میں نے پہلی بار والڈن تالاب میں کشتی چلائی اس زمانہ میں وہ موٹے موٹے اور سادہ پکے صنوبروں اور شاہ بلوط کے جنگلوں سے محصور رہتا تھا۔ اور اس کی بعض کھاڑیوں میں انگور کی بیلوں نے کنارے کے درختوں پر چڑھ کر کنج سے بنا دیئے تھے کشتیوں کو ان میں سے ہو کر گزرنا پڑتا تھا۔ وہ پہاڑیاں جو والڈن تالاب کا ساحل بناتی ہیں اس قدر

عمودی تھیں وہاں پر اُگے ہوئے درخت اتنے بلند تھے کہ اگر آپ مغربی حصے سے اُن پر نگاہ ڈالتے تو وہ آپ کو ایک ایسی تماشہ گاہ معلوم ہوتے جن میں جنگل کے کھیلوں کا مظاہرہ کیا جا رہا ہو۔ جب میں ذرا نسبتاً جوان تھا میں نے اس طرح گھنٹوں صرف کئے کہ گرمیوں کی صبح کو اپنی کشتی کھے کر جھیل بیچ لے جاتا تھا پھر اسے اس طرح چھوڑ دیتا تھا کہ ہوا اُسے جہاں چاہے لے جائے۔ میں چت لیٹ جاتا تھا اور آنکھ بند کئے ہوئے اپنے خیالات میں غرق رہتا تھا یہاں تک کہ کشتی کنارے کی ریت سے جا ٹکراتی اور میں اُٹھ کر دیکھتا کہ مجھے قسمت کس کنارے پر لے آئی ہے یہ وہ دن تھے جب کاہلی سب سے زیادہ خوشگوار اور مفید مشقت تھی۔ میں اکثر صبح کو دن کا سب سے قیمتی حصہ اس طرح صرف کرنے کے لئے چپکے سے نکل جایا کرتا تھا کیونکہ میں دولت مند تھا اور یہ دولت روپے پیسے پر مشتمل ہونے کی بجائے دھوپ سے چمکتے اوقات اور موسم گرما کے ایام پر مشتمل تھی۔ میں اس دولت کو جی کھول کر صرف کرتا تھا اور مجھے اس کا ذرا بھر بھی افسوس نہیں ہے کہ میں نے زیادہ تر حصہ ورکشاپ یا مدرس کی میز پر بیٹھ کر کیوں ضائع نہ کیا۔ لیکن جب میں اُن کناروں سے چلا آیا۔ تو لکڑہاروں نے ان کو مزید ویران بنا دیا اور اب کئی برس تک جنگل کے درختوں میں ٹہلنا اور کھلی جگہوں سے پانی کا نظارہ کرنا ممکن نہیں۔ اب اگر میرا تخیل ختم ہو گیا ہے تو مجھے معاف کر دیا جائے۔ جب پرندوں کے کنج کاٹ کر پھینک دیئے جائیں تو آپ یہ توقع کیونکر کر سکتے ہیں کہ وہ گاتے بھی رہیں گے۔

اب تالاب کی تہہ میں پڑے ہوئے درختوں کے تنے اور پرانے شہتیروں کی کشتی اور ارد گرد کے تاریک جنگل غائب ہو چکے ہیں اور گاؤں کے لوگ جن کو شاید یہ بھی معلوم نہ ہو کہ تالاب کہاں واقع ہے وہاں نہانے یا پانی پینے کی بجائے یہ سوچ رہے ہیں کہ اس پانی کو پائپ کے ذریعے گاؤں میں لے آئیں جو گنگا کی طرح مقدس ہو گا اور اس سے اپنے برتنوں کو دھو سکیں۔ گاؤں والے یہ چاہتے ہیں کہ ٹونٹی گھما کر یا ڈاٹ ہٹا کر والڈن کا پانی حاصل کر لیں۔

اس شیطانی لوہے کے گھوڑے کی جس کی کان کے پردے پھاڑ دینے والی ہنہناہٹ گاؤں بھر میں سنائی دیتی ہے ۔ جو اٹیلنگ چشمہ کو اپنے کھروں سے گدلا بنا دیا ہے۔ اس نے والڈن کے کنارے کے سارے جنگلوں کو چر لیا ہے۔ یہ ٹرائے کا گھوڑا ہے جس کے پیٹ میں ہزاروں گھوڑے تھے اور جسے یونان کے کرائے کے سپاہیوں نے استعمال کیا تھا۔ اس ملک کا پہلوان مور ہال کا مور کہاں ہے کہ اس سے جاکر ڈیپ کٹ میں مقابلہ کرے اور اس کو ذلیل دبائی کیڑے کی پسلیوں میں انتقام پرست تلوار بھونک دے۔

بہرکیف جتنی شخصیتوں سے میں آشنا ہوں ان سب میں غالباً والڈن سب سے بہتر اور بہترین انداز میں اپنی پاکیزگی برقرار رکھے ہوئے ہے۔ بہت سے آدمیوں کو اس سے تشبیہ دی گئی ہے لیکن قابلِ احترام صرف چند ہی ہیں۔ اگرچہ لکڑہاروں نے پہلے اس کنارے کو برہنہ کیا اور پھر دوسرے کو اور آئرستانیوں نے اس کے قریب اپنے سؤر خانے بنا لئے ہیں اور ریل کی پٹری نے دستی اس کی سرحدوں میں گھس آئی ہے۔ اور برف والے اسے ایک بار بلو بھی چکے ہیں۔ پھر بھی اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی ہے۔ اس کا پانی اب بھی وہی ہے جیسا میں نے جوانی میں دیکھا تھا۔ اگر کوئی تبدیلی آئی ہے تو مجھ میں آئی ہے۔ اتنی سلوٹیں پڑ جانے کے باوجود اس کے ماتھے پر ایک مستقل شکن نہیں پڑی ہے۔ یہ سدا جوان رہتا ہے آج بھی ماضی کی طرح میں وہاں تھم کر ایک ابابیل کو بظاہر کوئی کیڑا پکڑنے کے لئے سطح کی طرف غوطہ لگاتے دیکھ سکتا ہوں۔ اور آج رات مجھے پھر اچانک خیال آیا۔ جیسے میں اسکو بیس برس سے روزانہ نہیں دیکھتا ہوں ۔ ارے یہ کیا ۔ یہ تو والڈن ہے وہی جنگلوں سے گھری ہوئی جھیل جسے میں نے اتنے برس پہلے ڈھونڈ نکالا تھا ۔ جہاں گذشتہ موسم سرما میں ایک جنگل کاٹا گیا تھا مگر اس جوشِ نو سے اب وہاں دوسرا جنگل اُبھر رہا ہے۔ اس کی سطح پر اب بھی وہی خیالات اُبھر رہے ہیں۔ جو اس وقت اُبھرا کرتے تھے۔ یہ اب بھی اپنے اور اپنے خالق کے لئے ویسی ہی مسرت اور ویسی ہی انبساط رکھتا ہے ۔ اور شائد میرے لئے بھی ۔ یقیناً یہ ایک بہادر

آدمی کا کارنامہ ہے جس میں کوئی چالاکی نہیں تھی ۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے پانی کھینچا اُسے گہرا بنایا اور اپنے خیال کے مطابق صاف کیا۔ اور اپنی وصیت کی رُو سے کنکارڈ کو دے گیا ۔ اس کے چہرے سے میں صاف اندازہ لگا سکتا ہوں کہ اس کے دل میں بھی ایسے ہی خیالات پیدا ہو رہے ہیں۔ اور میں قریب قریب کہہ سکتا ہوں "کیا تم ہی والڈن ہو ؟"

"یہ میرا کوئی خواب نہیں ہے
کہ میں کوئی مرصّع مصرع کہہ دوں ۔لیکن
میں کہہ سکتا ہوں کہ والڈن کے کنارے پر
قیام کئے بغیر میں خدا اور جنّت سے زیادہ
نزدیک نہیں ہو سکتا ۔
میں اس کا پتھریلا ساحل ہوں ،
اور وہ ہوا ہوں جو اس کے اوپر سے گزرتی ہے
میری ہتھیلی میں
اس کا پانی ہے اور اس کی ریت ہے
اور میرے ذہن میں اس کی
عمیق ترین گہرائی بسی ہوئی ہے ۔"

ریل گاڑیاں اس کو دیکھنے کے لئے نہیں رُکتی ہیں ۔ اس کے باوجود میرا خیال ہے کہ انجنیئر، فائرمین اور گارڈ اور مسافر جن کے پاس موسمی ٹکٹ ہیں اور اسے اکثر دیکھتے رہتے ہیں وہ محض والڈن کو دیکھنے سے بہتر انسان بن گئے ہیں۔ رات کو انجنیئر یہ نہیں بھولتا یا شاید اس کی فطرت نہیں بھولتی ہے کہ اس نے دن بھر میں کم سے کم ایک بار پاکیزگی اور نفاست کا جلوہ دیکھ لیا ہے ۔ چاہے ایک بار ہی کیوں نہ دیکھا جائے یہ اسٹیٹ اسٹریٹ اور انجن کی کالک دھونے میں مدد دیتا ہے ۔ یہ خیال ظاہر کرنے کو جی چاہتا ہے کہ اسے "خدا کا قطرہ" کہا جائے۔

میں بتا چکا ہوں کہ والڈن میں پانی کی آمد اور پانی کے اخراج کا بظاہر کوئی راستہ نظر نہیں آتا ہے لیکن ایک طرف تو یہ فلنٹ تالاب سے قُرب کا اور بالواسطہ رشتہ رکھتا ہے جو زیادہ بلندی پر واقع ہے۔ اور اس سے چھوٹے چھوٹے تالابوں کا ایک سلسلہ والڈن کی طرف آتا ہے اور دوسری طرف والڈن تالاب بلاواسطہ طور پر اور صاف صاف کنکارڈ دریا سے رشتہ رکھتا ہے۔ اس طرف بھی ایسے ہی تالابوں کا سلسلہ ہے جن میں اس سے پہلے کسی اور ارضیاتی زمانہ میں اس کا پانی بہہ کر جاتا رہا ہوگا۔ اور اگر اُسے تھوڑا سا کھود دیا جائے تو پھر اس میں سے بہہ کر جا سکتا ہے۔ اگر اتنی طویل مدت تک ایک راہب کی طرح جنگل میں الگ تھلگ رہنے اور پرہیزگاری کی زندگی بسر کرنے سے اس کے پانی میں عجیب و غریب پاکیزگی آگئی ہے تو فلنٹ تالاب کا مقابلتہً غلیظ پانی اس میں مل جانے پر اس کا میٹھا پانی سمندر کی لہروں میں مل کر ضائع ہو جائے گا۔ بھلا اس پر کس کو دکھ نہیں ہوگا؟

لنکن میں فلنٹ یا سینڈی تالاب جو ہماری سب سے بڑی جھیل ہے اندرونی سمندر ہے۔ والڈن سے تقریباً ایک میل مشرق میں واقع ہے۔ وہ جھیل والڈن سے بہت بڑی ہے۔ اُس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایک سو ستانوے ایکڑ میں پھیلی ہوئی ہے، اور اس میں مچھلیاں بہت ہیں۔ لیکن وہ والڈن کے مقابلہ میں زیادہ پایاب ہے اور پانی زیادہ صاف نہیں ہے۔ میں اکثر جنگل سے گزر کر وہاں تفریح کی غرض سے جایا کرتا تھا اپنے گالوں کو آزاد ہوا کا چھوتے ہوئے محسوس کرنا، موجوں کے بہاؤ کا نظارہ کرنا اور ملاحوں کی زندگی کی یاد تازہ کرنا وقت کو صحیح طور پر استعمال کرنے کے مترادف تھا۔ خزاں کے اُن دنوں میں جب تیز ہوائیں چلتی تھیں میں وہاں جوز کھانے کے لئے نکل جایا کرتا تھا۔ جوز پانی میں گرا کرتے اور پانی انہیں بہا کر میرے قدموں تک لے آتا۔ ایک دن جب میں اُس کے سیوان سے ڈھکے ہوئے کنارے پر دھیرے دھیرے چل رہا تھا اور جھیل کے تازہ پانی کے چھینٹے میرے منہ پر پڑ رہے تھے۔ میں نے ایک گلی اور بوسیدہ کشتی دیکھی جس کے دونوں پہلو غائب تھے۔ اور بمشکل پیندے کا

کوئی نشان باقی رہ گیا تھا مگر اسکی وضع قطع ابھی تک نمایاں تھی۔ وہ ایک ایسی بوسیدہ ٹوکری سے ملتی جلتی تھی جس کی تیلیاں باہر نکل آئی ہوں۔ یہ شکستہ اور بوسیدہ کشتی بہت ہی پراسرار تھی۔ سمندر کے کنارے جہازوں کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کی طرح۔ اس کے نظارے سے ایک اچھا سبق بھی حاصل ہوتا تھا۔ وہ گل کر کنارے کا ایک جزو بن گئی تھی۔ اس میں سینٹھا بھی نکل آیا تھا۔ اس تالاب کے شمالی ساحل پر ریتلی تہ میں لہروں کے جو نشانات پڑ جاتے تھے وہ مجھے بہت ہی بھلے معلوم ہوتے تھے۔ یہ ریت پانی کے دباؤ سے اتنی ٹھوس ہو گئی تھی کہ تالاب میں اترنے والے شخص کے پاؤں اس میں نہیں دھنستے تھے اور نشانوں کے ساتھ ساتھ لگے ہوئے سینٹھے کے پودے (ایک کے پیچھے ایک) لہراتی ہوئی قطاروں میں یوں اُگ آئے تھے کہ جیسے موجوں ہی نے ان کو اُگایا ہو۔ میں نے وہیں بھاری تعداد میں عجیب قسم کے آدھے انچ سے لے کر چار انچ کے قطروں والے بالکل گول گول گیندیں پائیں جو بظاہر بہت ہی عمدہ گھاس یا سرکنڈوں کی جڑ سے بن جاتی تھیں۔ موجیں ان کو پایاب پانی کی ریتلی تہوں میں لڑھکاتی رہتی تھیں۔ اور کبھی کبھی کنارے پر اچھال کر پھینک دیتی تھیں۔ وہ یا تو خالص گھاس کی ہوتی تھیں یا ان کے بیچ میں تھوڑی سی ریت ہوتی تھی۔ آپ پہلی نگاہ میں تو شاید یہ سمجھ لیں گے کہ یہ پتھر کے ڈلوں کی طرح موجوں کے تھپیڑوں سے گول ہو گئی ہیں لیکن ان میں سے چھوٹی چھوٹی گیندیں بھی ویسے ہی آدھ انچ لمبے لمبے ریشوں کی ہوتی ہیں اور وہ ایک خاص موسم میں بنتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ مسالہ پہلے ہی تیار اور ٹھوس ہو چکا ہوتا ہے اور موجیں اس کو بنانے کی بجائے صرف گھس دیتی ہیں۔ جب یہ گیندیں سوکھ جاتی ہیں تو ان کی صورت ایک غیر معین عرصہ تک قائم رہتی ہے۔

فلنٹ کا تالاب ــــ یہ ہے ہمارے نام رکھنے کی صلاحیت کا افلاس! اس غلیظ اور احمق کسان کو جس کا کھیت اس آسمانی پانی سے ملحق ہے۔ اور جس نے

اس کے ساحل کو بڑی سنگدلی سے برہنہ کر دیا ہے اس کا کیا حق ہے کہ وہ اسے کوئی نام عطا کرے؟ وہ کنجوس مکھی چوس جو اس تالاب کے پانی سے زیادہ ایک ڈالر کی منعکس سطح میں یا ایک چمکیلے سینٹ میں اپنا جھلسا ہوا چہرہ دیکھنا پسند کرتا تھا اور جو ان جنگلی ہنسوں کو جو اس تالاب میں رہا کرتے تھے رخنہ اندازی کرنے والے سمجھا کرتا تھا اور جس کی انگلیاں پیسے کو سختی کے ساتھ پکڑنے کی عادت سے چڑیلوں کی طرح ٹیڑھی اُمڑی تڑی اور بڑے بڑے ناخنوں والی ہو گئی تھیں میرے لئے اس کا کوئی نام ہی نہیں ہے میں وہاں اسے ملنے یا اس کی باتیں سننے کے لئے نہیں جاتا ہوں جس نے تالاب کو کبھی دیکھا نہیں اور جو کبھی اس میں نہایا نہیں ، جس نے کبھی اس سے محبت نہیں کی ، جس نے اس کی کبھی حفاظت نہیں کی ، جس نے کبھی اس کی تعریف نہیں کی اور نہ کبھی اس خدا کا شکریہ بجا لایا جس نے اس کو جنم دیا - کیا ہی اچھا ہوتا اگر اس کا نام ان مچھلیوں کے ناموں پہ رکھا گیا ہوتا جو اس میں تیرتی ہیں ، ان جنگلی پرندوں اور چوپایوں کے ناموں پہ رکھا گیا ہوتا جو وہاں گھومتے رہتے ہیں ، ان جنگلی پھولوں کے ناموں پہ رکھا گیا ہوتا جو اس کے کنارے پہ اُگتے ہیں یا کسی ایسے جنگلی آدمی یا بچے کے نام پہ رکھا گیا ہوتا جس کی تاریخ جھیل کی تاریخ میں شامل ہوئی ہے ۔ اس شخص کو اسے نام نہیں دینا چاہیئے تھا جس کو اس کے سوا اور کوئی حق نہیں ہے کہ اس کے پاس اس جیسی ذہنیت کے پڑوسی یا قانون ساز مجلس کی دی ہوئی کوئی قانونی دستاویز ہے یعنی اس شخص کو اسے نام دینے کا کوئی حق نہیں تھا جو روپوں میں اس کی قیمت لگاتا ہے ۔ جس کی موجودگی سے سارا ساحل مقہور بن گیا ہے ۔ جس نے اس کے ارد گرد واقع سارا زمین ختم کر دی ہے ۔ جس کو اس بات کی خوشی ہے کہ اس نے اس کا سارا پانی بھی ختم کر دیا ہے ۔ جسے یہ دکھ ہے کہ فلنٹ تالاب پانی کی بجائے انگریزی گھاس یا ککروندوں کا گیا سحقان کیوں نہ ہوا ۔ جس کی نظر میں اس کی کوئی وقعت نہیں ہے جس نے اس کی تہہ میں پڑے ہوئے کیچڑ کی خاطر اسے خالی کر کے بیچ دیا ہوتا ۔ یہ تالاب اس کی چکی نہیں چلاتا تھا ۔ اس لئے اس کا نظارہ کرنے میں کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا تھا ۔ میں اس کسان کی مشقت کی عزت نہیں کرتا اور نہ اس کے کھیت کی جس میں ہر چیز کی کوئی نہ کوئی قیمت ہے جو اتنی

منظر کو اور جو اپنے خدا کو اٹھا کر منڈی لے جائے گا اگر اس کو اس کے دام مل سکیں۔ جن کے کھیت میں کوئی چیز مفت نہیں ہوتی۔ جس کے کھیتوں میں فصل، جس کی چراگاہوں میں پھول اور جن کے پیڑوں میں پھل نہیں بلکہ ڈالر اُگتے ہیں جو اپنے پھلوں کی خوبصورتی کو عزیز نہیں رکھتا۔ اور جن کے پھل اُس کے لئے اس وقت نہیں پکتے جبتک وہ ڈالروں میں تبدیل نہیں ہو جاتے۔ مجھے آپ وہ افلاس دیدیجئے جو سچی دولت سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ کسان میرے لئے اسی تناسب سے قابلِ احترام اور دلچسپ ہیں جس تناسب سے وہ غریب ہیں۔ ایک مثالی کھیت۔ جہاں کسان کا مکان کوڑے کرکٹ کے ڈھیر میں اُگے کُکر متے کی طرح ہوتا ہے اور جہاں آدمیوں، گھوڑوں بیلوں اور سوروں کے لئے صاف اور ناصاف کمرے ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے سے ملے ہوئے۔ آدمیوں سے بھرا ہُوا چکناہٹ کا بہت بڑا پیالہ جس میں سے کھاد اور مکھن ملے دودھ کی بو آرہی ہوتی ہے۔ پوری طرح کاشت کیا ہُوا کھیت جس میں آدمیوں کے دل و دماغ کی کھاد ڈالی جاتی ہے۔ بالکل ایسا ہی جس میں آپ کلیسا کے احاطے میں آلو پیدا کرتے ہیں۔ مثالی کھیت ایسا ہوتا ہے۔

نہیں۔ نہیں۔ اگر ارضی منظر کے دلآویز خدوخال کا نام آدمیوں کے نام پر ہی رکھنا مقصود ہے تو صرف پاکباز اور ذہین لوگوں کے نام رکھئے۔ ہماری جھیلوں کو کم سے کم اکارین ہمنڈ جیسے سچے نام ملنے چاہئیں جہاں ابھی تک ساحل "پُر شجاعت کارناموں سے گونج رہا ہے۔

گونہ تالاب جو کسی حد تک چھوٹا تھا فلنٹ تالاب تک جانے میں میرے راستہ ہی میں پڑتا تھا۔ فیر ہیون کنکارڈ دریا کے توسیعی حصّہ ہے اور کہا جاتا ہے کہ تقریباً ۷۰ ایکڑ زمین پر مشتمل ہے اور جنوب مغرب میں ایک میل کے فاصلہ پر واقع ہے اور وائٹ تالاب جو ۴۰ ایکڑ زمین پر مشتمل ہے۔ فیر ہیون سے ڈیڑھ میل دُور ہے۔ یہ میرا جھیلوں والا دیش ہے۔ ان جھیلوں پر کنکارڈ دریا سمیت میرا خاص حق ہے۔ مَیں دن رات سال بہ سال جو کچھ اُن کے پاس لے جاتا ہوں وہ اسے پیس کر رکھ دیتی ہیں۔

چونکہ لکڑ ہاروں، ریل کی پٹڑیوں اور خود میں لے جا لڈن تالاب کو غلیظ کر دیا ہے اس لیے غالباً ہماری سب جھیلوں میں سب سے دلکش (اگرچہ وہ خوبصورت نہیں ہے) جنگل کا موتی وائٹ تالاب ہے۔ یہ نام بھی اپنی عمومیت کی وجہ سے بہت ہی بے بضاعت ہے۔ خواہ یہ نام اسے اس کے پانی کی حیرت انگیز پاکیزگی یا اس کی ریت کے رنگ کی وجہ سے دیا گیا ہے۔ اِن باتوں کے اعتبار سے اور دیگر معاملات میں یہ تالاب والڈن کا چھوٹا جڑواں بھائی ہے۔ ان دونوں میں اتنی مماثلت ہے کہ آپ کہیں گے کہ زمین کے نیچے دونوں آپس میں ضرور وابستہ ہوں گے۔ اس کا ساحل بھی ویسا ہی پتھریلا ہے اور اس کا پانی ویسا ہی رنگ رکھتا ہے جس دن گرمی اور اُمس ہو اُس دن آپ والڈن کی طرح جنگل سے اُس کی اُن چند خلیجوں پر نظر ڈالیے جو اتنی پایاب ہیں کہ تہہ کا رنگ ان میں سے جھلکتا ہے تو آپ دیکھیں گے کہ اس کا پانی دھندلا آسمانی سبز یا مٹیالا رہا ہے۔ اب سے کئی برس پہلے میں ریگ مال کا کاغذ بنانے کے لئے چھکڑے میں ریت بھر کر لایا کرتا تھا جب سے اب تک میں وہاں برابر جا رہا ہوں۔ جو شخص وہاں لگاتار جاتا ہے وہ اسے ویرڈ جھیل (سبز جھیل) کہہ کر پکارنا چاہے گا۔ غالباً اسے ییلو پائن لیک (زرد صنوبر کی جھیل)، مندرجہ ذیل واقعہ کے باعث کہا جاتا ہے۔ آج سے پندرہ برس پہلے کنارے سے کئی جریب کے فاصلہ پر آپ جھیل کی سطح سے سیاہ صنوبر کا سرا نکلا ہوا دیکھ سکتے تھے۔ یہ صنوبر اس قسم کا تھا جسے زرد صنوبر کہا جاتا تھا گو یہ کسی واضح قسم کا نہیں ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ تالاب زمین کے اندر دھنس گیا تھا اور یہ وہی قدیم جنگل ہے جو پہلے وہاں موجود تھا۔ میسے چیوسٹس کی تاریخی سوسائٹی کے ذخیرۂ کتب میں ۱۷۹۲ء میں ایک کتاب ہے جسے وہاں کے ایک شہری نے کنکارڈ قصبہ کا جغرافیائی تذکرہ" کے نام سے لکھا ہے۔ اس کا مصنف والڈن اور وائٹ تالاب کا اتنے دنوں پہلے ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے "جب پانی بہت ہو جاتا ہے تو موخر الذکر تالاب کے بیچ میں ایک درخت یوں دکھائی دیتا ہے جیسے وہیں نکلا ہو۔ اس کی جڑیں پچاس فٹ گہرے پانی میں چلی گئی ہیں۔ اس درخت کا چھتنارہ ٹوٹ

گیا ہے ۔ اور اُس جگہ اس کا قطر ۱۴ انچ لکھا ہے ؛ میں نے ۱۸۴۹ء کے موسم بہار میں ایک شخص
سے بات چیت کی جو سڈبری تالاب کے قریب رہتا تھا ۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس نے دس یا
پندرہ برس ہوئے اس درخت کو تالاب سے باہر نکالا تھا ۔ جہاں تک اُسے یاد آسکتا تھا
اُس نے بتایا کہ وہ درخت کنارے سے بارہ یا پندرہ جریب دُور تھا جہاں پانی تیس
یا چالیس فٹ گہرا تھا ۔ یہ موسم سرما کی بات تھی اور وہ صبح کو برف نکال رہا تھا کہ اس نے
تہیہ کیا کہ وہ اپنے پڑوسیوں کی مدد سے اس صنوبر کو سہ پہر کے وقت نکال لائے
گا ۔ اس نے برف کے اندر اپنے آرے سے ایک نہر سی نکالی اور اس درخت کو اسی راستے
سے بیلوں کے ذریعہ کھنچوا کر برف پر لے آیا لیکن اُس نے اس کام میں زیادہ وقت صرف
نہیں کیا تھا ۔ اسے یہ دیکھ بہت تعجب ہوا کہ وہ درخت پانی میں الٹا کھڑا تھا ۔ اس کی شاخوں کے
ٹھنٹھ پانی کے اندر تھے اور اُس کا پتلا چھتنار ریتلی تہہ میں گڑھا ہوا تھا ۔ اس درخت کے
بڑے سرے پر اس کا قطر تقریباً ایک فٹ تھا اور اسے یہ توقع تھی کہ اُسے چیرنے کے لئے
ایک اچھا شہتیر مل جائے گا ۔ لیکن وہ اتنا گلا ہوا تھا کہ صرف ایندھن کے کام آسکتا تھا ۔
ویسے یہ بات بھی ذرا مشکوک تھی کیونکہ اس کے شیڈ میں اس درخت کے ٹکڑے ابھی تک پڑے
ہوئے تھے ۔ اس کے تنے کے نچلے حصے پر کلہاڑی اور بسولے کے نشان ابھی تک موجود تھے
اُس نے خیال کیا تھا کہ وہ کنارے پر ایک مردہ درخت تھا جسے آندھی اڑا کر تالاب کے
اندر لے گئی تھی اور جب اس کا چھتنار پانی میں ڈوب کر بھاری ہو گیا اور اس کا نچلا حصّہ
خشک اور ہلکا رہا تو وہ لڑھک کر ذرا باہر نکلا ۔ اور الٹا ہو کر پانی میں ڈوب گیا ۔ اس شخص کے
باپ کو جس کی عمر اسی برس کی تھی ایسا زمانہ یاد نہ تھا جب یہ درخت وہاں موجود نہ تھا ۔ آج
بھی بڑے بڑے شہتیر تالاب کی تہہ میں پڑے ہوئے دکھائی دیتے ہیں ۔ سطح پر تموج کی وجہ
سے وہ پانی میں رینگتے ہوئے سانپ معلوم ہوتے ہیں ۔ اس تالاب کو شاذ ہی کسی کشتی نے غلیظ
کیا تھا کیونکہ اس میں ماہی گیری کی دلچسپی کی چیزیں بہت ہی کم تعداد میں تھیں ۔ سفید سوسن

کی جگہ جس کے لئے کیچڑ ضروری ہے یا عام شیریں فینگ کی جگہ نیلا فینگ خالص پانی میں تھوڑا بہت ہوتا ہے۔ یہ پھول پتھریلی تہہ سے نکل کر سارے ساحل پر پھیل جاتا ہے اور جون میں اس پر بھونروں کی طرح گنگنانے والے پرندے آکر بیٹھتے ہیں۔ اس کی نیلی پتیوں اور اس کے پھولوں کا رنگ اور خاص طور پر ان کا عکس مٹیالے پانی سے مل کر ایک بے مثال ہم رنگی پیدا کرتے ہیں۔

وائٹ تالاب اور والڈن تالاب سطح زمین پر بڑے بڑے دو بلور ہیں۔ روشنی کی جھیلیں۔ اگر وہ مستقل طور پر منجمد ہو جاتے اور اتنے چھوٹے ہو جاتے کہ ہاتھ میں پکڑے جا سکتے تو غالباً غلام انہیں قیمتی پتھروں کی طرح اٹھالے جاتے تاکہ اپنے شہنشاہوں کے سروں کو ان سے آراستہ کر سکیں۔ لیکن چونکہ وہ سیال ہوتے ہیں اور بکثرت پائے جاتے ہیں اور ہمارے وارثوں کو ہمیشہ کے لئے مل چکے ہیں اس لئے ہم ان کی ذرا کبھی پروا نہیں کرتے اور "کوہ نور" ہیرے کے پیچھے دوڑتے ہیں۔ وہ اتنے صاف ہیں کہ منڈی میں ان کی کوئی قیمت نہیں لگائی جا سکتی۔ ان میں کسی قسم کی ملاوٹ نہیں ہے وہ ہماری زندگیوں سے زیادہ حسین و جمیل اور ہمارے کرداروں سے زیادہ شفاف ہیں ہم نے کبھی ان سے کوئی کمینگی نہیں سیکھی۔ کسان کے دروازے کے سامنے جو جوہڑ ہے اور جس میں اس کے ہنس تیرتے رہتے ہیں وہ اس سے بھی زیادہ صاف ستھرے ہیں۔ یہاں صاف ستھری جنگلی بطخیں آتی ہیں۔ قدرت کے پاس کوئی ایسا مکین نہیں ہے جو اس کی ہمسر ہو، کلغی دار پرندے اور ان کے نغمے پھولوں سے ہم آہنگ ہیں لیکن کونسا ایسا نوجوان ہے اور کونسی ایسی دوشیزہ ہے جو قدرت کے بافراط جنگلی حسن سے اپنا دل لگا سکے۔ وہ جن قصبوں میں رہتے ہیں ان سے قدرت دور ہو، تنہا کھلتی پھولتی ہے۔ تو جنت کی باتیں کرتا ہے لیکن تو زمین کے لئے بھی باعث ننگ ہے۔

بیکر فارم

میں بعض اوقات گھومتا ہوا صنوبر کے جھنڈوں میں جا نکلتا تھا جو مندروں یا سمندر میں کھلے بادبانوں والے جہازوں کے بیڑوں کی طرح ایستادہ ہوتے تھے۔ ان کی شاخیں لرزرہی ہوتیں اور روشنی میں جھلملا رہی ہوتی تھیں۔ وہ اتنے نرم اور سرسبز اور سایہ دار تھے کہ ڈروئڈوں نے ان کے نیچے عبادت کرنے کے لئے اپنے شاہ بلوط کے پیڑوں کو چھوڑ دیا ہوتا۔ یا میں فلنٹ تالاب سے دور چیڑ کے پیڑوں کے جنگلوں میں چلا جایا کرتا تھا۔ یہ درخت جو نیلی کونپلوں کی بیلوں سے ڈھکے ہوئے ہیں علند سے بلند تر ہوتے چلے گئے ہیں اور والہالا (سکینڈے نیویا کے دیوتاؤں کا محل) کا مقابلہ کرنے کے لئے موزوں ہیں اور جونیپر کی رینگتی ہوئی سدا بہار بیل زمین کے پھلوں کو ہاروں سے ڈھک دیتی ہے۔ یا میں ان دلدلوں کی طرف نکل جاتا تھا۔ جہاں سفید صنوبر کے درختوں سے کائی مالا بن کر لٹکی ہوتی ہے۔ اور سانپ کی چھتریاں یعنی دلدل کے دیوتاؤں کی گول میزیں زمین پر چھائی ہوتی ہیں اور زیادہ خوبصورت بیلیں کھنٹھوں کو آراستہ کرتی ہیں تتلیوں یا سیپیوں اور نباتاتی گھونگوں کی طرح۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں دلدلی گل نفل اور چیپ چیپی نکلتے ہیں۔ جہاں بیدوں کے سرخ پھل بھوتوں کی آنکھوں کی طرح چمکتے ہیں۔ جہاں ویکس ورک سخت سے سخت لکڑی کو اپنے آغوش میں بھینچ کر رکھ دیتی ہے اور جہاں سدا بہار

سُرخ پھولوں والی جنگلی جھاڑی اپنی دلآویزی سے نظارہ کا دل ایسا موہ لیتی ہے کہ وہ اپنا گھر بھول جاتا ہے اور اس کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا ہو جاتی ہے۔ اُسے نہ جانے کتنے "شجر ممنوعہ" جو اتنے دلکش ہیں کہ آدمی ان کو چکھنے کی کبھی جرأت نہیں کر سکتا اپنی طرف بلاتے ہیں۔ میں کسی دانشور سے ملنے کی بجائے ان خاص خاص درختوں کو دیکھنے کے لئے چلا جاتا ہوں جو اس گرد و نواح میں بہت کم پائے جاتے ہیں۔ یہ کسی چراگاہ کے بیچ میں کافی فاصلے پر یا جنگل یا دلدل یا کسی پہاڑ پر ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض پیڑ سیاہ بید تھے جن کے دو دو فٹ موٹے قطر والے نمونے بہار سے راں موجود تھے۔ اس کے چچیرے بھائی زرد بید بھی ڈھیلی ڈھالی سنہری قبا پہنے درختوں کی طرح معطر معطر کھڑے ہیں۔ السن کا درخت بھی تھا۔ اس کے چکنے پتے پر کائی نے نہایت ہی خوشنما گلکاریاں کر رکھی تھیں اور اسکے ہر لبے کو نقش بنا دیا تھا۔ اس قسم کے درخت خال خال تھے۔ میں ان کے صرف ایک ہی کافی بڑے جھنڈ کو جانتا ہوں۔ جو قصبے میں رہ گیا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ درخت ان کبوتروں کی بیٹ سے آگے ہیں جنہوں نے کسی نزدیکی جنگل میں السن کے پھل کھائے تھے۔ جب آپ اسکی لکڑی چیرتے ہیں تو اس میں نقرئی ریشوں کو چمکتا ہوا دیکھ کر ساری محنت وصول ہو جاتی ہے۔ لیموں اور ہارن بیم کے پیڑ بھی ہیں۔ ایک درخت بلوط جیسے چند معتمل نما بڑے صنوبر ہیں۔ ایک درخت ایسا ہے جو عام تختے جیسا معلوم ہوتا ہے اس سے زیادہ مکمل ہیملوک درخت ہے جو اس جنگل میں پودھوں کے مٹھ کی طرح کھڑا ہے ایسے بھی بہت سے درخت ہیں جن کے ذکر کا کوئی فائدہ نہیں۔ موسم سرما ہو کہ موسم گرما میں ان عبادت گاہوں کی زیارت کے لئے ضرور جایا کرتا تھا۔

ایک دفعہ ایسا اتفاق ہوا کہ میں دھنک کی محراب کے نیچے جو فضا کی کھلی سطح پر پھیلی ہوئی تھی کھڑا تھا۔ اس دھنک نے چاروں طرف کی گھاس اور پتیوں کو مختلف اقسام کے رنگوں میں ڈبو دیا تھا۔ اور میری آنکھوں میں ایسی چکا چوند پیدا ہوتی جیسے میں کسی رنگین بلور

میں سے جھانک رہا ہوں۔ ایسا دکھائی دیتا تھا جیسے سات رنگوں والی یہ دھنک روشنی کی ایک جھیل ہے اور میں اُس میں ایک ڈالفن رنگ بدلنے والی مچھلی، مچھلی ہوں اگر یہ روشنی ذرا پائیدار ثابت ہوتی تو اس نے میرے مشاغل اور میری زندگی کو کئی رنگ عطا کر دیئے ہوتے ریل کی پٹڑی والے راستے پر چلتے ہوئے مجھے اپنے سایہ کے اندر ایک ہالہ سا دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی ہے۔ اور میں خوشی خوشی یہ سوچنے کے لئے تیار ہو گیا کہ میرا شمار بھی ارفع و اعلیٰ اور منتخب ہستیوں میں ہونے لگا ہے۔ ایک شخص نے جو مجھ سے ملنے کے لئے آیا کرتا تھا بتایا کہ اس سے پہلے جو آئرستانی یہاں آئے تھے ان کے سایوں کے گرد کوئی ہالہ نہیں ہوا کرتا تھا اور یہ اعزاز صرف اس ملک کے باشندوں ہی کو نصیب ہوتا ہے۔

بین وینٹو سیلینی نے اپنے یادداشت ناموں میں یہ لکھا ہے کہ سینٹ اینجلو کے قلعہ میں جب وہ قید تھا تو اس نے ایک بھیانک خواب دیکھا جس کے بعد سے صبح وشام اس کے سر کے سایہ کے گرد روشنی کا ایک حلقہ رہنے لگا۔ خواہ وہ فرانس میں تھا یا اٹلی میں یہ حلقہ اس وقت زیادہ روشن ہو جاتا تھا جب گھاس اوس سے بھیگی ہوئی ہوتی تھی غالباً یہ بھی اسی طرح کا معاملہ ہے جس کا میں نے ذکر کیا ہے۔ یہ ہالہ اگرچہ دوسرے اوقات میں یا چاندنی رات میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ لیکن صبح کو خاص طور سے زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ روشنی مسلسل موجود رہتی ہے۔ لیکن عام طور سے اسکی طرف توجہ نہیں کی جاتی اور سیلینی جیسے شدید تصور رکھنے والے لوگوں کے لئے توہم پرستی کی بنیاد بن جاتی ہے۔ اس کے علاوہ سیلینی ہمیں بتاتا ہے کہ اس نے اپنے سر کے گرد یہ ہالہ بہت کم لوگوں کو دکھایا لیکن کیا وہ لوگ واقعی ممتاز اور نامور نہیں ہیں۔ جو اس بات کا شعور رکھتے ہیں کہ اُن پر امتیازی نگاہ ڈالی جا رہی ہے؟

میں ایک سہ پہر کو ہکلبیریوں کا تذکار کھینچنے کے لئے جنگل میں سے گزر کر فیرہیون گیا تاکہ اپنی ترکاریوں کی کچھ قیمت ادا کر سکوں۔ میرا راستہ پلیزنٹ میڈو میں سے ہو کر جاتا

تھا جو سیکہ کھیت سے ملحقہ تھی۔ یہ چراگاہ وہ کنج عزلت ہے جس کی تعریف میں ایک شاعر نے اپنی نظم کے آخر میں یہ لکھا ہے :-

"ایک سانوتی کھیت سے گذر کر اس میں داخل ہونا پڑتا ہے۔
اس میں ہوا سے لہکتے ہوئے کچھ پھلدار درخت لگے ہوئے ہیں۔
اور ان کے نزدیک ہی ایک چمکتا ہوا چشمہ بہتا ہے۔
جس میں سمور دار مچھلیاں تیرتی ہیں۔
اور پارے کی جھلملاتی ہوئی مچھلیاں اچھلتی اور کودتی ہیں۔"

میں نے والڈن جانے سے پہلے وہاں رہنے کا ارادہ کیا ہے۔ میں نے سیب کے درختوں میں پھندا ڈالا۔ میں نے ندی نالوں کو پار کیا اور میں نے آبی چڑیوں اور ٹڈیوں کو ڈرا کر بھگا دیا۔ یہ ان سہ پہروں میں سے ایک تھی جو بظاہر بہت طویل ہوتی ہیں اور جن میں بہت سے واقعات رونما ہو سکتے ہیں۔ یہ سہ پہر ہماری زندگی کا بہت بڑا حصہ ہوتی ہے۔ جب میں روانہ ہوا تو یہ سہ پہر آدھی گذر چکی تھی۔ راستے میں بوندا باندی ہونے لگی اور میں آدھ گھنٹے کے لئے ایک صنوبر کی گھنی شاخوں کے نیچے اپنا رومال کا سائبان بنا کر پناہ لینے پر مجبور ہو گیا۔ بالآخر جب میں نے پانی میں کمر کمر کھڑے ہو کر پکرل مچھلی والے سرکنڈوں پر سے اپنی بنسی پھینکی تو میں نے دفعتہً دیکھا کہ میں ایک ابر کے سایہ میں کھڑا ہوں۔ اور بادل اس زور سے گرجنے لگے کہ میں ان کی گرج سننے کے سوا اور کوئی کام نہ کر سکا۔ میں نے سوچا کہ دیوتا یقیناً فخر کر رہے ہونگے۔ کہ انہوں نے ایک غریب اور نہتے ماہی گیر کو ان نکیلی بجلیوں سے شکست دے دی ہے۔ میں نے تیزی سے بھاگ کر قریبی جھونپڑی میں پناہ لی۔ یہ جھونپڑی ہر سڑک سے نصف میل کے فاصلہ پر واقع تھی۔ لیکن تالاب کے بہت نزدیک تھی۔ اور ایک مدت سے وہاں کوئی آباد نہیں تھا۔

"یہاں کھلا ، برسوں میں
ایک شاعر نے زرا دیکھئے تو بھی
ایک حقیر سا جھونپڑا تعمیر کیا تھا
جو تیزی سے تباہی کی طرف جا رہا تھا۔"

شاعر نے یہی حکایت بیان کی ہے ۔ لیکن اس کے اندر پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ اس میں اب ایک
آئرستانی جان فیلڈ اپنی بیوی اور اپنے کئی بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ ان میں چوڑے چکلے
چہرے والا وہ لڑکا بھی تھا جو اپنے باپ کو اس کے کام میں مدد دیتا تھا اور اب بارش سے بچ
نکلنے کے لئے دلدل سے بھاگا ہوا جھونپڑی میں آگیا تھا۔ ان میں جھری دار منہ اور مخروطی سر والا
وہ بچہ بھی تھا جو اپنے باپ کے گھٹنے پر یوں بیٹھا تھا جیسے وہ امراء کے ایوانوں میں بیٹھا ہو
اور جو اس بارش اور بھوک کے ماحول میں مجھ اجنبی کو مستفسرانہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا ۔ وہ
یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ جان فیلڈ کا بھوکا بیٹا ہے یا کسی امیر گھرانے کے سلسلۂ نسب کی آخری کڑی
ہے۔ دنیا کی امیدوں کا سہارا اور عالم کا منظورِ نظر ہے۔ ہم سب سمٹ کر چھت کے اس حصے
کے نیچے بیٹھ گئے جو سب سے کم ٹپکتا تھا۔ باہر بارش ہوتی رہی۔ بجلی کڑکتی رہی۔ میں اس
جہاز کے تعمیر ہونے سے بہت پہلے جو اس خاندان کو امریکہ میں لایا تھا۔ اس جھونپڑی میں کئی بار بیٹھ
چکا تھا جب فیلڈ ایک سیدھا سادا ، ایماندار اور محنتی شخص تھا جو ہیرا پھیری نہیں کر سکتا تھا۔
اس کی بیوی بھی بہت حوصلہ مند تھی۔ وہ بہت اونچے چولھے پر برابر کھانا پکاتی رہی تھی
وہ اپنے گول اور چکنے چہرے اور عریاں سینے کے باوجود یہ سوچ رہی تھی کہ ایک دن
اس کی حالت بہتر ہو جائے گی۔ اس کے ہاتھ میں ہمیشہ جھاڑن رہتا تھا لیکن گھر میں
اس کی موجودگی کا کوئی نشان نظر نہیں آرہا تھا۔ مرغی کے بچوں نے بھی بارش سے بھیگ
کر یہیں پناہ لی تھی۔ وہ کمرے میں بڑی آزادی سے گھوم رہے تھے جیسے وہ اس خاندان
کے افراد ہوں ـــــ میرے خیال میں اب ان میں اتنی زیادہ انسانیت آچکی تھی کہ ان کا بھی

طرح بھون کر کھایا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ وہ کھڑے ہو کر میری آنکھوں میں جھانکنے لگتے۔ اور میرے جوتوں پر معنی خیز انداز میں چونکیں مارنے لگتے۔ اس درمیان میں میرے میزبان نے مجھے اپنا افسانہ سنایا۔ وہ ایک پڑوسی کے لئے بڑی جانفشانی سے دلدل کو کھیت میں تبدیل کر رہا تھا۔ دلدل کے ایک قطعہ کو کدال سے کھودنے کے لئے اُسے فی ایکڑ دس ڈالر کی اُجرت ملتی تھی۔ اس کے علاوہ اس کھیت کو وہ ایک برس تک زیرِ کاشت بھی لا سکتا تھا۔ کسان نے اس کے لئے کھاد دینے کا وعدہ بھی کیا ہے۔ اس مشقت میں اس کا چوڑے چکلے چہرے والا بیٹا بھی خوشی خوشی ہاتھ بٹا رہا تھا۔ اور یہ نہیں جانتا تھا کہ اس سودے میں اس کے باپ کو سراسر نقصان ہے۔ میں نے اپنے تجربہ کی بدولت اس کی مدد کرنے کی کوشش کی۔ میں نے اسے بتایا کہ میں اس کا نزدیکی پڑوسی ہوں اور میں جو یہاں مچھلیوں کا شکار کھیلنے آیا تھا اور بظاہر ایک آوارہ گرد معلوم ہوتا ہوں۔ اسی کی طرح روزی پیدا کرتا ہوں۔ میں نے اُسے یہ بھی بتایا کہ میں ایک مضبوط، روشن اور صاف گھر میں رہتا ہوں۔ اور اس مکان کو تعمیر کر لے میں اتنی رقم صرف ہوئی تھی جتنا اس شکستہ جھونپڑے کا سالانہ کرایہ بنتا ہے۔ میں نے اُس سے یہ بھی کہا کہ وہ اگر چاہے تو مہینے دو مہینے میں خود اپنے لئے ایک محل کھڑا سکتا ہے۔ اور میں نے کہا "میں نہ تو چائے پیتا ہوں نہ کافی — نہ دودھ پیتا ہوں نہ مکھن کھاتا ہوں۔ نہ تازہ گوشت۔ اس لئے مجھے ان چیزوں کو حاصل کرنے کے لئے محنت نہیں کرنی پڑتی۔ اور چونکہ میں سخت جسمانی محنت نہیں کر سکتا ہوں۔ اس لئے مجھے زیادہ کھانے کی ضرورت بھی نہیں پڑتی۔ اور مجھے کھانے پر بہت کم رقم صرف کرنی پڑتی ہے۔ آپ چونکہ شروع ہی سے چائے، کافی، مکھن، دودھ اور گوشت کھاتے ہیں اس لئے کہ آپ کو سخت محنت کرنی پڑتی ہے۔ چونکہ آپ مشقت کرتے ہیں۔ اس لئے آپ کے بدن کی جو طاقت زائل ہو جاتی ہے۔ اُسے بحال کرنے کے لئے آپ کو کھانا بھی زیادہ پڑتا ہے۔ یہ سیدھا اور صاف معاملہ ہے! یہی وجہ ہے

کہ آپ مطمئن نہیں ہیں۔ آپ نے اپنی عمر یوں ہی ضائع کر دی ہے۔ آپ نے سمجھا تھا کہ امریکہ
آنے میں آپ کو یہ فائدہ ہوگا کہ یہاں آپ کو ہر روز چائے، کافی اور گوشت میسر آئے گا
لیکن حقیقی امریکہ وہ ملک ہے جہاں آپ آزادی سے وہ طرز زندگی اختیار کر سکیں
جو آپ کو اس قابل بنائے کہ آپ کو ان چیزوں کی ضرورت ہی نہ رہے۔ جہاں حکومت
آپ کو غلامی اور جنگ اور فضول اخراجات جو ان کی بدولت بالواسطہ یا بلاواسطہ طور
پر پیدا ہو جاتے ہیں قائم رکھنے پر مجبور نہ کرے۔ میں نے جان بوجھ کر اس سے
ایسی باتیں کہیں جیسے وہ کوئی فلسفی ہو یا فلسفی بننا چاہتا ہو۔ اگر انسان کے کھوئے
ہوئے وقار کو واپس لانے کے لئے دنیا کے سارے سبزہ زار اپنی گذشتہ جنگلاتی
حالت کی طرف پلٹ آئیں تو میں بہت خوش ہوں گا۔ خود اپنی تربیت اور تہذیب
نفس کے لئے سب سے بہتر صورت کیا ہو سکتی ہے؟ اسے جاننے کے لئے کسی
شخص کو تاریخ کا مطالعہ کرنے کی ضرورت نہیں لیکن افسوس کہ ایک آئرستانی
کی تربیت ایک ایسی مہم ہے جو اسے کسی اخلاقی دلدل کو صاف کرنے والی کدال کے
ذریعہ ہی دی جا سکتی ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ آپ چونکہ دلدل میں اتنی سخت
مشقت کرتے ہیں۔ اس لئے آپ کو دبیز جوتوں اور موٹے کپڑوں کی ضرورت پڑتی ہے
اس کے باوجود وہ جلدی سے بھر جاتے ہیں۔ لیکن میں ہلکے جوتے اور پتلے کپڑے پہنتا
ہوں جن کی قیمت آپ کے جوتوں اور ملبوسات سے آدھی سے بھی کم ہے۔ ممکن ہے
آپ یہ سمجھتے ہوں کہ میں نے امیروں جیسا لباس پہن رکھا ہے مگر میں آپ کو یقین
دلاتا ہوں کہ ایسا نہیں ہے۔ میں محنت کے بغیر بلکہ تفریح کے طور پر اگر چاہوں تو گھنٹے
دو گھنٹے میں اتنی مچھلیاں پکڑ سکتا ہوں کہ وہ میری دو دن کی غذا کا کام دے سکیں۔
یا میں اتنی رقم کما سکتا ہوں جو میری ایک ہفتہ کی گذر بسر کے لئے کافی ہو۔ اگر آپ
اور آپ کے اہل و عیال سادہ زندگی بسر کریں تو آپ سب موسم گرما میں تفریحی طور پر

مشکل بری بھی کھا سکتے ہیں۔" جان نے میری باتوں پر ایک ٹھنڈی آہ بھری اور اس کی بیوی کمر پر ہاتھ رکھ کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے فرطِ حیرت سے دیکھتی رہی۔ دونوں سوچ رہے تھے کہ ان کے پاس کیا اتنی پونجی ہے کہ وہ میرے مشورہ پر عمل کر سکیں اور کیا ان کو اتنا حساب آتا ہے کہ اس مشورہ پر عمل کر کے اس کی تکمیل بھی کر سکیں۔ یہ بات ان کے لئے ایسی ہی تھی جیسے صرف قطب نما کے ذریعہ تاریکی میں جہاز نہ چلایا جائے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس طرح وہ اپنی بندرگاہ پر کیسے پہنچ سکیں گے۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ وہ اب بھی اپنے ڈھنگ سے زندگی کا ڈٹ کر مقابلہ کر رہے ہوں گے۔ آمنے سامنے ہو کر اس سے دست و گریباں رہتے ہوں گے۔ انہیں اتنی چالاکی نہیں ہے کہ وہ زندگی کے ہوتے ہوئے کوئی باریک سی بچر کھو کر اسے چیر ڈالیں اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالیں۔ اس سے اچھی کہ زندگی کے ساتھ پیش آئیں جس طرح کوئی لوہار ہیں سلوک کرتا ہے۔ لیکن وہ اتنی ناموافق حالات میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اور افسوس کہ جان فیاڈ اس طرح ہی لڑ رہا ہے اور زندگانی کی جنگ میں مارا جا رہا ہے۔

میں نے پوچھا کہ "کیا آپ کبھی مچھلی کا شکار بھی کھیلتے ہیں؟" اس نے جواب دیا جس دن میں کام نہیں کرتا اس دن ڈھیروں مچھلیاں پکڑتا ہوں۔" "آپ مچھلیوں کے چارے کے طور پر کیا چیز استعمال کرتے ہیں؟" اس نے جواب دیا "میں چلوا مچھلی تو معمولی کیڑوں سے پکڑ لیتا ہوں اور چلوا مچھلی کو پرتنگ مچھلی کے لیے استعمال کرتا ہوں۔" اس کی بیوی نے چپکے اور پرامید چہرے کو اٹھا کر کہا "جان اب تم جاؤ۔" لیکن جان ٹال گیا اور ملے۔

بارش اب بند ہو چکی تھی اور مشرقی جنگلوں پر نکلی ہوئی دھنک ایک خوشگوار شام کی اطلاع دے رہی تھی۔ اس لئے میں وہاں سے چلا آیا۔ جب میں جھونپڑے سے باہر آیا تو میں نے یہ دیکھنے کے لیے کہ ان کا کنواں کہاں واقع ہے اور کس قسم کا ہے اور اس لئے بھی کہ ان کے گھر سے

متعلق میرا جائزہ مکمل ہو جائے۔ پانی کا گلاس طلب کیا۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ بعض مقامات پر پانی پایاب ہوتا ہے۔ بعض مقامات پر ریگ رواں ہوتی ہے۔ رسیاں ٹوٹ جاتی ہیں اور بالٹیاں کنوئیں میں پڑی رہتی ہیں۔ ان کو نکالا نہیں جا سکتا۔ اس درمیان میں باورچی خانے کا موزوں برتن چن لیا گیا تھا۔ پانی بظاہر مقطر تھا اور انہوں نے باہمی مشورہ کے بعد پیاسے کو پانی دیا۔ لیکن اُسے اب تک ٹھنڈا ہونے کا موقع ہی نہیں ملا تھا اور اس کی گادھی ابھی تک تہہ میں بیٹھنے نہیں پائی تھی۔ لیکن میں نے دل ہی دل میں کہا "یہ ہے وہ دلیہ جو یہاں زندگی کو برقرار رکھتا ہے!" میں نے یہ سوچتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں اور میں نے پھونک مار کر ذرّوں کو ادھر ادھر ہٹاتے ہوئے اس کی سچی مہمان نوازی کے نام پر پانی کا ایک لمبا گھونٹ بھرا۔ جہاں شائستہ اطوار کا مظاہرہ مقصود ہوتا ہے وہاں میں ہچکچایا نہیں کرتا۔

بارش کے بعد جب میں اس آرستانی کے جھونپڑے سے روانہ ہو رہا تھا اور اپنے قدم تالاب کی طرف اٹھا رہا تھا۔ اور تیز رفتاری کے ساتھ سمر کہنیاں پکڑنے کے لئے گمنام گوشوں کے سبزہ زاروں، کیچڑ اور دلدلوں میں گھستا جا رہا تھا۔ میں ایک لمحہ کے لئے سوچ میں پڑ گیا کہ میں جو اسکول اور کالج کی تعلیم حاصل کر چکا ہوں مجھے ایسی حرکت زیب نہیں دیتی۔ لیکن جب میں پہاڑی پر سُرخ پڑتے ہوئے مغربی افق کی طرف اپنے کندھوں پر دھنک لئے ہوئے دوڑنے لگا اور ایک ہلکی سی چھن چھن کی صدا اس صاف ہوا میں میرے کانوں تک آنے لگی جس کے متعلق میں نہیں بتا سکتا کہ وہ کہاں سے آ رہی تھی تو مجھے محسوس ہوا کہ میری کرمفرما ذہانت مجھ سے کہہ رہی ہے "جا اور روزبروز دور دراز تک مزید وسعتوں میں جا کر مچھلیاں پکڑ اور شکار کھیل۔ بہت سی ندیوں اور آتش دانوں کے قریب جا کر بے خوف و خطر آرام کر۔ اپنے شباب کے ایام یاد رکھ۔ پو پھٹنے سے پہلے بے فکری سے اٹھ اور نئی مہمات تلاش کر۔ سہ پہر کو دوسری جھیلوں

پر ملا کر۔ رات آئے تو گھر میں موجود ہوا کر۔ ان سے وسیع تر میدان اور کوئی نہیں ہے ان سے بہتر اور کوئی کھیل نہیں کھیلا جا سکتا۔ ان گھاسوں اور جھاڑیوں کی طرح جو کبھی انگریزی گھاس نہیں بن سکتیں۔ تو بھی اپنی قدرت کے مطابق جنگل کی طرح پروان چڑھ، بجلی کو کڑکنے دے۔ چاہے وہ کسان کو فصل برباد کر دینے کی دھمکی ہی کیوں نہ دے۔ تیرے لئے اس کا یہ پیغام نہیں ہے۔ لوگ جب چھکڑوں اور شیڈوں میں پناہ لینے کے لئے بھاگ رہے ہوں تو بادل کے نیچے پناہ لے۔ تفریح سے اپنی معاش پیدا کر دھندے سے نہیں۔ زمین سے لطف اندوز ہو مگر اس کا مالک نہ بن۔ ہمت اور اعتقاد کی کمی کے باعث یہ انسان آج اتنا ذلیل ہے کہ وہ کچھ خریدتا ہے اور کچھ بیچتا ہے اور غلام کسانوں کی طرح زندگی بسر کرتا ہے۔ اے بیکر فارم۔

"تو ایک ایسا ارضی منظر ہے۔

جہاں سب سے بیش بہا عنصر مختصر سی اور معصوم دھوپ ہے"۔۔

"کوئی بھی تیرے ان سبزہ زاروں میں رنگ رلیاں

نہیں مناتا جو ریل کی پٹڑیوں سے گھرے ہوئے ہیں"۔۔

" تو کسی انسان سے کج بحثی نہیں کرتا

تو سوالات سے کبھی پریشان نہیں ہوتا

تو آج بھی پہلی نظر میں اتنا ہی

سدھا ہوا ہے جتنا تو اپنے سادہ اور گیرو ے

لباس میں تھا۔۔۔"

" اے محبت کرنے والو،

اے نفرت کرنے والو ــ آؤ

اے مقدس فاختہ کے بچو ــ آؤ

بلند تر قوانین

جب میں اپنی بنسی میں مچھلیوں کا گچھا لٹکائے ہوئے جنگل میں سے گزر کر گھر واپس آیا تو خاصہ اندھیرا پھیل چکا تھا۔ میں نے ایک جنگلی گلہری کو اپنا راستہ کاٹتے ہوئے دیکھا اور ایک وحشیانہ خوشی محسوس کی میرا جی چاہا کہ میں اسے دبوچ لوں اور کچا ہڑپ کر جاؤں۔ اس لئے نہیں کہ میں اس وقت بھوکا تھا بلکہ اس لئے کہ وہ وحشت کی نمائندگی کر رہی تھی۔ بہرکیف جب میں تالاب کے کنارے پر مقیم تھا تو میں نے ایک دو بار اپنے آپ کو ایک نیم گرسنہ شکاری کتے کی طرح بڑی بے پروائی کے ساتھ جنگل میں گھومتے ہوئے پایا تھا۔ اور اس تلاش میں تھا کہ کوئی شکار مل جائے تو میں اسے ہڑپ کر جاؤں۔ اور اس دوران میں مجھے ہرگز یہ خیال نہ آیا کہ میں وحشیوں کی طرح کوئی نوالہ نگل رہا ہوں۔ میں بے حساب وحشیانہ مناظر سے مانوس ہو چکا تھا۔ میں نے اپنے آپ میں ایک اعلیٰ زندگی کی طرف رجحان پایا۔ اور اب بھی پاتا ہوں۔ اس اعلیٰ زندگی کو روحانی زندگی کہا جاتا ہے۔ میرا دوسرا میلانِ طبع ابتدائی اور وحشیانہ زندگی کی طرف تھا۔ میں ان دونوں کا احترام کرتا ہوں۔ میں وحشیانہ اور اچھی زندگی دونوں سے محبت کرتا ہوں۔ مچھلی کے شکار میں جو وحشیانہ پن اور مہم جوئی ہے وہ مجھے

اپنی طرف راغب کرتی ہے۔۔ میرے دل میں بعض اوقات خواہش پیدا ہوتی ہے کہ میں پست ترین زندگی بسر کروں اور اپنا زیادہ تر دن جانوروں کی طرح بتاؤں۔ غالباً میں نے اسی شغل اور شکار کے ذریعہ اپنی جوانی میں قدرت کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ وہ ابتدا ہی میں ہمیں ایسے مناظر سے آشنا اور اُن میں مقیم کر دیتی ہے جن سے ہم اس عمر میں بہت ہی کم روشناس ہوتے ہیں۔ فلسفیوں اور شاعروں کی نسبت جو خاص توقعات لئے ہوئے قدرت کو دیکھتے ہیں۔ ماہی گیر، شکاری، لکڑہارے وغیرہ جو اپنی زندگی کھیتوں اور جنگلوں میں بسر کرتے ہیں۔ اور ایک خاص لحاظ سے خود بھی قدرت کا ایک حصّہ ہوتے ہیں اپنے مشاغل سے لمحاتِ فرصت میں اکثر قدرت کے مطالعہ کے لئے زیادہ بہتر نقطۂ نظر پیدا کر لیتے ہیں۔ قدرت اُن کے سامنے اپنی نمائش کرتے ہوئے نہیں ڈرتی۔ ایک سیاح گیا ستان میں فطری طور پر شکاری بن جاتا ہے۔ وہ مسوری اور کولمبیا دریاؤں کے سوتے پر پھندے لگاتا ہے۔ اور سینٹ میری کے آبشار میں مچھلیاں پکڑتا ہے۔ وہ شخص جو صرف مسافر ہے قدرت کے بارے میں اس کا علم صرف دوسرے درجہ کا ہوتا ہے۔ اور اس کی بات مستند نہیں ہوتی۔ ہم سب سے زیادہ دلچسپی کا اظہار اس وقت کرتے ہیں جب سائنس کے تذکروں سے ہمیں اُن چیزوں کا پتہ چلتا ہے جن کو سیّاح پہلے ہی سے عملی اجبلی طور پر جانتے ہوتے ہیں۔ کیونکہ یہی حقیقی انسانیت یا انسانی تجربہ کی حقیقی رُوداد ہے۔

وہ لوگ غلطی کرتے ہیں جو اس بات پر زور دیتے ہیں کہ امریکی لوگوں کو دل بہلانے کی تفریحیں بہت کم ہیں۔ کیونکہ اُن کے ہاں عام چھٹیاں کم ہیں۔ اور وہاں مرد اور عام لڑکے اتنے کھیل نہیں کھیلتے جتنے انگلینڈ میں لوگ کھیلتے ہیں۔ اس غلطی کا سبب یہ ہے کہ امریکہ میں شکار اور ماہی گیری وغیرہ جو ابتدائی اور زیادہ تفریحیں ہیں، ان کی جگہ اب تک اِن کھیلوں نے نہیں لی ہے۔ میرے زمانہ میں نیو انگلینڈ کا

دس سے چودہ برس تک کی عمر کا ہر لڑکا بندوق کندھے پر رکھ کر نکل جاتا تھا اور
اس کا شکار اور مچھلی پکڑنے کے میدان انگریزی رؤسا کی مخصوص شکارگاہوں کی
طرح محدود نہیں ہوا کرتے تھے بلکہ وہ ایک جنگلی باشندہ کی شکارگاہوں سے بھی زیادہ
لامحدود ہوتے تھے۔ اگر وہ قصبہ کے میدان میں کھیلنے کے لئے زیادہ دیر تک نہیں ٹھہرتا تو اس
میں تعجب کی کون سی بات ہے۔ اب ایک تبدیلی آنی شروع ہو گئی ہے۔ اس کی وجوہات انسانوں
کی کثرت نہیں ہے بلکہ شکار کی قلت ہے۔ کیونکہ غالباً شکاری انسانی سماج سے کہیں
زیادہ ان جانوروں کا دوست ہوتا ہے جن کو شکار کیا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ جب میں تالاب پر مقیم تھا تو میں غذا کو تبدیل کرنے کی غرض
سے اس میں مچھلی کا اضافہ کرنا چاہتا تھا۔ میں نے حقیقتاً اس غرض سے مچھلی پکڑی جو
سب سے پہلے مچھلی پکڑنے والوں کو پیش آئی تھی۔ اس کے خلاف میں چاہے کتنی ہی ہمدردی
کا اظہار کیوں نہ کرتا وہ ساری کی ساری مصنوعی ثابت ہوتی اور اس کا میرے جذبات سے
زیادہ میرے فلسفہ سے تعلق ہوتا۔ میں اس وقت مچھلی کے شکاری سے متعلق گفتگو کر رہا
ہوں اس لئے کہ پرندوں کے شکار سے متعلق میرے جذبات بہت پہلے ہی دوسروں
کی طرح کے ہو چکے ہیں اور میں نے جنگل میں جانے سے پہلے اپنی بندوق بیچ دی تھی۔
ایسا نہیں ہے کہ میں دوسروں سے کم انسان دوست ہوں لیکن میں یہ معلوم نہ کر سکا
کہ میرے احساسات زیادہ متاثر ہوئے ہیں۔ مجھے مچھلیوں اور کیڑوں پر ترس نہیں
آتا تھا۔ جہاں تک پرندوں کے شکار کا تعلق ہے میں گذشتہ برسوں میں بندوق اس بہانے
سے نہیں اٹھائے پھرتا تھا کہ میں پرندوں کے علم کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ میں دراصل نئی
اور نایاب چڑیاں تلاش کیا کرتا تھا۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ اب میرا ایسا خیال ہو رہا ہے کہ
پرندوں کے علم کے مطالعہ کا اس سے بہتر ایک طریقہ اور بھی ہے۔ اس طریقہ میں پرندوں
کی عادتوں پر زیادہ توجہ نہیں دینی پڑتی ہے۔ اگر اور کوئی وجہ تسلیم نہ کی جائے تو

بندوق کے استعمال کو ترک کر دینے کی یہی ایک وجہ تسلیم کی جا سکتی ہے۔ انسانیت پر بیسیوں اعتراضات کے قطعِ نظر میں یہ شک کرنے پر مجبور ہوں کہ ان کی جگہ کوئی اور اتنا ہی قیمتی کھیل نہیں لے سکتا۔ میرے چند احباب نے اپنے بیٹوں کے متعلق بڑی تشویش کے ساتھ پوچھا کہ ان کو شکار کھیلنے کی اجازت دینی چاہیئے یا نہیں تو میں نے یہ بات یاد کرتے ہوئے کہ میری اپنی تعلیم کا یہ بہترین حصہ رہا ہے انہیں جواب دیا "ہاں۔ انہیں شکاری بنانا چاہیے وہ پہلے پہل ایک کھیل سمجھ کر شکار کیوں نہ کھیلیں۔ بالآخر انہیں بہت بڑا شکاری بنانا ہے۔ اتنا بڑا کہ انہیں اس شکار گاہ میں یا کسی اور جنگل میں ان کے قابل شکار ہی نہ مل سکے۔ اور وہ انسانوں کے ماہی گیر اور شکاری بن جائیں" میں یہاں تک تو چاسر کی راہبہ کی رائے سے اتفاق کرتا ہوں جس نے کہا تھا:-

"میں اس پکی اور صاف کی ہوئی مرغی کا ہمنوا نہیں ہوں

جو یہ کہتی ہے کہ شکاری پاکباز انسان نہیں تھے"

نسل و قوم کی تاریخ کی طرح فرد کی تاریخ میں بھی ایسا زمانہ آتا ہے جب شکاری بہترین انسان ہوتے ہیں۔ جیسا کہ الگون کوئنس نے کہا — ہم اس لڑکے پر ترس کھائے بغیر نہیں رہ سکتے جس نے کبھی بندوق چلائی ہی نہیں۔ وہ کوئی زیادہ انسان دوست نہیں ہے بلکہ اس کی تعلیم کی طرف سے افسوسناک حد تک غفلت برتی گئی ہے۔ ان نوجوانوں کے بارے میں میرا یہی جواب تھا جو بندوق سے شکار کرنے کے بہت شائق تھے۔ مجھے اس بات کا یقین تھا کہ وہ بہت جلد اس منزل سے گزر جائیں گے کہ لڑکپن کی نافہم عمر کو چھوڑ کر کوئی انسان ایسی مخلوق کو مفت میں ہلاک نہیں کرے گا جو اپنی زندگی کو اتنی ہی قیمتی سمجھتی ہے جتنی وہ خود سمجھتا ہے۔ خرگوش انتہائی تکلیف کے عالم میں بچوں کی طرح روتا ہے۔ مارے مادُں! میں آپ کو متنبہ کرتا ہوں کہ میری ہمدردیاں ہمیشہ رسمی انسان دوست امتیازات نہیں ہوتے۔

اسی طرح اکثر اوقات نوجوان جنگل سے اور خود اپنی شخصیت کے بنیادی جزو سے روشناس ہو جاتا ہے۔ وہ پہلے یہاں ایک شکاری اور ماہی گیر کی حیثیت سے جاتا ہے۔ اور آخر کار اگر اس میں کسی زیادہ بہتر زندگی کی صلاحیت موجود ہے تو وہ اپنے اصل مقصد حیات کو پہچان لیتا ہے۔ اور شاعر یا قدرت پرست بن جاتا ہے۔ اور بندوق اور بنسی کو ایک طرف اٹھا کر رکھ دیتا ہے۔ اس اعتبار سے اکثر انسان ہمیشہ جوان رہتے ہیں۔ بعض ممالک میں شکاری پادری کا نظر آنا عام بات ہے۔ اس طرح کا پادری ایک گڈریے کا کتا تو بن سکتا ہے۔ لیکن خود اچھا گڈریا نہیں بن سکتا مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی ہے کہ لکڑی یا برف کاٹنے یا اس قسم کی اور دھندوں کے سوا کوئی اور دھندا جس نے میری یادداشت کے مطابق میرے کسی ہم قصبہ شخص کو سارے سارے دن کے لیے والڈن تالاب پر روکا ہے تو وہ صرف مچھلی کا شکار تھا۔ وہ اگر بہت سی مچھلیاں نہ پکڑتے تو وہ اپنے آپ کو بدقسمت کہتے۔ اور یہ سوچا کرتے کہ ان کو ان کے وقت کا مناسب معاوضہ نہیں ملا۔ حالانکہ انہیں اس مدت میں تالاب کے نظاروں کا موقع ملا تھا۔ اس سے پہلے کہ مچھلی پکڑنے سے جو کیچڑ پانی کی سطح پر آجاتا تھا تہہ میں بیٹھ جائے اور ان کا مقصد نکھر آئے ان کو ہزاروں بار تالاب پر جانا چاہیئے اس میں بھی شک نہیں ہے کہ مقصد کو صاف کرنے کا یہ عمل برابر جاری رہے گا۔ گورنر اور اس کی کونسل کو تالاب کی دھندلی سی یاد ہے۔ کیونکہ وہ وہاں لڑکپن میں ماہی گیری کے لیے گئے تھے۔ لیکن اب وہ اتنے بوڑھے اور معزز ہو چکے ہیں کہ مچھلیاں پکڑنے کے لیے نہیں جا سکتے۔ اس لیے اب یہ تالاب ان کے نزدیک ہمیشہ کے لیے اجنبی ہو گیا ہے۔ لیکن وہ جنت میں جانے کی توقع ضرور رکھتے ہیں۔ اگر قانون ساز مجلس کو اس کا خیال آتا ہے تو محض اس لیے کہ وہ قانون کی مدد سے یہ طے کر دے کہ یہاں مچھلیاں پکڑنے کے لیے کتنے کانٹے

استعمال ہو سکتے ہیں لیکن وہ اس بڑے کانٹے کے بارے میں کچھ نہیں جانتے جس میں مجلس قانون ساز کا چارہ لگا کر سارے تالاب کو پکڑا جا سکتا ہے۔ پس مہذب اقوام میں ابتدائی انسان اپنی ترقی کے دور میں شکاری کی منزل سے گزر کر آگے بڑھتا ہے۔

میں نے گزشتہ برسوں میں بار بار محسوس کیا ہے کہ میں جب مچھلی کا شکار کرتا ہوں تو اپنی ہی نظروں میں تھوڑا سا گر جاتا ہوں۔ میں نے اس کا بار بار تجربہ کیا ہے میں اس کا ماہر ہوں اور اپنے بیشتر ساتھیوں کی طرح اس شکار کے لئے فطری رغبت بھی رکھتا ہوں۔ جو تھوڑے تھوڑے عرصہ کے بعد پھر بیزاری پیدا کر دیتی ہے لیکن جب میں شکار کھیل چکتا ہوں تو ایسا محسوس کرتا ہوں کہ اگر میں نے مچھلیاں نہ پکڑی ہوتیں تو بہتر ہوتا۔ میرا خیال ہے کہ میں اس معاملہ میں کوئی غلطی نہیں کر رہا ہوں یہ ایک ہلکی سی علامت ہے۔ صبح کی پہلی روشنیاں بھی اتنی ہی خفیف ہوتی ہیں۔ وہ جبلت جو مخلوقات کی پست ترین طبقہ کی خصوصیت ہے۔ مجھ میں بھی یقینی طور پر موجود ہے۔ اگرچہ نہ میری انسانیت بڑھتی ہے اور نہ عقل۔ پھر بھی جیسے جیسے سال گزرتے جا رہے ہیں میری ماہی گیری میں برابر کمی واقع ہوتی جا رہی ہے۔ فی الحال میں پورے طور پر ماہی گیر نہیں ہوں۔ لیکن مجھے معلوم ہے کہ اگر میں دوبارہ جنگل میں جا کر رہوں گا تو پھر مجھے یہ ترغیب ملے گی کہ میں شکاری اور ماہی گیر بن جاؤں اس کے علاوہ اس قسم کی غذا میں اور ہر طرح کے گوشت میں یقیناً کچھ نہ کچھ غلاظت ہوتی ہے اور میں یہ سمجھنے لگا ہوں کہ گھریلو کام کہاں سے شروع ہوتا ہے اور اپنے کو روزانہ صاف ستھرا رکھنے اور گھر کو ہر طرح کی گندگی اور بدبو سے پاک و صاف رکھنے میں جو کا وقت اور محنت کرنی پڑتی ہے۔ اس میں کتنی لاگت آتی ہے۔ چونکہ میں اپنا خود قصاب، ملازم اور باورچی رہا ہوں اور میں ہی وہ صاحب خانہ ہوں جن کے دستر خوان پر یہ کھانا چنا جاتا ہے۔ اس لئے جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ ایک غیر معمولی اور

مکمل تجربہ کی بنا پر کہہ رہا ہوں ۔ میں گندگی کی وجہ سے جانوروں کا گوشت کھانے سے ہچکچاتا تھا ۔ اس کے علاوہ جب میں مچھلی پکڑتا ، اُسے صاف کرتا اور پکاتا اور اسے کھا چکتا تو مجھے محسوس ہوتا کہ میری اصل بھوک اس سے نہیں مٹی ہے ۔ وہ معمولی اور غیر ضروری محسوس ہوتی اور اُسے حاصل کرنے میں جو محنت کرنی پڑتی اور جو وقت صرف کرنا پڑتا وہ اس سے زیادہ قیمتی ہوتا تھا ۔ تھوڑی سی روٹی اور چند آلو بھی کام دے جاتے ہیں اور ان کے لئے اتنی محنت نہیں کرنی پڑتی اور نہ ان کی وجہ سے غلاظت پیدا ہوتی ہے ۔ میں نے اپنے اکثر ہم وطنوں کی طرح کئی سال تک بہت ہی کم گوشت ، مچھلی یا کافی وغیرہ کا استعمال کیا تھا ۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ ان کے کھانے سے مجھے کوئی گزند پہنچتا تھا بلکہ اس لئے کہ وہ ذہنی اعتبار سے مجھے پسند نہیں تھے ۔ جانور کو غذا بنانے سے نفرت کسی تجربہ کی بنا پر نہیں ہے بلکہ قدرتی ہے اس میں زیادہ حُسن محسوس ہوتا ہے کہ بہت سی باتوں میں کمی کی جائے اور غذا میں سختی برتی جائے اگرچہ میں ایسا کبھی نہ کر سکا ۔ پھر بھی میں نے اتنی سختی ضرور کی کہ مجھے ذہنی طور پر اطمینان ہو گیا مجھے اس کا یقین ہے کہ ہر اس شخص نے جو اپنی اعلیٰ دماغی قوتوں یا شاعرانہ صلاحیتوں کو برقرار رکھنے کا خواہاں رہا ہے ۔ اس نے جانوروں کو غذا بنانے یا کسی طرح کا کھانا زیادہ کھانے سے گریز کیا ہے ۔ عالم حشریات کا یہ بیان میں نے کربی اور سپینس کی کتابوں میں پڑھا ہے بہت ہی اہم ہے کہ بعض کیڑے جب اچھی طرح پنپ جاتے ہیں تو اگرچہ ان کے جسم میں غذا پہنچانے والے اعضا موجود ہوتے ہیں پھر بھی وہ ان کو استعمال نہیں کرتے ہیں ۔" یہ علما یہ اصول بھی بیان کرتے ہیں کہ عام طور پر تقریباً سب کیڑے مکمل روپ دھار کر اس حالت سے کم کھاتے ہیں جبکہ وہ پھل روپ " میں ہوتے ہیں اور پیٹو رسے پھل روپ کے کیڑے جب مکمل بن جاتے ہیں تو وہ شہد یا کسی دوسری میٹھی رقیق چیز کے ایک دو قطروں سے سیر ہو جاتے ہیں ۔ تتلی کے پروں کے نیچے جو پیٹ ہوتا ہے وہ اب بھی کیلے کی نمائندگی کرتا ہے ۔ یہی وہ تر نوالہ ہے

جو کیڑے کھانے والے جانوروں کو اُسے کھا جانے پہ مائل کرتا ہے۔ پیٹو انسان دراصل کملے والی منزل کا انسان ہے۔ اور پوری پوری قومیں اس منزل میں ہیں۔ یہ وہ اقوام ہیں جن کے ہاں نہ کوئی تصور ہے اور نہ تخیل۔ وہ اپنی بڑی بڑی توندوں سے پہچانی جاسکتی ہیں ایسی صاف اور سادہ غذائیں مہیا اور تیار کرنا جو ہمارے ذہن پر گراں نہ گزریں بہت مشکل کام ہے۔ لیکن ہمیں اپنے بدن کے ساتھ ساتھ اپنے ذہن کو بھی سیر کرنا ہے۔ ان دونوں کو ایک ہی میز پہ بٹھانا ہے۔ شاید یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ پھل اگر اعتدال کے ساتھ کھائے جائیں تو نہیں تو اپنی بھوک پر شرمندہ ہونا پڑے گا اور نہ ہمارے اچھے سے اچھے کاموں میں کوئی رکاوٹ پیدا ہوگی۔ لیکن اگر آپ بھوک سے زیادہ ذراسی چٹنی بھی کھا جائیں گے تو وہ آپ کے لئے زہر بن جائے گی۔ اچھے پکے ہوئے کھانوں پہ زندگی بسر کرنا وقت کا صحیح استعمال نہیں ہے۔ ان لوگوں کے لئے جن کو دوسرے لوگ ہر روز ترکاریاں اور گوشت پکا کر دیتے ہیں اگر خود اپنے ہاتھ سے کھانا تیار کرنے ہوئے پکڑے جائیں تو ان میں سے بیشتر شرم محسوس کریں گے۔ پھر بھی جب تک اس کے الٹ کام نہ ہوگا ہم صحیح معنوں میں مہذب نہیں بن سکیں گے۔ چاہے ایسے لوگ لاکھ شریف زادے اور شریف زادیاں بن جائیں مگر وہ حقیقی طور پہ نہ مرد ہوں گے نہ عورتیں۔ اس بات سے یقیناً ظاہر ہو جاتا ہے کہ اس طریقہ کار کو بدلنا نہایت ضروری ہے۔ یہ بات پوچھنے کا کوئی فائدہ نہیں کہ ذہن گوشت اور چربی کو کیوں گوارا نہیں کرتا۔ میں مطمئن ہوں کہ وہ انہیں پسند نہیں کرتا۔ کیا یہ امر شرمناک نہیں ہے کہ انسان ایک گوشت خور جانور ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ بڑی حد تک دوسرے جانوروں کا شکار کر کے ہی زندہ رہتا ہے۔ اور رہتا بھی ہے۔ لیکن یہ ایک انتہائی ناپسندیدہ اور نامناسب طریقۂ کار ہے۔ وہ شخص اسے بخوبی جان لے گا۔ جو خرگوشوں کو جال میں پھنساتا ہے یا میمنے کو ذبح کرتا ہے۔ وہ شخص انسان کی نسل کا محسن سمجھا جائے گا۔ جو انسانوں کو اس سے زیادہ معصوم اور صحت مند غذا کھانا سکھا دیگا۔

میرا اپنا طریقۂ کار چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہو لیکن مجھے اس کا یقین ہے کہ ارتقا کی منزلیں
آہستہ آہستہ طے کرنے کے سلسلہ میں انسان کی تقدیر کا یہ مقدر ہے کہ وہ جانوروں کا کھانا
اس طرح ترک کر دے گا جس طرح جنگلی قوموں نے زیادہ مہذب قوموں کے ساتھ رابطہ پیدا
کرتے ہی ایک دوسرے کا کھانا ترک کر دیا تھا۔

اگر کوئی شخص اپنی عقل کی ہلکی اور مستقل ہدایتوں پر کان دھرے جو واقعی سچی
ہوتی ہیں۔ تو وہ یہ دیکھنے کے باوجود کہ اسے یہ کس حد تک لے جائیں گی۔
اور کس حد تک پاگل بنا دیں گی۔ اسے پتہ چلے گا کہ جیسے جیسے اس کی قوت استقلال
بڑھتی ہے ویسے ویسے اس کو اپنا راستہ صاف نظر آنے لگتا ہے۔ ایک تندرست شخص
جو خفیف سے خفیف تر اعتراض محسوس کرے گا۔ وہ سب انسانیت کے دلائل
اور رسم و رواج پر حاوی ہوگا۔ کسی شخص نے اپنی فطرت کی اس وقت تک
تقلید نہیں کی۔ جب تک اس نے اسے غلط راستے پر نہیں ڈال دیا۔ اگرچہ جسمانی
کمزوری اس کا نتیجہ ہوتی ہے پھر بھی کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس نتیجہ پر افسوس
کرنا چاہیئے کیونکہ یہ وہ زندگی ہے جو اعلیٰ اصولوں کے تحت بسر کی جا رہی ہے۔ اگر
رات اور دن ایسے ہوتے ہیں کہ آپ خوشی اور مسرت سے ان کا خیرمقدم کرتے ہیں۔
اور زندگی پھولوں اور میٹھی خوشبو والی جڑی بوٹیوں کی طرح نکہت بکھیرتی ہے
اور زیادہ لچکدار ہے، زیادہ تاروں بھری ہے اور زیادہ غیرفانی ہے۔ تو
یہ آپ کی کامیابی کی علامت ہے۔ پوری فطرت آپ کے لئے ہدیہ مبارکباد بن
جاتی ہے۔ اور آپ کو یہ موقع میسر آتا ہے کہ آپ اپنے کو لمحاتی طور پر آشیرواد دیں۔
سب سے بڑے منافعوں اور قدروں کی بالکل قدر و منزلت نہیں کی جاتی ہمیں
بڑی آسانی سے شک کرنے لگتا ہے کہ ان کا کوئی وجود بھی ہے یا نہیں۔
ہم ان کو بہت جلد بھول جاتے ہیں۔ وہ سب سے بڑے حقائق ہیں۔ غالباً ایسے

حقائق جو انتہائی حیرت انگیز اور سچے ہیں اور جنہیں ایک انسان نے دوسرے انسان تک نہیں پہنچایا۔ میری روزمرہ زندگی کا پھل انتہائی مبہم اور ناقابلِ بیان ہے جیسے صبح و شام کے رنگ۔ یہ ستاروں کی وہ دھول ہے جو میری مٹھی میں آگئی ہے۔ اور قوس و قزح کا وہ ٹکڑا ہے جسے میں نے پکڑ لیا ہے۔

پھر بھی جہاں تک میرا تعلق ہے میں غذا کے سلسلے میں غیر معمولی طور پر نفاست پسند نہیں رہا ہوں۔ بعض اوقات میں ضرورت پڑنے پر تلا ہوا چوہا بڑے مزے سے کھا لیتا تھا۔ میں خوش ہوں کہ بہت عرصہ تک صرف پانی ہی پیتا رہا ہوں۔ محض اس وجہ سے کہ میں ایک افیونی کے آسمان پر قدرتی آسمان کو ترجیح دیتا ہوں۔ میں خوش ہوں کہ میں بہت سی شراب پی کر بھی باہوش رہ سکتا ہوں۔ ویسے بدمستی کے لامحدود مدارج ہیں میرا یقین ہے کہ ایک ذی عقل کے لئے پانی ہی صرف پینے کی چیز ہے۔ شراب کوئی عمدہ شربت نہیں ہے۔ ذرا سوچئے تو سہی کہ ہم کام کی ساری امیدیں گرم گرم کافی کی پیالی پی کر اور شام کی ساری امیدیں چائے پی کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں۔ آہ! جب میں ان کی ترغیب کے بس میں آجاتا ہوں تو کتنا پست ہو جاتا ہوں۔ موسیقی بھی نشہ آور ثابت ہو سکتی ہے ایسے ہی معمولی اسباب نے یونان اور روم کو تباہ کر دیا تھا اور یہی اسباب انگلستان اور امریکہ کو تباہ و برباد کر دیں گے۔ اگر مدہوش ہونا ہی مقصود ہے تو کون اس ہوا سے متوالا بننا پسند نہ کرے گا جس میں وہ سانس لیتا ہے۔ میں نے بہت دنوں تک جاری رہنے والی کٹھن اور تلخ قسم کی مشقت کی مخالفت کی ہے۔ اس وجہ سے کہ مجھے موقتاً غذا کھانی پڑی اور غلیظ پانی پینا پڑا۔ آپ سے سچ عرض کر دوں کہ میں ان معاملات میں فی الحال زیادہ احتیاط استعمال نہیں کرتا ہوں۔ میں کھانے کی میز پر مذہب کو بہت کم لے جاتا ہوں اور نہ دعا مانگتا ہوں۔ اس لئے نہیں کہ میں اب پہلے سے زیادہ عقلمند ہو گیا ہوں بلکہ میں یہ اقرار کرنے پر مجبور ہوں کہ اس امر کو کتنا ہی قابلِ افسوس کیوں نہ سمجھا جائے۔ عمر کے ساتھ مجھ

میں نفاست کم ہوتی جارہی ہے۔ جس طرح شاعری کے بارے میں بہت سے لوگوں کا خیال ہے اسی طرح جوانی میں غالباً ایسے سوالات پر نظر رکھی جاتی ہے۔ میرا عمل چاہے کچھ بھی رہا ہو لیکن میری یہی رائے ہے۔ بہر کیف میں اپنے آپ کو ان مستحق لوگوں میں سے ہرگز خیال نہیں کرتا جن کے بارے میں وید کہتا ہے کہ "وہ شخص جو ہر جگہ موجود خدائے برتر پر سچا اعتقاد رکھتا ہے ایسی تمام چیزیں کھا سکتا ہے جو وجود رکھتی ہیں" لیکن اس کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ یہ پوچھے کہ اس کی خوراک کیا ہے اور کس نے اسے تیار کیا ہے۔ لیکن ایک ہندو مفسر کے قول کے مطابق ان لوگوں کے معاملہ میں بھی ویدانت نے اس رعایت کو صرف یہاں تک محدود کر دیا ہے کہ "مصیبت میں ایسا کیا جا سکتا ہے"

کون ایسا شخص ہے جس نے اپنی اس خوراک سے ناقابلِ بیان لذت محسوس نہ کی ہو جس میں اس کی بھوک کا کوئی حصہ نہیں ہوتا؟ مجھے یہ سوچ کر بہت مزا آتا ہے کہ لذت اور ذائقہ کے مجموعی احساس میں عام طور سے میرے ذہنی ادراک کا ہاتھ تھا۔ اور یہ کہ لذت کا موقعہ ان کے جنگل میں ندی کنارے سے کیا اور پہاڑی پر جو میں نے چند گوندنیاں کھائی تھیں انہوں نے میری فراست کو غذا پہنچائی تھی۔ سینگ سیو کہتا ہے "جب روح اپنی مالک نہیں رہتی تو آدمی دیکھتے ہوئے بھی کچھ نہیں دیکھتا۔ سنتے ہوئے بھی کچھ نہیں سنتا۔ کھاتا ہے مگر اسے ذائقہ کا پتہ نہیں چلتا" وہ شخص جو اپنی غذا کے صحیح ذائقہ سے واقف ہے کبھی پیٹو نہیں بن سکتا۔ وہ شخص جو اپنی غذا کے ذائقہ سے واقف نہیں وہ پیٹو کے سوا اور کچھ نہیں بن سکتا۔ ایک کٹر مذہب پرست چوکر کی روٹی کا ٹکڑا اسی مزے سے کھاتا ہے جس سے ایلڈرمین اپنے سبز کچھوے کو۔ جو غذا انسان کے منہ میں جاتی ہے اسے ناپاک کر دیتی ہے۔ بلکہ وہ بھوک اسے ناپاک کرتی ہے جس سے وہ چیز کھائی جاتی ہے۔ اس میں غذا کی نوعیت اور مقدار کا سوال نہیں ہے۔ بلکہ سوال ہے نفسانی لذات کی غلامی کا۔ اس حالت میں جو کچھ

کھایا جاتا ہے وہ نہ تو بقائے صحت کے لئے ہوتا ہے اور نہ ہماری روحانی زندگی کو غذا پہنچانے کے لئے - بلکہ صرف ان کیڑوں کی غذا ہوتی ہے جو ہم پر قابض ہیں۔ اگر شکاری کو دلدلی کچھووں، چھچھوندروں اور اس طرح کی جنگلی چاٹ میں مزا آتا ہے تو ایک دولتمند نازنین کو بچھڑے کے پائے کی جیلی میں یا سمندر کی سارڈین مچھلی میں۔ اس طرح وہ دونوں برابر ہو جاتے ہیں۔ شکاری "تالاب کی پن چکی" تک جاتا ہے اور وہ نازنین اپنے مرتبان تک۔ تعجب تو اس بات کا ہے کہ "وہ" یعنی میں اور آپ کیوں اس طرح کی غلیظ اور وحشیانہ زندگی کھاتے اور پیتے ہوئے بسر کر سکتے ہیں

مجموعی طور پر زندگی کی حیرت انگیز اخلاقی اسباق سے بھرپور ہے۔ نیکی اور بدی میں کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی صلح نہیں ہوتی۔ نیکی - - ہی وہ سرمایہ ہے جس میں کبھی کوئی خسارہ نہیں ہوتا۔ بربط کے اس نغمہ میں جو اس دنیا کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ یہی وہ دعوت ہے جو ہمارے رگ و پے میں مسرت کی لہر دوڑا دیتی ہے۔ بربط دنیا کی بیمہ کمپنی کا مشتہر و پیغامبر ہے جو اس کمپنی کے قواعد سمجھاتا ہے اور ہم میں جو تھوڑی سی نیکی ہے وہ ایسی مشخص شدہ قسط ہے جو ہم ادا کرتے ہیں۔ اگرچہ نوجوان بالآخر بے پروا ہو جاتا ہے لیکن عالم کے قوانین نہیں بدلتے اور وہ ہمیشہ ان لوگوں کی حمایت کرتے ہیں جو زیادہ حساس ہوتے ہیں۔ کان لگا کر نسیم کے ہر جھونکے میں کوئی ہدایت سنئے کیونکہ یہ ہدایت نسیم میں موجود ہے اور وہ شخص بدنصیب ہے جو یہ ہدایات سنتا نہیں ہے۔ جب ہم کبھی کوئی تار چھیڑتے ہیں یا اسے حرکت میں لاتے ہیں تو کوئی دلآویز اخلاقی سبق ہم پر سکتہ کا عالم طاری کر دیتا ہے تو آپ کوئی بھونڈا شور بلند کیجئے اور اس سے فوراً دور چلے جائیے تو یہی شور موسیقی بن جائے گا جو ہماری زندگیوں کی کمینگیوں پر فخر سے شیریں لب و لہجہ میں طنز کر رہی ہوگی۔

ہم اپنے اندر کے حیوان سے باخبر ہیں جو اسی تناسب سے جاگتا ہے جس تناسب سے ہماری اعلیٰ درجہ کی فطرت سوتی ہے۔ یہ رینگنے والا کیڑا بہت شہوانی

ہے اور غالباً پورے طور سے اُسے اُن کیڑوں کی طرح جو زندگی اور تندرستی کے عالم میں
بھی ہمارے جسموں میں موجود رہتے ہیں کبھی نہیں نکالا جاسکتا۔ ہم اُس سے دُور تو شاید
ہٹ سکتے ہیں لیکن اس کی خصوصیت کبھی نہیں بدل سکتے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ وہ اپنی تندرستی
سے لطف اندوز ہوتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ ہم تندرست ہونے پر بھی اس کی غلاظت
سے پاک نہ ہوں۔ کچھ دن ہوئے میں نے ایک سؤر کے جبڑے کا نچلا حصہ ایک جگہ
پڑا ہوا پایا تھا۔ اس کے سفید اور مضبوط چھوٹے بڑے دانت اب بھی موجود تھے۔
جس کے معنی یہ تھے کہ روحانی قوت اور تندرستی سے بالکل الگ ایک حیوانی تندرستی بھی
ہوتی ہے۔ خدا کی یہ مخلوق اعتدال اور پاکیزگی کے علاوہ دوسرے ذرائع سے بھی فیضیاب
رہی۔ مینسیس کہتا ہے کہ انسان اور جانور میں بہت ہی کم فرق ہوتا ہے۔ عام لوگ بہت
جلد یہ فرق کھو بیٹھتے ہیں۔ اور فہیم و اعلیٰ انسان بڑی احتیاط سے اسے محفوظ رکھتے
ہیں۔ کون جانتا ہے کہ اگر ہم پاکیزگی پر مائل ہو جاتے تو اس کا کیا نتیجہ ہوتا۔ اگر میں کسی
ایسے عقلمند آدمی کو جانتا ہوتا جو مجھے پاکیزگی کی تعلیم دے سکتا تو میں فوراً اس کی تلاش
میں نکل کھڑا ہوتا۔ وید میں لکھا ہے کہ اپنی حرص و ہوا اور اپنے جسم کے خارجی احساسات
پر قابو رکھنا اور نیک کام کرنا خدا سے روح کی قربت کے لئے ناگزیر ہے۔
اس کے باوجود روح ایک وقت جسم کے ہر عضو اور ہر حس پر چھا جاتی ہے اور اس
پر قابو پا لیتی ہے اور بدترین قسم کی حرص و ہوا کو پاکیزگی اور ریاضتِ نفس میں تبدیل
کر دیتی ہے۔ وہ تولیدی قوت جو ہمارے آوارہ ہونے پر ضائع ہو کر ہمیں ناپاک کر
دیتی ہے۔ ہمارے پرہیزگار ہو جانے پر ہمیں قوت بخشتی ہے اور ہماری حوصلہ افزائی
کرتی ہے۔ پاکبازی سے انسانیت میں پھول کھلتے ہیں اور جسے ذہانت، بہادری اور
تقدیس کہتے ہیں وہ مختلف قسم کے پھل ہیں جو اس پھول کے بعد لگتے ہیں۔ جب پاکیزگی کی
نہر کھل جاتی ہے تو ہم انسان فوراً اس میں بہتا ہوا خدا تک پہنچ جاتا ہے۔ ہماری پاکیزگی

اپنی باری پر ہماری ہمت بڑھاتی ہے اور ہماری ناپاکی ہمیں ذلیل و خوار کر دیتی ہے۔ وہ آدمی خوش نصیب ہے جسے اس بات کا یقین ہو جائے کہ اس کے اندر کا آدمی روز بروز بڑھتا چلا جا رہا ہے اور اُلوہیت اس میں مستحکم ہوتی جا رہی ہے۔ شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو جو اس رذیل اور وحشیانہ فطرت کے باعث شرمسار نہ ہو جو اس سے وابستہ کر دی گئی ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ ہم ایسے دیوتا یا نصف دیوتا ہیں جیسے غزال اور ستیار دیوتا تھے۔ حیوان اور دیوتا مل جُلے۔ حرص و ہوا کے بندے ۔۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری زندگی میں کسی حد تک قلت موجود ہے۔

"وہ شخص کس قدر خوش نصیب ہے جس نے
اپنے درندوں کو ان کے اصل مقام پر بٹھا رکھا ہے
اور اپنے دماغ کا جنگل صاف کر دیا ہے ۔۔!
جو اپنے گھوڑے، اپنی بکری، اپنے بھیڑیئے اور ہر چوپائے
سے کام لے سکتا ہے اور خود اُن سب کا گدھا نہیں بن گیا ہے۔
اگر ایسا نہیں ہے تو انسان صرف سوروں کا ریوڑ
ہی نہیں بلکہ اُن شیطانوں میں سے ہے
جنہوں نے اپنی بے عقلی سے اپنے آپ کو غصّے کا غلام
بنا لیا ہے اور اپنی حالت اور بھی خراب کر لی ہے۔"

ساری نفس پرستی ایک سی ہوتی ہے اگرچہ اس نے بہت سی صورتیں اختیار کر رکھی ہیں۔ ساری پاکیزگی بھی ایک جیسی ہے۔ یہ ایک سی بات ہے۔ چاہے آدمی حرص و ہوا کے کھائے، پیئے یا اختلاط سے یا سوئے۔ یہ سب ایک ہی نفسانی خواہش کا نتیجہ ہیں۔ اگر ہم کسی شخص کو ان میں سے کوئی بات کرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو فوراً جان جاتے ہیں کہ وہ کتنا ہوس پرست ہے۔ کوئی ناپاک نہ تو پاکیزگی کے ساتھ کھڑا رہ سکتا

کہ کھڑا ہو سکتا ہے اور نہ اس کے ساتھ بیٹھ سکتا ہے۔ جب ہم کسی رینگنے والے
کیڑے کے بل کے دہانہ پر جھانکتے ہیں تو وہ دوسرے جانب پر نظر آتا ہے۔ اگر آپ پاکباز
رہنا چاہتے ہیں تو آپ کو پرہیزگار بننا پڑے گا۔ پارسائی کسے کہتے ہیں؟ کوئی شخص کیسے
جان سکتا ہے کہ وہ پارسا ہے؟ اس کا اسے علم نہیں ہو سکتا۔ ہم نے نیکی کا نام سن رکھا
ہے لیکن ہم یہ نہیں جانتے کہ یہ ہوتی کیا ہے۔ ہم نے اس کے بارے میں جو افواہیں
سن رکھی ہیں ان کے مطابق ہم اس کی تعریف کرتے ہیں۔ محنت سے عقل اور پاکیزگی
حاصل ہوتی ہے اور کاہلی سے جہالت اور ہوس پرستی۔ طالب علم میں ہوس پرستی
ذہنی کاہلی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ہوس کا غلام عام طور پر کاہل ہوتا ہے۔ جو اسٹوو کے
پاس بیٹھا رہتا ہے، دھوپ میں لیٹا رہتا ہے اور تھکن کے بغیر بھی سویا رہتا ہے
اگر آپ ناپاکی اور سارے گناہوں سے بچنا چاہتے ہیں تو خلوص سے کام لیجئے خواہ
وہ کسی اصطبل کی صفائی کا کام ہی کیوں نہ ہو۔ فطرت پر فتح پانا مشکل ہے لیکن اسے
فتح کرنا ہی پڑے گا۔ آخر آپ کے عیسائی ہونے کا کیا فائدہ ہے۔ اگر آپ ناستکوں سے
زیادہ پاکیزہ نہیں ہیں۔ اگر آپ ان سے زیادہ اپنے نفس پر قابو نہیں رکھتے ہیں اور
اگر آپ ان سے زیادہ مذہبی نہیں ہیں؟ میں بہت سے ایسے مذاہب سے واقف
ہوں جنہیں ناستک کہا جاتا ہے۔ لیکن جن کے آدرش قاری کو نادم کر دیتے ہیں۔
اور ان کو نئی عبادت پر ابھارتے ہیں چاہے وہ رسوم کی ادائیگی ہی کیوں نہ ہو۔
لیکن یہ باتیں لکھتے ہوئے میں ہچکچاتا ہوں۔ لیکن یہ ہچکچاہٹ میری باتوں کے
موضوع کی وجہ سے نہیں ہے اور میرے الفاظ چاہے کتنے ہی فحش کیوں نہ ہوں مجھے
اس کی کوئی پروا نہیں ہے۔ میری ہچکچاہٹ کی وجہ یہ ہے کہ میں ان باتوں کے
متعلق باتیں کیے بغیر اپنی ناپاکی ظاہر نہیں کر سکتا۔ ہم کسی شرم و لحاظ کے بغیر ہوس
پرستی کی اور ایک عورت کی باتیں کرتے ہیں لیکن ہم دوسری طرح کی ہوس رانیوں

کے بارے میں خاموش رہتے ہیں۔ ہم اس قدر ذلیل ہو چکے ہیں کہ ہم صرف انسانی فطرت کے خصائل کے متعلق سادگی سے گفتگو نہیں کر سکتے۔ ابتدائی زمانوں میں چند ملکوں میں ہڈیوں کا ذکر بڑے احترام سے کیا جاتا تھا اور ان کو باقاعدہ صورت دینے کے لئے قوانین موجود تھے۔ منو دھرم ساز کے نزدیک کوئی بات حقیر نہیں تھی۔ وہ جدید مذاق سلیم رکھنے والے کے لئے کتنا ناگوار سہی۔ منو دھرم قانون ساز یہ تعلیم دیتا ہے کہ کس طرح کھایا جائے، پیا جائے، مباشرت کی جائے، پاخانے اور پیشاب کیا جائے وغیرہ۔ وہ ہر ذلیل فعل کو ایک ارفع و اعلیٰ بنا دیتا ہے اور ان باتوں کو حقیر کہہ کر اپنے آپ پر جھوٹا الزام نہیں لگاتا۔

ہر انسان اپنے خدا کی عبادت کے لئے ایک مندر بناتا ہے جسے اس کا جسم کہا جاتا ہے۔ اس جسمانی مندر کی جگہ وہ سنگ مرمر کو مختلف تصاویر بنا کر نجات حاصل نہیں کرتا۔ ہم سب مجسمہ ساز اور مصور ہیں اور اس کے لئے مواد ہمارا گوشت، خون اور ہڈیاں ہیں۔ ایک شریفانہ فعل کا ارتکاب کرتے ہی ایک شخص کی صورت پر پاکیزگی کی لہر دوڑنے لگتی ہے۔ اور ایک ذلیل فعل یا ہوس کاری چہرے پر حیوانیت پیدا کر دیتی ہے۔

ماہ ستمبر میں کاشتکار جان ایک شام کو دن بھر کی مشقت کے بعد اپنے دروازے پر بیٹھا تھا۔ وہ ابھی مشقت ہی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ غسل کر کے وہاں اس لئے بیٹھ گیا تھا کہ ذرا دماغ کو تازہ کرے۔ شام کسی حد تک ٹھنڈی تھی اور اس کے چند پڑوسیوں کو اس بات کا خطرہ تھا کہ کہرا پڑے گا۔ وہ اپنے خیالات میں دیر تک مستغرق نہ رہ سکا۔ اس نے کسی کو بانسری بجاتے ہوئے سنا اور یہ آواز اس کے ذہن کی کیفیت سے ہم آہنگ ہو گئی لیکن وہ پھر بھی اپنے کام کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگرچہ کام کے متعلق خیالات

کاتا تھا بندھا ہوا ہے لیکن ان کا اس کام سے اور مجھ سے بہت کم رشتہ ہے ؟
یہ اس کی تجارت کی پیڑی تھی جو باپ دادا سے چلی آ رہی تھی۔ لیکن بانسری کی
آواز اس کی روح دوسری دنیا سے آ رہی تھی اور اس کی خوابیدہ قوتوں کو جگا رہی
تھی۔ اس نے اس کے دل سے اس بات، گاؤں اور مرنے کو بھلا دیا۔ یہاں
وہ رہتا تھا۔ اس آواز نے اس سے کہا کہ جب تمہارے لئے ایک شاندار زندگی
کا امکان ہے تو تم یہاں رہ کر ایسی پست اور مشقت سے بھرپور زندگی کیوں بسر
کر رہے ہو؟ یہی سبب ہے ان کھیتوں کے علاوہ دوسرے کھیتوں پر بھی چمکتے
ہیں۔ لیکن وہ اس حالت سے باہر نکلے اور کیسے دوسرے مقام تک ہجرت
کر جائے؟ وہ صرف اتنا ہی سوچ سکتا تھا کہ کوئی دوسری ریاضت کرے
تاکہ اس کا ذہن اس کے جسم میں اتر جائے اور اسے پھر سے حاصل کرے اور
اپنا اندر اندر احترام کرتا رہے۔

وہاں صبح سویرے لوگوں کی ملاقاتوں اور کھانے کی دعوتوں کا جہاں تک تعلق ہے صرف ایک کٹھ پھوڑوا دروازہ پہ دستک دے گا۔ اوہ! لوگوں کا تو ایک بھاری ہجوم جمع ہو گیا ہے۔ وہاں دھوپ بھی بہت تیز ہے۔ لوگ جنم سے ہی زندگی کے بکھیڑوں میں اُلجھے ہوئے ہیں۔ اس لئے میرے کام کے نہیں ہیں۔ میرے پاس تو چشمے کا پانی ہے۔ اور الماری کے تختے پر بھوری روٹی کا ایک ٹکڑا ہے۔ سُنئیے ۔ مَیں پتّوں کی سرسراہٹ سُن رہا ہوں۔ کیا یہ گاؤں کا کوئی نیم گرسنہ شکاری کتا ہے۔ جو کسی شکار کا پیچھا کرنے کی عادت کے ہاتھوں مجبور ہے؟ یا کسی کا کھویا ہوا سؤر ہے جو اس جنگل میں بھٹکتا پھر رہا ہے۔ جس کے قدموں کے نشانات میں نے بارش کے بعد دیکھے ہیں؟ — وہ بڑی تیزی کے ساتھ آ رہا ہے — میرے سماق کے درخت اور بیٹھی گوندنیوں کے پیڑ لرز رہے ہیں۔ اچھا آپ حضرت شاعر ہیں — آج اس دُنیا کو آپ کیا بتا رہے ہیں؟

شاعر: آپ بادل دیکھتے ہیں۔ کس طرح چھائے ہوئے ہیں۔ آج میں نے یہ سب سے بڑی بات دیکھی ہے۔ ایسا دلآویز منظر کسی پرانی تصویر میں نہیں۔ ایک دفعہ جب ہم اسپین کے ساحل پہ پہنچے ہمیں وہاں ایسا منظر نظر آیا تھا۔ واقعی سمندر کا آسمان جیسا رنگ تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ مجھے اپنی روزی پیدا کرنی ہے۔ اور آج میں نے کچھ کھایا بھی نہیں ہے۔ اس لئے چل کر کچھ مچھلیاں پکڑنی چاہئیں۔ شاعروں کا یہ سب سے عمدہ شغل ہے۔ میں بس یہی ایک کام جانتا ہوں ۔ آئیے چلیں ۔

سنیاسی: مَیں ابھی نہیں رُک سکتا چونکہ میری بھوری روٹی بہت جلد ختم ہو جائے گی۔ مَیں فوراً آپ کے ساتھ خوشی خوشی چلوں گا۔ لیکن میں ابھی ابھی اپنا مراقبہ ختم کرنے والا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ میں اپنے مراقبہ کے انجام تک پہنچ چکا ہوں۔ آپ مجھے تھوڑی دیر کے لئے تنہا چھوڑ دیجئے۔ آپ اس درمیان میں چارہ کاٹئے تاکہ کہیں دیر نہ ہو جائے۔ اس گرد و نواح میں چارے کے لئے کیڑے بہت ہی کم ملتے ہیں۔ اس

لئے کہ یہاں زمین میں کھاد نہیں ڈالی گئی ہے۔ ان کیڑوں کی نسل یہاں تقریباً ختم ہو چکی ہے۔ چارہ کھودنے کا شغل بھی اتنا ہی دلچسپ ہے جتنا مچھلی پکڑنا۔ خاص طور سے جب بھوک لگی ہو۔ یہ دلچسپ کام آج صرف آپ کے ذمہ ہے میرا خیال ہے کہ یہاں مونگ پھلی لگی ہے۔ وہاں پھاوڑے سے زمین کھود دیجئے جہاں چاند سورج چمک رہا ہے میرے خیال میں آپ کو تین پھاوڑے بھر مٹی کھودنے کے بعد ایک کیڑا ملے گا بشرطیکہ آپ اسے توجہ سے نکال پائیں جس طرح آپ جھاڑ جھنکار کی جڑیں مٹی سے نکالتے ہیں۔ یا اگر آپ پادری جی! پسند کریں تو یہ کوئی حماقت نہ ہوگی۔ اس لئے کہ میں جتنی مرتبہ جریب یہاں سے دور گیا ہوں مجھے اتنے ہی زیادہ اچھے کیڑے ملے ہیں۔

سنیاسی:۔ (اپنے آپ سے) اچھا تو میں کہاں تھا؟ مجھے ایسا یاد آتا ہے کہ میرے خیال کا انداز یہ تھا۔ میں دنیا کو اس زاویہ نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔ میں جنت میں جانے کی فکر کروں یا مچھلی پکڑنے کی؟ اگر میں اپنے اس انہماک کو اس قدر جلد ختم کر دوں تو کیا پھر ایسا نایاب موقع مجھے مل سکے گا؟ میں حقائق میں اشیاء کے مدغم ہونے کے اتنا قریب تھا کہ اب شاید عمر بھر اتنا قریب نہیں ہو سکوں گا۔ مجھے خوف ہے کہ میرے یہ خیالات اب پلٹ کر نہیں آئیں گے۔ ان کو سیٹی بجا کر بلانا بے سود ہوگا جب وہ خود ہی آنے کے لئے آمادہ ہوں تو کیا یہ عقلمندی ہوگی کہ میں ان سے یہ کہوں کہ میں ذرا سوچ کر تمہیں بلا لوں گا۔ میرے خیالات نے اپنا کوئی نقشِ قدم نہیں چھوڑا ہے۔ میں راستہ دوبارہ نہیں تلاش کر سکتا۔ میں کیا سوچ رہا تھا؟ یہ ایک بہت ہی دھندلا دن تھا۔ میں کنفیوشس کے صرف یہ تین جملے دہراؤں گا۔ وہ شاید میری ذہنی کیفیت کو بحال کر دیں۔ میں نہیں جانتا کہ وہ افسردگی تھی یا وجدان کی کھلتی ہوئی کلی۔ ایک طرح کا موقع بار بار نہیں آتا۔

شاعر:۔ سنیاسی جی۔ کیا اب بھی میں جلدی کر رہا ہوں؟ مجھے پورے تیرہ کیڑے

مل گئے ہیں۔ ان کے علاوہ ادھورے یا چھوٹے کیڑے تو بے شمار ہیں۔ لیکن ان سے چھوٹی مچھلی پکڑی جا سکے گی۔ وہ کانٹے پر ٹھیک طرح سے پورے نہیں آتے۔ گاؤں کے کیڑے بہت بڑے ہوتے ہیں۔ ایک چلوہ مچھلی کانٹا چھوئے بغیر ان سے اپنا پیٹ بھر سکتی ہے۔

سنیاسی :۔ اچھا آؤ چلیں۔ کیا کنکارڈ کی جانب چلیں؟ اگر پانی چڑھا ہوا نہ ہوگا تو اچھی تعداد میں مچھلیاں ہاتھ لگیں گی۔

ٹھیک وہی چیزیں کیوں ایک دنیا تعمیر کرتی ہیں جن کو ہم دیکھتے ہیں؟ حیوانوں کی یہی انواع انسان کی پڑوسی کیوں ہیں؟ ایسا دکھائی دیتا ہے جیسے ایک چوہا بھی اس خلا کو پُر کر سکتا تھا۔ مجھے شک ہے کہ پلپے اینڈ کمپنی نے جانوروں سے بہت اچھا کام لیا ہے۔ کیونکہ وہ سب باربردار جانور ہیں۔ اور ایک طرح سے ہمارے خیالات کا ایک حصہ بھی ان پر لدا ہوتا ہے۔

میرے گھر میں جو چوہے اودھم مچایا کرتے تھے وہ عام قسم کے نہیں تھے یعنی جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کو اس ملک میں نرو نج دیا گیا ہے۔ میرے چوہے اس طرح کے جنگلی چوہے تھے جو قصبہ میں نہیں پائے جاتے۔ میں نے ان میں سے ایک نامور ماہر حیوانات و نباتات کے پاس بھیج دیا تھا۔ اس نے اس میں گہری دلچسپی لی۔ جب میں اپنا مکان تعمیر کر رہا تھا تو ان میں سے ایک چوہے کا بل میرے مکان کے نیچے تھا اور اس سے قبل کہ میں دوسری منزل اٹھاتا اور ملبہ اٹھا کر پھینک دیتا وہ برابر سحر کے وقت آتا اور میرے پاؤں کے پاس پڑے ہوئے ٹکڑے اٹھا کر لے جاتا۔ اس نے غالباً اس سے پہلے کبھی کسی انسان کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ مجھ سے بہت جلد مانوس ہو گیا۔ میرے جوتوں اور کپڑوں پر چڑھ دوڑتا۔ کمرے کی پتلی دیواروں پر چڑھ جاتا۔ گلہری کی طرح جس سے اس کی حرکات بہت ملتی جلتی تھیں۔ وہ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد تیزی سے چڑھ جاتا تھا۔ آخر ایک دن جب میں ایک بنچ پر اپنی کہنی ٹکائے

ہوئے بیٹھا تھا وہ میرے کپڑوں پر چڑھ کر میری آستین تک آپہنچا۔ پھر اُس کاغذ کے گرد دوڑنے لگا جس میں میرا کھانا رکھا ہوا تھا۔ میں نے اس کاغذ کو بند رکھا تھا وہ اُس سے آنکھ مچولی کھیلنے لگا۔ آخر کار جب میں نے انگشتِ شہادت اور انگوٹھے کے درمیان پنیر کا ایک ٹکڑا لے کر اُسے دکھایا تو وہ میرے ہاتھ پر چڑھ آیا اور پنیر کترنے لگا۔ وہ یونہی میرے ہاتھ پر بیٹھا ہوا کھاتا رہا۔ اس کے بعد اس نے اپنا منہ اور اپنے پنجے اسی طرح صاف کئے جس طرح مکھیاں کیا کرتی ہیں اور پھر وہ وہاں سے چلا گیا۔

ایک فوبی چڑیا نے میرے شیڈ میں اور ایک روبن (سرخ سینے والی چڑیا) نے صنوبر کے درخت میں جو میرے مکان کے سامنے اگا ہوا تھا اپنی حفاظت کے لئے گھونسلے بنائے۔ جون میں ایک مادہ تیتر جو بہت شرمیلی ہوتی ہے اپنے بچے لئے ہوئے میری کھڑکی کے سامنے سے گزری ——— وہ پچھلی جنگل سے مرغیوں کی طرح کٹ کٹ کرتی اور بلاتی ہوئی اُن کو میرے گھر کے سامنے لے آتی۔ اس کے رویہ سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ وہ جنگل کی مرغی ہے۔ جہاں آپ آتے ہوئے دکھائی دیئے ماں کی ایک ہی آواز پر سارے بچے اس طرح غائب ہو جاتے ہیں جس طرح آندھی ان کو اُڑا کر لے گئی ہو۔ وہ سوکھی پتیوں اور ٹہنیوں سے اتنے ملتے جلتے ہوتے ہیں کہ اکثر اوقات راہگیر نادانستہ طور پر ان کے بیچ میں پاؤں رکھ دیتا ہے اور جب ماں پھڑ پھڑا کر اڑتی ہے تو راہگیر چونکتا ہے۔ اس کی چیخ پکار سنتا ہے اور اُسے پر پھڑ پھڑا کر اپنی جانب متوجہ کرتے ہوئے دیکھتا ہے پھر کہیں جا کر اس کی سمجھ میں آتا ہے کہ وہ تیتر کے بچوں کے بیچ میں کھڑا ہے۔ بعض اوقات ماں اپنے بال و پر یوں پریشان کئے ہوئے لوٹے گی اور لٹو کی طرح چکر کاٹے گی کہ آپ پہلی نگاہ میں پہچان جائیں گے کہ وہ کس قسم کی مخلوق ہے۔ بچے بالکل خاموش دبکے ہوئے بیٹھ جائیں گے۔ اکثر اپنے سر کسی پتی کے نیچے چھپا لیں گے۔ اور ماں کی فاصلے سے دی جانے والی ہدایات پر عمل کرتے رہیں گے۔ آپ کے قریب آنے پر بھی وہ اٹھ کر نہیں بھاگیں گے اور نہ

کسی طرح یہ ظاہر ہونے نہیں دیں گے کہ وہ کہاں چھپے ہوئے بیٹھے ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان
پر آپ کا پاؤں پڑ جاتا ہے۔ اور یوں بھی ہوتا ہے کہ وہ ایک منٹ تک آپ کی نظر کے سامنے ہوتے
ہیں پھر بھی آپ کو ان کی موجودگی کی خبر تک نہیں ہوتی۔ میں نے ان کو اپنے کھلے ہوئے ہاتھ پر
ایسے اوقات میں بٹھا لیا ہے۔ لیکن ان کو یہی فکر رہی کہ وہ اپنی فطرت اور اپنی ماں کی
اطاعت کریں۔ وہ خاموش بیٹھے رہتے۔ نہ ڈرتے نہ کانپتے۔ ان میں یہ میلان اتنا
کامل ہے کہ ایک دفعہ جب میں ان بچوں کو پھر سے پتوں میں رکھ رہا تھا تو ان میں سے
ایک اتفاق سے اپنے ایک پہلو پر گر پڑا۔ وہ دس منٹ بعد بھی دوسروں کے ساتھ اسی
پہلو پر پڑا ہوا ملا۔ وہ اکثر پرندوں کے بچوں کی طرح بے بال و پر نہیں ہوتے بلکہ مرغی
کے بچوں سے زیادہ کامل اور وقت سے پہلے ہوشیار ہو جاتے ہیں۔ ان کی کھلی اور
اور نرم آنکھوں میں ایک حیرت انگیز حد تک اطمینان لیکن معصومانہ اور ناقابلِ فراموش
چمک ہوتی ہے۔ ان میں ہر طرح کی ذہانت جھلکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ ان سے
صرف بچپن کی پاکیزگی ہی نمایاں نہیں ہوتی ہے بلکہ وہ ہوشیاری بھی جو تجربہ کے
بعد میسر آتی ہے۔ اس طرح کی آنکھ پرندے کے ساتھ ختم نہیں ہوتی ہے بلکہ اس
آسمان کی ہمعصر ہوتی ہے جسے وہ منعکس کرتی ہے۔ جنگل میں اس طرح کا کوئی
موتی نہیں ہوتا۔ مسافر کو ایسے صاف کنوئیں میں جھانکنے کا کم ہی موقع ملتا ہے۔
جاہل یا بے پروا شکاری ایسے اوقات میں ماں کو نشانہ بنا لیتا ہے۔ اور ان معصوموں
کو کسی شکاری جانور یا پرندے کا شکار بننے کے لئے چھوڑ دیتا ہے۔ یا آہستہ آہستہ
ان گلی سڑی پتیوں کا جزو بن جانے کے لئے رہنے دیتا ہے جن سے وہ بہت
ملتے جلتے ہوتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اگر کوئی مرغی تیتر کے انڈے سے ان کے بچے
نکالے تو وہ ذرا سا خطرہ محسوس کرتے ہی فوراً منتشر اور گم ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ
ہے کہ وہ اپنی ماں کی طرف سے بلاوے کی آواز نہیں سنتے۔ یہی میری مرغیاں اور

طرح ڈگ مگ ڈولتی ہوئی اڑنے لگتی تھی جیسے اس کے پر یا پاؤں ٹوٹ گئے ہوں،
تاکہ میری توجہ اپنی طرف مبذول کرا سکے۔ اس کے بچے دھیمی دھیمی چیں چیں کے ساتھ
بھاگتے ہوئے اس کی ہدایت کے مطابق ایک کے پیچھے ایک دلدل میں جا کر چھپ
جاتے تھے۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ بچوں کی چیں چیں تو سنائی دیتی لیکن ان کی ماں
کہیں نظر نہ آتی تھی۔ چشمے پر جنگلی فاختائیں جمع ہو کر بیٹھا کرتیں یا میرے سر پر سفید صنوبر کی
شاخوں میں پھڑ پھڑا کر اڑا کرتی تھیں یا سرخ گلہری قریب ترین شاخوں سے دوڑ
کر اترتی یہ مجھ سے خاص طور پر مانوس ہو گئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اسے ہر
معاملہ کی کھوج لگانے کی لگن ہو گئی تھی۔ آپ کو بس اتنی ضرورت ہے کہ جنگل میں کسی دلکش
جگہ پر تھوڑی دیر کے لئے بیٹھ جائیں اور پھر دیکھئے کہ جنگل کے سارے باسی ایک ایک
کر کے آپ کے سامنے مظاہرہ کرنے لگیں گے۔

میں نے اس سے کم پرامن نوعیت کے واقعات بھی دیکھے ہیں۔ ایک روز جب
میں اپنی لکڑیوں کے ڈھیر پر گیا یعنی کہ کندوں کے ڈھیر کے قریب گیا تو میں نے چیونٹیوں
کو لڑتے دیکھا۔ ایک چیونٹی سرخ تھی اور دوسری کالی۔ یہ کالی چیونٹی بہت بڑی تھی۔
تقریباً آدھا انچ لمبی۔ دونوں ایک دوسرے سے لپٹی ہوئی تھیں اور اس طرح جکڑی ہوئی تھیں کہ وہ ایک دوسری
کو چھوڑتی ہی نہ تھیں۔ دونوں لڑتی ہوئی لکڑی کے تختہ پر لڑھکتی ہوئی جاتی تھی اور ایک دوسرے
سے گتھی ہوئی برابر چمٹی ہوئی جنگ جاری رکھتی تھیں۔ میں نے جب دور تک نظر
دوڑائی تو مجھے یہ دیکھ کر سخت تعجب ہوا کہ ساری سفیلوں پر اسی طرح کی جنگ جاری
تھی یہ صرف ایک دو چیونٹیوں کی لڑائی نہ تھی بلکہ دو قسم کی چیونٹیوں میں باقاعدہ
جنگ ہو رہی تھی۔ ساری سرخ چیونٹیاں کالی چیونٹیوں سے لڑ رہی تھیں اور اکثر دو دو سرخ
چیونٹیاں ایک ایک کالی چیونٹی سے گتھم گتھا تھیں۔ ان جنگ آزماؤں کی فوجوں کے
پرے کے پرے میری لکڑیوں کے ڈھیر کی ساری وادیوں اور پہاڑیوں میں پھیلے ہوئے

تھے۔ سرخ و سیاہ اور مردہ و نیم مردہ چیونٹیاں زمین پر چت لیٹی ہوئی تھیں۔ میں نے عمر بھر میں یہی ایک جنگ دیکھی تھی۔ یہی ایک ایسا میدانِ کارزار تھا جہاں میں اس گھڑی موجود تھا جبکہ لڑائی ہو رہی تھی۔ یہ ایک دوسرے کا قلع قمع کر دینے والی جنگ تھی اِس میں سرخ جمہوریت پسند ایک جانب تھیں اور کالی بادشاہت نواز دوسری جانب۔ وہ چاروں ایک دوسری کو ہلاک کر رہی تھیں۔ پھر بھی مجھے کوئی شور سنائی نہ دیا اور نہ کبھی میں نے انسانی جنگ آزماؤں کو اس استقلال کے ساتھ کبھی لڑتے دیکھا تھا۔ میں نے دو ایسی چیونٹیوں کو دیکھا جو آپس میں گتھم گتھا تھیں۔ چھپتیوں کے درمیان ایک روشن وادی میں۔ وہ اس وقت دوپہر کو اس طرح لڑ رہی تھیں جیسے انہوں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ یہ جنگ اسوقت تک جاری رہے گی جبتک سورج ڈوب نہیں جاتا یا جان نہیں چلی جاتی۔ مقابلتہً چھوٹی سرخ اور بہادر چیونٹی دشمن کے اگلے حصہ سے چمٹ گئی تھی۔ اور اکھاڑے میں ہچکنیاں کھاتی پھر رہی تھی۔ مگر اس نے اپنی گرفت کبھی ڈھیلی نہ ہونے دی اور دشمن کی ایک سونڈ کو مسلسل جڑ سے کاٹتی رہی۔ وہ دوسری سونڈ پہلے ہی کاٹ چکی تھی۔ اس درمیان میں مضبوط تر کالی چیونٹی اُسے اِدھر اُدھر پٹکتی رہی اور جب میں نے پاس جاکر دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ سرخ چیونٹی کے کئی اعضا توڑ کر پھینک چکی تھی۔ وہ بلی کتے سے بھی زیادہ دلجمعی کے ساتھ لڑ رہی تھیں۔ ان میں سے کوئی پسپا ہونے کا ارادہ نہیں رکھتی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ اُن کا نعرۂ جنگ ہے "فتح یا موت!!" اس درمیان میں اس وادی میں ایک سرخ چیونٹا جوش میں بھرا ہوا آنکلا۔ وہ یا تو اپنے دشمن کو موت کے گھاٹ اتار چکا تھا یا اس نے ابھی تک جنگ میں حصہ نہیں لیا تھا۔ غالباً موخرالذکر بات سچی تھی۔ اس لئے کہ ابتک اس کے سارے اعضا صحیح و سالم تھے۔ غالباً اس کی ماں نے اُسے حکم دیا تھا کہ بیٹا جاؤ واپس آنا تو اپنی ڈھال لئے ہوئے آنا یا ڈھال کے اوپر آنا۔ شاید وہ کوئی ایکلیز دیونانی پہلوان) تھا جو الگ رہ کر اپنے غصہ کی پرورش کر رہا تھا اور اب اپنے

پیٹروکلس کو بچانے یا اس کا بدلہ لینے کے لئے آیا تھا۔ اس نے دور ہی سے یہ غیر مساوی
جنگ دیکھی اس لئے کہ کالی چیونٹیاں سرخ چیونٹیوں کے قد سے دگنی تھیں۔
وہ تیزی سے ان کے قریب آیا اور جنگ آزماؤں سے ایک انچ سے کم فاصلے پر
خم ٹھونک کر کھڑا ہو گیا۔ پھر موقع پاتے ہی وہ کالے پہلوان پر جھپٹ پڑا۔
اور اس نے اس کے داہنے اگلے پیر پر نشتر زنی کا کام شروع کر دیا۔ اور یہ
بات کالے چیونٹے پر چھوڑ دی کہ وہ اس کے جسم کا کوئی حصہ چاہے تو چن لے۔
اس طرح دو کی بجائے تین زندگی کے اس بندھن میں بندھ گئے۔ جیسے ایک نئی
قسم کی کشش ایجاد ہو گئی ہو اور جس کے مقابلہ میں ہر کشش ہیچ ہو۔ اتنی دیر تک یہ منظر
دیکھنے کے بعد مجھے یہ بتایا جاتا کہ انہوں نے اپنے فوجی بینڈ چپٹیوں پر کھڑے کر
رکھے ہیں جو سست سپاہیوں کا دل بڑھانے اور دم توڑنے والوں کو جوش دلانے کے
لئے اپنے اپنے قومی ترانے بجا رہے ہیں تو مجھے کوئی تعجب نہ ہوتا۔ کسی حد تک میں خود بھی
اس طرح جوش میں آگیا تھا جیسے وہ لڑنے والے چیونٹے نہ ہوں انسان ہوں —
آپ اس پر جتنا غور کریں گے اتنا ہی آپ کو اس میں کم فرق ملے گا۔ امریکہ کی تاریخ
میں چاہے اس قسم کی جنگ کا ذکر ہو لیکن کنکارڈ کی تاریخ میں ایسی جنگ کا کوئی
ذکر نہیں ہے جو لڑنے والوں کی تعداد، حب الوطنی یا شجاعت کے مظاہرے کے
اعتبار سے اس جنگ کے مقابلے میں پیش کیا جا سکے۔ سپاہیوں کی تعداد اور اپنی
کشتیوں کے اعتبار سے وہ جنگ آسٹرلز یا ڈریسڈن کی جنگ کے مترادف تھی یعنی جنگ
کنکارڈ — وطن پرستوں کی طرف سے دو شہید ہوئے۔ اور لوتھر بلانچارڈ زخمی ہوا۔ یہاں
تو ہر ایک چیونٹی بٹرک تھی "گولی چلاؤ — خدا کے لئے گولی چلاؤ!" اور ہزاروں کا
وہی حشر ہوا جو "ڈیوس" اور "ہوسمر" کا ہوا تھا۔ اس جنگ میں ایک بھی بھاڑے کا ٹٹو
نہ تھا۔ مجھے یقین ہے کہ ہمارے آباؤ اجداد کی طرح چیونٹیاں بھی کسی نہ کسی اصول کی

کے بعد وہ کسی بڑی مشقت کے قابل نہ رہا۔ مجھے نہ تو یہ پتہ چلا کہ اُن میں سے کون سا فریق جیتا اور کونسا ہارا۔ اور نہ اس جنگ کی وجہ معلوم ہو سکی۔ لیکن دن بھر میرے جذبات برانگیختہ رہے اور میں اُداس رہا جیسے میں نے اپنے دروازے کے سامنے انسانوں کی جنگ کا شور و غل، قتل و غارت، خونریزی و خون آشامی اپنی آنکھوں سے دیکھی ہو۔

کربی اور اسپنس ہمیں بتاتے ہیں کہ چیونٹیوں کی جنگیں ایک زمانہ سے مشہور ہیں۔ اور اُن کی تاریخیں تک لکھی گئی ہیں۔ اور وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جدید ادیبوں میں صرف ہیوبر ہی ایسا ادیب ہے جس نے یہ جنگیں دیکھی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اینیاس سلویس ایک ایسی جنگ کا مفصل ذکر کرنے کے بعد جو بڑی اور چھوٹی چیونٹیوں کے درمیان ایک ناشپاتی کے درخت کے تنے پر بڑی شدت سے لڑی گئی تھی، مزید لکھتا ہے کہ یہ جنگ پاپائے روم الیوجینیس چہارم کے عہد میں نکولس پسٹورین سس ایک نامور وکیل کی موجودگی میں ہوئی تھی جس نے اس جنگ کی تاریخ بڑی صداقت اور دیانت داری سے بیان کی ہے بڑی اور چھوٹی چیونٹیوں کے درمیان ایک ایسی ہی جنگ کا ذکر اولاس میگناس نے کیا ہے جس میں کہا جاتا ہے کہ چھوٹی چیونٹیوں نے فتح پاکر اپنے کشتوں کو تو دفن کر دیا لیکن اپنی دلیر دشمن چیونٹیوں کی لاشوں کو پرندوں کے شکار کے لئے چھوڑ دیا۔ یہ واقعہ سویڈن کے جابر بادشاہ کرسٹیرن دوم کی جلاوطنی سے پہلے ظہور میں آیا۔ میں نے جو جنگ دیکھی تھی وہ پریذیڈنٹ پولک کے عہد میں ویبسٹر کے مفرور غلاموں سے متعلق بل کے پاس ہونے سے پانچ برس پہلے لڑی گئی تھی۔

گاؤں کے بہت سے بلی کتے جو صرف باورچی خانے کے چوہوں کو دوڑا کر بھگا سکتے تھے جنگل میں اپنے مالکوں کو مطلع کئے بغیر اپنے بھاری بھرکم جسم لئے ہوئے چلے آتے تھے۔ یہاں وہ لومڑیوں کے چھوڑے ہوئے بھٹ اور گلہریوں کے بل خواہ مخواہ سونگھتے

پھرتے تھے۔ کبھی کبھی کوئی مریل سا بازاری کتا ان کی رہنمائی کیا کرتا تھا جو جنگل میں بڑی پھرتی سے گھوما کرتا اور اب بھی جنگل کے باسیوں کے دلوں میں خوف و ہراس کی لہر دوڑا دیتا بلی کتا ایک نر گاؤ کی طرح اپنے رہنما سے بہت پیچھے ہٹ کر بھونکتا ہوا کسی گلہری پر اپنے بھدے جسم سے جھپٹتا لیکن وہ کسی وقت درخت پر چڑھ کر۔ اس کی حرکتیں بڑے ہی غور سے دیکھتی رہتی پھر جھاڑیوں کو اپنے بوجھ سے دباتا ہوا اسی خاندان کی بھٹکی ہوئی گلہری کے تعاقب میں نکل کھڑا ہوتا۔ مجھے ایک دفعہ تالاب کے پتھریلے ساحل پر ایک بلی کو ٹہلتے ہوئے دیکھ کر بڑا تعجب ہوا اس لئے کہ ایسے جانور گھر سے شاذو نادر ہی جاتے ہیں۔ یہ ملاقات دونوں کے لئے تعجب خیز تھی۔ بہرکیف ان تمام باتوں کے باوجود ایک گھریلو بلی جو عمر بھر قالین پر لیٹی رہتی ہے جنگل میں آ کر کوئی اجنبیت نہیں محسوس کرتی۔ اور اپنے عیارانہ اور مکارانہ افعال سے ظاہر کر دیتی ہے کہ جنگل اس کے اصل باسیوں سے کہیں زیادہ اس کا گھر ہے۔ ایک دفعہ جب میں گوندنیاں توڑ رہا تھا تو مجھے ایک جنگلی بلی اپنے بچوں سمیت ملی۔ اپنی ماں کی طرح بچے بھی اپنی پیٹھ اونچی کر کے مجھ پر غرانے لگے۔ جنگل میں میرے قیام سے چند برس پہلے مسٹر گلین بیکر کے فارم میں جو تالاب کے قریب لنکن میں واقع تھا ایک ایسی ہی بلی تھی جسے "پروں والی بلی" کہا جاتا تھا۔ جب میں جون ۱۸۴۲ء میں اسے فارم پر دیکھنے گیا تو وہ حسب معمول جنگل میں شکار کھیلنے کے لئے جا چکی تھی۔ میں نہیں جانتا کہ وہ بلی تھی یا بلا۔ اسی لئے میں تانیث سے کام لے رہا ہوں۔ اس کی مالکن نے بتایا کہ ایک سال سے زائد عرصہ ہوا اپریل کے مہینے میں وہ اس گردونواح میں آئی تھی اور آخرکار انہوں نے اسے اپنے گھر میں پال لیا تھا۔ وہ سیاہی مائل مٹیالے رنگ کی تھی۔ اس کے حلق پر ایک سفید داغ تھا اور ٹانگیں بھی سفید تھیں۔ اس کی دم لومڑی کی طرح بڑی گچھے دار تھی۔ موسم سرما میں اس کے پہلوؤں کے بال کافی بڑے ہو کر چپٹے ہو جاتے تھے اور دو دو انچ لمبے اور ڈھائی ڈھائی انچ چوڑے ٹکڑے بن جاتے تھے۔ ٹھوڑی کے نیچے کے بال مفلر کی طرح اوپر سے بکھرے

اور اندر سے نمدے کی طرح گتھے رہتے تھے۔ موسم بہار میں یہ سارے فالتو بال جھڑ جاتے تھے۔ مجھے انہوں نے اس کے پروں کا ایک جوڑا دیا تھا جو میرے پاس اب بھی موجود ہے۔ اُن کے اندر کہیں بھی کسی جھلی کا پتہ نہیں چلتا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ اس بلی میں کسی اُڑنے والی گلہری یا کسی دوسرے جنگلی جانور کا کوئی حصہ تھا اور یہ بات ناقابلِ یقین بھی نہیں تھی کیونکہ حیوانات و نباتات کے ماہرین کے قول کے مطابق گھریلو بلی اور سمور دار نیولے کے اختلاط سے بکثرت دو غلے جانور پیدا ہوتے ہیں۔ اگر میں کوئی بلی پالتا تو وہ میرے لئے بالکل موزوں بلی ہوتی کیونکہ ایک شاعر کی بلی کو اس کے راہوارِ تخیل کی طرح پر دار ہونا ہی چاہیئے!

موسم خزاں میں پن ڈبی حسبِ معمول گریز کرنے اور نہانے کے لئے آجاتی تھی۔ میں صبح کو جاگنے بھی نہ پاتا کہ جنگل اس کے قہقہے سے گونجنے لگتا تھا۔ جوں ہی اسکی آمد کی خبر پھیلتی ڈیموں میں شکار کھیلنے والے تیار ہو جاتے اور گاڑیوں میں سوار یا پیدل، دو دو تین تین کر کے پیٹنٹ رائفلیں، ۔۔۔۔ کارتوس اور دوربینیں لئے ہوئے آدھمکتے۔ وہ خزاں زدہ پتیوں کی طرح جنگل میں کھڑکھڑاتے اور ایک پن ڈبی پر تین شکاریوں کے حساب سے پل پڑتے۔ بعض شکاری تالاب کے اس کنارے پر اور بعض دوسرے کنارے پر رہتے اس لئے کہ غریب پرندہ ہر جگہ موجود نہیں رہ سکتا تھا۔ اگر وہ یہاں ڈبکی لگاتی تو وہاں جا نکلتی۔ لیکن اب تو اکتوبر کی مہربان ہوائیں پتیوں کو کھڑکھڑاتی اور پانی میں تموج پیدا کرتی ہوئی چلنے لگی تھیں۔ پن ڈبی کے دشمن تالاب کو دوربین لگا کر دیکھتے اور اپنی بندوقوں کی تڑا تڑ اپنی آواز سے سارے جنگل کو سر پہ اٹھا لیتے۔ لیکن اب نہ پن ڈبی کی آواز سنائی دیتی اور نہ اس کی صورت دکھائی پڑتی تھی۔ بڑی بڑی لہریں اٹھتیں اور پرندے کی حمایت میں دونوں کناروں سے بڑی شدت کے ساتھ ٹکراتیں اور ہمارے شکاریوں کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ رہتا کہ وہ پسپا ہو جائیں۔ اور اپنی اپنی دو کانوں یا اپنے

اپنے نامکمل کاموں پر لوٹ جائیں۔ لیکن بدقسمتی یہ تھی کہ وہ اپنے شکار میں اکثر کامیاب ہو جاتے تھے۔ جب میں صبح سویرے ایک بالٹی پانی لانے کے لئے جاتا تو میں چند جریب کے فاصلہ پہ اس عظیم الشان پرندے کو اپنی کھاڑی سے اڑتے ہوئے دیکھتا اگر میں ایک کشتی میں سوار ہو کر یہ دیکھنے کے لئے اس کا تعاقب کرتا کہ وہ کیا کیا سرگرمی کرتی ہے تو وہ ڈبکی لگا کر بالکل غائب ہو جاتی۔ اور میں بعض اوقات دن کے ختم ہونے تک دیکھ پاتا لیکن سطح آب پر یہاں اس سے زیادہ ہوشیار ثابت ہوتا تھا۔ بارش میں عام طور سے وہ بھاگ جاتی تھی۔

میں ایک پرسکون سہ پہر کو ڈبکیوں کی تلاش میں نکلا اور کشتی پر سوار ہو کر اسے شمالی کنارے کے متوازی دھیرے دھیرے چپو ڈولے سے چلانے لگا۔ میرا خیال تھا کہ وہ خاص طور سے ایسے پرسکون ایام میں جھیل پہ آ جاتی ہیں اور دودھیا پھولوں کی طرح تیرتی رہتی ہیں۔ لیکن جب کوئی بھی ڈبکی دکھائی نہ دی تو اچانک ایک ڈبکی مجھ سے چند جریب کے فاصلہ پر کنارے سے تالاب کے بیچ کی جانب ہوتی میرے قریب سے گذری اور قہقہہ لگا کر اس نے اپنے آپ کو ظاہر کر دیا۔ میں نے اس کا تعاقب کیا لیکن اس نے غوطہ لگایا اور جب اس نے پانی سے سر نکالا تو میں اس کے زیادہ قریب پہنچ چکا تھا۔ اس نے دوبارہ ڈبکی لگائی لیکن اس دفعہ میں نے اس کے پانی سے باہر نکلنے کی جگہ کے بارے میں غلط اندازہ لگایا۔ اس لئے وہ باہر نکلی تو میری کشتی سے ہمارے درمیان فاصلہ بڑھ گیا اور ہم ایک دوسرے سے پچاس جریب کی دوری پہ چلے گئے۔ اب پھر اس نے قہقہہ کی۔ اس بار اس کی ہنسی زیادہ بے محل تھی۔ وہ اسی طرح بڑی ہوشیاری سے پینترے بدلتی رہی۔ میں کبھی اس سے نصف درجن جریب سے کم فاصلہ پہ نہ پہنچ سکا۔ ہر بار جب وہ پانی سے سر نکالتی تو سر گھما کر ادھر ادھر دیکھتی اور بڑے اطمینان سے زمین اور

پانی کا اندازہ لگاتی اور بظاہر اپنے لئے ایسا راستہ اختیار کرتی جہاں پانی
کی چوڑائی زیادہ سے زیادہ اور کشتی سے بہت دور ہو۔ وہ جتنی جلدی سے اس
بات کا فیصلہ کرتی اور جس پھرتی سے اپنے فیصلہ کو عملی جامہ پہناتی وہ بہت ہی
حیرت انگیز ہوتا۔ وہ مجھے تالاب کے سب سے وسیع حصہ میں لے گئی اور پھر وہاں
سے نکلی۔ جب وہ اپنے ذہن میں کوئی خیال سوچ رہی ہوتی تھی۔ تو میں اُسے
بھانپنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ تالاب کی سطح پر ایک انسان اور ایک پن ڈبی کے
درمیان نہایت ہی [illegible] کھیل ہو رہا تھا۔ آپ کے حریف کی گوٹ اچانک
غائب ہو جاتی۔ پھر آپ کو اپنی گوٹ اس جگہ رکھنا ہوتا ہے جہاں اس کی گوٹ
نمودار ہوگی۔ بعض اوقات وہ میرے مخالف سمت میں نکلتی۔ بظاہر وہ کشتی کے نیچے
سے گزر کر گئی ہوتی تھی۔ اس میں اس قدر دم تھا کہ وہ سانس روکے رکھنے میں اتنی
ماہر تھی کہ وہ [illegible] تھک کر فوراً ڈبکی لگا دیتی۔ کوئی یہ نہ بتا سکتا تھا کہ اس وقت وہ کہاں چھپی ہوئی
سطح کے نیچے تالاب کی گہرائی میں وہ مچھلی کی طرح تیرتی ہوئی کدھر نکل جاتی ہے۔
کیونکہ تالاب کے گہرے سے گہرے حصے میں تہ تک پہنچنے کا اس کے پاس وقت ہوتا۔
اور اس میں صلاحیت بھی تھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ نیویارک کی جھیلوں میں سطح سے
اسی فٹ کی گہرائی میں پن ڈبیاں ایسے کانٹوں میں پھنس گئی ہیں جو ٹراؤٹ مچھلیوں
کے لئے ہوتے تھے۔ والڈن تالاب تو اس سے زیادہ گہرا ہے۔ جب مچھلیاں اس
دوسری دنیا کے بسنے والے بھونڈے مہمان کو اپنے جھنڈ میں سے تیزی کے ساتھ
گزرتا ہوا دیکھتی ہوں گی تو ان کو کس قدر تعجب ہوتا ہوگا۔ پھر بھی وہ پانی کے اندر کی
راہوں سے اتنی واقف معلوم ہوتی ہیں جس قدر سطح کے اوپر کے راستوں سے۔ پانی کے
اندر وہ اور بھی تیزی سے تیرتی تھیں۔ ایک دفعہ میں نے دیکھا کہ جب وہ سطح کے قریب
آئی تو ایک لہر سی بلند ہوئی اس نے سر نکال کر راستے اور خطرے کا اندازہ لگایا اور پھر

غوطہ لگا گئی۔ میں اس نتیجے پہ پہنچا کہ اس کی بجائے کہ اس کا تعاقب کیا جائے یا یہ اندازہ لگایا جائے کہ وہ اب کی بار کہاں **نکلے گی** ؟ یہ بہتر ہوگا کہ چپو رکھ کر بیٹھا رہا جائے اور اُسے خود ہی نکلنے دیا جائے۔ ایسا بارہا ہوا کہ میں اپنی آنکھوں پر زور دے کر سطح کی ایک جا دیکھ رہا ہوتا تو اچانک اپنی پیٹھ پہ اس کا وحشتناک قہقہہ سن کر چونک پڑتا لیکن یہ کیا بات تھی کہ اتنی تیاری کا اظہار کرنے کے باوجود بھی وہ جیسے باہر نکلتی قہقہہ کر کے اپنے مقام سے مطلع کر دیتی۔ کیا اس کا سفید سینہ اُسے نمایاں کرنے کے لئے کافی نہ تھا؟ میں نے سوچا کہ واقعی ایک ... احمق ڈبی ہے۔ جیسا کہ لوگ اس کے بارے میں کہتے ہیں۔ جب وہ نکلتی تھی تو پانی کا چھپاکا بھی سنائی دیتا تھا۔ مجھے معلوم ہو جاتا تھا کہ وہ کہاں ہے۔ لیکن ایک گھنٹہ کے بعد وہ بالکل تازہ دم ہوتی تھی۔ خوشی خوشی غوطے لگاتی تھی اور پہلے سے بھی زیادہ دور ... تیرتی چلی جاتی تھی۔ وہ جب سطح پہ آتی تو پانی کے اندر اس کے جالی دار پاؤں تیزی کے ساتھ کام کرتے رہتے اور سطح کے اوپر اپنے پرسکون انداز سے سینہ تانے تیرتی کہ حیرت ہوتی تھی۔ اس کی آواز شیطانی قہقہہ جیسی ہوتی۔ لیکن کبھی کبھی آبی پرندوں کی آواز سے مشابہ ہوتی۔ جب کبھی وہ مجھے ... بار بار غچے دینے میں بہت کامیاب رہتی اور بہت دور بھاگ جاتی تو ایک طویل ہیبتناک چیخ بلند کرتی جو پرندوں سے زیادہ بھیڑیے کی آواز سے مشابہ ہوتی تھی اور ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے کوئی جانور اپنی تھوتھنی زمین پہ رکھ کر عمداً چیختا ہے۔ یہ اس کے خللِ دماغ کی علامت تھی۔ جتنی آوازیں یہاں سنائی دیتی تھیں یہ آواز ان میں سب سے زیادہ وحشت ناک تھی اور سارا جنگل اس کی آواز سے دور دور تک گونجنے لگتا تھا۔ میں اس نتیجہ پہ پہنچا کہ اسے اپنی چالاکیوں پر پورا بھروسہ تھا اور وہ میری تدبیروں کی ہنسی اڑاتی تھی۔ اگرچہ اس وقت آسمان ابر آلود تھا لیکن سطح پہ کوئی سلوٹ نہ تھی۔ چاہے میں اس کی کوئی آواز نہ سنتا لیکن وہ جہاں کہیں بھی پانی سے باہر نکلتی میں اسے دیکھ لیتا تھا۔ اس کے سینے کی سفیدی، ہوا کا سکون اور پانی کا تموج یہ ساری باتیں اس کے خلاف تھیں۔ آخر کار تقریباً

پچاس جریب نزدیک آکر اُس نے اپنی وہی لمبی تان لگائی جیسے وہ پن ڈبیوں کے دیوتا کو پکار رہی ہو۔ میری مدد کیجئے! فوراً ہَوا چلنے لگی جھیل کی سطح پہ لہریں اُٹھنے لگیں اور ساری فضا کہرے جیسی پھوار سے بھر گئی۔ مجھے ایسا محسوس ہُوا جیسے پن ڈبی کی دُعا قبول ہو گئی ہو اور اُس کا دیوتا مجھ سے خفا ہو گیا ہو۔ مَیں ایسے طوفانی موجوں میں غائب ہوتا ہُوا چھوڑ کر اپنے گھر چلا آیا۔

میں نے خزاں کے ایام میں گھنٹوں بطوں کو دیکھا ہے۔ وہ نہایت ہوشیاری سے رُخ بدل کر اور گھوم گھوم کر تالاب کے وسط میں تیرتی رہتی ہیں تاکہ شکاری سے ذرا دُور ہی رہیں۔ لوزیانہ کے دریاؤں کی دلدلی شاخوں میں اُن کو اُن تدبیروں کی بھی ضرورت نہ ہوگی۔ جب اُن کو مجبوراً اُڑنا پڑتا تھا تو بعض اوقات وہ اس قدر بلند ہو کر اُڑنے لگتیں کہ وہاں سے دوسرا تالاب اور دریا دیکھ سکتی تھیں اور خود کالے دانوں کی طرح آسمان میں نظر آتی تھیں۔ جب میں سمجھتا کہ اب تو دیر ہو چکی ہے اور وہ کہیں چلی گئی ہوں گی تو ایک چوتھائی میل تک آڑی ترچھی پرواز کر کے والڈن ہی کے کسی دُور افتادہ خالی حصّے میں اُتر پڑتیں۔ لیکن والڈن کے بیچ میں تیرنے سے انہیں محفوظ رہنے کے علاوہ اور کونسا فائدہ پہنچتا تھا۔ مَیں اس کے سوا اور کچھ نہیں جانتا کہ جس بِنا پر مَیں والڈن کے پانی سے پیار کرتا ہوں اُسی بنا پر وہ بھی اُسے عزیز رکھتی ہیں۔
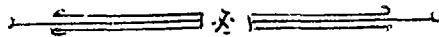
گھر گرم رکھنا

میں اکتوبر میں دریا کے سبزہ زاروں میں انگور جمع کرنے کے لیے جایا کرتا تھا۔ اور ان کے بڑے بڑے گچھوں سے لدا پھندا ہوا آیا کرتا تھا جو خوراک کی نسبت اپنے حسن اور اپنی خوشبو کے اعتبار سے زیادہ بیش بہا تھے۔ وہاں میں کرین بیری کو تحسین آمیز نگاہوں سے دیکھا کرتا مگر اسے توڑا نہیں کرتا تھا۔ کرین بیریاں چھوٹے چھوٹے مومی موتیوں کی طرح ہوتی تھیں۔ چراگاہ کی گھاس کے آبدار بُندوں کو کسان اپنے بدنما پھاوڑے سے اس طرح اکھاڑتا ہے کہ ہموار چراگاہ اوبڑ کھابڑ ہو جاتی ہے۔ وہ ان کی قیمت صرف بُشلوں کے وزن یا ڈالروں کے حساب سے لگاتا ہے۔ وہ چراگاہوں کی ان تباہ کاریوں کو بوسٹن یا نیویارک کے بازاروں میں بیچتا ہے۔ جہاں ان کی قسمت میں مربہ بننا لکھا ہوتا ہے۔ اور پھر وہ قدرت کے شیدائیوں کے شوق کی تسکین کرتی ہیں۔ اسی طرح یہ قصاب گاؤ میشوں کی زبانیں گھاس کی پتیوں سے کھینچ کر نکال لیتے ہیں اور مجروح اور مرجھائے ہوئے پودوں کی مطلق پروا نہیں کرتے۔ باربری کے درخشندہ پھل بھی میرے لیے صرف دعوتِ نظر تھا۔ لیکن میں نے جنگلی سیبوں کا ایک چھوٹا سا ذخیرہ اچار ڈالنے کے لیے جمع کر لیا تھا جن کو ان کے مالک یا سیاح نظر انداز کر گئے تھے۔ جب جوز پک جاتے تھے

تو میں موسمِ سرما کے لئے تقریباً چودہ سیر جمع کر لیا کرتا تھا۔ لنکن کے لامحدود جوز کے جنگلوں
میں جو اب ریل کی پٹڑیوں کے نیچے لمبی نیند سو رہے ہیں اس موسم میں اپنے کندھے سے
تھیلا لٹکائے اور کانٹے دار چھلکے ہٹا کر جوز گرانے کے لئے چھڑی ہاتھ میں لئے گھومنے
پھرنے میں بڑا مزا آتا تھا۔ میں اس بات کا انتظار نہیں کرتا تھا کہ کہرا پڑے تو میں جوز
جمع کرنے کے لئے نکلوں۔ پتیاں کھڑکھڑاتیں، سرخ گلہریاں اور نیل کنٹھ شور مچاتے
کیونکہ میں ان کے آدھے کھائے ہوئے جوز بھی بعض اوقات چرا لاتا تھا۔ مجھے معلوم
تھا کہ جن خوشوں کو انہوں نے چنا ہوتا تھا۔ ان میں اچھے جوزوں کا ہونا یقینی تھا
کبھی کبھی میں انہیں درختوں پہ ہلا دیتا تھا۔ جوز کے درخت میرے گھر کے عقب
میں بھی اُگے ہوئے تھے۔ ان میں ایک بڑا درخت تو میرے مکان کو اپنے سایہ میں لئے
ہوئے تھا جب پھلتا پھولتا تھا تو ایک گلدستہ کی طرح لگتا۔ دل و روح کو معطر کر دیتا
تھا لیکن اس کے پھل زیادہ تر گلہریاں اور نیل کنٹھ کھاتے تھے۔ مؤخرالذکر صبح سویرے
بڑے بڑے غولوں میں آیا کرتے تھے اور چھلکوں کے ٹپکنے سے پہلے ہی ان کی گریاں
کھا جاتے تھے۔ میں نے یہ درخت ان کے لئے چھوڑ رکھے تھے۔ مگر دور افتادہ
جنگل میں جو پورے کا پورا جوز کا تھا چلا جاتا تھا۔ یہ جوز بڑی حد تک روٹی کا
کام دیتے تھے۔ ممکن ہے بہت سی اور بھی چیزیں روٹی کی جگہ کام میں لائی جاتی
ہوں۔ ایک دن مچھلی کا چارہ کھودتے ہوئے ایک جڑ میں لگی ہوئی بہت سی مونگ
پھلیاں ملیں۔ یہ ابتدائی انسانوں کا آلو، ایک طرح کا افسانوی پھل ہے۔ مجھے شک ہو رہا
تھا کہ میں نے یہ ذکر کیا تھا کہ میں نے بچپن میں زمین کھود کر مونگ پھلی کھائی تھی تو کیا
واقعی ایسا ہوا تھا یا میں نے محض خواب دیکھا تھا۔ میں نے اس واقعہ کے بعد اکثر اس کے
سکڑے ہوئے مخملیں پھول اور دوسرے پودوں کی ٹہنیوں سے لپٹے ہوئے دیکھے تھے۔
اور ان کو پہچان نہیں سکا تھا۔ کاشتکاروں نے مونگ پھلی کو تقریباً ختم کر دیا ہے۔ اس کا

ذائقہ میٹھا ہوتا ہے۔ ویسا ہی جیسا کھرے کے مارے ہوئے آلو کا۔ مجھے بھنی ہوئی مونگ پھلی سے اُبلی ہوئی زیادہ پسند ہے۔ ایسا دکھائی دے رہا تھا جیسے قدرت نے اس مونگ پھلی کے ذریعہ ہم سے یہ وعدہ کیا ہے کہ وہ آیندہ اپنے بچے خود پیدا کرے گی۔ اور خود ہی ان کی غذا کا انتظام کرے گی۔ آج کے زمانے میں جب چربی سے لدے ہوئے مویشی اور لہلہاتے ہوئے کھیت عام ہیں۔ یہ حقیر سی جڑ جو کبھی انڈین قبیلہ کا امتیازی نشان تھی اب قطعاً فراموش کر دی گئی ہے۔ یا اگر اسے کوئی جانتا بھی ہے تو صرف اس کی پھولی ہوئی بیلوں کو جانتا ہے۔ لیکن اگر قدرت کو یہاں دوبارہ اپنی مرضی سے حکومت کرنے دی جائے تو ہمارے نرم اور بافراط انگریزی اناج لاکھوں دشمنوں کے مقابلے میں غائب ہو جائیں گے۔ اور انسان کا پہرہ نہ ہونے کی وجہ سے کوے اس کے آخری دانے تک کو اٹھا کر جنوب مغرب میں انڈینوں کے خدا کے کھلیان میں پہنچا دیں گے جہاں سے وہ اسے اٹھا کر یہاں لائے تھے۔ لیکن یہ مونگ پھلیاں جن کا تقریباً قلع قمع کر دیا گیا ہے کہرے اور گھاس پھوس کی فراوانی کے باوجود غالباً پھر اُگ آئیں گی اور شکاری قوم کی عام خوراک کی حیثیت سے اپنی پرانی اہمیت اور عزت پھر سے حاصل کر لیں گی۔ کوئی انڈین مسرِیز (زمین کی دیوی) یا منروا (فنونِ لطیفہ کی دیوی) اس کی موجد اور اسے عطا کرنے والی رہی ہوگی اور جب یہاں شاعری کی حکمرانی ہوگی تو اس کی پتیاں اور اسکی ریشوں میں لٹکی ہوئی پھلیاں ہمارے آرٹ کی تصانیف میں ممتاز مقام حاصل کر لیں گی۔

یکم ستمبر تک تالاب کے اس پار دو تین چھوٹے میپل کے درختوں کو میں سرخ ہوتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ یہ درخت پانی کے قریب خشکی کی اس بلندی کے نیچے تھے جس پر سفیدے کے تین درخت مختلف سمتوں میں نکلے ہوئے تھے۔ آہ ان کا رنگ بہت سی کہانیاں کہتا تھا۔ بتدریج ہفتہ بہ ہفتہ ہر درخت کی خصوصیت نمایاں ہونے لگیں۔ اور ان میں سے ہر ایک درخت جھیل کے چمکتے آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر جھومنے لگتا تھا۔ ہر صبح اس نگارخانے

کا منتظم پرانی تصویروں کی جگہ زیادہ خوش رنگ تصویریں ان دیواروں پہ آویزاں کر دیتا تھا
اکتوبر میں بھاری تعداد میں بھڑیں میرے مکان میں اس طرح آتی تھیں جیسے
اپنے سردیوں کے گھر میں آئی ہوں۔ وہ میری کھڑکی کے اندرونی حصے میں چھتے لگائیں اور
بعض اوقات مجھ سے ملنے کے لئے آنے والے لوگوں کو روکا کرتیں۔ ہر صبح کو جب وہ سردی
سے بے حس پڑی ہوتیں تو میں بہت سی بھڑوں کو جھاڑ کر باہر پھینک دیا کرتا تھا لیکن
مَیں نے اُن کو گھر سے بھی نکال باہر کرنے کی فکر نہیں کی تھی۔ مَیں کسی حد تک یہ محسوس کیا کرتا تھا
کہ وہ میرے گھر کو اپنے لئے ایک اچھی جائے پناہ سمجھتی ہیں۔ اگرچہ وہ میرے بستر میں بھی
گھس جاتی تھیں لیکن مجھے زیادہ ستایا نہیں کرتی تھیں۔ سخت سردی سے بچنے کے لئے وہ کن
کن درزوں اور شگافوں میں گھس کر غائب ہو جاتی تھیں اس کا مجھے کوئی علم نہیں ہے۔

مَیں بھڑوں کی طرح آخر کار نومبر میں اپنے سرمائی مکان میں جانے سے پہلے والڈن
کے شمال مشرقی حصے پہ جایا کرتا تھا۔ کالے صنوبر اور کنارے کے پتھر پہ آفتاب کا جو
عکس پڑتا تھا اس کے باعث یہ حصۂ تالاب کا آتش دان بن جاتا تھا۔ اپنے آپ کو سورج
کی گرمی سے گرمانا مصنوعی آگ تاپنے سے زیادہ خوشگوار اور صحت بخش ہے۔ مَیں اپنے آپ
کو اس آگ سے گرمایا کرتا تھا جیسے موسم گرما ایک شکاری کی طرح جاتے ہوئے چھوڑ گیا تھا۔

جب میں نے اپنی چمنی بنانی چاہی تو میں نے فن تعمیر کا مطالعہ کیا۔ چونکہ میری اینٹیں
استعمال شدہ تھیں اس لئے ان کو صاف کرنا پڑتا تھا۔ اس طرح اینٹوں اور کرنیوں کے
بارے میں مجھے معمول سے زیادہ واقفیت حاصل ہو گئی۔ ان اینٹوں پہ جو گارا لگا ہوا تھا وہ
پچاس برس پرانا تھا اور بقولِ عوام زیادہ سخت ہوا جاتا تھا۔ لیکن یہ بات لوگوں کے عام
دہرائے جانے والے اقوال میں سے ہے خواہ وہ سچے ہوں یا جھوٹے۔ ایسے اقوال جتنے پرانے
ہوتے ہیں اتنے ہی سخت اور کرخت ہوتے ہیں۔ اور اتنے ہی زور سے چپکے بھی رہتے ہیں۔
نہ جانے کتنی کرنیاں مارنی پڑیں گی جب کہیں جا کر کوئی بوڑھا فلسفی اس طرح کے کسی قول

سے چھٹکارا ملے گا۔ میسوپوٹیمیا کے بہت سے دیہات اسی قسم کی پرانی اینٹوں کے بنے
ہوئے ہیں۔ یہ اینٹیں عمدہ قسم کی ہیں اور بابل کے کھنڈرات سے حاصل کی گئی ہیں۔ ان پر جو سیمنٹ
لگا ہوا ہے وہ بہت پرانا ہے اور شاید ابھی تک سخت ہے۔ بہرکیف میں ان کی سختی سے
خاص طور پر حیران ہوا۔ جو گھسے بغیر اتنی شدید ضربات حاصل جاتا تھا۔ اگرچہ میں نے ان
پر بخت نصر کا نام لکھا ہوا نہیں پڑھا تھا میں نے آتشدان کے لئے اتنی ہی اینٹیں چن
لیں جتنی ڈھونڈ سکتا تھا تاکہ محنت سے بچ جاؤں اور کوڑا اینٹ ضائع نہ ہو اور اینٹوں
اور آتشدان کا درمیانی حصہ میں نے تالاب کے کنارے کے پتھروں سے بھر دیا۔ میں نے دریا
سے لائی ہوئی ریت کو گارے کے طور پر استعمال کیا۔ میں نے آتشدان کو مکان کا سب سے اہم
حصہ سمجھ کر اسے تعمیر کرنے میں کافی وقت صرف کیا۔ میں نے اس قدر اہتمام سے کام کیا کہ
میں صبح کو زمین کی سطح سے کام شروع کرتا اور شام تک جب رات کو سونے
کے لئے جاتا تو اینٹیں صرف چند انچ بلند ہوتیں۔ اور وہ میرے تکیے کا کام دیتیں
جہاں تک مجھے یاد ہے اس طرح سونے سے میری گردن میں اکڑاؤ نہیں آیا۔ اکڑی ہوئی گردن
کی بات تو بہت پرانی ہے۔ میں نے دو ہفتہ کے لئے ایک شاعر کو ان دنوں میں اپنے ہاں
ٹھہرا لیا تھا۔ میں نے جگہ کی تنگی کی وجہ سے یہ تدبیر اختیار کی تھی۔ وہ اپنا چاقو اپنے
ساتھ لایا تھا۔ میرے پاس دو چاقو تھے۔ ہم ان کو زمین میں گھسا کر صاف کیا کرتے
تھے۔ وہ کھانا پکانے کی محنت میں میرا ہاتھ بٹایا کرتا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت مسرت
ہوتی تھی کہ میری چمنی درجہ بدرجہ مضبوط اور مستحکم ہوتی جا رہی تھی۔ اور میں
سوچتا تھا کہ اگر وہ اسی طرح تاخیر سے تیار ہوئی تو یقیناً دیر تک قائم بھی رہے گی
چمنی کسی حد تک ایک الگ عمارت ہوتی ہے۔ اس کی بنیاد زمین پر ہوتی ہے۔ لیکن
بلند ہو کر آسمان سے باتیں کرنے لگتی ہے۔ بعض اوقات گھر کے جل جانے پر بھی
کھڑی رہتی ہے۔ اس وقت اس کی اہمیت اور اس کی خود مختاری نمایاں ہوتی ہے۔

یہ واقعہ موسم [illegible] ہوا [illegible] تو نومبر آ چکا ہے

شمالی ہوا نے تالاب کے پانی کو ٹھنڈا کرنا شروع کر دیا تھا۔ یہ ہوا جب کئی ہفتے
تک متواتر چلتی رہی تب اس تالاب کا پانی ٹھنڈا ہوا کیونکہ تالاب بہت گہرا تھا۔ جب
میں نے شام کو آگ جلانی شروع کر دی تو گھر کی دیواروں میں پلستر لگائے جانے سے پہلے
تختوں میں جو درزیں تھیں ان کی وجہ سے چمنی کا دھواں بہت اچھی طرح باہر نکلتا تھا
لیکن اس کے باوجود میں نے اس ٹھنڈے ہوادار کمرے میں کھردرے گانٹھوں بھرے
تختوں کے درمیان اور چھال والے بلند کھمبوں کے نیچے بہت ہی خوشگوار شامیں بسر کیں۔
میری آنکھوں کو مکان پلستر لگ جانے کے بعد کبھی معلوم نہیں ہوا۔ حالانکہ میں یہ اعتراف
کرنے کے لیے آمادہ ہوں کہ وہ زیادہ آرام دہ بن گیا تھا۔ کیا ہر اس مکان کو جس میں انسان
رہتا ہے اتنا ہی بلند ہونا چاہیے کہ اس کی چھت میں کوئی نامعلوم سی کیفیت پیدا ہو جائے
اور اس کے شہتیروں میں طرح طرح کی پرچھائیاں آنکھ مچولی کھیلنے لگیں۔ چھت میں
بنے ہوئے آبی رنگ کے نقوش اور دیگر قیمتی سامان سے کہیں زیادہ یہ پرچھائیاں تخیل
کے لیے سازگار تھیں۔ جب میں نے اپنا مکان اپنے آپ کو گرم رکھنے کے لیے استعمال
کرنا شروع کیا تو میں کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اسے [illegible] اپنی اقامت گاہ بنایا۔ میرے پاس
دو پرانے [illegible] تھے جو لکڑی کو آتش دان کے فرش سے الگ رکھتے ہیں۔ اپنی بنائی
ہوئی چمنی کی پشت پر کالک کو جمتے ہوئے دیکھنا ایک خوشگوار منظر تھا۔ اور میں دوسروں
کی نسبت بڑے اطمینان سے آگ کریدا کرتا اور اسے تیز کر سکتا تھا۔ میرا مکان چھوٹا تھا۔ اس
میں صدائے بازگشت کو کبھی مہمان نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لیکن میرا مکان اس لیے زیادہ بڑا دکھائی
دیتا تھا کہ اس میں صرف ایک کمرہ تھا اور وہ ہمارے ہمسایوں سے [illegible]
گھر کی چیزیں صرف ایک ہی کمرے میں جمع تھیں۔ [illegible]
خواب گاہ [illegible] تھے۔ [illegible] آرام [illegible]

وہ سب مجھے حاصل تھے۔ کیٹو کہتا ہے "خاندان کے سردار کو اپنے مضبوط گھر میں ایک ایسا تہہ خانہ رکھنا چاہیئے جس میں تیل اور شراب کے کئی خم رکھے جا سکیں تاکہ مہنگائی کے دنوں کا انتظار بلا خوف و خطر کیا جا سکے۔ اس طرح اسکو فائدہ پہنچے گا۔ اُسے نیک نام بھی بنائے گا۔ اور اُس کی عزت و توقیر میں اضافہ کرے گا"۔ میرے تہہ خانے میں آدھا پیپا آلوؤں سے بھرا ہُوا پڑا تھا۔ نصف پونڈ سٹر گھن سمیت موجود تھے۔ الماری میں تھوڑے سے چاول تھے۔ جگ لاب سے بھرا ہُوا تھا۔ رئی اور جوار سے بھرا ایک ایک گیلن موجود تھا۔

بعض اوقات میں بڑے اور زیادہ پُر رونق مکان کا خواب دیکھتا ہوں۔ یہ مکان سنہری زمانے پر زیادہ پائیدار مسالے کا بنا ہُوا ہوگا۔ اس میں بیل بوٹے کا کام نہیں ہُوا ہوگا۔ وہ اس وقت بھی ایک ہی کمرے پر مشتمل ہوگا۔ یعنی ایک بڑا غیر آراستہ مستحکم اور ابتدائی ہال۔ جس پر نہ کوئی چھت ہو گی اور نہ اس پر پلستر ہُوا ہوگا۔ اس کے تختے اور شہتیر ایک طرح کا پست آسمان اس کے مکینوں پر بنائیں گے۔ اس کا مقصد صرف اتنا ہوگا کہ وہ اپنے مکینوں کو برف اور بارش سے محفوظ رکھے۔ جہاں بڑے بڑے ستون بادشاہ اور ملکہ کی طرح آپ کو کورنش قبول کرنے کے لئے کھڑے ہوں گے۔ اور آپ جب اُن تک پہنچیں گے اور قدیم شاہی خاندان کے سامنے سر جھکا کر چلیں گے تو وہ آپ کو ایک عارضی گھر نظر آئے گا۔ جس کی چھت دیکھنے کے لئے آپ کو ایک بانس میں مشعل باندھ کر بلند کرنی پڑے گی۔ کچھ لوگ تو آتشدان میں رہیں گے۔ کچھ کھڑکیوں کے گوشوں میں، بعض صوفے پر، بعض ہال کے ایک حصہ میں، بعض دوسرے حصہ میں اور بعض اگر وہ پسند کریں گے تو دو تختوں پر لکڑیوں کے ساتھ رہ سکتے ہیں۔ وہ ایک ایسا مکان ہوگا جہاں تھکا ماندہ مسافر نہا دھو سکے گا، کھا پی سکے گا، بات چیت کر سکے گا اور سو لے گا۔ اُسے کہیں کام پر نہیں جانا پڑے گا۔ یعنی ایک ایسی پناہ گاہ جہاں طوفانی

رات میں پہنچ کہ آپ اطمینان محسوس کریں گے جہاں گھر کی تمام سہولتیں موجود ہوں۔
لیکن خانہ داری کی قطعاً ضرورت نہ ہو۔ ایک ایسا مکان جس کے سارے خزانے آپ صرف ایک
ہی نگاہ میں دیکھ سکیں۔ اور جہاں آپ کے استعمال کی ہر چیز کھونٹی پر ٹنگی ہوئی ہو۔ اور جو
بیک وقت باورچی خانہ، مودی خانہ، نشست گاہ، خواب گاہ، گودام اور غریبوں کی
کٹیا بھی۔ وہ مکان جس میں سیڑھی اور پیپے جیسی ضروری اور الماری جیسی آرام دہ
چیزیں آپ کی نظر کے سامنے ہوں، جہاں پتلی کے کھولنے کی آواز سن سکتے ہوں۔ اور
جس میں آپ اس آگ کا احترام کر سکتے ہوں۔ جو آپ کا کھانا پکاتی ہے اور اس تنور
کی عزت کر سکتے ہوں۔ جو آپ کی روٹی پکاتا ہے جس کی سب سے بڑی آرائشیں یعنی
یعنی فرنیچر صرف برتن ہوں۔ جہاں میلا کپڑا باہر دھویا جاتا ہو اور نہ آگ کھائی رہ جاتی ہو
مالکہ جھنجلاتی ہو اور جہاں بعض اوقات آپ کو تہ خانے کے تختے پر سے اس وقت
ہٹ جانے کے لئے کہا جائے۔ جب باورچی تہہ خانہ میں اترنا چاہتا ہو اور اس
طرح آپ پاؤں پٹکے بغیر یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ آپ کے قدموں کے نیچے زمین ٹھوس
ہے یا کھوکھلی۔ یہ ایک ایسا مکان ہوگا جس کا اندرونی حصہ اتنا ہی کھلا اور نمایاں ہوگا
جتنا پرندے کا گھونسلا۔ آپ اس کے اگلے دروازے سے داخل ہو کر اس کے مکینوں
سے ملے بغیر عقبی دروازے سے نکل جانا چاہیں گے تو آپ کے لئے ایسا کرنا ناممکن
ہوگا۔ جہاں مہمان ہونے کے یہ معنی ہوں گے کہ آپ کو گھر بھر میں رہنے اور کام کرنے
کی آزادی میسر آگئی ہے یعنی آپ کو مکان کے ⅞ حصہ سے الگ نہیں کر دیا گیا ہے۔
اور آپ کو ایک چھوٹے سے کمرے میں بند کر کے یہ نہیں کہا گیا ہے کہ آپ اسے ہی
اپنا گھر سمجھیے۔ جیسے آپ کو قید تنہائی کی سزا دی گئی ہو۔ آج کے زمانے میں میزبان
آپ کو اپنے گھر میں گھسنے نہیں دیتا۔ بلکہ اس نے آپ کے لئے گلی میں معمار سے مکان
بنوا دیا ہے۔ اور اب میزبانی کے معنی یہ ہیں کہ مہمان کو اپنے سے دور فاصلے پر رکھو

کھانا اس قدر اہتمام سے چھپا کر پکایا جاتا ہے کہ ایسا دکھائی دیتا ہے کہ اس میں زہر ڈالنے
کا بندوبست کیا جا رہا ہے۔ میں جانتا ہوں کیونکہ میں بہت سے لوگوں کے گھروں میں گیا ہوں
اگر وہ چاہتے تو قانونی حیثیت سے مجھے وہاں سے نکلوایا جاسکتا تھا لیکن میں یہ نہیں
بتاسکتا کہ میں واقعی کسی کے گھر گیا بھی ہوں یا نہیں۔ میں نے جس مکان کا ذکر کیا ہے اگر
میں اُدھر سے گذروں اور اس میں کوئی بادشاہ یا ملکہ سادگی سے رہتے ہوں تو میں انہیں
پرانے کپڑوں میں ملنے کے لئے جا سکتا ہوں۔ لیکن اگر میں جدید زمانہ کے کسی محل میں پھنس
جاؤں تو میں اس کے اندر رہنے کی بجائے یہ جاننا چاہوں گا کہ میں وہاں سے اُلٹے پاؤں
کیسے بھاگ سکتا ہوں۔ ہماری زندگی اپنی علامات سے اس قدر دُور ہوتی جارہی ہے اور
اس کی تشبیہات اور کنایات اس قدر بے معنی ہوتے جارہے ہیں اور ہمارے کام ایسے
وسوسوں اور گونگے ملازموں کے ذریعہ ہو رہے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے چند روز میں
ہماری نشست گاہ کی زبان بالکل بے رُوح ہو جائے گی اور محض یادہ گوئی بن کر رہ
جائے گی۔ دوسرے معنوں میں ہماری نشست گاہیں ہمارے باورچی خانوں اور کارگاہوں
سے بہت دُور ہیں۔ عام طور سے ہمارا کھانا صرف کھانے کی تمثیل بن کر رہ گیا ہے۔ ایسا
معلوم ہوتا ہے کہ صرف ایک وحشی ہی قدرت اور صداقت کے قریب رہ سکتا اور
ان سے کوئی مفید صنعت حاصل کر سکتا ہے۔ ایک دانشمند جو شمال مغربی ملک میں
جزیرہ "مین" میں رہتا ہے وہ کیونکر بتا سکتا ہے کہ باورچی خانے میں کونسی بات جا رہی ہے

بہرکیف میرے صرف ایک دو مہمان ہی اتنے جری تھے کہ وہ میرے یہاں
ٹھہرے اور انہوں نے تیزی سے میرے ساتھ [illegible] کھایا اور جب وہ کسی سنکٹ کو آتا
ہوا دیکھتے تو یوں سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑے ہوتے جیسے مکان کی بنیاد تک ہل
جائے گی۔ اس کے باوجود یہ مکان تیزی سے کئی بار کھائے جانے والے دلیے کے
باوجود قائم رہا۔ میں نے اس وقت تک پلستر نہیں لگایا جب تک رگوں میں خون منجمد کر دینے

والی سردی شروع ہو گئی ۔ میں اس کام کی غرض سے زیادہ سفید اور صاف ریت سامنے کے
ساحل سے کشتی میں بھر کر لے آیا۔ یہ ایسی سواری تھی کہ ضرورت پڑنے پر میں اس سے دور جا سکتا
تھا۔ میں نے اس درمیان میں اپنے گھر کے چاروں طرف چھپر نما تختے جڑ دیئے تھے۔ لکڑی کی پتلی
چھپتیاں جڑنے میں مجھے بہت لطف آتا تھا کیونکہ میں ہتھوڑے کی ایک ہی ضرب سے کیلوں کو ان
کی موزوں جگہ پر گاڑ دیا کرتا تھا۔ مجھے اس بات کی بڑی خواہش تھی کہ میں تختے پر رکھے ہوئے پلستر
کو دیوار تک تیزی اور نفاست سے پہنچا رہا ہوں۔ مجھے ایک خود نما شخص کا قصہ یاد آ گیا جو بہت اچھا
لباس پہن کر معماروں کو ہدایت دیا کرتا تھا۔ ایک دن اس نے اپنے قول کو عملی جامہ پہنانے کی جرأت
کی۔ اس نے اپنی آستین کے کف الٹے، پلستر لگانے والا تختہ اٹھایا۔ اپنی کرنی پر بلا ضرورت
بہت سا گارا رکھا، بڑے اطمینان کے ساتھ اپنے سر کے اوپر اونچی پٹڑی کی طرف دیکھا اور گارا اس
پر کھینچ کر مارنا چاہا لیکن ستم ظریفی ملاحظہ فرمایئے گارا ادھر جانے کی بجائے سیدھا اس کی چنی ہوئی
قمیص کے سینے پر آ گرا۔ میں نے پلستر کرنے کی اقتصادیات اور آرام دہی کی دل ہی دل میں تعریف
کی کہ وہ بہت ہی مؤثر انداز میں ٹھنڈک کو اندر سے روکتا ہے۔ اور پھر اس قدر صفائی سے برابر ہو
جاتا ہے اور مجھے ان مختلف حادثات کا تجربہ ہو گیا جو پلستر کرنے والے کو پیش آتے رہتے ہیں۔
مجھے یہ دیکھ کر بہت تعجب ہوتا تھا کہ اینٹیں کس حد تک پیاسی تھیں کہ پلستر برابر کرتے کرتے وہ
اس کی ساری نمی پی جاتی تھیں۔ اور یہ تجربہ بھی ہو گیا کہ ایک نئے آتش دان کو "بپتسمہ" دینے
کے لیے کتنی بالٹیاں پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں نے گذشتہ موسم سرما میں تجربہ کے طور پر
گھونگھوں کے خول جلا کر چونا بنایا تھا۔ یہ گھونگھے ہمارے دریاؤں میں ملتے ہیں۔ اس لئے میں جانتا
تھا کہ میرا مسالہ کہاں سے آیا ہے۔ اگر میں ضروری سمجھتا تو مجھے میل دو میل کے اندر اچھا چونے
کا پتھر مل سکتا تھا۔ اور میں اسے خود ہی جلا کر اس کا چونا تیار کر سکتا تھا۔

دریں اثنا برف کے عام انجماد کے کئی دن بلکہ ہفتوں پہلے تالاب کے ان حصوں پر
جہاں درختوں کا سایہ بہت گہرا تھا یا ان کھاڑیوں میں جو بہت پایاب تھیں برف کی پپڑی جم گئی

نقصی ۔ یہاں برف خاص طور سے بڑی دلچسپ ہوتی ہے۔ وہ سخت سیاہ اور شفاف ہوتی ہے۔ اور
جہاں پانی نایاب ہو وہاں اس کی وجہ سے تہہ کو دیکھنے اور جانچنے کا بہترین موقع ملتا ہے۔ جس
طرح جل جھینگر پانی کی سطح پر چلتا ہے اسی طرح آپ بھی ایک انچ موٹی برف پر پورے قد سے
لیٹ کر تہہ کو اطمینان سے دیکھ سکتے ہیں۔ وہ آپ سے دو تین انچ کے فاصلے پر ہوتی ہے اور بالکل
شیشے کے پیچھے تصویر جیسی معلوم ہوتی ہے۔ اس میں پانی قدرتی طور پر ساکن رہتا ہے۔ ریت
میں جہاں تک کوئی بڑا جانور ادھر ادھر رینگتا ہے یا کچھ دور تک پلٹ کر آتا ہے بہت سی نالیاں
بن جاتی ہیں۔ خود برف سب سے زیادہ قابل مطالعہ چیز ہے۔ اور آپ کو اولین فرصت میں اس
کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ جس رات پانی جم کر برف بن جاتا ہے۔ اسی صبح کو اگر آپ اسے غور
سے دیکھیں تو ان بلبلوں میں سے جو برف کے اندر دکھائی دیتے ہیں اکثر اس کے نیچے موجود
ہوتے ہیں۔ جب تک برف ٹھوس اور سیاہی مائل رہتی ہے تب تک آپ اس میں سے پانی دیکھ
سکتے ہیں۔ یہ بلبلے ایک انچ کے [illegible] سے لے کر [illegible] تک قطر کے بہت ہی صاف اور خوبصورت ہوتے
ہیں۔ ان میں آپ کے چہرے کا عکس برف میں سے دکھائی دے سکتا ہے۔ ایک مربع انچ جگہ میں وہ
تیس تیس چالیس چالیس کی گنتی میں ہوتے ہیں۔ خود برف کے اندر پتلے لمبوترے عمودی تقریباً آدھ
انچ کے بلبلے موجود رہتے ہیں۔ یہ نکیلے اور مخروطی ہوتے ہیں جن کے سرے اوپر کی جانب اٹھے ہوتے
ہیں یا اکثر اگر برف تازہ جمی ہوئی ہو تو یہ گول ہو جاتے ہیں۔ اور ایک کے اوپر ایک اس طرح ٹکے ہوتے
ہیں کہ معلوم ہوتا ہے جیسے پروئے ہوئے منکوں کی مالا ہوں۔ مگر وہ بلبلے جو برف کے اندر ہوتے ہیں
اتنے نمایاں نہیں ہوتے جتنے نیچے والے۔ بعض اوقات یہ دیکھنے کے لئے کہ برف کس قدر دبیز
ہے میں اس پر پتھر پھینک دیا کرتا تھا۔ ان پتھروں میں سے جو پتھر برف توڑ دیتا تھا وہ اپنے
ساتھ ہوا بھی برف کے اندر لے جاتا تھا اور اس طرح مزید بڑے بڑے نمایاں بلبلے بن
جاتے تھے۔ ایک دفعہ جب میں اڑتالیس گھنٹوں کے بعد اسی جگہ گیا تو میں نے دیکھا کہ اگرچہ ایک
برف کے ٹکڑے کی تہہ سے صاف نمایاں تھا کہ اس اثنا میں برف ایک انچ مزید موٹی ہو چکی ہے

لیکن وہ بڑے بڑے بُلبُلے ابھی تک مکمل ہی تھے۔ لیکن چونکہ گذشتہ دو روز ہندوستان کے
موسم گرما کی طرح بڑے گرم گزرے تھے اس لئے برف اب اتنی شفاف نہیں رہی تھی کہ اس میں
سے تہہ دکھائی دے سکتی یا گہرا سبز پانی جھلک سکتا۔ وہ اب دھندلا سفید مائل بھورا دکھائی
دے رہا تھا۔ اور اگرچہ برف پہلے سے دُگنی موٹی تھی لیکن وہ پہلے سے زیادہ مضبوط نہ تھی
اس لئے کہ بُلبُلے اس گرمی کی وجہ سے پگھل کر مل گئے تھے۔ اور اُن میں باقاعدگی بھی باقی
نہیں رہی تھی۔ اور اب وہ ایک کے اوپر ایک برابر برابر ٹکے ہوئے بھی نہیں تھے۔ بلکہ
تھیلی سے گرے ہوئے چاندی کے سکوں کی طرح ایک کے اوپر ایک۔ آڑے ترچھے پڑے
ہوئے خندق نما تہوں میں تھے۔ جیسے وہ شگافوں اور دراڑوں کو پُر کر رہے ہوں۔ برف
کا سارا حُسن جاتا رہا تھا اور اب تہہ کا مطالعہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ جاننے کے لئے کہ بڑے
بُلبُلوں کی برف کی تہہ میں اب کیا حالت ہے میں نے برف کا ایسا ٹکڑا توڑا جس میں
اوسط درجہ کا بلبلہ تھا۔ اس ٹکڑے کی تہہ کو اوپر کی طرف سے پلٹ دیا۔ نئی برف بُلبلے
کے چاروں طرف اور اس کی نچلی طرف جم گئی اور اس طرح وہ برف کی دونوں پرتوں میں شامل ہو گیا
وہ مجسم طور پر نچلی برف میں تھا لیکن بالائی برف سے بھی جُڑا ہوا تھا۔ وہ چپٹا سا تھا
اور بیچ میں تھوڑا سا اُبھرا ہوا تھا۔ اس کے کنارے گول تھے اور ایک چوتھائی انچ موٹا
اور چار انچ کے قریب لمبا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ بُلبلے کے عین نیچے برف
بڑی باقاعدگی سے بیچ میں ۵/۸ انچ کی اونچائی تک ایک اُلٹی طشتری کی صورت میں پگھل
گئی تھی اور اس کی بجائے ایک پتلی سی خالی جگہ رہ گئی تھی۔ اس خالی جگہ میں چھوٹے چھوٹے
بُلبلے تہہ کی طرف پھوٹ کر رہ گئے تھے۔ غالباً سب سے بڑے بلبلوں کے نیچے جو قطر میں
ایک ایک فٹ کے تھے۔ برف نہیں جمی تھی۔ اس سے میں نے یہ نتیجہ برآمد کیا کہ وہ
لاتعداد چھوٹے چھوٹے بلبلے جو میں نے برف کے نیچے دیکھے تھے سب اس طرح ختم ہو گئے
ہوں گے اور ان میں سے ہر بُلبلے نے اپنے سے نیچی برف کے لئے آتشیں شیشے کا کام دیا

ہو گا اور اسے پگھلانے اور گلانے میں حصہ لیا ہو گا۔ یہی وہ چھوٹی چھوٹی ہوائی بندوقیں ہیں جو برف کے پھٹنے اور چیخنے میں مدد دیتی ہیں۔

بالآخر جوں ہی میں نے پلستر کرنے کا کام ختم کیا۔ سردیاں صحیح معنوں میں آ گئیں اور گھر کے گرد ہوائیں زور زور سے چیخنے لگیں جیسے اب تک اسے اس چیخ و پکار کی اجازت نہیں تھی۔ زمین کے برف سے ڈھک جانے کے بعد بھی ہر رات ہنس پھڑپھڑاتے اندھیرے میں دھم سے گرتے پڑتے چلے آ رہے تھے۔ ان میں سے بعض ہنس تو والڈن ہی میں اتر پڑتے اور بعض جنگلوں میں بہت نیچے اڑتے ہوئے "فیئر ہیون" کی طرف نکل جاتے۔ میکسیکو ان کی منزل مقصود ہوتا۔ کئی دفعہ گاؤں سے رات کو دس گیارہ بجے آتے ہوئے جنگل کی پگڈنڈی پر ہنسوں یا بطوں کی ڈار کے چلنے کی آواز یا بھاگتے ہوئے ان کے قائد کی دبی ہوئی قائیں قائیں سنائی دیتی۔ یہ پرندے میرے گھر کے عقب میں دانہ دنکا چگنے کے لئے اترتے تھے۔ ۲۲ دسمبر ۱۸۴۵ء کی رات پہلی دفعہ پوری والڈن جھیل جم گئی۔ فلنٹ اور دوسرے پایاب تالاب اور دریا اس دن یا اس سے بھی بہت پہلے جم چکے تھے۔ ۱۶ دسمبر ۱۸۴۶ء کو اور ۳۱ دسمبر ۱۸۴۹ء کے لگ بھگ، ۱۸۵۰ء میں تقریباً ۲۷ دسمبر کو، ۵ جنوری ۱۸۵۲ء کو اور ۱۸۵۳ء میں ۳۱ دسمبر کو وہ منجمد ہوئی۔ ۲۵ نومبر ہی سے برف نے زمین کو ڈھک دیا تھا۔ اور اب اس نے اچانک مجھے موسم سرما کے منظر سے گھیر لیا۔ میں اپنے خول میں اور بھی سمٹ کر رہ گیا۔ اور یہ کوشش کرنے لگا کہ میرے گھر اور میرے سینہ میں آگ برابر جلتی رہے۔ میرا باہر کا مشغلہ یہ تھا کہ میں جنگل میں لکڑیاں جمع کرتا تھا اور اسے اپنے ہاتھوں میں اٹھا کر یا کندھے پر لاد کر لے آتا تھا اور بعض اوقات اگر کوئی خشک صنوبر مل جاتا تھا تو اسے بغل میں دبا کر گھسیٹ لاتا تھا۔ جنگل کا ایک پرانا باڑھ دار جنگلہ جو اچھے دن دیکھ چکا تھا میرے لئے نعمت تھا۔ میں نے اسے ولکن (آگ کا دیوتا) کی بھینٹ چڑھا دیا۔ اس

لیئے کہ اب وہ ٹرمینس (سرحدوں کا دیوتا) کی خدمت انجام دینے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اُس شخص کا کھانا کتنا لذیذ ہوتا ہے جو اُسے پکانے کے لئے برف میں لکڑیوں کی تلاش میں نکلتا ہے۔ اس لکڑی سے پکائی ہوئی روٹی اور گوشت بہت ہی مزیدار ہو جاتے ہیں۔ ہمارے جنگلوں میں اتنے شہتیر اور ایندھن کے قابل اتنی لکڑی ہے کہ اس سے بہت سی آگیں روشن رکھی جا سکتی ہیں لیکن اس وقت وہ کوئی آگ روشن نہیں کر رہی ہیں۔ اور بعض لوگوں کے کہنے کے مطابق جنگل کی نشوونما میں حارج ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ لکڑی بھی تھی جو تالاب میں بہہ کر چلی آتی تھی۔ موسم گرما کے ایام میں مجھے شہتیروں سے بنی ہوئی ایک کشتی ملی۔ آئرستانیوں نے ریل کی پٹڑیاں تیار کرتے ہوئے بہت سے شہتیروں کو ایک ساتھ باندھ کر بنایا تھا۔ میں اُسے کنارے تک کھینچ لایا۔ دو برس تک پانی میں اور چھ مہینے تک خشکی میں پڑے رہنے کے باوجود وہ کافی مضبوط تھی لیکن اس میں پانی اس طرح جذب ہو گیا تھا کہ اب اس کا سوکھنا ناممکن تھا۔ میں نے ایک روز کئی منزلیں طے کر کے اُسے تالاب میں نصف میل تک پھسلایا اور پندرہ فٹ لمبے شہتیر کا ایک سرا اپنے کندھے پر اور دوسرا سرا اُس کشتی پر رکھ کر خود بھی اس کے ساتھ ساتھ پھسلا۔ میں نے اس کے بہت سے شہتیر بید کی رسی سے کس باندھ دیئے اور ایک لمبا بید لے کر اس کا ایک سرا کانٹے کی طرح موڑا اور ان شہتیروں میں پھنسا دیا اور پوری کشتی کو کشاں کشاں کھینچتا رہا۔ اگرچہ شہتیر پانی میں تر ابور تھے اور سیسے کی طرح بھاری ہو گئے تھے۔ لیکن میرے خیال میں وہ بھیگ جانے کے باعث زیادہ اچھی طرح جلتے تھے۔ ایسا دکھائی دیتا ہے کہ درخت کا رس پانی میں محصور ہو جانے کے بعد زیادہ دیر تک اُسی طرح جلتا ہے جس طرح لیمپ میں تیل جلتا ہے۔

گلپین انگلستان کی سرحدوں پر واقع جنگلات میں رہنے والے لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہ جنگلات میں راہگیروں کی مدافعت بیجا اور جنگلات کی سرحدوں پر

مکان اور باڑھ میں قانونِ جنگلات کی رو سے بہت مذموم خیال کی جاتی تھیں اور مجرموں کو
سخت سزا دی جاتی تھی کیونکہ کہا جاتا ہے کہ ایسا کرنے سے شکار خوف زدہ ہو جاتا ہے اور
جنگل کو نقصان پہنچتا ہے۔" لیکن میں جنگل کے شکار پر تحفظ اور جنگل کی شادابی میں شکاریوں
اور لکڑہاروں کی نسبت زیادہ دلچسپی رکھتا تھا جیسے میں اُن کا لارڈ وارڈن (بڑا داروغہ
جنگلات) تھا۔ اگر جنگل کا کوئی حصّہ جل جاتا تھا چاہے وہ میرے ہی ہاتھ سے اتفاقیہ
کیوں نہ جل جاتا تو میں جنگل کے مالکوں سے زیادہ دیر تک رنجیدہ رہا کرتا تھا بلکہ میں اس وقت بھی
بہت غم کیا کرتا تھا جب ان کے مالک خود ان کو کاٹا کرتے تھے۔ میں چاہتا ہوں کہ جب ہمارے
کسان کسی جنگل کو کاٹیں تو اسی قسم کا خوف محسوس کیا کریں۔ جو قدیم رومی لوگ کسی متبرک
کیاری کو چھانٹتے یا اس میں روشنی پہنچانے کے لئے اسے تراشتے وقت محسوس کیا کرتے
تھے یعنی ان کسانوں کو بھی یہی سمجھنا چاہیئے کہ انہیں کسی دیوتا کی بھینٹ چڑھایا گیا ہے۔ رومی
لوگ کفارے کی منت مانتے تھے۔ اور یہ دعا مانگا کرتے تھے "اے تو، دیوی یا دیوتا
ہے اور جس کے لئے یہ مقدس کنج ہے تو مجھ پر میرے خاندان پر اور میرے بچوں پر اپنا
فضل و کرم کر اور مجھ پر اپنی نوازش جاری رکھ۔"

یہ بات نہایت حیرت انگیز ہے کہ اس زمانہ میں اور اس نئے ملک میں بھی جنگلات
کی بہت قدر کی جاتی ہے۔ یہ قدر و قیمت سونے کی قدر و قیمت سے زیادہ مستقل اور عالمگیر
ہے۔ اتنی دریافتوں اور ایجادوں کے باوجود کوئی شخص لکڑیوں کے ڈھیر کو نظر انداز نہیں
کر سکتا۔ وہ ہماری نظر میں اتنے ہی بیش بہا ہیں جتنے ہمارے آباؤ اجداد یعنی سیکسنوں اور
نارمنوں کی نگاہ میں تھے۔ اگر وہ ان سے اپنی کمانیں بناتے تھے تو ہم ان سے اپنی
بندوقوں کے کندے بناتے ہیں۔ میکاکس نے تیس برس سے بھی زیادہ مدت سے پہلے
لکھا ہے "نیویارک اور فلاڈلفیا میں ایندھن کی لکڑی کی قیمت پیرس کی بہترین قسم کی لکڑی
کی قیمت کے تقریباً برابر ہے بلکہ بعض اوقات اس سے بھی بڑھ جاتی ہے۔ جبکہ اس وسیع

عریض راجدھانی میں تین کروڑ چوراسی لاکھ مکعب فٹ لکڑی ہر سال خرچ ہوتی ہے۔ اور تین سو میل دُور تک یہ مزروعہ میدانوں سے گھری ہوئی ہے"۔ اس قصبہ میں لکڑی کا بھاؤ بتدریج چڑھتا رہتا ہے اور یہی ایک سوال پیشِ نظر رہتا ہے کہ اس کی قیمت گذشتہ سال کی نسبت کس قدر بڑھے گی مشینوں کے ماہر اور تاجر محض اس غرض سے جنگل میں آتے ہیں۔ لکڑی کے نیلام میں ضرور موجود ہوتے ہیں اور وہ لکڑ ہارے کی کاٹی ہوئی لکڑی کے زیادہ دام بھی دے دیتے ہیں۔ سالہا سال سے لوگ جنگل میں ایندھن اور مختلف قسم کے فنون کے لئے لکڑی حاصل کرنے آتے ہیں۔ نیو انگلستانی / نیو ہالینڈ اور پیرس کے لوگ اور کیلٹ / کسان اور رابن ہڈ۔ گڈی بلیک اور ہیری گل۔ دنیا کے بیشتر حصوں میں شہزادے اور کسان، دانشور اور وحشی کو یکساں طور پر اپنے آپ کو گرم رکھنے اور کھانا پکانے کے لئے لکڑی کی ضرورت پڑتی ہے۔ میں بھی لکڑی کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ ہر شخص اپنی لکڑی کے ڈھیر کو بڑی پیار بھری نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ مجھے اپنی لکڑی کو اپنی کھڑکی کے سامنے رکھنا بہت مرغوب تھا اور مجھے جتنی زیادہ چھپتیاں دکھائی دیتی تھیں۔ میں اتنا ہی اپنے کام سے خوش ہوتا تھا۔ میرے پاس ایک پرانا کلہاڑا تھا جس کی ملکیت کا کوئی دعویدار نہ تھا۔ موسم سرما میں مکان کے اس طرف جدھر دھوپ ہوتی ہے۔ میں اس کلہاڑے سے ان ٹھنٹوں کے ساتھ کھیلا کرتا تھا جو میں نے اپنے سیم والے کھیت میں ہل چلاتے ہوئے نکالے تھے۔ میرے ہلواہے نے پیشگوئی کی تھی کہ ان ٹھنٹوں نے مجھ کو دوبارہ گرما دیا ہے۔ ایک دفعہ اس وقت جب میں انہیں پھاڑ رہا تھا۔ دوسری دفعہ اس وقت جب وہ جل رہے تھے۔ اس سے زیادہ کوئی ایندھن گرمی نہیں پہنچا سکتا۔ جہاں تک اس کلہاڑے کا سوال تھا لوگوں نے مجھے رائے دی کہ میں گاؤں کے لوہار سے اُسے تیز کرالوں۔ لیکن میں ان سے بھی تیز نکلا۔ میں نے اس میں ہکوری کا دستہ لگا کر اُسے خوب تیز چلایا اور اس طرح اپنا کام نکال لیا۔ اگرچہ کلہاڑا کند تھا لیکن اس کا دستہ بالکل ٹھیک تھا۔

صنوبر کے بند موٹے موٹے ٹکڑے میری دولت تھے۔ یہ بات دلچسپی سے یاد رکھنے کے قابل ہے کہ آگ کی اس غذا کا بہت بڑا حصہ زمین کے پیٹ میں چھپا ہوا ہے۔ میں گذشتہ برسوں میں ان پہاڑیوں پر ایندھن کی تلاش میں گیا تھا جو کبھی صنوبر کے جنگل سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ لیکن اب اُن پر کوئی درخت نہ تھا۔ میں نے وہاں بہت سی موٹی موٹی جڑیں کھود نکالیں۔ یہ تقریباً غیر فانی ہوتی ہیں۔ کم سے کم تیس چالیس برس کے کھنڈ کی لکڑی کے بیچ میں بالکل ٹھیک ہوگی۔ حالانکہ رس بھرا چھلکا نباتاتی پھپھوندی بن جاتا ہے۔ یہ بات موٹے چھلکے کے اس پرت سے بھی نمایاں ہوتی ہے جو اصل تنے سے چار پانچ انچ کی دوری پر ایک حلقہ کی صورت میں زمین کے برابر بن جاتی ہے۔ آپ کدال یا کلہاڑے سے اس کان میں جمع شدہ سنہ کو جو گائے کی چربی اور سونے کی دھاری کی طرح پیلی ہوتی ہے۔ زمین کی تہوں تک کھودتے چلے جاتے ہیں لیکن میں آگ سلگانے کیلئے زیادہ تر سوکھی پتیاں استعمال کرتا تھا جو میں نے اپنے احاطہ میں برف پڑنے سے پہلے جمع کر رکھی تھیں۔ جب لکڑہارا جنگل میں ڈیرہ ڈالتا ہے تو وہ اپنی آگ سلگانے کے لئے تازہ ہکوری کی لکڑی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرکے رکھ دیتا ہے۔ کبھی کبھی مجھے بھی یہ مل جاتے تھے۔ میں بھی اپنی چمنی سے ڈھیروں دھواں نکال کر والڈن کے جنگلی لوگوں کو اس بات سے آگاہ کر دیتا تھا کہ میں بھی جاگ رہا ہوں۔

"اے ہلکے پروں والے درویش — یعنی اے جنتی پرندے
اوپر اُڑتے ہوئے تُو اپنے پر پرواز تیار دیتا ہے —
تُو ایک ایسا لوا ہے جو گاتا نہیں ہے — تُو سحر کا
پیامبر ہے —
تُو تصویروں کے اوپر اس طرح چکر لگاتا رہتا ہے جیسے
وہی تیرے گھونسلے ہوں —
تُو ایک غائب ہو جانے والا خواب ہے —

یا آدھی رات کو آسمان والی پری کی پرچھائیں ہے
جو اپنا لہنگا سمیٹ رہی ہے —
تو رات کو ستاروں کے چہرے پر نقاب بن جاتا ہے۔
تو دن کی روشنی کو دھندلا دیتا ہے اور آفتاب کو
چھپا دیتا ہے —
اے میرے چولھے سے اُٹھنے والے بخور کے سے دھوئیں
اوپر جا — اور دیوتاؤں سے جا کر کہہ دے کہ وہ
میرے اس صاف شعلے کو صاف کر دیں "

میں وہ لکڑی بہت کم استعمال کیا کرتا تھا جو فوراً ہی کاٹ لی گئی ہو۔ لیکن وہی لکڑیاں میرے لئے بہت مفید ہوتی تھیں۔ جب میں کبھی موسم سرما کی سہ پہر کو آگ جلتی ہوئی چھوڑ کر جنگل میں سیر کے لئے نکل جاتا تھا اور تین چار گھنٹے بعد پلٹ کر آتا تھا تو وہ اس وقت بھی باقی رہتی تھی اور اس کے کوئلے دہکتے رہتے تھے۔ اگرچہ میں اپنے گھر سے غیر حاضر رہتا تھا لیکن میرا گھر خالی نہیں رہتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے میں اپنے پیچھے ایک خوش مزاج منتظم خانہ چھوڑ گیا ہوں۔ اگرچہ اس گھر میں صرف میں رہتا تھا یا آگ رہتی تھی لیکن عام طور سے گھر کی یہ منتظمہ قابل اعتماد ثابت ہوتی تھی۔ لیکن ایک روز جب میں لکڑیاں چیر رہا تھا تو مجھے خیال آیا کہ ذرا کھڑکی سے جھانک کر دیکھوں کہ میرے گھر میں آگ تو نہیں لگی ہوئی ہے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے میں صرف اسی دفعہ اس کے لئے پریشان ہوا تھا میں نے جھانک کر دیکھا کہ ایک چنگاری میرے بستر پر گر گئی تھی۔ میں نے اندر جا کر اسے بجھا دیا۔ لیکن اتنی دیر میں میرا بستر ایک بالشت کے قریب جل گیا تھا۔ میرا مکان بہت ہی محفوظ مقام پر تھا۔ وہاں دھوپ بہت اچھی آتی تھی۔ اس کی چھت اتنی نیچی تھی کہ سخت سردی کے دنوں میں اگر آگ بجھ جاتی تو مجھے

کوئی فکر نہ ہوتی۔

[illegible] تہہ خانے میں چھچھوندروں نے اپنا گھر بنالیا تھا۔ انہوں نے ہر تیسرا آلو
کتر ڈالا [illegible] اور [illegible] سے جو ریت بچ گئی تھی اسے انہوں نے اپنا آرام دہ بستر بنایا تھا
اس لئے کہ انسان اور [illegible] جانوروں کو بھی آرام اور گرمی مرغوب ہوتی ہے۔ اگر وہ یہ چیزیں
حاصل نہ کرے تو [illegible] گرما کا [illegible] نہ سکے۔ بعض دوست ایسی باتیں کرتے تھے جیسے
میں جنگل میں سردی سے ٹھٹھر کر مرنے کے لئے گیا تھا۔ ایک محفوظ مقام پر جانور صرف
ایک ایسا بستر بناتا ہے جس سے وہ اپنے [illegible] گرمی پہنچا سکے۔ لیکن انسان نے آگ دریافت
کر لی ہے [illegible] اور اسے اپنے جسم کی گرمی
صرف کرنے کی بجائے آگ سے گرماتا [illegible] اپنا ایسا بستر بناتا ہے جس میں وہ
اپنے بوجھل کپڑے [illegible] گھوم پھر سکے۔ [illegible] موسم سرما میں گرمی کی کیفیت برقرار رکھ
سکے۔ وہ [illegible] روشنی بھی حاصل کر سکتا ہے اور لیمپ کی مدد سے
دن کو طول [illegible] اس طرح [illegible] اپنے میلانِ طبع سے دو چار قدم آگے
نکل جاتا ہے۔ اس [illegible] فنونِ لطیفہ پر صرف کرنے کے لئے کافی وقت بچ جاتا
ہے۔ جب میں دیر تک طوفان کی لپیٹ میں رہتا تھا اور میرا سارا بدن بے جان سا
ہو جاتا تھا تو گھر کی مہربان فضا میں پہنچتے ہی میری جان میں جان آ جاتی تھی اور میری
[illegible] تھی۔ لیکن انسان عظیم الشان مکان میں رہتا ہے اور اس سلسلے میں زیادہ
فخر نہیں کر سکتا۔ انسانی نسل بالآخر ختم ہو گی تو کیسے ہو گی۔ اس سلسلے میں ہمیں زیادہ
غور و فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ انسان کے رشتۂ حیات کو شمال سے آنے والا
کوئی بھی جھونکا توڑ سکتا ہے۔ ہم "سرد شکر وار دن" اور شدید برف باری والے
دنوں سے تاریخیں شمار کرتے رہتے ہیں لیکن ذرا زیادہ سخت سرد شکروار اور اس
سے بھی شدید برف باری اس روئے زمین پر انسان کے وجود کو ختم کر دیگی۔

چونکہ میں جنگل کا مالک نہیں تھا اس لئے میں نے اگلے موسم سرما میں اقتصادی اسباب کی بنا پہ ایک انگیٹھی استعمال کی۔ لیکن اس میں کھلے منہ والے آتش دان کی نسبت آگ اچھی طرح نہیں جلتی تھی۔ کھانا پکانا ایک شاعرانہ کاوش کی بجائے ایک کیمیائی عمل بن گیا تھا انگیٹھیوں کے اس زمانہ میں لوگ یہ بات بہت جلد بھول جائیں گے کہ انڈینوں کی طرح ہم بھی آلو ریت میں دبا کر پکایا کرتے تھے۔ انگیٹھی نے نہ صرف گھر میں جگہ گھیر لی بلکہ سارے گھر کو بدبودار بنا دیا۔ اس نے آگ کو بھی چھپا دیا اور مجھے یہ محسوس ہونے لگا کہ میرا کوئی ساتھی گم ہو گیا ہے۔ آپ آگ میں ہمیشہ اپنا چہرہ دیکھ سکتے ہیں۔ جب مزدور شام کو اپنی آگ میں جھانکتا ہے تو دن بھر میں جمع کئے ہوئے خیالات کی کثافت جل کر پاک و صاف ہو جاتی ہے۔ لیکن میں بیٹھ کر آگ میں نہیں جھانک سکتا تھا اور شاعر کے خاص اور موزوں اشعار ایک نئی قوت کے ساتھ مجھے یاد آنے لگے۔

"اے رخشندہ شعلے! مجھے اپنی پیاری زندگی کی عکاسی
کرنے والی ہمدردی سے محروم نہ ہونے دے۔
تیرے سوا کون میری امیدوں کو اتنی تابندگی سے
بلندی پر اڑنے کے لئے پر پرواز دے سکتا ہے +
راتوں کو میری قسمت تیرے بغیر اور بھی پست ہو جاتی ہے۔
مجھے ہمارے چولہوں اور ہمارے ہالوں سے کیوں نکال دیا گیا ہے۔
تجھے تو ہر شخص خوش آمدید کہتا اور پیار کرتا ہے۔
ہماری زندگیوں کے عام طور سے ٹمٹماتی اور بے حد مدھم روشنی
کے لئے کیا تیرا وجود محض ایک خواب تھا؟
کیا تیری تیز چمک ہماری روحوں سے کوئی رازدارانہ
گفتگو کر رہی تھی؟ کیا وہ ایسے راز تھے جن کے افشا

ہو جانے کا ڈر تھا ــــــ؟

خیر ــــــ اب ہم محفوظ اور قدرتی طور پر کیونکہ

اب ہم انگیٹھی کے قریب بیٹھے ہیں جہاں دھندلی

پرچھائیاں اُڑتی ہی نہیں ہیں ــــ

جہاں کوئی بات نہ مسرور کرتی ہے اور نہ مغموم ــــ

بلکہ آگ ہاتھوں اور پیروں کو گرم کرتی ہے ــــ

اس سے زیادہ وہ اور کچھ کرنا بھی نہیں چاہتی ــــ

زمانۂ حال لکڑیوں کے سلیقہ کے ساتھ لگے ہوئے ڈھیر

کے سامنے بیٹھ سکتا ہے اور سو سکتا ہے۔

وہ اُن بھوتوں سے نہیں ڈرے گا جو ہمارے دُھندلے ماضی

سے نکل کر پرانی لکڑی کی مدھم روشنی میں ٹہل ٹہل کر ہم سے باتیں

کرتے ہیں ــــ!
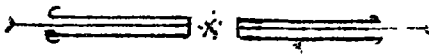
قدیم باشندے اور موسم سرما کے مہمان

میں نے اپنی انگیٹھی کے سامنے بیٹھ کر جب باہر برف وحشیوں کی طرح ناچ رہی ہوتی تھی اور اُلو بھی نہیں بول رہے ہوتے تھے کئی برفانی طوفان جھیلے اور بہت سی خوشگوار شامیں گذاریں میری ملاقات کئی ہفتوں تک اپنی جھیل قدمی کے دوران میں ان لوگوں کے سوا جو لکڑیاں کاٹنے اور ٹھیلوں میں رکھ کر گاؤں لے جانے کے لئے آتے تھے کسی شخص سے نہیں ہوتی۔ قدرتی عناصر نے جنگل کی گہری سے گہری برف میں مجھے راستہ بنانے میں مدد دی۔ کیونکہ میں ایک دفعہ جدھر سے گزرتا تھا ہوا شاہ بلوط کی پتیوں کو اڑا کر میری پگڈنڈیوں پر بچھا دیتی تھی یہ پتیاں دھوپ جذب کر لیتی تھیں اور برف پگھلا دیتی تھیں۔ اس لئے نہ صرف یہ ہوتا تھا کہ مجھے اپنے قدموں تلے خشک زمین میسر آجاتی تھی جاڑوں میں یہ سیاہ لکیریں مجھے راستہ بھی سمجھایا کرتی تھیں۔ جہاں تک انسانوں کی ہمدمی کا سوال تھا مجھے ان جنگلوں کے قدیم باشندوں کو اپنے قریب لانا پڑتا تھا۔ میرے بہت سے ہم قصبہ لوگوں کو وہ سڑک یاد ہوگی جس کے قریب میرا مکان تھا۔ اور جو ان قدیم باشندوں کے قہقہوں اور باہمی گفتگو سے گونجا کرتی تھی۔ وہ جنگل جو اس سڑک کے کناروں پر واقع تھے وہاں ان کے چھوٹے چھوٹے باغ اور گھر تھے۔ اس زمانہ میں

جنگل نے اس سڑک کو آج سے زیادہ سیرہ وزنا رکیک بنا رکھا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ
بعض جگہوں پر صنوبر کے درخت گزرتی ہوئی ریل گاڑی کے دونوں پہلوؤں سے
رگڑ کھایا کرتے تھے۔ عورتیں اور بچے اس طرف سے لنکن پیدل جاتے ہوئے
ڈرتے تھے اور اکثر زیادہ تر فاصلہ دوڑ کر طے کیا کرتے تھے۔ اگرچہ یہ لواحی گاؤں
تک جانے یا لکڑہارے کے ٹھیلے کے گزرنے کے لئے ایک معمولی راستہ تھا لیکن کسی
زمانہ میں اپنی رنگا رنگی کی وجہ سے سیاحوں کے لئے دلچسپی کا باعث تھا وہ انہیں
بہت دنوں تک یاد رہتا تھا۔ اب جہاں گاؤں سے جنگل تک کھلے کھیت ہیں اس زمانہ
میں یہ سڑک تختوں کی بنیاد پر بلیک کی دلدل کے اوپر سے گزرتی تھی یعنی اس کا سچا کچھ حصہ
اس خاک سے اٹی ہوئی موجودہ سڑک کے نیچے مدفون ہے۔ جو آسٹرٹین سے جسے اب
آمس ہارس کہا جاتا ہے برسٹر پہاڑی کی طرف جاتی تھی۔

سڑک کے آس پار میرے بیم والے کھیت کے پورب میں کیٹو انگراہم رہا کرتا تھا جو
کنکارڈ کے گاؤں کے رئیس ڈنکن انگراہم کا غلام تھا اور اس نے اپنے غلام کیلئے
ایک مکان بنوا دیا تھا اور اسے والڈن کے جنگل میں رہنے کی اجازت دے دی
تھی۔ اس کیٹو کو یعنی یوٹی سینس کو نہیں بلکہ کنکارڈ سینس کو۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ
گنی کا حبشی تھا۔ کچھ لوگوں کو ابھی تک یاد ہے کہ اخروٹ کے درختوں کے بیچ میں
اس کا ایک صاف ستھرا چھوٹا سا جھونپڑا تھا۔ اس نے اخروٹ کے درختوں کو خوب
پھلنے پھولنے دیا تھا کہ وہ بڑھاپے میں اس کے کام آئیں گے۔ لیکن نسبتاً جوان اور گورے
آدمی نے بالآخر اسے حاصل کر لیا۔ لیکن وہ اب بھی اسی طرح ایک تنگ مکان میں رہتا
ہے۔ کیٹو کے آدھے معدوم تہ خانے کا گڑھا اب بھی باقی ہے لیکن چونکہ راہگیروں
کی نظروں سے درختوں کی ایک جھاڑ اسے پوشیدہ رکھتی ہے اس لیے شاذونادر ہی
کوئی اس سے آگاہ ہوگا۔ اب وہ سماق کے چکنے درختوں سے بھرا ہوا ہے اور گولڈن راڈ

کی سب سے پرانی قسموں میں سے ایک قسم وہاں کثرت سے پائی جاتی ہے
یہاں میرے کھیت کے ایک سرے پر قصبہ سے زیادہ نزدیک ایک جنّن زلفا کا مکان تھا جہاں وہ قصبہ کے لوگوں کے لئے کپڑا بنا کرتی تھی۔ چونکہ اس کی آواز بلند اور دلفریب تھی اس لئے اُس کے گانے سے والڈن کا جنگل گونج اٹھتا تھا۔ آخر کار ۱۸۱۲ء کی جنگ میں انگریز سپاہیوں نے جو ضمانت پر رہا کئے گئے قیدی تھے اس کے مکان کو نذر آتش کر دیا۔ اس وقت زلفا گھر میں نہیں تھی۔ لیکن اس کی بلی اس کا کتا اور اس کی مرغیاں سب جل کر بھسم ہوگئیں۔ وہ بڑی پامشقت زندگی بسر کرتی تھی اور کسی قدر سنگدل تھی۔ ایک بوڑھا جو ان جنگلوں میں گھومتا تھا۔ کہتا ہے کہ اُسے یاد ہے کہ جب وہ ایک دن دوپہر کو زلفا کے گھر کے قریب سے گزرا تو اس نے جنّن کو سنسناتی ہوئی ہنڈیا پر بڑبڑاتے ہوئے سنا۔ "تم سب ہڈیاں ہو ہڈیاں!" میں نے وہاں شاہ بلوط کے جھنڈوں کے درمیان اینٹیں رکھی ہیں۔

سڑک کے جنوب میں دائیں طرف بریسٹر پہاڑی پر بریسٹر فری مین رہتا تھا۔ وہ کبھی جاگیردار کمنگس کا غلام تھا اور ہر وقت کام آنے والا "حبشی" تھا۔ وہ اس جگہ رہتا تھا جہاں اب بھی سیب کے درخت اُگے ہوئے ہیں۔ یہ درخت بریسٹر نے لگائے تھے اور اُن کی نگہداشت کی تھی۔ وہ درخت اب بڑے اور پرانے ہو گئے ہیں۔ مگر ان کے پھلوں میں اب بھی جنگلی پھلوں اور سیب کی شراب کا ساذائقہ ہے۔ لنکن کے پرانے قبرستان کے ایک گوشہ میں اُن برطانوی سپاہیوں کی بے نام و نشان قبروں کے درمیان جو کنکارڈ سے فرار ہوتے ہوئے مارے گئے تھے میں نے چند روز پہلے اُس کی قبر کا کتبہ پڑھا تھا۔ جس پر اُس کا نام "سی پیو بریسٹر"۔ کندہ تھا۔ یعنی اسے سی پیو افریقی کا خطاب دیا گیا تھا۔ جس کا مطلب ہے "رنگ دار آدمی"۔ جیسے اس کا کوئی رنگ ہی نہیں تھا۔ اس کتبہ میں نمایاں طور سے لکھا ہوا تھا کہ اس کی موت کب واقع ہوئی تھی۔ گویا بالواسطہ طور پر مجھے یہ اطلاع

بہم پہنچائی گئی تھی کہ وہ کبھی واقعی زندہ تھا۔ بہ ہر حال کے ساتھ اس کی مہمان نوازی کی فضا بھی رہتی تھی۔ وہ قسمت کا حال بتایا کرتی تھی۔ لیکن صرف اچھی ہی باتیں بتاتی تھی۔ وہ لمبی تڑنگی، گول مٹول اور سیاہ فام تھی۔ اس کا رنگ رات کی اولاد سے زیادہ کالا تھا ایک اتنا سیاہ کرہ جو کینکارڈ کے مطلع پہ اس سے پہلے یا اس کے بعد کبھی نمودار نہیں ہوا۔

پہاڑی کی ڈھلوان پہ دور جا کر بائیں طرف جنگل کی پرانی سڑک پہ اسٹریٹن خاندان کے جھونپڑوں کے کچھ آثار ملتے ہیں۔ ان کا باغ سرسبز پہاڑی کی ساری ڈھلوان پہ پھیلا ہوا تھا لیکن بہت دن ہوئے کہ سیاہ صنوبر نے اس باغ کو غارت کر دیا۔ اب چند کھنڈروں کے سوا اس باغ کا کوئی نشان باقی نہیں ہے۔ اس وقت گاؤں میں جو کم پھل دینے والے درخت ہیں ان ہی پرانی جڑوں کی نسل میں سے ہیں۔

جنگل کے کنارے پہ سڑک کی دوسری جانب قصبہ سے اور بھی قریب بریڈ کی منزل ہے، یہ وہ جگہ ہے جو اس قسم کے شیطان کی شرارتوں کے لئے مشہور ہے جس کا ذکر قدیم دیومالا میں کہیں بھی واضح صورت سے نہیں ملتا ہے حالانکہ اس شیطان نے ہماری نیو انگلینڈ کی زندگی میں بہت نمایاں اور حیرت انگیز حصہ لیا تھا۔ اور دیومالا میں مذکورہ کرداروں کی طرح وہ اس بات کا مستحق ہے کہ ایک دن اس کی سوانح عمری لکھی جائے۔ وہ پہلے ایک دوست یا ملازم کا بھیس بدل کر آتا ہے۔ اور پھر پورے خاندان کو ہلاک کر کے ان کا سارا زر و مال اکٹھا کر لے جاتا ہے۔ وہ شیطان دراصل نیو انگلینڈ کی رم (ایک قسم کی شراب) تھی۔ یہاں جو المناک واقعات ہوئے ہیں۔ ابھی تاریخ کو ان واقعات کا ذکر نہیں کرنا چاہیئے آپ ان واقعات میں وقت کو مداخلت کرنے دیجیئے تاکہ وہ ان پہ ایک آسمانی رنگ چڑھا دے۔ ایک مشکوک روایت یہ بھی ہے کہ یہاں شراب خانہ تھا۔ یعنی اس کنوئیں کا پانی مسافر کی شراب کو ہلکا اور اس کے گھوڑے کو تازہ دم کر دیتا تھا۔ یہاں لوگ ایک دوسرے کی صحت کا جام پیتے تھے۔ خبریں سنتے اور سناتے تھے اور دوبارہ

اپنی راہ پر ہو لیتے تھے۔

بریڈہ کی جھونپڑی اگرچہ بہت دنوں سے خالی پڑی تھی لیکن بارہ برس پہلے یہاں موجود تھی۔ وہ میرے مکان جتنی بڑی تھی۔ اگرچہ میں غلطی نہیں کرتا تو انتخابات کی رات کو چند شریر لڑکوں نے اس میں آگ لگا دی تھی۔ میں اس زمانہ میں گاؤں کی نکڑ پر ہی رہتا تھا۔ اور ڈیوینینٹ کی کتاب "گونڈی برٹ" میں اس قدر کھو چکا تھا کہ اس موسم سرما میں سب میں نے بڑی کاہلی سے کام کیا۔ اس کاہلی کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ شاید یہ کاہلی کوئی خاندانی بیماری تھی۔ کیونکہ میرا ایک چچا حجامت بناتے ہوئے سو جاتا تھا اور وہ یوم السبت کو جاگتے رہنے کے لئے اتوار کو تہ خانے میں آلو کے پودے لگایا کرتا تھا۔ یا میری کاہلی کی وجہ یہ تھی کہ میں اس زمانہ میں انگریزی نظم کا چامر کا کیا ہوا مجموعہ لفظ بہ لفظ پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ مجموعہ نظم میرے اعصاب پر مسلط ہو چکا تھا۔ میں نے اس کتاب پر سر جھکایا ہی تھا کہ آگ کی اطلاع دینے والی گھنٹیاں بجنے لگیں اور آگ بجھانے والے انجن تیز رفتاری سے ادھر دوڑے۔ ان کے آگے آگے مردوں اور لڑکوں کا لشکر تھا۔ اور ان سب سے آگے میں تھا۔ کیونکہ میں نے بیچ کے چشمے کو پھاند کر پار کر لیا تھا۔ ہم وہ لوگ تھے جو پہلے بھی آگ بجھا چکے تھے۔ لیکن اس کے باوجود ہم یہ سمجھ رہے تھے کہ یہ آگ جنگل کے اس پار اور جنوب میں کسی کھلیان یا دوکان یا مکان یا ان سب میں ایک ساتھ لگ گئی ہے۔ ایک شخص نے کہا "بیکر کا کھلیان جل رہا ہے۔" دوسرا بولا "کاڈ من کے گھر میں آگ لگ گئی ہے۔" اس کے بعد جنگل کے درختوں کے اوپر نئے نئے شعلے بھڑکتے ہوئے دکھائی دیئے۔ جیسے چھت جل کر گر رہی ہو۔ ہم سب چیخ اٹھے "کنکارڈ کے لوگو۔ بچاؤ کے لئے دوڑو۔" اور گھوڑا گاڑیاں جن پر بوجھ لدا ہوا تھا تیزی سے دوڑنے لگیں۔ ان میں دوسرے لوگوں کے ہمراہ غالباً بیمہ کمپنی کا ایجنٹ بھی تھا۔ جسے بہرحال وہاں جانا تھا چاہے آگ کتنی ہی دور کیوں نہ ہو کبھی کبھی پیچھے سے انجن کی گھنٹی کی آواز بھی آ جاتی۔ یہ انجن

دھیرے دھیرے بڑی متانت سے چلا آرہا تھا اور سب کے پیچھے جلیبے کہ سرگوشیاں کی جا رہی تھیں وہ لوگ آرہے تھے جنہوں نے آگ لگائی تھی اور اس خطرے سے آگاہ کیا تھا۔ ہم سچے عینیت پسندوں کی طرح اپنے احساسات کے پیش کردہ ثبوت سے انکار کرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ ایک موڑ پار کرنے پر ہم نے کچھ چیزوں کے چٹخنے کی آواز سُنی۔ اور جلتی ہوئی آگ کی آنچ محسوس کی۔ اور بڑے دُکھ کے ساتھ ہم یہ ماننے پر مجبور ہو گئے کہ ہم وہاں پہنچ چکے ہیں۔ آگ کی گرمی نے ہمارے جوش کو ٹھنڈا کر دیا۔ پہلے تو ہمارا جی چاہا کہ ہم مینڈکوں سے بھرا ہوا تالاب اس پر انڈیل دیں لیکن آخر میں ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ مکان اس قدر شکستہ اور جھلسا ہوا ہے کہ ہمارے لئے یہی بہتر ہے کہ اُسے جل جانے دیا جائے۔ اپنے انجن کے گرد کھڑے ایک دوسرے کو دھکا دیتے اور ایک دوسرے کو اپنے دلی جذبات سے بھونپو کے ذریعہ آگاہ کرتے رہے۔ ہم دبی زبان میں آگ نے ان حادثات کا ذکر کرتے رہے جو دُنیا میں رونما ہو رہے تھے۔ ان واقعات میں باسکم کی دوکان کے اندر آتش ہونے کا واقعہ بھی شامل تھا۔ ہم میں سے ہر ایک کو اپنی اپنی جگہ یقین تھا کہ اگر ہم اپنے انجن کے ساتھ وہاں وقت پر پہنچ گئے ہوتے تو ہم نے اس آتشزدگی کے آفاق گیر اور آخری واقعہ کو اپنے ٹب اور اپنے مینڈکوں سے بھرے ہوئے تالاب کے ذریعہ سیل آتش کی بجائے طغیانی میں تبدیل کر دیا ہوتا۔ آخرکار ہم کوئی شرارت کئے بغیر پسپا ہو گئے اور سونے کے لئے گرنڈی برٹ لوٹ آئے۔ گونڈی برٹ کے سلسلے میں مجھے بدلہ سنجی سے متعلق دیباچہ کا ایک اقتباس پیش کرنا ہے کہ بدلہ سنجی ہی روح کا ایک بارود ہے لیکن بیشتر انسان بدلہ سنجی سے اُتنے ہی بے بہرہ ہیں جتنے انڈین بارود سے۔"

میں اتفاق سے کھیتوں کو پار کرتا ہوا دوسری ہی رات تقریباً اس وقت اس جگہ کی طرف سیر کو نکل گیا۔ وہاں کسی کے دھیرے دھیرے کراہنے کی آواز سُن کر میں اندھیرے میں قریب گیا تو مجھے وہ شخص ملا جو اس ۔۔ اق کا تنہا وارث تھا۔ اسے اپنے آباؤ اجداد

کی ساری بھلائیاں اور برائیاں ورثے میں ملی تھیں۔ صرف اسی کو اس آگ سے دلچسپی تھی۔ وہ پیٹ کے بل لیٹا ہُوا تہہ خانے کی دیوار پر سے جھانک کر نیچے بجھتی ہوئی چنگاریاں دیکھ رہا تھا اور حسب عادت منہ ہی منہ میں بڑبڑا رہا تھا۔ وہ دن میں دریا کے سبزہ زار میں بہت دُور جاکر کام کیا کرتا تھا۔ اور چھٹی ملتے ہی اپنے آبائی اور عالم شباب کے گھر کو دیکھنے کے لئے چلا آیا تھا۔ وہ ہر جانب سے تہہ خانے میں جھانکتا تھا اور لیٹ لیٹ کر اُسے ہر پہلو سے یوں دیکھتا تھا جیسے پتھروں کے درمیاں جہاں اب اینٹوں اور راکھ کے سوا اور کچھ بھی نہ تھا کوئی خزانہ گڑا ہوا ہو۔ گھر جل چکا تھا اور جو کچھ باقی رہ گیا تھا وہ اسے دیکھ رہا تھا۔ میری موجودگی سے جس ہمدردی کا اظہار ہُوا اس سے اس کو بہت خوشی ہوئی۔ اس تاریکی میں جس طرح ہو سکا اُس نے مجھے اس گھر کا ڈھکا ہُوا کنوآں دکھایا جسے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ دیوار کو ہاتھ سے ٹٹولتا ہُوا وہاں پہنچا جہاں کنوئیں کی منڈیر تھی۔ یہ منڈیر اُس کے باپ نے درخت کاٹ کر بنائی تھی۔ اُس نے ٹٹول ٹٹول کر لوہے کا وہ کنڈا اور کانٹا بھی دکھایا جس کے ذریعے ایک سرے پر بھاری بوجھ باندھ دیا گیا تھا اب وہ صرف اسی سرے کا سہارا لے سکتا تھا۔ اس نے یہ سب کچھ اس لئے کیا تاکہ مجھے یقین آجائے کہ وہ منڈیر کوئی معمولی منڈیر نہیں تھی۔ مَیں نے بھی اُسے ٹٹول کر دیکھا اور اب بھی تقریباً ہر روز مَیں اُسے اپنی سیر کے دوران میں غور سے دیکھتا ہوں کیونکہ اس میں ایک پورے خاندان کی تاریخ مضمر ہے۔

ایک بار اور ــــ بائیں طرف جہاں کنوآں نظر آتا ہے اور دیوار کے قریب جہاں بنفشہ کی جھاڑیاں ہیں اور کھلا کھیت ہے وہاں کبھی نٹنگ اور لی گروے رہتے تھے۔ خیر ان کو چھوڑیئے ــ ہم لنکن کی طرف پلٹتے ہیں۔

ان سب سے زیادہ اور جنگل کے اندر جو جھیل ہیں اور جہاں سڑک تالاب سے بہت ہی قریب ہے وائمن کمہار رہتا تھا۔ وہ اپنے قصبہ کے لوگوں کے لئے برتن بنایا کرتا تھا اور اپنے پیچھے

اپنے جانشین چھوڑ گیا تھا۔ اُن کے پاس دنیاوی زر و مال تھا اور وہ جب تک زندہ رہے بڑی مصیبت کے ساتھ اپنی زمین پر قابض رہے۔ ان کے ہاں شیرف (ناظم بلدیہ) ٹیکس وصول کرنے کے لئے بے سود آیا کرتا تھا اور محض قانونی کارروائی کرنے کی غرض سے ایک چیغتی قرق کر کے لے جاتا تھا۔ میں نے اس کی رپورٹ میں پڑھا ہے کہ اس چیغتی کے سوا اُن کے گھر میں کچھ نہ تھا جس پر وہ ہاتھ ڈال سکتا۔ موسم گرما کے وسط میں ایک روز جب میں کھیت گوڈ رہا تھا ایک شخص نے جو اپنے برتن منڈی میں لے جا رہا تھا اپنا گھوڑا میرے کھیت میں روک لیا اور مجھ سے اُس نے دائمن کے بیٹے کا پتہ پوچھا۔ بہت عرصہ ہوا اُس نے اُس سے برتن بنانے کا چاک خریدا تھا۔ اس لئے وہ اس کا حال جاننا چاہتا تھا۔ میں نے انجیل میں کمہار کی مٹی اور چاک کا قصہ پڑھا تھا۔ لیکن کبھی اس بات پر غور نہیں کیا تھا جو برتن ہم استعمال کرتے ہیں وہ اس طرح کے نہیں تھے جس طرح کہ اس زمانہ کے صحیح و سالم برتن ہمیں ملے ہیں۔ وہ برتن کسی درخت پر تونبے کی طرح پہلے بھی نہیں تھے۔ مجھے یہ سُن کر خوشی ہوئی کہ میرے پڑوس میں مٹی کے برتن بنانے کا فن بھی رائج تھا۔

مجھ سے پہلے اس جنگل کا آخری باشندہ ایک آئرستانی تھا جس کا نام ہیوکوائل تھا (میں نے اس کے نام کے ہجے زبان کو بہت بل دیکر کئے ہیں) وہ وائمن کے جھونپڑے میں رہتا تھا۔ لوگ اُسے کرنل کوائل کہا کرتے تھے۔ کیونکہ یہ بات بہت مشہور تھی کہ وہ واٹرلو کی جنگ میں ایک سپاہی رہ چکا تھا۔ اگر وہ زندہ ہوتا تو میں نے اُسے دوبارہ اپنی جنگ لڑنے پر مجبور کر دیا ہوتا۔ اُس کا پیشہ خندقیں کھودنا تھا۔ نپولین سینٹ ہیلنا پہنچا اور کوائل والڈن جنگل میں چلا آیا۔ میں اس کے بارے میں جو کچھ جانتا ہوں وہ ایک المناک داستان ہے۔ وہ ایک جہاں دیدہ شخص تھا اور بڑا ہی مہذب تھا۔ اتنی لمبی گفتگو کرتا تھا کہ آپ اُسے سُن نہیں سکتے تھے۔ وہ موسم گرما کے وسط میں ایک لمبا کوٹ پہنتا تھا کیونکہ اس کو مرگی کا دورہ پڑتا تھا۔ اس کا چہرہ قرمزی رنگ کا تھا۔ میرے

جنگل میں آنے سے چند روز بعد وہ برسٹر پہاڑی کے دامن میں سڑک پر مر گیا۔ اس طرح میں اُسے پڑوسی کی حیثیت سے نہیں جانتا۔ اس کا مکان گرائے جانے سے پہلے جب اس کے ساتھی اس کے گھر کو ایک "منحوس قلعہ" بتا کر اس سے گریز کیا کرتے تھے۔ میں اُسے دیکھنے گیا تھا۔ اس کے اونچے تختوں کے بستر پر اس کے پرانے کپڑے جو کثرت استعمال سے شکن آلود ہو گئے تھے اس طرح پڑے ہوئے تھے جیسے وہ خود ہی گٹھڑی بن کر لیٹ ہوا ہے۔ چشمہ پر کوئی ٹوٹا ہوا پیالہ ملنے کی بجائے وہاں فرش پر اس کا ٹوٹا ہوا پائپ پڑا تھا۔ چشمہ پر شکستہ پیالہ اس کی موت کی علامت ہرگز نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ اُس نے میرے سامنے یہ اعتراف کیا تھا کہ اس نے اگرچہ برسٹر چشمہ کا نام سُنا تھا لیکن اس نے اسے کبھی دیکھا نہیں تھا۔ فرش پر تاش کے پتے بکھرے ہوئے تھے۔ اینٹ، حکم اور پان کے بادشاہ — ایک کالا چوزا جو رات کی طرح سیاہ اور خاموش تھا اور ذرا سی چیں چیں بھی نہیں کر سکتا تھا، جسے سرکاری منتظم پکڑ نہیں سکا تھا۔ جو اپنی گرفتاری کے لیے لومڑی کا منتظر تھا۔ اور اس گھر کو اپنا اڈہ بنائے ہوئے تھا۔ مکان کے عقب میں ایک باغ کا مٹا مٹا سا نشان تھا۔ اس باغ میں جو بیج بو دیئے گئے تھے لیکن مرگی کے جسم کو ہلا دینے والے دردوں کی وجہ سے وہ اس باغ کی گوڑائی نہیں کر سکا تھا۔ اور اب اس باغ کے پھلوں کو کاٹنے کا موسم آ گیا تھا۔ اس میں السیتین رومی اور چٹ چٹا نکل آیا تھا۔ اس باغ میں جانے کا مجھے یہ انعام ملا کہ چٹ چٹا میرے کپڑوں سے چپک گیا۔ مکان کے عقب میں ایک جنگلی گلہری کی کھال تازہ پھیلا کر رکھی ہوئی تھی۔ وہ گلہری اس کی واٹرلو کی آخری لڑائی کا انعام تھی۔ لیکن اب وہ کبھی اس کی کھال کی بنی ہوئی گرم ٹوپی یاد ستانے نہیں پہن سکے گا۔

اب تو زمین میں صرف ایک نشیب اس کے مکان کی جگہ کو نمایاں کرتا ہے۔ اُس مکان کے تہہ خانے کے پتھر اب بھی دفن پڑے ہیں اور اسٹرابری، رس بھری، گوندنیاں، خندقی جھاڑیاں اور سماق دھوپ سے روشن سبزہ زاروں میں اُگے ہوئے تھے۔ جہاں چمنی کا گوشہ

تھا وہاں ایک سیاہ صنوبر یا گانٹھ دار بڑھا شاہ بلوط نکلا ہوا تھا۔ جس جگہ دہلیز تھی وہاں ایسا
ایک خوشبودار بید کا درخت لہراتا تھا۔ بعض اوقات کنوئیں کا وہ نشیب دکھائی دیتا ہے جہاں
کبھی ایک چشمہ پھوٹتا تھا اور جہاں اب خشک اور سوکھی گھاس اگتی ہے۔ غالباً اس کنوئیں کو ایک
چپٹے پتھر سے ڈھک دیا گیا تھا تاکہ اس کا اس وقت پتہ چلے جب ان کی قوم کا آخری فرد
تک وہاں سے چلا جائے۔ یہ کتنا دردناک واقعہ ہوگا۔ یعنی پانی کے کنوئیں کو ڈھک دینا۔
اور آنسوؤں کے کنوئیں کو کھول دینا۔ جہاں پہلے زندگی کی چہل پہل تھی اور جہاں قسمت،
جبر و اختیار اور علم غیب کے موضوع پر کسی نہ کسی زبان میں بحث ہوا کرتی تھی۔ وہاں
اب صرف ان تہہ خانوں کے نشان ہیں جو ادھڑیوں کے چھوڑے ہوئے پرانے بلوں جیسے
معلوم ہوتے ہیں۔ میں ان کے مقصد حیات کے بارے میں صرف اتنا جان سکا کہ کیٹو اور
برسٹر اُون کترتے تھے"۔ لیکن ان معلومات سے صرف اتنا ہی روحانی فائدہ ہوتا ہے جتنا
زیادہ مشہور مدرسہ ہائے فلسفہ کی تاریخ سے۔ ۔۔ دروازے، سر دل اور چوکھٹ کے
غائب ہو جانے کے بعد بھی خوش نما گھاس ابھی تک نکلتی ہے۔ ہر بہار میں اس کے نکہت بیز
پھول کھلتے ہیں اور اگر اپنے خیال میں گم کوئی مسافر ادھر آ نکلتا ہے تو انہیں توڑ لیتا ہے۔
بچوں نے بھی مکان کے باہر صحن میں ان کو لگایا تھا۔ اور ان کی خبر و پرداخت کی تھی۔ اب وہ
جنگلوں کی نئی پود کو اپنی اپنی جگہیں دے چکے ہیں۔ دیواروں کی اوٹ میں چھپے ہوئے کھڑے
ہیں۔ اب وہی اس نسل کے زندہ وارث ہیں۔ ان سیاہی مائل چھوٹے بچوں کے خواب و خیال
میں بھی یہ بات نہ آئی ہوگی کہ یہ دو آنکھوں والا چھوٹا سا پودا جسے انہوں نے گھر کے سایہ میں
زمین میں گاڑ دیا تھا اور جس کی روزانہ آبیاری کی جاتی تھی وہ اتنی مضبوط جڑ پکڑے گا کہ
اُن کے گھر، مکان اور عقبی مکان جو ان کے پھولوں پر سایہ فگن تھا اور ان کے بزرگوں
کے لگائے ہوئے چمن اور باغ کے بعد بھی باقی رہے گا۔ اور اپنے لگانے والوں کے بڑے ہو جانے
اور مر جانے کے پچاس برس بعد ایک جہاں گرد کو اپنی داستان سنائے گا۔ اور اس کے پھول

اس وقت بھی خوبصورتی سے کھلے ہوں گے۔ اور اتنے ہی خوشبودار ہوں گے جتنے وہ پہلی بہار میں تھے۔ میں آج بھی اس کے نرم، شائستہ، خوشبودار اور بنفشی رنگوں کو دیکھ رہا ہوں!

لیکن یہ چھوٹا سا گاؤں جس میں پنپنے کے زیادہ امکانات تھے کیوں مٹ گیا۔ اور لنکارڈ ابھی تک مضبوط بنیاد پر قائم ہے؟ کیا وہاں قدرتی فوائد، پانی کی سہولتیں وغیرہ نہیں تھیں۔ یہ والڈن جھیل۔ یہ ٹھنڈا بریسٹر چشمہ ایک خاص فیض ہیں۔ ان میں بھر بھر کے صحت کے جام پیجیے۔ ان کو انسانوں نے بہتر بنانے کی کوشش نہیں کی ہے۔ وہ تو اپنے جام کی شراب کو ہلکا بنانے کے لئے ان کا پانی استعمال کرتے رہے ہیں۔ اُن کی نسل ہمیشہ سے پیاسی رہی ہے۔ کیا وہ ٹوکری، اصطبل کا جھاڑو، چٹائی بنانے، کپڑے بننے اور برتن بنانے کے پیشے سے ترقی نہیں کر سکتے تھے۔ جن سے یہ جنگلی گلاب کی طرح کھل اٹھتا اور آنے والی نسلوں کو ان کے اسلاف سے زمین ورثہ میں ملتی اور نشیبی زمینوں کے زوال کا یہ مقام کم سے کم مقابلہ تو کر سکتا یہ امر افسوسناک ہے کہ ان باشندوں کی یاد مناظر کی خوبصورتی میں کوئی اضافہ نہیں کرتی۔ شاید قدرت مجھے یہاں کا پہلا باشندہ تسلیم کر کے دوبارہ کوشش کرے گی اور گذشتہ بہار میں تعمیر کیا گیا یہ مکان اس پڑاؤ کا سب سے پرانا مکان بن جائے گا۔ جہاں تک مجھے علم ہے جس جگہ میرا گھر ہے وہاں پہلے کسی کا گھر نہیں تھا۔ خدا مجھے ایسے شہر سے محفوظ رکھے جو کسی قدیم ترین شہر کے آثار پر بنایا گیا ہو۔ اس کا سارا مصالحہ گلا سڑا ہوتا ہے اور اس کے باغ قبرستان ہوتے ہیں۔ وہاں کی زمین خشک اور مردود ہوتی ہے اور قبل اس کے کہ اس طرح کے شہروں کو آباد کرنا ناگزیر ہو جائے یہ دنیا ہی تہ و بالا ہو جائے گی۔ میں اس طرح کی یادوں سے جنگل کو آباد کر دیتا اور ان میں منہمک ہو جایا کرتا تھا۔

مجھ سے ایسے موسم میں شاید ہی کوئی ملنے آتا تھا جب برف کی تہہ بہت گہری جمی ہوتی تھی تو ہفتہ دو ہفتے کے لئے کسی کو میرے گھر کے قریب پھٹکنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ لیکن میں اپنے گھر میں اتنے ہی آرام سے رہتا تھا جتنا سبزہ زار کا چوہا اپنے بل میں۔ یا جیسے مویشی

اور مرغیاں جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ برف کے ڈھیر میں دب کر کچھ کھائے پیئے بغیر خاصی مدت تک زندہ رہ سکتے ہیں۔ یا سوٹن میں اس پہلے آباد ہونے والے خاندان کی طرح جس کی جھونپڑی اس کی غیر موجودگی میں ۱۷۸۰ء کی عظیم برف باری میں سر سے پاؤں تک برف سے چھپ گئی تھی اور جس کا پتہ ایک انڈین نے اس گڑھے سے لگایا تھا۔ جو چمنی کی گرم ہوا سے برف میں پیدا ہو گیا تھا اور اس طرح اس خاندان کی جان بچائی گئی تھی۔ لیکن کسی انڈین دوست کو میرے بارے میں کوئی فکر نہیں تھی۔ اور اسے فکر کرنی بھی نہیں چاہیئے تھی کیونکہ مکان کا مالک گھر میں موجود تھا۔ "عظیم برف باری!" اس کے حالات سننے میں بہت لطف آتا ہے۔ یہ وہی برف باری تھی جب کسان اپنے گھوڑوں کو لئے ہوئے جنگلوں اور دلدلوں تک نہیں پہنچ سکتے تھے اور ان کو مجبوراً اپنے گھروں کے سامنے اُگے ہوئے سایہ دار درخت کاٹنے پڑے تھے۔ جب برف سخت ہو کر جم گئی تھی تو انہوں نے جیسا کہ آئندہ بہار میں پتہ چلا کہ دلدلوں کے درختوں کو زمین سے دس دس فٹ کی بلندی تک کاٹا تھا۔

جب بہت گہری برف پڑتی تو وہ نصف میل لمبی پگڈنڈی جسے میں شاہراہ سے اپنے گھر تک آنے کے لیئے استعمال کرتا تھا، ایک ایسی نقطہ دار ٹیڑھی لکیر بن جاتی تھی جس کے نقطوں کے درمیان تھوڑا تھوڑا فاصلہ ہو۔ جس ہفتہ اوسط درجے کی برف باری ہوئی تھی میں نے اس ہفتہ میں گن گن کر اور پھونک پھونک کر قدم رکھے تھے۔ میں اس طرح ٹھیک ٹھیک اپنے گہرے نقوش پا پر فاصلہ پیمایہ پرکار کی سی درستی سے پاؤں رکھ کر چلتا تھا کہ ان کی تعداد بھی ایک سی رہتی تھی۔ اور ان کے درمیانی فاصلے بھی یکساں ہوتے تھے۔ موسم سرما کی یہ کرامات ہے کہ ہم اس قسم کی معلومات حاصل کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ان نقوش پا میں اکثر آسمان کا نیلا رنگ جھلکتا تھا۔ کوئی بھی موسم مجھے چہل قدمی اور گھر سے باہر نکلنے سے نہیں روک سکا۔ کیونکہ میں اکثر گہری برف میں آٹھ یا دس میل کا سفر طے کر کے بیچ کے درخت یا کسی زرد بید کے درخت یا کسی جانے پہچانے پرانے صنوبر سے ملنے جایا کرتا تھا۔ برفباری

کی شدت سے اُن کی شاخیں جھکی ہوتی تھیں۔ اُن کے سرے نکیلے ہو جاتے تھے اور صنوبر کے درخت کا جُو کے درخت دکھائی دینے لگتے۔ مَیں اُونچی سے اُونچی پہاڑی چوٹی پر اس وقت بھی چڑھ جایا کرتا تھا۔ جب ہموار مقامات پر بھی برف دو دو فٹ گہری ہوتی تھی اور میرے سر پر مسلسل برف کی طوفانی بارش ہوتی رہتی تھی۔ بعض اوقات تو مَیں گِرتا پڑتا ہاتھوں کے بل رینگ کر ان تک پہنچتا تھا۔ مَیں یہ ساری حرکتیں اُس وقت کیا کرتا تھا جب شکاری اپنے اپنے موسم سرما کے گھروں میں جاکر دبک جاتے تھے۔ ایک دن سہ پہر کو میں نے دھاری دار اُلّو کے نظارے سے اپنا دِل بہلایا۔ وہ ایک سفید صنوبر کی سوکھی شاخ پر جو اس کے تنے کے بالکل قریب تھی دِن کی روشنی میں بیٹھا ہُوا تھا اور مَیں اُس سے ایک جریب سے بھی کم فاصلہ پر کھڑا تھا۔ مَیں جب بھی حرکت یا اپنے پاؤں سے برف کچلتا تو وہ اس کی آواز سُن لیتا۔ لیکن وہ مجھے صاف صاف نہ دیکھ سکتا تھا۔ جب مَیں زیادہ شور کرتا تو وہ اپنی گردن لمبی کر کے اُس کے بال کھڑے کر لیتا اور اپنی آنکھیں سیکڑ کھول دیتا لیکن اس کے پپوٹے اس کی آنکھوں پر پھر جھک جاتے۔ اور وہ پھر اُونگھنے لگتا تھا۔ اس کی آدھ گھنٹہ تک نیم وا آنکھیں دیکھنے کے بعد مَیں خود بھی غنودگی محسوس کرنے لگا۔ وہ اپنی بلی جیسی نیم باز آنکھوں کی وجہ سے بلی کا بال و پر والا بھائی معلوم ہوتا تھا۔ اس کے پپوٹوں کے درمیان ایک تنگ سی درز رہ جاتی تھی جس کے ذریعہ اُس نے اپنا مجھ سے جزیرے کا سا رشتہ قائم رکھا تھا۔ وہ نیم وا آنکھوں سے دُنیا دیکھ رہا تھا اور اُسے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ مَیں اس کی نظر میں کوئی دھندلی سی چیز یا ایک ذرہ تھا جو اس کے نظارے میں حائل تھا۔ اچانک وہ کسی آواز پر یا میرے قریب ترین چلے جانے پر بیقرار ہو جاتا تھا اور بیزاری کاہلی کے ساتھ اپنے اڈے پر گھوم جاتا جیسے وہ خواب شیریں سے بیدار کئے جانے پر تلملا رہا ہو۔ جب وہ اُڑ گیا اور صنوبروں پر سے اپنے پر پھڑپھڑاتا ہوا نامعلوم دستور میں کھو گیا تو مجھے اُس کے اُڑنے کی ہلکی سی آواز بھی سُنائی نہ دی۔

اس طرح قوت بینائی کی جگہ اُس نے صنوبر کی شاخوں کی قربت کے احساس سے رہنمائی حاصل کی اور اپنے مقصد کے راستے کو اپنے ذکی الحس پروں سے محسوس کر کے ایک نیا ٹھکانہ ڈھونڈ لیا جہاں وہ اطمینان سے بیٹھ کر دن نکلنے کا انتظار کر سکتا تھا۔

جب میں اس بیچ پتھریلے راستے پر چلتا تھا جو ریل والوں نے سبزہ زاروں کے بیچ میں سے نکالا تھا تو مجھے اکثر تند تازی اور جسم میں چبھتی ہوئی ہواؤں سے دوچار ہونا پڑتا تھا کیونکہ ہوا کے لئے اس جگہ سے زیادہ اور کہیں بھی کھل کھیلنے کا موقع میسر نہیں آسکتا تھا۔ جب کہرا میرے ایک گال پہ تھپیڑ مارتا تو کافر ہونے کے باوجود میں دوسرا گال بھی پیش کر دیتا۔ گاڑیوں والی پگڈنڈی جو بے سطح پہاڑیوں سے آتی تھی بہت خستہ حال تھی کیونکہ ایک دوست انڈین کی طرح میں اس وقت بھی قصبہ میں جایا کرتا تھا جب وسیع و عریض اور کھلے کھیتوں کی کمائی والی ان سڑک کی دیواروں کے درمیان ڈھیروں کی صورت میں پڑی رہتی تھی۔ اور آخری مسافر کے نقوش پا مٹانے کے لئے آدھا گھنٹہ بہت کافی ہوتا تھا۔ جب میں واپس آتا تھا تو برف کی ننھی ننھی روئیں جمی ہوتی تھی۔ میں ان میں سے گرتا پڑتا گذر جاتا تھا اور اچانک سڑک کا ایک موڑ پار کرتا تھا۔ جہاں شمالی مغربی ہوا نے سفوف جیسی برف بکھیر رکھی ہوتی تھی۔ وہاں خرگوش تک کے نقش پا نہیں ملتے تھے اور نہ سبزہ زار کے کسی چوہے کے ننھے ننھے پاؤں کے باریک نشان نظر آتے تھے اس کے باوجود مجھے موسم سرما کے وسط میں گرم چشمہ سے بنی ہوئی کوئی نہ کوئی دلدل مل جاتی تھی جہاں گھاس اور کدم کلا مکمل طور سے سرسبز ہوتے اور ان میں کوئی ایسا جفاکش پرندہ دکھائی دے جاتا تھا جو بہار کے واپس آنے کا منتظر ہوتا تھا۔

بعض اوقات میں برفباری کے باوجود جب شام کو اپنی سیر سے واپس آتا تو مجھے اپنے دروازے سے تک جاتے ہوئے کسی لکڑہارے کے نقوش پا پر چلنا پڑتا۔ گھر کے اندر آکر میں آتش دان میں اس کے لائے ہوئے لکڑی کے چھلکے جلتے دیکھتا اور میرا مکان اس کے پائپ کی خوشبو سے بھرا ہوتا۔ یا کبھی اتوار کی سہ پہر کو اگر میں اتفاق سے گھر میں ہوتا تو مجھ

ایک لمبے سر والے کسان کے قدموں کو دروازے کے سامنے کی برف کو کچلتے ہوئے سنتا
وہ بہت دور سے جنگلوں کو پار کر کے مجھ سے گفتگو کرنے کے لئے آیا کرتا تھا۔ وہ کھیتوں پر
کام کرنے والے اپنے ہم پیشہ آدمیوں سے اپنی ایک الگ خصوصیت رکھتا تھا۔ وہ پروفیسر
کے گاؤن کی بجائے فراک پہنتا تھا اور گرجا اور حکومت سے ہدایت حاصل کرنے کے
لئے اسی طرح تیار رہتا تھا جس طرح اپنے فارم گھر کے احاطہ سے کھاد کا بوجھ ڈھونے
کے لئے۔ ہم دونوں ان سیدھے سادے اور غیر مہذب ایام کے بارے میں باتیں
کرتے۔ جب لوگ سرد اور خوشگوار موسم میں الاؤ کے گرد تازہ دماغ ہو کر بیٹھتے تھے اور
جب ہمارے پاس کھانے کو کچھ نہیں ہوتا تھا تو اپنے دانتوں سے ان گریوں کو توڑا
کرتے جن کو عقلمند گلہریوں نے بہت دنوں سے چھوڑ رکھا ہے۔ تھا کیونکہ جو چھلکے موٹے
ہوتے ہیں وہ عام طور سے خالی ہوتے ہیں۔

وہ شخص جو بہت دور سے انتہائی گہری برف اور انتہائی خطرناک طوفان سے گزر کر
میرے گھر آتا تھا وہ ایک شاعر تھا۔ ایک کسان، ایک شکاری، ایک فوجی۔ ایک نامہ نگار
اور ایک فلسفی تک بھی آ سکتا ہے۔ مگر ایک شاعر کو کوئی خطرہ نہیں روک سکتا کیونکہ
خالص محبت ہی اس کی ترغیب دلاتی ہے۔ کون اس کی آمد و رفت کے بارے میں
پیشگوئی کر سکتا ہے؟ اس کا کاروبار اسے ایسے وقت میں بھی گھر سے باہر نکال دیتا ہے
جب ڈاکٹر بھی خوابیدہ ہوتے ہیں۔ میرا گھر قہقہوں اور سنجیدہ باتوں سے گونج اٹھتا
تھا۔ اس طرح میں والڈن وادی کے حضور اپنی طویل خاموشیوں کا تدارک کیا کرتا تھا
اس کے مقابلہ میں براڈوے خاموش اور ویران جگہ تھا۔ بیچ بیچ میں برمحل ہنسی کی
ٹولیوں کی سلامی دی جاتی، جس کو گذشتہ مذاق کا اثر یا آنے والے مذاق کا پیش خیمہ کہا
جا سکتا تھا۔ ہم پتلا دلیا کھاتے ہوئے زندگی کے کچھ جدید نظریات پیش کیا کرتے
تھے جن میں دعوتوں کی زندہ دلی اور فلسفہ کی مطلوبہ شگفتگی ہوتی تھی۔

مجھے یہ بات بھولنی نہیں چاہیے کہ تالاب پر میرے آخری موسم سرما میں ایک اور عزیز تر نیا مہمان مجھ سے ملنے آیا جو ایک گاؤں سے برف باری اور تاریکی میں سے گزر کر آیا تھا کیونکہ اس نے درختوں میں میرے گھر کے اندر جلتا ہوا لیمپ دیکھ لیا تھا۔ اس کے بعد اس نے موسم سرما کی کئی طویل شامیں میرے ساتھ گزاریں۔ وہ آخری دور کے فلسفیوں میں سے تھا اور دنیا کے لئے کنکٹی کٹ کی طرف سے ایک نذرانہ تھا۔ پہلے وہ جا بجا گھوم کر کنکٹی کٹ کے برتن بیچتا تھا۔ بعد میں اس کے اپنے قول کے مطابق وہ اپنا دماغ بیچنے لگا۔ وہ اب بھی اپنا دماغ بیچتا ہے خدا کی عظمت میں اضافہ کرتا ہے اور انسان کی توہین کرتا ہے۔ اپنے دماغ کو پھل کے طور پر پیش کرتا ہے جس طرح بادام اپنی گری کو۔ میرا خیال ہے کہ دنیا میں اس سے زیادہ کوئی راسخ الاعتقاد شخص نہیں ہے۔ اس کے الفاظ اور اس کا طریقہ عمل ہمیشہ بہتر صورت حال فرض کر لیا کرتے تھے۔ جن سے بیشتر آدمی آگاہ ہی نہیں ہوتے۔ وہ ایسا شخص ہے کہ گردش ایام کے باوجود کبھی مایوس نہ ہوگا۔ اسے زمانہ حال سے کوئی سروکار نہیں۔ اگرچہ اب مقابلتاً اسے نظر انداز کیا جا رہا ہے لیکن ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ وہ قوانین جن کا لوگوں کو وہم و گمان بھی نہیں ہے نہایت موثر ثابت ہوں گے اور خاندانوں کے سردار اور حکمران اس کے پاس مشورہ کے لئے آیا کریں گے۔

"وہ شخص کس قدر اندھا ہے جو اطمینان قلب نہیں پہچان سکتا۔"

وہ انسان کا سچا دوست ہے اور شاید انسانی ارتقا کا واحد دوست ہے وہ ایک "بوڑھی فنا" یا یوں کہئے کہ غیر فانی ہے۔ وہ ان تھک صبر و تحمل اور اعتقاد سے اس صورت کو اجاگر کر رہا ہے جو انسانوں کے اجسام میں کندہ ہے لیکن اس خدا کو جس کی وہ مسخ شدہ اور شکستہ یادگاریں ہیں۔ وہ بچوں [illegible]

پاگلوں اور دانشمندوں کو بڑی فراخدلی کے ساتھ اپنی آغوش میں لے لیتا ہے۔ وہ ہر ایک کے خیالات سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ اور ان خیالات کو وسعت اور نفاست عطا کر دیتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اُسے اس دُنیا کی شاہراہ پر ایک کارواں سرائے کھول لینی چاہیئے جس میں تمام ممالک کے فلسفی آکر ٹھہریں اور اس کارواں سرائے کے بورڈ پہ لکھا ہو "یہاں انسان کی تفریح کا سامان ہے۔ لیکن اس کے حیوانات کے لئے نہیں۔ وہ لوگ بڑی خوشی سے آئیں جن کو فرصت ملے، جن کا دماغ پرسکون ہے اور جو خلوص سے سیدھا راستہ ڈھونڈ رہے ہیں۔" مجھے جتنے لوگوں کو جاننے کا اتفاق ہوا ہے۔ وہ اُن میں غالباً سب سے زیادہ ذی ہوش ہے اور اگر اُسے خبط ہو بھی تو وہ سب سے کم خبط رکھتا ہے اس کا کل بھی آج جیسا ہے۔ ہم ایک ساتھ ٹہلا کرتے اور باتیں کیا کرتے اور دُنیا کو بہت پیچھے چھوڑ جاتے تھے۔ کیونکہ وہ دُنیا کے کسی مدرسۂ خیال کا پابند نہ تھا۔ وہ پیدائشی طور پر آزاد تھا۔ اُس میں کوئی بناوٹ نہ تھی۔ ہم جس طرف بھی مڑتے تھے۔ ایسا دکھائی دیتا تھا جیسے زمین اور آسمان گلے مل رہے ہیں۔ کیونکہ اس کی موجودگی مناظر کی دلفریبی میں اضافہ کر دیتی تھی۔ وہ ایک نیلا جُبّہ پہنتا ہے۔ اس کی موزوں چھت محراب دار آسمان ہے جو اس کی دلجمعی کی جھلک پیش کرتا ہے۔ مجھے تو ایسا دکھائی دیتا ہے کہ وہ ہرگز ہرگز نہیں مر سکتا۔ قدرت اس کے بغیر کام نہیں چلا سکتی۔

چونکہ ہم دونوں میں سے ہر ایک نے خیالات کی کچھ لکڑیاں اچھی طرح سُکھا کر رکھی ہوئی تھیں اس لئے ہم بیٹھ کر اُن کو چھیلنے لگتے، اُن پر اپنے چاقو آزمانے لگتے اور ہم اُس صاف اور زردی مائل ریشے کی بھی تعریف کرتے جو کدو نما صنوبر سے نکلتا ہے۔ ہم خیال کے سمندر میں آہستگی سے تیرتے یا بڑی ہمواری سے اُس میں کشتی چلاتے تھے تاکہ خیالات کی مچھلیاں ڈر کر بھاگ نہ جائیں۔ وہ مچھلیاں کنارے

بیٹھے ہوئے کسی شکاری سے نہیں ڈرتی تھیں۔ وہ بڑی شان کے ساتھ آتیں اور گزر جاتیں بادلوں کے ان ٹکڑوں کی طرح جو منہ پی آسمان پر اڑتے ہیں۔ اور بادلوں کے ان موتیوں جیسے جھنڈوں کی طرح جو وہاں نیچے اور محو ہو جاتے ہیں۔ ہم وہاں بیٹھ کر کام کرتے۔ دیومالا پر نظرثانی کرتے۔ یہاں وہاں کسی کہانی کا انجام بدل دیتے اور ایسے ہوائی قلعے بناتے تھے۔ جن کے قیام کے لئے دنیا میں کوئی بنیاد نہ ہوتی۔ وہ بڑا صاحب نظر ہے اور عظیم توقعات رکھتا ہے۔ اس سے باتیں کرنا نیو انگلینڈ کی شبانہ تفریح کے برابر ہے۔ ہم نے آپس میں کیا کیا بحث کی۔ ہم میں بحث طول پکڑ جاتی تھی اور میرا چھوٹا سا مکان لرزتا رہتا تھا۔ میں یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ ہر مادر اینچ پر فضا کے دباؤ کا کتنے پونڈ کا وزن ہوتا تھا اس کے جوڑ کھل جاتے تھے اور ہمیں بعد میں دماغی کاہلی سے درزوں کو بھرنا پڑتا تھا تاکہ وہ ٹپکنے نہ لگیں۔ میں نے اس قسم کا مسالا پہلے ہی جمع کر رکھا تھا۔

ایک شخص اور بھی تھا جس کے ساتھ میں نے گاؤں میں اس کے گھر پر بھرپور شامیں گزاری تھیں جو مدت تک یاد رہیں گی۔ وہ کبھی میرے گھر بھی آیا کرتا تھا لیکن میرے اس سے زیادہ ہمدم نہیں تھے۔

میں وہاں بھی ہر جگہ کی طرح بعض اوقات اس مہمان کا منتظر رہا جو کبھی نہ آیا۔ وشنو پران میں لکھا ہے کہ مکان کے مالک کو اتنی دیر تک اپنے صحن میں رہنا چاہیئے۔ جتنی دیر گائے کو دوہنے میں ہوتی ہے۔ اور اگر وہ چاہے تو اس سے بھی زیادہ دیر تک وہاں رہ سکتا ہے۔ اور اسے وہاں کسی مہمان کا منتظر رہنا چاہیئے۔" میں نے اکثر اس میزبانی کے فرائض سرانجام دیئے اور اتنی دیر تک انتظار کرتا رہا۔ جتنی دیر میں گائیوں کے ایک پورے گلے کو دوہا جا سکتا ہے۔ لیکن میں نے اس شخص کو قصبے سے آتے ہوئے نہ دیکھا۔

موسمِ سرما کے جانور

جب تالاب بڑی سختی سے جم جاتے تھے تو ان میں سے نہ صرف مختلف مقامات
تک پہنچنے کے لئے نئے اور چھوٹے راستے بن جاتے تھے بلکہ اُن کی سطحوں سے اِن کے
اردگرد کے جانے پہچانے ارضی مناظر بھی نئے رنگ میں نظر آنے لگتے تھے۔ اگرچہ
میں نے فلنٹ تالاب پر اکثر کشتی چلائی تھی۔ اور اُس پہ اسکیٹنگ کی تھی۔ پھر بھی
جب میں نے اس کے برف سے ڈھک جانے کے بعد اُس کو پار کیا تو وہ خلافِ توقع
اتنا چوڑا اور اتنا اجنبی معلوم ہوا تھا کہ میں خلیج بفن کا تصور کئے بغیر نہ رہ سکا۔
لنکن پہاڑیاں ایک ایسے برفانی میدان کے دُور دراز کونے پہ میرے چاروں طرف سربلند تھیں
جن میں اپنی یادداشت کے مطابق میں پہلے کبھی کھڑا نہیں ہوا تھا اور وہ ماہی گیر جو برف
پہ ایک غیر معیّن فاصلہ پہ اپنے بھیڑیے جیسے کتّوں کے ساتھ دھیرے دھیرے
چلتے تھے سیل پکڑنے والے یا اسکیمو دکھائی دیتے تھے یا کہر آلود موسم میں افسانوی
جانور معلوم ہوتے تھے اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ دیو ہیں یا بونے۔ جب
میں شام کو لیکچر دینے کے لئے لنکن جایا کرتا تھا تو اسی راستے سے ہو کر جاتا تھا
میں اپنے گھر سے لے کر لیکچر کے کمرے تک نہ کسی سڑک پہ چلتا تھا نہ کسی مکان کے

قریب سے گزرتا تھا۔ میرے راستے میں جو لطوں کا تالاب پڑتا تھا وہاں چھچھوندروں کی بستی تھی۔ انہوں نے برف کے اوپر اونچے اونچے گھروندے بنا رکھے تھے لیکن جب میں ادھر سے گزرتا تو وہ ان گھروندوں میں نظر نہ آتیں۔ دوسرے تالابوں کی طرح والڈن بھی عام طور پر آسمانی برف سے خالی ہوتا یا اس پر برف کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بہہ رہے ہوتے تھے یہ میرا احاطہ تھا جہاں میں آزادی سے اس وقت بھی ٹہل سکتا تھا۔ جب دوسری جگہوں پر دو دو فٹ گہری برف پڑ چکی ہوتی تھی۔ اور گاؤں کے لوگ اپنی گلیوں میں بند ہو کر رہ جاتے تھے۔ گاؤں کی گلیوں سے دور طویل وقفوں کے بعد آنے والی آوازوں کے سوا اور برف کی گاڑیوں کی گھنٹیوں کی ٹن ٹن سے بھی دور میں یوں پھسلتا اور اسکیٹنگ کیا کرتا تھا جیسے میں ہرنوں کے کسی ایسے میدان میں ہوں جس پر کافی لوگ چل چکے ہوں۔ جس پر شاہ بلوط اور گمبھیر صنوبر سایہ فگن ہوں۔ اور برف سے جھک گئے ہوں یا جن پر برف کے دانے چمک رہے ہوں۔

جہاں تک موسم سرما کی راتوں اور اکثر موسم سرما کے دنوں کا تعلق ہے ایک نامعلوم دوری سے الو کی دردناک مگر ترنم آواز آتی ہوئی سنائی دیتی تھی یہ ایسی آواز تھی جو منجمد زمین پر زخم ساز کی ضرب لگانے سے پیدا ہو سکتی تھی۔ یہ آواز والڈن جنگل کی بولی ٹھولی تھی۔ اگرچہ میں نے اس پرندے کو کبھی بولتے ہوئے نہیں دیکھا تھا لیکن میں اس آواز سے مانوس ہو چکا تھا۔ میں جب موسم سرما میں اپنے گھر کا دروازہ کھولتا تو اس کی آواز سنتا۔ ہو۔ ہو۔ ہو۔ ہو۔ ہو۔ پہلے تین ٹکڑے ہاؤ۔ ڈر۔ ڈر جیسے معلوم ہوتے یا کبھی کبھی صرف ہو۔ ہو پر ہی موقوف رہتے تھے۔ ایک روز سردیوں کے اوائل میں تالاب کے منجمد ہونے سے پہلے ۹ بجے کے قریب میں ایک ہنسی کی بلند قہقہے سے چونک پڑا۔ میں دروازے تک چل کر آیا تو میں نے ان کو اپنے گھر کے اوپر بہت نیچے اڑتے ہوئے اور یوں

پہ پھڑ پھڑا کر گذرتے ہوئے دیکھا جیسے جنگل میں زور کی آندھی چل رہی ہو۔ بظاہر
وہ میرے گھر کی روشنی دیکھ کر تالاب پر نہ بیٹھے اور "فیر ہیون" کی طرف اڑ گئے۔
ان کا کمانڈر بڑی باقاعدگی سے قہ قہ کرتا رہا۔ اچانک ایک اُلو میرے قریب ہی
سے ایسی کرخت آواز میں جو میں نے اس رات سے پہلے جنگل کے کسی جانور کے منہ سے
نہ سنی تھی۔ باقاعدہ وقفوں کے بعد ہنسوں کی قہ قہ کا جواب دینے لگا۔ جیسے اس
نے خلیج ہڈسن سے آنے والے ان رختہ اندازوں کا پول کھولنے اور انہیں ذلیل
کرنے کا تہیہ کر رکھا تھا کہ وہ دکھا دے گا کہ جنگل کے اس باشندے کے مقابلہ میں
ان کی آواز زیادہ دور تک جانے اور گونجنے والی نہیں ہے اور اس طرح ان
کو کنکارڈ کے افق سے ہُو۔ہُو کر کے بھگا دے گا۔ وہ اس قلعے میں جو اس وقت
رات کو میرے لئے مخصوص ہو چکا ہے تم شور و غل مچانے والے کون ہو؟ تم
سمجھتے کیا ہو کیا اس اس وقت کبھی کسی نے مجھے اونگھتے ہوئے دیکھا ہے اور کیا
میرے پاس تمہارے جیسے پھیپھڑے اور حلق نہیں ہیں؟" ہُو۔ہُو۔ہُو۔ہُو۔
ہُو۔ہُو" اتنا ولولہ انگیز اور بے سرا نغمہ میں نے پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔ اسکے
باوجود اگر آپ امتیاز کرنے والے کان رکھتے ہیں تو آپ اس میں ایک ایسی ہم آہنگی
پائیں گے جو ان میدانوں میں آپ نے نہ کبھی سنی ہو گی اور نہ کبھی دیکھی ہو گی۔

مجھے تالاب میں برف کی چڑ چڑاہٹ بھی سنائی دیتی تھی۔ یہ تالاب میرا عظیم
ترین بستر تھا۔ ایسا دکھائی دیتا تھا جیسے وہ بے قرار ہو اور بستر میں کروٹ بدلنا
چاہتا ہو یا اُسے نفخ کی شکایت ہو اور بڑے بڑے خواب دیکھ رہا ہو یا پھر کھرے
سے زمین پھٹتی تو میری آنکھ کھل جاتی۔ جیسے کسی نے اپنی گھوڑا گاڑی لا کر میرے دروازے سے
ٹکرا دی ہو اور صبح کو زمین میں ایک چوتھائی میل لمبا اور ایک تہائی انچ چوڑا شگاف تھا۔
بعض اوقات مجھے لومڑیوں کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ جب وہ برف کی تہوں پر

دوسری جانب دوڑ جاتی لیکن ایک وقت میں کبھی آدھی جریب سے زیادہ دور نہ جاتی۔ پھر وہ مفلوجانہ حیرت زدگی سے ٹھٹک جاتی۔ اور پیسہ لئے بغیر مفت قلابازیاں لگاتی جیسے ساری دنیا کی آنکھیں اس پر لگی ہوں۔ گلہری کی تمام حرکات خواہ وہ جنگل کے کسی تنہا گوشے میں ہی کیوں نہ کی جا رہی ہوں ایک رقاصہ کا سا انداز رکھتی ہیں۔ اور ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حرکات تماشائیوں کو خوش رکھنے کے لئے کی جا رہی ہیں۔ اس طرح بار بار رک کر وہ اتنا وقت ضائع کرتی تھی کہ اتنے میں اس فاصلہ کو چل کر طے کیا جا سکتا تھا۔ میں نے کبھی کسی گلہری کو چلتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اور پیشتر اس کے کہ آپ اپنے منہ سے جبکہ رابنسن کا پورا نام ادا کریں وہ کالے درخت پر سب سے اوپر چڑھ جاتی۔ اپنے گال کو پھلا دیتی اور خیالی ناظرین کو اپنی ٹکٹکی نظر سے تکتی رہتی اور بیک وقت اپنے آپ سے اور دنیا کی تمام ساکنات سے باتیں کرتی تھی۔ میں اس کی کوئی وجہ نہ معلوم کر سکا۔ اور مجھے شبہ ہے کہ اس کی وجہ وہ خود بھی نہیں جانتی تھی۔ بالآخر وہ ناکام پہنچ جاتی۔ ایک مناسب بالی چن لیتی۔ اور پھر ایک غیر یقینی علم مثلث والے طریقہ سے بہر لکڑیوں کے ڈھیر کی سب سے بالائی لکڑی پہ میری کھڑکی کے سامنے بیٹھ کر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیتی اور وہاں گھنٹوں بیٹھی رہتی۔ اور وقتاً فوقتاً کوئی نئی بالی بڑی گرسنگی کے ساتھ کترنے لگتی اور پھر ادھ چبے گودے کو ادھر ادھر پھینک دیتی۔ بالآخر وہ بہت ہی نفاست پسند ہو جاتی اور اپنی خوراک سے کھیلنے لگتی۔ وہ گودے کا اندرونی حصہ چکھتی اور اس بالی سے جو لکڑی پر اس کے پنجے میں دبوچا ہوا تھا بے پروا ہو جاتی۔ وہ بالی پھسل کر زمین پر گر پڑتی۔ وہ زمین پر گری ہوئی بالی کو بہت ہی مضحکہ خیز انداز میں غیر یقینی نظروں سے دیکھتی جیسے اس کو شک ہو رہا ہو کہ اس بالی میں جان ہے یا نہیں۔ وہ فیصلہ نہ کر سکتی کہ اس بالی کو اٹھا لائے یا کوئی دوسری بالی لائے یا وہاں سے بھاگ

جائے ۔ اس طرح یہ شریر گلہری سہ پہر کو بہت سی بالیاں ضائع کر دیتی۔ وہ اپنے سے بھی زیادہ بڑی اور موٹی بالی کو اٹھا لیتی۔ اور جس طرح شیر بھینسے کو اٹھا لے جاتا ہے، اسی طرح وہ اس بالی کو لیے ہوئے جنگل کی طرف روانہ ہو جاتی۔ پھر اسی طرح ٹیڑھی چال چلتی اور بیچ بیچ میں رک جاتی اور پھر بالی کو اسی طرح گھسیٹتی جیسے وہ اس کے لیے بہت وزنی ہو۔ وہ بالی اس سے چھوٹ کر گر پڑتی۔ اور بعض اوقات اس کو اس طرح گرا دیتی کہ وہ بالی عمودی اور افقی خط کے درمیان وتر بن جاتی۔ اس نے تہیہ کر رکھا ہوتا تھا کہ چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہو جائے وہ اسے ضرور لے جائے گی یہ انتہائی تمسخر انگیز اور قوم پرست گلہری اس بالی کو وہاں لے جاتی۔ جہاں وہ رہتی تھی۔ غالباً چالیس پچاس جریب دور کسی صنوبر کی چوٹی پر۔ کیونکہ میں بعد میں کچے دانے جنگل میں ادھر ادھر بکھرے ہوئے دیکھتا تھا۔

بالآخر شور و غل مچاتے ہوئے نیل کنٹھ آجاتے ہیں جن کا بے سرو پا شور و غل ایک فرلانگ کے فاصلے سے جب وہ بڑی احتیاط کے ساتھ آ رہے ہوتے ہیں سنائی دیتا ہے۔ وہ چوروں کی طرح چھپ چھپ کر اس درخت سے اس درخت پر اڑتے ہوئے قریب سے قریب تر ہوتے جاتے ہیں اور گلہریوں کی گرائی ہوئی گریاں اٹھا لیتے ہیں۔ اس کے بعد کالے صنوبر کی شاخ پر بیٹھ کر تیزی سے گری نگلنے کی کوشش کرتے ہیں جو ان کے حلق کے لیے بہت بڑی ہوتی ہے۔ وہ گری ان کے حلق میں پھنس جاتی ہے۔ وہ بڑی مشکل سے اسے اگل پاتے ہیں۔ اور ایک گھنٹہ اسے چونچیں مار مار کر توڑنے میں صرف کر دیتے ہیں۔ صاف عیاں تھا کہ وہ چور تھے اور میں ان کی ذرہ بھر عزت نہیں کیا کرتا تھا۔ لیکن گلہریاں اگرچہ پہلے پہل بڑی شرماتی تھیں مگر اپنے کام پر یوں جاتی تھیں جیسے وہ وہی چیز لے رہی ہوں جو ان کی اپنی ہے۔

دریں اثنا جھنڈوں کی صورت میں ابابیلیں آئیں اور گلہریوں کے گرائے ہوئے

ٹکڑے اُٹھا کر نزدیکی شاخ پر جا بیٹھتیں اور اُن کو اپنے پنجوں میں دبا کر اپنی چھوٹی چھوٹی چونچوں سے اُن پر ضرب لگاتیں جیسے وہ چھال کے اندر کسی کیڑے پر چونچیں مار رہی ہوں حتیٰ کہ وہ ٹکڑے گھٹ کر اتنے پتلے ہو جاتے کہ ان کے حلق کے قابل ہو جاتے۔ یہ چھوٹے چھوٹے پرندے چھوٹے چھوٹے جھنڈوں میں آتے اور میری لکڑیوں کے ڈھیر یا دروازے پر پڑے ہوئے ٹکڑوں سے اپنی خوراک چن لے جاتے اور گھاس میں کھنکتے ہوئے برف کے ٹکڑوں کی طرح دھیمی دھیمی آوازیں نکالتے یا کپھر ڈے۔ ڈے۔ ڈے کر کے بولتے اور موسم بہار جیسے دنوں میں جنگل سے آتی ہوئی۔ فی۔ بی کی تیکھی آواز نکالتے۔ ابابیلیں اس قدر مانوس ہو گئی تھیں کہ ایک دن اُن میں سے ایک میری بغل میں دبے ہوئے لکڑیوں کے گٹھڑ پر آ بیٹھی۔ اور بڑی بے خوفی سے اُس پر چونچیں مارنے لگی۔ ایک دفعہ جب میں گاؤں میں باغ کو دیکھ رہا تھا۔ تو ایک گوریا میرے کندھے پر آ کر بیٹھ گئی تھی۔ اور اس واقعہ نے میری نظر میں خود میری وقعت اس بات سے بڑھا دی۔ تو کسی بڑے عہدے کی علامت کی طرح مجھے اپنے کندھے پر لگانے کے لئے ملتا۔ بالآخر گلہریاں بھی مجھ سے بہت مانوس ہو گئیں اور کبھی کبھی اس طرف سے اگر اُن کا راستہ چھوٹا ہوتا تو میرے جوتے پر پاؤں رکھتی ہوئی گذر جاتیں۔

جب زمین برف سے اچھی طرح نہ ڈھکی ہوتی اور موسم سرما کے اختتام کے قریب جب میری جنوبی پہاڑی کے دامن اور لکڑیوں کے ڈھیر پر برف پگھل جاتی تو تیتر صبح و شام وہاں چگنے کے لئے آتے۔ آپ جنگل میں جدھر سے بھی گذر جائیں۔ تیتر سرسراتے ہوئے اُڑتے ہیں اور درختوں کی سوکھی پتیوں اور ٹہنیوں پہ جمی ہوئی برف کو ملا دیتے ہیں۔ اور جب برف چھن کر گرتی ہے تو سورج کی کرنیں سونے کے سفوف کی طرح چمک اٹھتی ہیں۔ یہ بہادر پرندہ موسم سرما سے بالکل نہیں ڈرتا اسے ہوا میں اڑتی برف اکثر ڈھک دیتی ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ بعض اوقات وہ ایک بازو سے نرم برف میں گھس جاتا ہے جہاں وہ چھپ کر ایک دو دن پڑا رہتا ہے لیکن

نے دیکھا کہ ایک لومڑی جس کا پیچھا شکاری کُتّے کر رہے تھے جنگل میں سے تیزی کے ساتھ والڈن تالاب پر پہنچی جب برف پر پایاب پانی جمع تھا۔ لومڑی تھوڑی دور تک تالاب کے اندر دوڑ گئی لیکن پلٹی اور پھر اُسی ساحل پر جا نکلی جدھر سے وہ آئی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہاں کُتّے بھی پہنچ گئے۔ لیکن اُن کو لومڑی کی بو نہ آئی۔ بعض اوقات کتوں کا گروہ خود بخود شکار کی تلاش میں نکلتا میرے دروازے کے سامنے سے گزرتا میرے گھر کے گرد چکر کاٹتا اور مجھ پر نگاہ ڈالے بغیر بھونکتا اور چیختا جیسے اُن کے سر پر کوئی جنون سوار ہو اور کوئی امر اُنہیں شکار کا پیچھا کرنے سے روک نہ رہا ہو۔ وہ اس طرح چکر لگاتے ہوئے کسی نہ کسی لومڑی کا سراغ لگا لیتے۔ کیونکہ ہوشیار کتا لومڑی کی تلاش میں دوسرے شکار کو چھوڑ دیتا ہے۔ ایک دن لیکسنگٹن سے ایک شخص اپنے شکاری کتے کے بارے میں پوچھ گچھ کے لئے میرے جھونپڑے میں آیا۔ اُس کے کتے نے پاؤں کے بڑے بڑے نشان چھوڑے تھے۔ اور ایک ہفتے سے اکیلا ہی شکار کر رہا تھا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ میں نے اُس کو جو کچھ بتایا وہ اس کی سمجھ میں نہ آیا کیونکہ جب میں اس کے سوالات کے جوابات دینے کی کوشش کرتا تھا تو وہ میری بات کاٹ کر مجھ سے پوچھتا تھا "آپ یہاں کیا کرتے ہیں؟" اُس نے اپنا کتا کھو دیا تھا لیکن اُسے ایک آدمی مل گیا تھا۔

ایک بوڑھے شکاری نے جو بہت کم باتیں کرتا تھا اور جو ہر سال میں ایک بار والڈن تالاب میں اس وقت نہانے کے لئے آیا کرتا تھا جب اُس کا پانی بہت گرم ہوتا تھا (وہ اس موقع پر مجھ سے ضرور ملنے آتا تھا) مجھے بتایا کہ کئی برس ہوئے وہ ایک دن والڈن جنگل میں نکل گیا تھا اور جب وہ ایک راستے پر جا رہا تھا تو اس نے پاس آتے ہوئے شکاری کتوں کی چیخ سُنی اور چند لمحوں کے بعد ایک لومڑی دیوار پھاند کر سڑک پر آ گئی اور پھر تیزی سے دوسری جانب کی دیوار پھاند کر غائب ہو گئی۔ لیکن اس نے تیزی سے اس پر گولی چلائی لیکن اس کی برق رفتاری کی وجہ سے گولی اُسے نہ چھو سکی تھوڑی دیر کے بعد ایک شکاری کتیا اپنے بچوں کے

کے ہمراہ لومڑی کا پیچھا کرتی ہوئی اپنے طور پر اُس کے شکار کی فکر میں وہاں پہنچی اور پھر جنگل میں جا گھسی۔ شام کے قریب جب شکاری والڈن کے جنوبی جنگل میں سستا رہا تھا اُس نے بہت دور سے "فیرہیون" کی جانب اُن شکاری کتوں کی آواز سنی۔ وہ اُسی کی طرف بڑھے چلے آ رہے تھے۔ ان کی چیخوں سے سارا جنگل گونج رہا تھا۔ اُن کی آواز قریب سے قریب تر ہوتی چلی گئی۔ ابھی اُن کی آواز ویل میڈو کی جانب سے آئی اور ابھی بیکر فارم کے قریب سنائی دی۔ وہ بڑی دیر سے اس موسیقی کو جو ہر شکاری کے کانوں کے لئے ایک شیریں نغمہ ہوتی ہے خاموش کھڑا سن رہا تھا کہ اچانک لومڑی درختوں کی قطار سے مستانہ چال سے آتی ہوئی دکھائی دی۔ اس کے قدموں کی چاپ پتیوں کی کھڑکھڑاہٹ میں سنائی نہ دی۔ وہ خاموش مگر تیز رفتار سے اپنے تعاقب کرنے والوں کو بہت پیچھے چھوڑتی ہوئی بڑھ رہی تھی۔ وہ اچھلتی ہوئی جنگل میں ایک چٹان پر آئی اور شکاری کی طرف پیٹھ کر کے اکڑ گئی۔ بیٹھ گئی اور کتوں کی آواز سننے لگی۔ ایک لمحہ کے لئے شکاری کو رحمدلی نے روک لیا۔ لیکن پھر اتنی ہی تیزی سے جتنی تیزی سے ایک کے بعد دوسرا خیال آتا ہے اس نے بندوق تان لی، نشانہ باندھا اور گولی داغ دی۔ لومڑی چٹان پر سے لڑھکی اور مر کر زمین پر آ گری۔ شکاری ابھی اپنی جگہ پر کھڑا ہوا کتوں کی آوازیں سن رہا تھا۔ کتے ابھی پیچھے آ رہے تھے۔ اور اب تو قریبی جنگل ان کی شیطانی چیخوں سے گونج اُٹھا تھا۔ آخر کار بوڑھی کتیا زمین سونگھتی اور پاگلوں کی طرح ہوا میں منہ مارتی ہوئی دکھائی دی۔

وہ سیدھی چٹان کی جانب چلی گئی لیکن لومڑی کو مردہ پا کر اس نے بھونکنا بند کر دیا۔ جیسے تعجب نے اسے گونگا بنا دیا ہو۔ اور وہ خاموشی لومڑی کے گرد چکر لگانے لگی۔ پھر ایک ایک کر کے اس کے پلے بھی آ پہنچے اور ماں کی طرح اس عجیب واقعہ نے ان کے منہ بھی سی دیئے۔ اس کے بعد وہ شکاری ان کے بیچ میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ اور کتوں نے اس معمہ کو حل کر لیا۔ جب تک وہ لومڑی کی کھال اتارتا رہا کتے خاموش کھڑے رہے۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے لومڑی کی دم کے پیچھے آئے لیکن آخر دوبارہ جنگل میں چلے گئے۔ کنکارڈ کے اس شکاری کے جھونپڑے میں

اُس شام کو ویلنگٹن کا جاگیردار آیا اور اپنے شکاری کتوں کے بارے میں پوچھنے لگا۔ اُس نے بتایا کہ کیسے اُس کے شکاری کتے ویلنگٹن جنگل میں بھاگ گئے تھے اور ایک ہفتہ سے خود وہاں شکار کھیل رہے تھے۔ کنکارڈ کے شکاری نے وہ سارا واقعہ بیان کر دیا جو اُسے پیش آیا تھا۔ اُس نے لومڑی کی کھال دینے کی پیشکش بھی کی۔ لیکن جاگیردار نے کھال نہ لی اور لوٹ گیا۔ اُس رات زمیندار کو اُس کے کتے نہ ملے لیکن دوسرے دن اُسے اطلاع ملی کہ وہ دریا پار کر گئے ہیں۔ اور رات کو ایک فارم پر جا کر ٹھہرے جہاں انہیں خوب کھلایا پلایا گیا۔ وہ صبح سویرے اُس فارم سے بھی نکل کھڑے ہوئے۔

جس شکاری نے مجھے یہ واقعہ سنایا تھا وہ سیم نٹنگ نامی ایک شخص کو جانتا تھا۔ جو فیرہیون کی پہاڑی پر ریچھوں کا شکار کیا کرتا تھا۔ اور کنکارڈ گاؤں میں ان کی کھال دے کر ان کے بدلے رم لیا کرتا تھا۔ نٹنگ نے اُسے بتایا تھا کہ اُس نے وہاں ایک ہرن بھی دیکھا تھا۔ نٹنگ کے پاس لومڑیوں کا شکار کرنے والا ایک مشہور کتا بھی تھا۔ جس کا نام برگوئن تھا۔ وہ اس کے نام کا تلفظ بیوگن ادا کیا کرتا تھا۔ "بیوگن" میرا شکاری دوست اُس کتے کو اس سے مستعار لے جایا کرتا تھا۔ میں نے اُس قصبہ کے ایک "تاجر کی واسلیٹ بک" میں جو فوج میں کپتان اور قصبہ کا کلرک اور نمائندہ بھی تھا یہ اندراج پڑھا تھا۔ "۱۸ جنوری سنہ ۱۷۴۲-۳ء۔ جان میلون نے ایک بھوری لومڑی کے عوض ۳-۲-۰ قرض لیا۔" اب یہ بھوری لومڑیاں یہاں نہیں ملتی ہیں۔ وہ اُس تاجر کے بہی کھاتے میں لکھا تھا "۷ فروری سنہ ۱۷۴۳ء ہزکیا سٹریٹن نے بلی کی نصف کھال کے لئے ½۴-۱-۰ قرض لیا" یقیناً یہ کوئی جنگلی بلی ہوگی۔ اس لئے کہ اسٹریٹن گذشتہ فرانسیسی جنگ میں سارجنٹ تھا۔ اور اُس نے کسی گھٹیا شکار کے لئے قرضہ ہرگز نہ لیا ہوگا۔ ہرن کی کھال پر بھی قرضہ دیا جاتا ہے۔ ان کی کھال روزانہ فروخت کی جاتی تھی۔ ایک شخص کے پاس اُس آخری ہرن کے سینگ ابھی تک محفوظ پڑے ہیں جسے ان اطراف میں ہلاک کیا گیا تھا۔ ایک اور شخص نے مجھے اس شکار کی تفاصیل بتائیں

جو اس کے پیچھے کیا تھا۔ یہاں پہلے شکاری بہت آیا کرتے تھے۔ اور وہ بڑے مرنجاں
مرنج لوگ تھے۔ اگر میری یادداشت ٹھیک کام کرتی ہے تو مجھے ایک دیہاتی نمرود یاد ہے
جو سڑک کے کنارے لگے ہوئے درخت سے ایک پتی توڑ لیتا تھا اور اس سے شکاری کے
بگل سے زیادہ ترنم ریز دھن نکال لیتا تھا۔

جب آدھی رات کو چاند نکلا ہوا ہوتا تو بعض اوقات مجھے شکاری کتے ملتے
جو جنگل میں شکار ڈھونڈ رہے ہوتے تھے۔ وہ میرے راستے سے الگ ہٹ جاتے جیسے
وہ مجھ سے ڈرتے تھے اور جھاڑیوں میں اس وقت تک خاموش کھڑے رہتے تھے
جب تک میں گزر نہیں جاتا تھا۔

گلہریاں اور جنگلی چوہے میرے اخروٹوں کے ذخیرہ پر آپس میں لڑتے تھے۔ میرے
گھر کے ارد گرد بیسیوں ایک انچ سے چار انچ قطر والے کالے صنوبر تھے جنہیں گزشتہ
موسم سرما میں چوہوں نے کتر ڈالا تھا۔ یہ موسم سرما ان کے لئے ناروے کا موسم بن گیا تھا
اس لئے کہ بہت دنوں تک گہری برف پڑتی رہی اور انہیں اپنی خوراک میں صنوبر کی چھال
کا بہت بڑا حصہ شامل کرنا پڑ گیا۔ یہ درخت موسم سرما کے وسط تک بظاہر سرسبز و شگفتہ
تھے اور ان میں سے کئی درخت ایک ایک فٹ بڑھے بھی ہو گئے تھے حالانکہ ان کے تنوں کے
گرد برف کا پورا حلقہ بن چکا تھا۔ لیکن دوسرے سخت جاڑے کے بعد ان میں سے
ہر پیڑ سوکھ گیا اور ایک بھی نہ بچا۔ یہ عجیب بات ہے کہ ایک واحد چوہے کو یہ
اجازت دے دی گئی کہ وہ پورا صنوبر کا پیڑ کھا جائے اور اسے اوپر سے نیچے کترنے
کی بجائے ایک دائرے کی شکل میں کاٹ ڈالے۔ لیکن شاید یہ اجازت اس لئے ضروری
تھی کہ گھنے اگنے والے درخت کچھ چھدرے ہو جائیں۔

خرگوش مجھ سے بخوبی واقف تھے۔ ایک خرگوش تو سارے موسم گرما میں میرے گھر کے
نیچے مقیم رہا۔ مجھ میں اور اس میں صرف فرش کے تختوں کا فاصلہ رہا۔ اور جب میں کر دیتا

بدلنے لگتا۔ تو وہ ہر صبح مجھے اتنی جلدی ہی روانگی سے جگا دیتا۔ دھم۔ دھم۔ دھم۔
وہ جلدی ہی فرش کے تختوں سے اپنا سر ٹکراتا۔ شام کو یہ خرگوش میرے آلو کے
چھلکوں کو کترنے کے لیے آیا کرتے تھے [illegible] باہر نکل [illegible] دیا کرتا تھا۔ ان کا رنگ زمین سے
اس قدر ملتا جلتا تھا کہ اگر وہ بے حس و حرکت بیٹھے ہوتے تو مشکل نظر آتے تھے۔ میں بعض
اوقات دھندلکے میں ایک خرگوش کو جو میری کھڑکی کے نیچے ساکت بیٹھا ہوا تھا
دیکھ پاتا تھا اور کبھی نہیں دیکھ پاتا تھا۔ میں شام کو اپنا دروازہ کھولتا تو وہ چیخ کر اور اچھل کر
بھاگ جاتے۔ جب وہ میرے قریب ہوتے تھے تو مجھے ان پر بڑا رحم آتا تھا۔ ایک شام کو
ایک خرگوش آیا۔ [illegible] دو قدم کے فاصلہ پر میرے دروازے پہ آکر بیٹھ گیا۔ وہ خوف کے
مارے کانپ رہا تھا۔ لیکن بھاگنے کے لیے تیار نہ تھا۔ وہ بیچارہ بہت چھوٹا تھا۔ دبلا
پتلا مریل۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ [illegible] جیسے [illegible] ہوں۔ نیلی ناک۔ چھوٹی سی دم۔ دبلے پتلے
پتلے پتلے پنجے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے قدرت میں اچھے خرگوش پیدا کرنے کی صلاحیت
باقی نہیں رہی تھی اور وہ اپنی آخری پونجی کو کسی کام میں لا چکی تھی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں
اس کا جوان [illegible] وہ بیمار دکھائی دیتا تھا۔ میں ایک قدم آگے بڑھا
تو وہ فوراً ہی برف پر سے اس طرح اچک گیا جیسے اس میں اسپرنگ لگے ہوئے ہوں
اس کا چھوٹا سا جسم اور اس کی ٹانگیں پوری طرح لمبی ہو گئیں۔ اور جنگل میرے اور
اس کے درمیان حائل ہو گیا۔ وہ ایک آزاد شکاری تھا۔ جو اپنی توانائی اور قدرت کی عظمت
کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اس کا چھریرا پن بلا سبب نہ تھا۔ اس کی فطرت ہی ایسی تھی۔ بعض
لوگ ایسے ہی [illegible] پسند کرتے ہیں۔

وہ بھلا کیا ملک ہے جس میں نہ خرگوش ہوں۔ نہ تیتر؟ وہ حیوانوں میں سب سے
زیادہ دلچسپ اور سادہ ہیں۔ قدیم اور قابل عزت جنس جن سے پرانا زمانہ اتنا ہی آشنا
تھا جتنا [illegible] زمانہ۔ وہ قدرت کا رنگ اور اس کا جزو رکھتے ہیں۔ زمین اور پتیوں

کے قریب ترین عزیز ہیں۔ ان میں سے کچھ جنسوں کے پر ہوتے ہیں۔ اور کچھ کی ٹانگیں ہوتی ہیں۔ اگر کوئی تیتر پھڑ پھڑا کر اڑتا ہے یا کوئی خرگوش پھدک کر بھاگتا ہے تو آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان کی حرکت میں جنگلی پن ہے۔ وہ تو بالکل قدرتی ہے جیسے پتیوں کا کھڑکھڑانا کیسا ہی انقلاب کیوں نہ رونما ہو۔ خرگوش اور تیتر اس روئے زمین کے باشندوں کی طرح یقینی طور پر زندہ رہیں گے۔ اگر جنگل کو کاٹ دیا جاتا ہے تو جو تازہ کونپلیں اور جھاڑیاں اگتی ہیں وہ ان کے چھپنے کے لئے پردہ بن جاتی ہیں اور ان کی تعداد پہلے سے زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ وہ ملک واقعی غریب ہے جس میں خرگوش نہیں ہوتا۔ ہمارا جنگل ان دونوں سے بھرا پڑا ہے۔ ہر دلدل کے اردگرد آپ کو تیتر اور خرگوش چلتے ہوئے ملیں گے۔ حالانکہ چرواہے نے ٹہنیوں کی باڑ میں اور گھوڑے کے بال کے پھندے لگا کر رکھے ہوتے ہیں۔
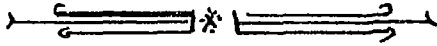
جاڑے میں تالاب

میں موسم سرما کی پُرسکون رات کے بعد یہ تاثر لئے ہوئے بیدار ہوتا تھا کہ مجھ سے کوئی سوال پوچھ گیا تھا اور میں سوتے میں اس کا جواب دینے کی بیسود کوشش کرتا رہا تھا۔ مثلاً کیا، کیسے، کب اور کہاں؟ لیکن سحر کے اُجالے میں قدرت جس کی گود میں ساری مخلوق بستی ہے اپنے پُرسکون اور مطمئن چہرے کے ساتھ میری چوڑی چوڑی کھڑکیوں میں جھانکتی ہے۔ اور اُس کے ہونٹوں پر کوئی سوال نہیں ہوتا۔ میں جب بیدار ہوتا تو سوال کا جواب مل چکا ہوتا۔ قدرت اور دن کی روشنی میرے سامنے ہوتی۔ صنوبر کے نوخیز درختوں سے بھری ہوئی زمین پر برف کی گہری تہہ جمی ہوئی ہوتی اور پہاڑی کی وہ ڈھلوان جس پر میرا مکان ہے جیسے کہہ رہی ہوتی ہو "آگے بڑھو!" قدرت کوئی سوال نہیں پوچھتی اور ہم فانی انسان جو سوال پوچھتے ہیں اُس کا کوئی جواب نہیں دیتی۔ مدت ہوئی وہ اپنا ارادہ طے کر چکی ہے "اے شہزادے ہماری آنکھیں اس کائنات کے حیرت انگیز اور مختلف اقسام کے مناظر تحسین آمیز انداز میں دیکھتی ہیں۔ اور اس کیفیت کو ہماری روحوں تک پہنچاتی ہیں۔ بلاشک رات اس عظیم الشان تخلیق کے ایک حصہ پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ لیکن دن ہمارے اس عظیم کارنامہ کو نمایاں کرنے کے لئے نکلتا ہے جو زمین سے آسمان کی بالائی وسعتوں

تک پھیلا ہوا ہے"۔

میں اس کے بعد اپنا صبح کا کام شروع کر دیتا تھا۔ سب سے پہلے میں ایک کلہاڑی اور بالٹی لے کر پانی کی تلاش میں اس طرح نکلتا جس طرح پانی ایک خواب بن چکا ہو۔ جب رات کو سردی اور برف پڑتی تو پانی تلاش کرنے کے لئے پانی کا پتہ دینے والی چھڑی کی ضرورت پڑتی۔ ہر موسم سرما میں تالاب کی سیال اور مرتعش سطح جو ہر سانس سے متاثر ہوتی تھی اور ہر سائے اور روشنی کو منعکس کرتی تھی۔ ایک یا ڈیڑھ فٹ کی گہرائی تک اتنی ٹھوس ہو جاتی تھی کہ اس پر سے سب سے وزنی گھوڑا گاڑی بھی گزر سکتی تھی۔ غالباً اتنی ہی برف نیچے ہوتی ہے۔ نتیجتہً جھیل اور کسی میدان میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ ارد گرد کی پہاڑیوں میں گلہریوں کی طرح وہ اپنی آنکھیں بند کر لیتی ہے اور تین ماہ سے زائد عرصہ کے لئے سو جاتی ہے۔ میں برف کے ڈھکے ہوئے میدان میں کھڑے ہو کر جیسے کسی چراگاہ یا پہاڑیوں کے درمیان کھڑا ہوں۔ پہلے ایک فٹ گہری آسمانی برف کاٹ کر اور پھر ایک فٹ گہری جمی ہوئی برف کاٹ کر اپنا راستہ بناتا ہوں اور اپنے قدموں تلے ایک کھڑکی کھول دیتا ہوں جہاں پانی پینے کے لئے جھکتے ہوئے مچھلیوں کے پرسکون حجرہ میں جھانکتا ہوں جس پہ ملکی سی روشنی اس طرح ہوتی ہے جیسی کھڑکی کے اندر سے شیشے سے چھن کر آتی ہے۔ اور اس کا فرش ایسی چمکتی ہوئی ریت کا ہوتا ہے جیسا موسم گرما میں دکھائی دیتا ہے۔ وہاں بارہ مہینے رہنے والا ایسا بے تموج سکون حکمران ہوتا ہے۔ جیسے نیلگوں و دھندلے آسمان میں ہوتا ہے۔ یہ غیر متلاطم سکون اس کے باشندوں کے ٹھنڈے اور معتدل مزاج سے مطابقت رکھتا ہے۔ گویا آسمان ہمارے قدموں کے نیچے بھی ہوتا ہے اور ہمارے سروں کے اوپر بھی۔

صبح سویرے جب ہر چیز کہرے سے کرکری ہو جاتی ہے لوگ مچھلی پکڑنے والی چرخی اور تھوڑا سا کھانا لئے ہوئے آتے ہیں اور برف سے ڈھکے ہوئے میدان سے میمکر اور خاردار مچھلیاں پکڑنے کے لئے اپنی اپنی بنسی کی ڈور لٹکا دیتے ہیں۔ یہ جنگلی لوگ ہیں جو اپنے میلان طبع کے مطابق اپنے

قصبہ والوں سے ذرا مختلف فیشنوں کی پیروی کرتے ہیں اور مختلف حاکموں پر بھروسہ
رکھتے ہیں۔ وہ اپنی آمد و رفت سے شہروں کا بھی رابطہ قائم رکھتے ہیں۔ ورنہ یہ
رابطہ ٹوٹ جاتا ہے وہ مضبوط اور موٹا کپڑا پہنے ہوئے تالاب کے کنارے پر پڑی ہوئی
شاہ بلوط کی سوکھی پتیوں پر بیٹھ جاتے ہیں اور اپنا کھانا کھاتے ہیں۔ وہ قدرت کی لوک
کہانی سے اُتنے ہی واقف ہیں جتنے شہری مصنوعی کہانیوں سے۔ وہ کتابوں سے
کبھی رہنمائی حاصل نہیں کرتے۔ وہ جو کام کرتے ہیں اُسے جانتے ہوتے ہیں اور جتنا
کام کرتے ہیں اس سے کم ہی اُسے بیان کر سکتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ جو کام کرتے ہیں۔
اس کا ابھی تک کسی کو علم نہیں۔ اُن میں سے ایک سالم مچھلی کا چارہ لگا کر سمیکہ مچھلی پکڑا
چاہتا ہے۔ اگر آپ اُس کی بالٹی میں جھانک کر دیکھیں تو آپ کو اتنا ہی تعجب ہوگا جتنا
موسم گرما میں کسی صاف تالاب میں جھانکنے سے ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے
اس نے موسم گرما کو اپنے گھر میں قید کر رکھا ہے۔ یا وہ جانتا ہے کہ گرمی کہاں چلی گئی ہے
ورنہ آپ ہی بتائیے اُس نے وسط سرما میں یہ کیڑے کہاں سے حاصل کئے؟ اُس نے یہ
کیڑے گلے سڑے شہتیر وں سے حاصل کئے۔ چونکہ زمین منجمد ہو گئی تھی اس لئے
اُن کو پکڑنا اس کے لئے آسان تھا۔ اس کی زندگی قدرت کی اتنی گہرائیوں میں بسر ہوتی ہے
کہ وہاں تک علم حیوانات اور علم نباتات کے ماہرین کی نظر ہی نہیں پہنچی۔ وہ خود ہی اِن
محققین کے مطالعہ کا موضوع ہے۔ آخر الذکر کیڑے ڈھونڈنے کے لئے چاقو سے
کائی اور چھلکا آہستہ آہستہ ہٹاتا ہے۔ لیکن اوّل الذکر اپنے کلہاڑے سے شہتیر کا
جگر تک کاٹ ڈالتا ہے اور کائی اور چھلکے دور تک اُڑ جاتے ہیں۔ درختوں کی چھال
اُتارنا ہی اُس کی روزی ہے۔ ایسے شخص کو مچھلیاں پکڑنے کا کچھ حق ضرور حاصل ہے۔
اور میں اس میں قدرت کو جلوہ یار دیکھ کر بہت خوش ہوتا ہوں۔ خاردار مچھلی کیڑے
کو نگل جاتی ہے۔ سمیکہ مچھلی خاردار مچھلی کو نگل جاتی ہے۔ اور ماہی گیر سمیکہ کو نگل

جاتا ہے اِس طرح تخلیق کے نظام میں جتنی درزیں ہیں پُر ہو جاتی ہیں۔

جب میں کُہرآلود موسم میں تالاب کے گرد چہل قدمی کیا کرتا تھا تو بعض اوقات کسی وحشی مچھیرے کے ابتدائی طریقے دیکھ کر ہنس پڑتا تھا۔ منجمد برف میں جو چھوٹے چھوٹے شگاف ہوتے تھے وہ ان پر بید کی شاخیں رکھ دیتا تھا۔ یہ شگاف ایک دوسرے سے چار چار یا پانچ پانچ جریب کے فاصلہ پر ہوتے تھے۔ تقریباً ان کا اتنا ہی فاصلہ ساحل سے ہوتا تھا۔ وہ ڈور کا ایک سرا ٹہنی سے باندھ دیتا تھا تاکہ مچھلی اسے اندر نہ گھسیٹ کر لے جائے۔ اور ڈور کے ڈھیلے حصّہ کا بید کی ایک ٹہنی پر پھندا سا لگا کر برف کے ایک فٹ یا اس سے زیادہ دُوری پر اس میں شاہ بلوط کی ایک سُوکھی پتّی باندھ دیتا ہے تاکہ جب کوئی مچھلی چارے پر مُنہ مارے تو اس کو اس کی خبر ہو جائے۔ اگر آپ نصف تالاب کے گرد کبھی گھومیں تو بید کی یہ چھڑیاں آپ کو کہرے میں پڑی ہوئی تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر بہت ہی بھیانک دکھائی دیں گی۔

آہ والڈن کی سمیکہ مچھلیاں کس قدر حسین ہوتی ہیں! جب میں اُن کو برف یا کنوئیں میں دیکھتا ہوں جیسے مچھیرے برف میں ایک چھوٹا سا شگاف بنا کر اور اس میں پانی ڈال کر بنا دیتے ہیں تو میں سمیکہ مچھلی کی بے نظیر خوبصورتی دیکھ کر بہت حیران ہوتا ہوں۔ جیسے وہ پُرانی حکایات میں بیان کی گئی مچھلیاں ہوں۔ وہ بازار اور جنگل کی مچھلیوں سے اتنی ہی مختلف ہیں جتنی عرب کی نسبت ہمارے کنکارڈ کی زندگی مختلف ہے۔ وہ آنکھوں کو خیرہ کر دینے والا حسن رکھتی ہیں۔ اور ان میں اور جنگلی کاڈ مچھلی اور ہیڈک مچھلی میں جن کے حسن کا ہمارے بازاروں میں ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ وہ نہ تو صنوبر کی طرح سبز ہوتی ہیں نہ پتھر کی طرح سیاہی مائل۔ اور نہ آسمان کی طرح نیلگوں۔ میری آنکھوں میں ان کا رنگ پھولوں اور جواہرات کی طرح بے مثال ہوتا ہے گویا وہ موتی ہیں۔ والڈن تالاب کی رُوح اور اس کا پانی بلوریں جزو۔ اُن کا ہر حصّہ یعنی اُن کا سراپا والڈن ہے۔ وہ حیوانات

کی سلطنت میں چھوٹے چھوٹے والڈن ہیں۔ یہ امر باعثِ حیرت ہے کہ ان کو والڈن تالاب میں پکڑا جاتا ہے۔ اس گہرے اور بڑے چشمے میں۔

ان تمام کھڑکھڑاتی گھوڑا گاڑیوں، آہنیوں اور چھن چھن کرتی ہوئی برف گاڑیوں کے نیچے یہ بڑی بڑی سنہری اور زمردیں مچھلیاں تیرتی رہتی ہیں۔ مجھے کسی منڈی میں ایسی مچھلی دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ اگر وہ کسی منڈی میں پہنچ جائیں تو سب کی نگاہوں کا مرکز بن جائیں۔ وہ ایک دھار تیرتی میں اور ان کی آبی روح پرواز کر جاتی ہے جس طرح ان مرنے والوں کی جو قبل از وقت جنت کو سدھار جاتے ہیں۔

چونکہ میں والڈن کی مدت سے گم شدہ تہہ بہت جلد حاصل کر لینا چاہتا تھا۔ اسلئے میں نے برف پگھلنے سے پہلے ۱۸۴۶ء میں پرکار، زنجیر اور پانی ناپنے والی ڈوز لے کر بڑی احتیاط سے پورا تالاب ناپ ڈالا۔ اس تحقیق کی تہہ اور اس کی گہرائی کے بارے میں بہت کہانیاں بیان کی گئی ہیں جن کی کوئی اصلیت نہیں ہے۔ یہ بات حیرت انگیز ہے کہ لوگ پانی کی گہرائی ناپے بغیر کسی تالاب کے بارے میں کیسے یقین کر لیتے ہیں کہ وہ اتھاہ ہے۔ میں اپنی سیر کے دوران میں ایک ہی دن میں ایسے دو اتھاہ تالاب اس گرد و نواح میں دیکھنے کے لئے گیا۔ اکثر لوگوں کو یقین تھا کہ والڈن اپنی گہرائی کے اعتبار سے کرۂ ارض کے اس پار پہنچ جاتا ہے۔ بعض لوگوں نے جو برف پر دیر تک چت لیٹے رہتے تھے اور اسے ایک فریب دینے والے وسیلے اور نم آلود آنکھوں کے ساتھ دیکھتے۔ رہتے تھے اس ڈر سے کہ ان کے سینوں میں سردی نہ لگ جائے جلد بازی میں یہ نتیجہ نکال لیا تھا کہ والڈن اتھاہ ہے۔ ان کا خیال ہے کہ انہوں نے اس کی تہہ میں اتنے بڑے بڑے سوراخ دیکھے تھے جن میں سے گھاس سے لدی ہوئی گاڑیاں گذر سکتی ہیں (بشرطیکہ ان گاڑیوں کا کوئی کوچوان ہو) گویا تحقیق میں یہ سوراخ اسٹائیکس کے مقامی چشمے اور پاتال میں داخل ہونے کے مقامی پھاٹک تھے۔ گاؤں کے کچھ دوسرے لوگ ایک بہت بڑا لنگر اٹھا کر گاڑی میں بھری ہوئی ایک انچ موٹی رسی لے کر آئے لیکن ان کو بھی اس گہرائی کا پتہ نہ چل سکا۔ اس لئے کہ ان کا

لنگر بیچ میں کہیں اٹک کر رہ گیا۔ لیکن وہ اپنے استعجاب کی ناقابلِ پیمائش مساحت کو ناپنے کے لئے تالاب میں رسی برابر ڈالتے چلے گئے۔ لیکن میں اپنے قارئین کو یقین دلا سکتا ہوں کہ والڈن کی تہ ٹھوس ہے اور ناقابلِ فہم حد تک دور نہیں ہے۔ ویسے اس کی گہرائی غیر معمولی ہے۔ میں نے بڑی مچھلی پکڑنے والی ڈور اور ڈیڑھ پونڈ وزنی پتھر کی مدد سے بڑی آسانی کے ساتھ اُسے ناپ لیا تھا۔ جب پتھر تہ کو چھوتا تھا تو مجھے معلوم ہو جاتا تھا کیونکہ جب تک پانی پتھر کے نیچے پہنچ کر پتھر کی مدد نہ کرتا مجھے رسی اوپر کھینچنے میں بہت زور لگانا پڑتا تھا۔ سب سے زیادہ گہرائی ایک سو دو فٹ تھی۔ اس میں اس وقت سے لے کر اب تک جو پانی بڑھ گیا ہے اگر اُسے بھی جوڑ دیا جائے تو اُس وقت والڈن کی کل گہرائی ایک سو سات فٹ ہوئی۔ اتنے چھوٹے سے رقبے کے لئے یہ گہرائی بہت زیادہ ہے۔ لیکن تخیل اس کی ایک ایک انچ گہرائی کو ناپ لیتا ہے۔ کیا ہوتا اگر سارے تالاب پایاب ہوتے؟ کیا انسانی دماغوں پر اس کا ردِ عمل نہ ہوا ہوتا؟ میں ممنون ہوں کہ اس تالاب کو علامت کے طور پر صاف اور گہرا بنایا گیا ہے۔ جب تک لوگ کسی لامحدود قوت پر اعتقاد رکھیں گے۔ بعض تالاب اتھاہ ہی سمجھے جائیں گے۔

ایک فیکٹری کے مالک نے یہ سن کر کہ میں نے تالاب کی گہرائی معلوم کی ہے بندھوں کے بارے میں اپنی واقفیت کو مدِنظر رکھتے ہوئے یہ سوچا کہ میری پیمائش درست نہیں ہو سکتی۔ اس کا خیال تھا کہ ریت عمودی گہرائی پر نہیں ٹھہر سکتی۔ لیکن گہرے سے گہرے تالاب بھی اپنے رقبہ کے اعتبار سے اتنے گہرے نہیں جتنے لوگ انہیں فرض کر لیتے ہیں۔ اگر ان کا پانی خارج کر دیا جائے تو ہمیں زیادہ نمایاں وادیاں نہیں ملیں گی۔ وہ پہاڑیوں کے درمیان پیالوں جیسی نہیں ہیں اور یہ والڈن تالاب جو اپنے رقبہ کے اعتبار سے غیر معمولی طور سے گہرا ہے اگر اس کے مرکز سے عمودی گہرائی دیکھی جائے تو وہ ایک کم گہری پلیٹ سے زیادہ گہرا نہیں ہے۔ اگر بیشتر تالابوں کو خالی کر دیا جائے تو ہمارے لئے وہ پایاب سبزہ زار بن جائیں گے۔ جیسے ہم عام طور سے دیکھتے ہیں۔ ولیم گلپن جو ارضی مناظر بیان کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا اور

جو عام طور سے درست باتیں کہتا ہے۔ اسکاٹ لینڈ میں لاخ فائن کے کنارے کھڑے ہو کر اُسے اس طرح بیان کرتا ہے "یہ ایک نمکین پانی کی خلیج ہے۔ ساٹھ یا ستر چیدم (چار سو تیس فٹ) گہری، چار میل چوڑی" اور تقریباً پچاس میل پہاڑیوں سے گھری ہوئی۔ وہ یہ رائے ظاہر کرتا ہے "اگر ہم نے اُس طوفانی سانحے یا اُس زلزلہ کے فوراً بعد جس کی وجہ سے وہ خلیج بن گئی اور اس میں پانی کے داخل ہونے سے پہلے اُسے دیکھا ہوتا تو کتنا ہمیں مہیب غار نظر آتا۔

"سر بفلک پہاڑیاں جتنی اُوپر اُبھریں
اُتنی ہی نیچی ایک خالی تہہ دھنس گئی۔
چوڑی اور گہری۔ پانی کا ایک وسیع و عریض
طاس بن گئی"

اگر ہم لاخ فائن کے اُس حصّہ کو لیں جس کا قطر سب سے چھوٹا ہے اور اس کے رقبے اور گہرائی کا والڈن تالاب پر اطلاق کریں۔ تو جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ اگر اس کی عمودی گہرائی پایاب پلیٹ معلوم ہوتی ہے۔ تو اس موازنہ کے بعد وہ چار گنی زیادہ پایاب معلوم ہوگی۔ اگر لاخ فائن کا غار خالی کر دیا جائے تو اُس کی ہولناکی کی حقیقت صرف اتنی باقی رہ جائے گی۔ اس میں شک نہیں کہ بہت سے منبسّم اور لہلہاتے ہوئے کھیتوں سے بھری وادیاں اسی طرح کے نام نہاد ہیبت ناک غاروں میں واقع ہیں۔ جن میں سے پانی بہہ کر خارج ہو گیا ہے اگرچہ اُس جگہ کے باشندوں کو اس حقیقت کا یقین دلانے کے لئے ماہر ارضیات کی دقیق اور وسیع نگاہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر متجسس نگاہ سامنے دکھائی دینے والی بہت سی پہاڑیوں میں ایک قدیم جھیل کے ساحل تلاش کر لیتا ہے اور اُس کی تاریخ کو چھپانے کے لئے کسی بعد کے دور میں میدان کو اُبھارنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ جیسا کہ شاہراہوں پر کام کرنے والے جانتے ہیں ہلکی بارش ہو جانے کے بعد گڑھے کا پتہ لگانا اس لئے آسان ہو جاتا ہے کہ اُس

میں پانی بھر جاتا ہے۔ اگر ہم عنانِ تخیل کو ذرا سا ڈھیلا کر دیں گے تو وہ ہر گڑھے کو اس کی قدرتی بلندی سے زیادہ بلند اور اس کی قدرتی گہرائی سے زیادہ گہرا بنا دیگی۔ اس طرح سمندر کی گہرائی اُس کی چوڑائی کے مقابلہ میں بہت کم نکلے گی۔

جب میں برف توڑ رہا تھا تو میں تہ کی شکل و صورت کا ان اندازوں سے صحیح اندازہ لگا سکتا تھا جو ایسی بندرگاہوں کی پیمائش کے سلسلے میں لگائے جاتے ہیں جو منجمد نہیں ہوتی ہیں۔ مجھے تہ کی عام ہمواری پر بہت تعجب ہوتا تھا۔ سب سے زیادہ گہرے حصّہ میں کئی ایکڑ زمین ہے۔ اس کھیت سے تقریباً زیادہ ہموار ہے جس پر آفتاب چمکتا ہے اور ہوا چلتی ہے۔ مثلاً اگر ہم ایک جگہ کو یک طرفہ طور پر چُن لیں تو تیس جریب کے فاصلہ تک گہرائی میں ایک فٹ سے زیادہ کا فرق نہیں ہوتا اور وسط کے قریب تو میں عام طور سے ایک فٹ کی مقدار تک چاروں طرف کی گہرائی کی کمی بیشی کو پہلے ہی بتا سکتا ہوں اور میرے اندازے اور اصلیت میں تین چار پانچ سے زیادہ کا فرق نہیں نکلے گا۔ بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ اس قسم کے ریتیلے اور پرسکون تالابوں کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ ان میں بڑے گہرے اور خطرناک گڑھے ہوتے ہیں لیکن ایسی حالتوں میں پانی کا یہ اثر ہوتا ہے کہ تمام ناہمواریاں سطح ہو کر یکساں ہو جاتی ہے۔ تہ کی ہمواری اور کناروں اور پڑوسی پہاڑیوں کے سلسلے سے ان کی مطابقت اتنی مکمل ہے کہ زمین کا دور افتادہ اُبھار بھی تالاب کی مخالف سمت سے ظاہر ہو جاتا ہے اور ساحل پر نظر ڈالنے سے اُس کا رُخ متعین کیا جا سکتا ہے۔ اس چاندی کی پٹی، میدان بالو کی پٹی اور وادی اور کھاڑی گہرا پانی یا نہر بن جاتی ہے۔

جب میں نے ایک انچ کو دس جریب کے برابر مان کر تالاب کا نقشہ بنایا اور سو سے زائد جگہوں کی گہرائیاں لکھ لیں تو میں نے اس عجیب و غریب یکسانیت کو محسوس کیا۔ یہ دیکھ کر کہ سب سے زیادہ گہرائی نقشہ کے وسط میں تھی۔ میں نے نقشہ پر ایک مسطر لمبان میں رکھا اور

پھر چوڑان ہیں اور یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ لمبائی کا سب سے بڑا خط چوڑائی کے سب سے لمبے خط کو ٹھیک اس جگہ کاٹتا ہے جہاں گہرائی سب سے زیادہ ہے۔ اگرچہ درمیان کا حصّہ تقریباً ہموار ہے لیکن اس کی حدوں میں باقاعدگی نہیں ہے۔ سب سے لمبے اور چوڑے حصّے کھاڑیوں کو ناپنے سے ملے۔ میں نے دل ہی دل میں کہا "کیا جانے یہی اصول سمندر کے گہرے سے گہرے حصّے پر بھی منطبق ہوتا ہو۔ جس طرح تالابوں اور گڑھوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ کیا یہی اصول پہاڑوں کی بلندی پر لاگو ہوتا ہے جو وادیوں کی ضد تسلیم کئے جاتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ پہاڑ اپنے سب سے زیادہ تنگ حصّے میں سب سے بلند نہیں ہوتا۔"

پانچ کھاڑیوں میں سے تین یا پھر ان سب کھاڑیوں کے دہانے پر ایک روک سی ہے جن کی گہرائی ناپی جا چکی ہے۔ اور جن کے اندر زیادہ گہرا پانی ہے۔ اس طرح خلیج میں پانی صرف افق کے متوازی ہی نہیں بلکہ عمودی طور پر بھی خشکی میں پھیلا ہوا ہے اندر پھیلا ہوا پانی بجائے خود ایک طاس یا آزادانہ طور پر تالاب بن گیا ہے۔ دونوں طرف کی راسوں کا محلِ وقوع باقی کی روک کے رُخ کو نمایاں کر دیتا ہے۔ سمندر کے ساحل پر ہر بندرگاہ میں داخل ہونے والی جگہ کے سرے پر اس قسم کی روک ہوتی ہے۔ کھاڑی کا دہانہ جتنا اس کی لمبائی کے مقابلہ میں بڑا ہوتا ہے۔ روک کے اوپر کا پانی اتنا ہی دریا کنارے کے پانی سے زیادہ گہرا ہوتا ہے۔ اگر کھاڑی کی لمبائی اور چوڑائی کا پتہ چل جائے اور اردگرد کے ساحل کی بناوٹ معلوم ہو جائے تو آپ کے پاس وہ سارے عناصر جمع ہو جاتے ہیں جن کی مدد سے آپ ساری کھاڑیوں کے لئے ایک اصول وضع کر سکتے ہیں۔

یہ معلوم کرنے کے لئے کہ ہیں صرف سطح کی قطع وضع اور کناروں کی ساخت دیکھ کر اس تجربہ کی روشنی میں کہ میں کسی تالاب کی سب سے گہری جگہ کے متعلق کس قدر

صحیح اندازہ لگا سکتا ہوں۔ میں نے وائٹ تالاب کا ایک نقشہ تیار کیا۔ وہ تقریباً ۴۱ ایکڑ میں پھیلا ہوا ہے اور والڈن کی طرح اُس میں نہ تو کوئی جزیرہ ہے اور نہ نکاس اور داخلے کا کوئی راستہ ہے۔ چونکہ سب سے زیادہ چوڑائی کا خط سب سے کم چوڑے خط کے بالکل قریب تھا اور وہیں دو مقابل راسیں قریب تر آجاتی تھیں اور دو متضاد خلیجیں ایک دوسری سے دور ہوتی چلی جاتی تھیں۔ اس لئے میں نے آخر الذکر خط سے تھوڑے فاصلہ پر اور سب سے لمبے خط پر اس کا نشان لگا دیا کہ یہاں سب سے زیادہ گہرا ہونا چاہیئے۔ گہرائی جب واقعی ناپی گئی تو سب سے زیادہ گہرا مقام میرے نشان سے سو فٹ کے اندر اسی سمت میں نکلا۔ اور میرے اندازہ سے صرف ایک فٹ زیادہ یعنی تقریباً ۶۰ فٹ گہرا تھا۔ اگر کوئی چشمہ وسط سے بہتا ہو یا تالاب میں کوئی جزیرہ ہو تو یہ مسئلہ زیادہ پیچیدہ ہو جائے گا۔

اگر ہم قدرت کے تمام قوانین جانتے ہوتے تو ہمیں محض ایک واقعہ یا ایک واقعہ کے تفصیلی بیان کی ضرورت پڑتی اور ہم اُس سے متعلق تمام جزوی نتائج اخذ کر لیتے۔ ہم ابھی صرف چند قوانین قدرت جانتے ہیں۔ اور جو نتائج برآمد کرتے ہیں اُن میں غلطیاں رہ جاتی ہیں۔ اُس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ قدرت میں کوئی اُلجھاؤ یا بے قاعدگی ہے بلکہ یہ ہے کہ حساب کتاب لگانے کے حقیقی عناصر کا ہمیں علم نہیں ہے۔ اصول اور ہم آہنگی کے متعلق ہمارے خیالات صرف ان مثالوں تک محدود ہیں جن کا ہمیں علم ہو جاتا ہے۔ لیکن وہ ہم آہنگی بظاہر متضاد مگر اصل میں متفق و معاون قوانین سے وجود میں آتی ہے جس کا ہمیں علم نہیں ہے بہت ہی حیرت انگیز ہوتی ہے۔ یہ خاص قوانین دراصل ہمارے نظریات میں بالکل اُسی طرح جیسے ایک مسافر کی نظر میں ایک پہاڑی کا خاکہ ہر قدم پر بدل جاتا ہے اور اُس کے لاتعداد رُخ ہوتے ہیں حالانکہ پہاڑی کی صرف ایک ہی حقیقی صورت ہوتی ہے۔ اُس وقت بھی جب ہم اس کے ٹکڑے اڑا دیتے ہیں

یا اُس میں چھید کر دیتے ہیں وہ مجموعی حیثیت سے ہماری سمجھ میں نہیں آتی ہے
میں نے تالاب کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہی اخلاق کے فلسفہ کے بارے میں
بھی درست ہے۔ یہ قانونِ اوسط ہے۔ دو قطروں کا یہ اصول نہ صرف نظامِ شمسی
کی جانب اور انسانی جسم میں دل کی طرف ہماری رہنمائی کرتا ہے بلکہ اگر ہم انسان کے
روزمرہ افعال میں اور اس کی زندگی کی لہروں کی کھاڑیوں اور خلیجوں کی لمبائی اور
چوڑائی میں خط کھینچیں تو وہ جہاں ایک دوسرے کو کاٹیں گے۔ وہاں اُس کے کردار کی
بلندی یا گہرائی ملے گی۔ ہمیں اس کی گہرائیوں اور اُسکی ڈھکی چھپی تہہ کا پتہ چلانے
کے لئے صرف یہ جاننے کی ضرورت ہو گی کہ اُس کے ساحل کی ڈھلوان کدھر ہے اور
آس پاس کی زمین یا ماحول کیا ہے۔ اگر کوئی شخص کوہ آسا حالات سے گھرا ہوا ملے تو کلیز
جیسے ساحل سے جس کی چوٹیاں اس کی تہہ میں سایہ فگن ہوتی ہیں اور جس کا عکس اس کے سینے
میں نظر آتا ہے۔ اُن چوٹیوں کی مناسبت سے اس کی گہرائی بھی ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن ایک
پست اور ہموار کنارا اُسے اس جانب پایاب دکھاتا ہے۔ ہمارے اجسام میں ایک اُبھری
اور باہر نکلی ہوئی پیشانی اپنی مناسبت سے خیالات کی گہرائی ظاہر کرتی ہے۔ ہماری ہر ایک
کھاڑی یا خاص رُجحان کے دہانہ پہ ایک روک ہے۔ ان میں سے ہر روک تھوڑی دیر کے
لئے ہماری ایسی بندرگاہ بن جاتی ہے جس میں ہمیں روک لیا جاتا ہے اور ہم خشکی سے گھرے
رہتے ہیں۔ یہ رجحانات عام طور سے توہمات نہیں ہوتے بلکہ اُن کی صورت، قد اور سمت کا فیصلہ
ساحل کے اُن غرقاب ٹیلوں سے ہوتا ہے۔ جو ہمیشہ سے بلندیوں کا محور رہے ہیں۔ جب
یہ روک طوفانوں، مدوجزر یا دھاروں کے ذریعہ آہستہ آہستہ بڑھ جاتی ہے، یا جب پانی
اتنا کم ہو جاتا ہے کہ وہ اُبھر کر سطحِ آب کے برابر آ جاتی ہے تو جو ساحل میں پہلے ایک ڈھلان
سا ہوتا تھا اور جس میں کوئی خیال جاگزیں تھا۔ اب سمندر سے بالکل الگ تھلگ ایک ایسی
انفرادی جھیل بن جاتا ہے۔ جس میں خیال خود اپنا ماحول بن جاتا ہے۔ وہ اس کے پانی کو بدل

دیتا ہے۔ کبھی نمکین کی جگہ تازہ، کبھی فیسرین چشمہ، کبھی مردہ سمندر یا کبھی دلدل۔ کیا آپ یہ فرض نہیں کرسکتے کہ ہر فرد جب زندگی میں پہلے پہل قدم رکھتا ہے تو اس طرح کی روک کہیں نہ کہیں سے ابھر کر سطح پر آجاتی ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ ہم اتنے ناکامیاب جہازراں ہیں کہ ہمارے خیالات زیادہ تر ایسے ساحل پر یا اس کے قریب لنگرانداز رہتے ہیں جس میں کوئی بندرگاہ نہیں ہوتی۔ ہم صرف شاعری کی خلیج کی بلندیوں سے واقف ہوتے ہیں۔ یا ہم اپنے جہازوں کو عام بندرگاہوں میں لے جاکر سائنس کی خشک گودیوں میں پہنچ جاتے ہیں۔ جہاں یہ خیالات اس دنیا کے لئے نئے سرے سے درست کئے جاتے ہیں۔ اور جہاں قدرتی دعاسان کی انفرادیت برقرار رکھنے کے لئے جمع نہیں ہوتے۔ جہاں تک والڈن میں پانی کے داخلے اور نکاس کے راستہ کا تعلق ہے، مجھے بارش، برف اور بخارات کے سوا کوئی اور راستہ دکھائی نہیں دیا۔ اگرچہ ایک تھرمامیٹر اور رسی کے ذریعہ ایسی جگہیں کبھی ڈھونڈی جاسکتی تھیں کیونکہ جس جگہ پانی تالاب کے اندر آتا ہوگا وہاں وہ غالباً موسم گرما میں سرد ترین اور موسم سرما میں گرم ترین ہوتا ہوگا۔ ۱۸۴۲ء کے موسم میں جب برف توڑنے والے مزدور یہاں کام کر رہے تھے تو برف کی ان سلوں کو جو ساحل پر پہنچائی جا رہی تھیں ایک دن برف جمع کرنے والوں نے لینے سے انکار کر دیا کیونکہ وہ پہلی سلوں جتنی موٹی نہیں تھیں۔ اس طرح برف توڑنے والوں کو اس بات کا پتہ چلا کہ ایک چھوٹے سے حصے میں برف دوسرے حصوں سے دو تین انچ پتلی تھی۔ انھوں نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ وہاں کہیں سے پانی آتا ہے۔ انھوں نے مجھے برف کی ایک سل پر بٹھاکر اور اسے پھسلا کر ایک اور جگہ دکھائی جسے وہ رسنے والا شگاف خیال کرتے تھے۔ یہیں سے تالاب کا پانی ایک پہاڑی کے نیچے سے ہوکر ایک قریبی گیاستان میں جاتا تھا۔ وہ دس فٹ گہرے پانی کے نیچے ایک چھوٹا سا غار تھا۔ لیکن میں خیال کرتا ہوں کہ میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ جب تک اس سے بڑا کوئی رسنے والا شگاف نہ ڈھونڈیں

تالاب میں ٹانکا لگانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ ایک شخص نے یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ اگر نکاس کا اس طرح کا کوئی شگاف ملے تو سبزہ زار سے اس کا تعلق اس طرح ثابت کیا جا سکتا ہے کہ اگر رنگین سفوف یا برادہ شگاف کے دہانہ پر رکھ دیا جائے اور سبزہ زار والے چشمہ کے دہانہ پر چھپتر رکھ دیا جائے تو دھارے میں بہتے ہوئے بعض ذرّے اور ریزے چھتے میں ضرور پھنس کر رہ جائیں گے۔

جب میں سروے کر رہا تھا تو برف جو سولہ انچ موٹی تھی ہوا میں پانی کی طرح ہلتی تھی۔ ہر کوئی یہ بات جانتا ہے کہ برف پر مسطر کو استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ ساحل سے ایک جریب کے فاصلہ پر جب زمین پر مسطر لگا کر دیکھا جاتا تھا اور برف پر کھڑے پیمائش کے ڈنڈے سے سیدھ لی جاتی تھی تو برف ¾ انچ گرتی چڑھتی دکھائی دیتی تھی۔ حالانکہ ساحل سے برف بہت مضبوطی سے جڑی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ غالباً یہ اتار چڑھاؤ وسط میں اور بھی زیادہ ہوتا تھا۔ کون جانتا ہے کہ اگر ہمارے پاس کافی نازک آلات ہوتے تو ہم زمین کی سطح میں اسی طرح کے نشیب و فراز معلوم کر لیتے۔ جب میرے مسطر کی دو ٹانگیں کنارے پر ہوتیں اور تیسری برف پر اور بصری حلقہ نگاہ میں رکھا جاتا تو برف میں ہلکے سے ہلکا اتار چڑھاؤ تالاب کے اس پار والے درخت پر کئی فٹ کا فرق پیدا کر دیتا تھا۔ جب میں نے گہرائی ناپنے کے لئے شگاف بنانے شروع کئے تو مجھے تین چار انچ پانی آسمان سے گری ہوئی برف کے نیچے جمی برف پر ملا۔ جو اس حد تک دھنس چکی تھی شگاف کے پیدا ہوتے ہی پانی ان میں سے بہنے لگا تھا اور دو دن تک گہرے چشموں کی صورت میں بہتا رہا۔ ان چشموں نے آس پاس کی برف کو پگھلا دیا تھا اور تالاب کی سطح کو خشک کرنے میں بڑی مدد دی تھی۔ اس لئے کہ جوں جوں پانی نکلتا گیا اس نے برف کو ابھار کر بہانا شروع کر دیا تھا۔ یہ تقریباً ویسا ہی تھا جیسا جہاز کے پیندے میں کوئی سوراخ کر دیا جائے تاکہ اس کی تہہ میں سے پانی نکل جائے۔ جب ایسے شگاف دوبارہ

جم جاتے ہیں اور اسکے بعد پانی دیتا ہے اور آخر میں جب برف دوبارہ جم کر ساری سطح کو ہموار
کر دیتی ہے تو اندر ہی اندر خوبصورت بندکیوں کی تاریک شکلیں مکڑی کے جالے کی طرح
بن جاتی ہیں جنہیں آپ برف کے مصنوعی گلاب کے پھول کہہ سکتے ہیں۔ جو پانی مختلف سمتوں
میں بہہ کر نالیاں بناتا ہے اور ایک مرکز کی طرف جاتا ہے وہ بھی ویسے ہی پھول بنا دیتا
ہے۔ اور مجھے اپنی دو دو پرچھائیاں ایک دوسری کے سر پر کھڑی دکھائی دیتی ہیں۔
ایک برف پر اور دوسری درختوں اور پہاڑیوں کے عکس پر۔

ابھی جب جنوری کا سرد مہینہ جاری ہے اور منجمد برف موٹی اور ٹھوس ہے
مدبر جاگیردار ایک موٹا کوٹ اور چمڑے کے دستانے پہنے ہوئے اپنے موسم گرما کے
مشروبات کو ٹھنڈا کرنے کے لئے یہاں برف لینے آتا ہے اور وہ قابلِ تعریف اور قابلِ
افسوس حد تک اتنا عقلمند ضرور ہے کہ جولائی میں لگنے والی پیاس کا اندازہ جنوری
میں ہی میں لگا لیتا ہے۔ حالانکہ بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کا ابھی سے بندوبست
نہیں کیا گیا ہے۔ عین ممکن ہے کہ وہ اس دنیا میں اتنے خزانے نہ جمع کرتا ہو جو
دنیا میں اس کے موسم گرما کے مشروبات کو ٹھنڈا کر سکیں۔ وہ ٹھوس تالاب کو کاٹتا
ہے اور چیرتا ہے اور مچھلیوں کے گھروندہ کی چھتیں اکھاڑ دیتا ہے۔ گویا ان کے ماحول
اور آب و ہوا کو گاڑیوں پر لاد کر اور اسے زنجیروں اور دھاری دار لکڑیوں کی بلیوں
سے باندھ کر وہ انہیں موسم سرما کی موافق اور سرد ہوا میں ٹھنڈے تہہ خانوں میں
لے جا کر گرمیوں کے لئے دفن کر دیتا ہے۔ جب لوگ برف کی سلوں کو قصبے کے
بازاروں میں سے لے جاتے ہیں تو دور سے ایسا دکھائی دیتا ہے جیسے آسمانی رنگ
کو ٹھوس شکل دے کر لئے جا رہے ہوں۔ برف توڑنے والے لوگ خوش مزاج ہوتے
ہیں۔ وہ ہر وقت ایک دوسرے کو چھیڑتے اور آپس میں ہنسی ٹھٹھا کرتے رہتے ہیں۔ میں
جب ان کے پاس جاتا تھا تو وہ مجھے ہمیشہ دعوت دیا کرتے تھے کہ میں ان کے ساتھ

کندھا جو ڑکر کھڑا ہو جاؤں اور کان کنوں کی طرح آرڈ چلاؤں

سنہ ۱۸۴۶ء کے موسم سرما میں ایک صبح کو دور شمال کی رہنے والی قوم کے ایک سو آدمی تالاب پر آئے اور اپنے ساتھ کئی گاڑیوں کے بوجھ کے برابر کاشتکاری کے بھدّے اور بدنما اوزار لائے۔ ان میں برف گاڑیاں بھی تھیں۔ بل تھے۔ شگاف کرنے والے برمے تھے گھاس کاٹنے والی چھریاں تھیں، پھاوڑے تھے؛ آرے تھے۔ کریدنی تھی اور ہر شخص کے پاس دو نوکوں والا ایک ایک ڈنڈا تھا جس کا ذکر "نیو انگلینڈ کا کسان" یا کاشتکار" میں کہیں نہیں ملتا ہے۔ میں یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ موسم سرما کی رئی یا کوئی اور غلّہ بونے آئے تھے۔ جو حال ہی میں آئس لینڈ میں رائج کیا گیا تھا۔ چونکہ ان کے پاس کوئی کھاد نظر نہیں آتی تھی اس لئے مجھے خیال آیا کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہاں کی مٹی گہری ہے۔ اور بہت دنوں تک غیر مزروعہ پڑی رہی ہے۔ اور اس لئے وہ میری طرح اس زمین کو کریدنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ ایک دولتمند کاشتکار جو ان کی پشت پناہی کر رہا تھا اپنی رقم دگنی کرنا چاہتا تھا جو میرے خیال میں پہلے ہی پانچ لاکھ ڈالر تھی لیکن چونکہ وہ اپنے ایک ڈالر میں دوسرا ڈالر ملا دینا چاہتا تھا۔ اس لئے اس نے والڈن تالاب کا واحد کوٹ ہی نہیں بلکہ اس کی کھال تک سخت سردی میں اتار لی۔ برف توڑنے والوں نے فوراً کام شروع کر دیا۔ انہوں نے قابل تعریف انداز سے ہل چلانے، سراون پھیرنے زمین ہموار کرنے اور نالیاں بنانے کی ابتدا کر دی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کوئی مثالی فارم بنانے پر تل گئے ہیں۔ لیکن میں ابھی یہ غور ہی کر رہا تھا کہ دیکھوں اب یہ کس طرح کے بیج نالیوں میں بوتے ہیں کہ اچانک اس گروہ نے جو میرے پاس کھڑا تھا غیر مزروعہ گیلی مٹی کو ایک خاص جھٹکے سے اس طرح اکھاڑنا شروع کر دیا کہ تہہ کی ریت یا پانی نکل آتا تھا کیونکہ سارے تالاب کی زمین کی طرح یہ زمین بھی چشمے کی زمین تھی۔ وہ اس مٹی کے ٹکڑے کو پھسلنے والی گاڑیوں میں لاد کر لے جانے لگے اور اس وقت میری

سمجھ میں یہ بات آئی کہ وہ دلدل میں سے کوئلہ نکال رہے ہیں۔ اس طرح وہ ہر ریلوے انجن کی ایک خاص چیخ کے ساتھ میرے خیال میں قطب شمالی کے کسی حصّہ سے پرندوں کے جھنڈ کی طرح آتے اور چلے جاتے تھے۔ لیکن بعض اوقات بیگم والڈن بھی انتقام لیتی تھی۔ کوئی مزدور اپنی گاڑی کے پیچھے چلتا ہُوا زمین میں کسی شگاف میں ٹارٹارس کی طرف پھسل جاتا اور جو پہلے اتنا اینڈتا پھرتا تھا اچانک انسان کا نواں حصّہ ہو کر رہ جاتا تھا۔ اس کی ساری گرمی نکل جاتی تھی اور وہ میرے گھر میں پناہ لے کر بہت خوش ہوتا تھا اور اس بات کو تسلیم کرتا تھا کہ اسٹوو فائدہ مند ہوتا ہے۔ بعض اوقات منجمد مٹی ہل کے منہ سے فولاد کا ٹکڑا چھین لیتی تھی یا کوئی ہل نالی میں اس طرح پھنس جاتا تھا کہ اُسے کاٹ کر باہر نکالنا پڑتا تھا۔

صحیح معنوں میں ایک سو آئرستانی امریکن نگرانوں کے ہمراہ کیمبرج سے ہر روز برف لینے آتے تھے۔ وہ برف کو جس طریقہ سے سلوں میں تبدیل کرتے اس طریقہ سے ہر کوئی واقف تھا اور اُسے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ سلیں ساحل تک برف گاڑیوں میں پہنچائی جاتیں اور وہاں سے فوراً ایک برفانی چبوترے پر اور پھر وہاں سے چرخی اور رسّی کے ذریعہ جنہیں گھوڑے کھینچا کرتے تھے۔ آٹے کے بوروں کی طرح اُٹھا کر برف کے ٹال میں ایک کے ساتھ ایک اور قطار اندر قطار برابر رکھ دی جاتی تھیں جیسے وہ بادلوں کو چھونے والے کسی چوکور یا مستطیل نما مینار کی ٹھوس بنیاد بننے والی ہوں۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ تقریباً ایک ایکڑ سے کسی اچھے دن میں ایک ہزار ٹن برف نکال سکتے تھے۔ برف گاڑیوں کے ایک ہی راستہ سے گزرنے کے باعث زمین کی طرح برف میں گہری لکیریں اور گڑھے پڑ گئے تھے اور گھوڑے بلاناغہ اپنا دلیہ اُن سلوں میں کھاتے تھے جن کو بالٹی کی طرح بنا دیا گیا تھا وہ کھلی فضا میں اس طرح ٹال بناتے تھے کہ وہ ایک طرف سے ۳۵ فٹ اُونچا اور چھ سات جریب چوکور ہوتا تھا۔ وہ ٹال کی پرتوں

۵

تختوں کو ہوا سے بچانے کے لیے اُن کے اوپر گھاس رکھ دیتے تھے کیونکہ ہوا چاہے کتنی ہی سرد کیوں نہ ہو اگر اسے گھاس میں گھسنے کا راستہ مل جائے تو وہ گہرے گہرے شگاف پیدا کر دیتی ہے چنانچہ صرف ادھر اُدھر سہارا دینے والے کھنڈر رہ جاتے ہیں۔ اور آخر کار وہ بھی منہدم ہو جاتے ہیں۔ پہلے تو وہ ایک وسیع و عریض نیلا قلعہ با دل بادل معلوم ہوتی تھیں لیکن جب وہ گیاستان کی موٹی گھاس شگافوں میں اُڑسنے لگتے اور یہ گھاس کہرے اور برف کے ٹکڑوں سے ڈھک جاتی تو یہ پورا ڈھیر ایک ایسے پھپھوندی لگے پرانے کھنڈر کی طرح دکھائی دیتا جو آسمانی رنگ کے سنگ مرمر سے بنا ہو۔ یہ موسم سرما کا گھر یعنی اس بوڑھے نے جیسے ہم جنتری میں دیکھتے ہیں۔ اپنے لئے کوئی جھونپڑی بنائی ہے جیسے وہ ہمارے ساتھ موسم گرما گذارنے کا ارادہ رکھتا ہو۔ ان لوگوں کے حساب کے مطابق ۱۵ فیصدی برف بھی اپنی منزل تک نہیں پہنچ سکتی۔ دو تین فیصدی برف تو گاڑیوں میں ضائع ہو جاتی ہے۔ لیکن اس ڈھیر کے ایک بہت بڑے حصے کا ان لوگوں کے ارادے کے خلاف ضائع جانا نوشتۂ تقدیر ہوتا ہے۔ اس لئے کہ برف کے منجمد حالت میں رہنے کے متعلق جو توقعات ہوتی تھیں وہ پوری نہ ہوتی تھیں یا کسی اور وجہ سے وہ بازار تک نہ پہنچتی تھی۔ اس ڈھیر کو ۱۸۴۶-۴۷ء میں لگایا گیا تھا اور جس کے متعلق اندازہ تھا کہ دس ہزار ٹن ہے۔ آخر کار گھاس اور تختوں سے چھپا دیا گیا اور اگرچہ آئندہ جولائی میں اس کی چھت کھول دی گئی۔ اس کا ایک حصہ منتشر ہو گیا اور بقیہ حصہ گرمی اور دھوپ میں کھلا پڑا رہا اور اس کے بعد موسم سرما بھی یوں ہی کھلا رہا۔ اور پھر بھی ستمبر ۱۸۴۸ء تک وہ برف مکمل طور پر نہ پگھلی اور اس طرح تالاب نے اپنی برف کا بہت بڑا حصہ واپس لے لیا۔

والڈن کے پانی کی طرح اس کی برف بھی نزدیک سے دیکھے جانے پر سبز دکھائی دیتی ہے اور دور سے بڑی خوشنما آسمانی نظر آتی ہے اور آپ کو آسمانی دریا کی سفید

برف اور ایک چوتھائی میل دور جو تالاب واقع ہیں ان کی سنہری برف سے یہ برف مختلف
دکھائی دیتی ہے۔ بعض اوقات برف والے کی گاڑی سے برف کی کوئی بڑی سِل
گاؤں کی سڑک پر گر پڑتی اور وہاں ایک بہت بڑے زمرد کی طرح ایک ہفتہ تک پڑی
رہتی اور ہر راہگیر کی دلچسپی کا باعث بنی رہتی تھی۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ والڈن کا ایک
حصّہ جو پانی ہونے کی حالت میں سبز نظر آتا ہے جم جانے پر اسی مقام سے آسمانی رنگ
کا دکھائی دینے لگتا ہے۔ اس طرح اس تالاب کے قریب گڑھے جو بعض اوقات
موسم سرما میں تالاب کی طرح سبز پانی سے بھرے ہوتے تھے۔ دوسرے ہی دن منجمد
ہو کر آسمانی رنگ کے ہو جاتے تھے۔ غالباً برف کے آسمانی رنگ کا سبب وہ روشنی
اور ہوا تھی جو اس میں موجود رہتی تھی اور ان میں سب سے زیادہ شفاف برف سب سے زیادہ گہری اور
آسمانی ہو جاتی ہے۔ برف مشاہدے کا دلچسپ موضوع ہے۔ لوگوں نے مجھے بتایا ہے
کہ فریش تالاب کی برف گھروں میں پانچ برس پرانی برف رکھی ہے۔ جو اب بھی اتنی تازہ
تھی جتنی پہلے تھی۔ کیا وجہ ہے کہ بالٹی میں بھرا ہوا پانی جلدی سڑ جاتا ہے لیکن
جم کر ہمیشہ میٹھا رہتا ہے؟ عام طور سے کہا جاتا ہے کہ یہی فرق عقل اور عقیدت
میں ہے۔

اس طرح میں نے دیکھا کہ ایک سو آدمیوں کو مزدور اشتکاروں
کی طرح گاڑیوں، گھوڑوں اور بظاہر زراعت کے تمام اوزاروں سے کام کرتے ہوئے دیکھا
وہ جنتری کے پہلے صفحہ کی تصویر کی مانند تصویر پیش کرتے تھے۔ اور میں جتنی بار انہیں
دیکھا کرتا تھا۔ مجھے فصل کاٹنے والوں اور لوہے کی کہانی یا لڑائی کرنے والوں کا ناٹک
یا اسی قسم کی دوسری باتیں یاد آ جاتی تھیں۔ اب وہ سب جا چکے ہیں۔ اور غالباً تیس روز
کے بعد وہی سمندر جیسا صاف والڈن کا سبز پانی مجھے اس کھڑکی سے نظر آنے لگے گا۔
اور اس پر بادلوں اور درختوں کے عکس ابھر رہے ہوں گے۔ اس تنہائی میں بخارات

اُمڈ رہے ہوں گے۔ اور یہ نشان تک باقی نہ رہے گا کہ انسان نے کبھی اس پر قدم رکھا
تھا۔ شاید مجھے وہاں کوئی یکسر و تنہا پنڈبی قہقہہ لگاتی۔ غوطے لگاتی اور پر کھجلاتی
ہوئی دکھائی دے گی۔ یا کوئی تنہا مچھیرا اپنی کشتی میں بیٹھا ایک پتّی کی طرح بہتا اور
اپنا عکس پانی میں دیکھتا ہوا نظر آئے گا جہاں ابھی ابھی ایک سو آدمی بڑے اطمینان
سے محنت کر رہے تھے۔

پس مجھے یہ دکھائی دیتا ہے کہ پسینے میں نہاتے ہوئے چارلسٹن، نیو آرلینز،
مدراس، بمبئی اور کلکتہ کے باشندے میرے کنوئیں پر پانی پی رہے ہیں۔ صبح کو میں
بھگوت گیتا کے عظیم الشان اور آفاقی فلسفے کی حکمت سے اپنے آپ کو نہلاتا ہوں بھگوت
گیتا تصنیف ہوئے دیوتاؤں کے ہزاروں سال بیت چکے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں ہماری
جدید دُنیا کا ادب بالکل ہیچ اور حقیر نظر آتا ہے۔ مجھے شک ہے کہ اس فلسفہ کا
تعلق کہیں کسی سابقہ دورِ حیات سے تو نہیں ہے۔ اس کی رفعت اور پاکیزگی ہماری
فہم و فراست سے بالاتر ہے۔ میں اپنی کتاب رکھ کر کنوئیں پر سے پانی لانے
چلا جاتا ہوں۔ میری ملاقات وہاں اس برہمن کے نوکر سے ہوتی ہے جو برہما،
وشنو اور اندر کا پجاری ہے۔ اور اب بھی گنگا کے کنارے اپنے مندر میں بیٹھا
وید پڑھ رہا ہے یا کسی درخت کی جڑ پر روٹی کا ٹکڑا یا لوٹا لئے بیٹھا ہے۔ میں
اس کے نوکر سے ملتا ہوں۔ جو اپنے مالک کے لئے پانی لینے آتا ہے اور ہمارے
ڈول ایک ہی کنوئیں میں ٹکراتے ہیں۔ والڈن کا صاف پانی گنگا کے مقدس
پانی سے جا ملتا ہے۔ سازگار ہوائیں اسے اڑا لے جاتی ہیں اور وہ افسانوں کے جزیروں
اطلانتس اور ہیسپریڈس سے ہوتا ہوا ہنّو کا چکر لگاتا ٹرنیٹ اور ٹائی ڈور کے قریب سے
گزرتا اور خلیج فارس کے دہانے سے بہتا بحرِ ہند کی ہواؤں میں جذب ہو جاتا ہے۔ اور
ایسی بندرگاہوں میں پہنچ جاتا ہے جن کے صرف نام ہی اسکندر نے سنے تھے۔

موسم بہار

برف کاٹنے والے مزدور جو بڑے بڑے راستے بنا جاتے ہیں وہ عام طور سے تالاب
کی برف کے جلد پگھل جانے کا سبب بنتے ہیں۔ اس لئے کہ موسم سرما میں جب پانی میں ہوا سے تموج
پیدا ہوتا ہے تو وہ آس پاس کی برف کو گلا دیتا ہے۔ لیکن اس برس والڈن پر کوئی اثر نہیں
ہوا کیونکہ پُرانے پیرہن کی جگہ اُس نے بہت جلد ایک نیا اور موٹا لباس پہن لیا تھا۔ اس
گرد و نواح کے دوسرے تالابوں کے برعکس اس تالاب کی برف کبھی جلد نہیں پگھلتی۔ اسکے
دو اسباب ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ تالاب بہت گہرا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس میں سے کوئی چشمہ
نہیں بہتا جو برف کو پگھلا یا گلا دے۔ ۱۸۵۲-۵۳ء میں جو ہر تالاب کے لئے سخت تھا، میری
دانست میں والڈن کی برف وسط سرما میں بھی نہیں پگھلی۔ فیئر ہیون اور فلنٹ کے تالاب کے
مقابلہ میں ایک ہفتہ یا دس دن بعد تقریباً یکم اپریل کو ہر سال اس کے شمالی حصے یا زیادہ
پایاب حصوں میں جہاں برف سب سے پہلے جمتی ہے پگھلنی شروع ہو جاتی ہے۔ یہ اس گرد و نواح
کے سارے تالابوں سے بہتر انداز میں موسم کی تبدیلی ظاہر کرتا ہے کیونکہ اس پر موسم کے
ہنگامی تغیرات کا بہت کم اثر ہوتا ہے۔۔ مارچ میں چند روز کی شدید سردی دوسرے تالابوں
کی برف کو پگھلنے سے روک سکتی ہے۔ لیکن والڈن کا درجہ حرارت لگ بھگ مسلسل بڑھتا

رہتا ہے۔ جب ۲۴ مارچ ۱۸۴۸ء میں جب والڈن کے بیچ میں ایک تھرمامیٹر لگایا گیا تو درجہ حرارت ۳۲ نکلا۔ پر اسی دن فلنٹ تالاب کے بیچ میں ۳۲½ اور کنارے سے ایک درمیان جریب کے فاصلہ پر پایاب پانی میں ایک فٹ موٹی برف کے نیچے ۳۶ تھا۔ موخرالذکر تالاب میں گہرے اور پایاب پانی کے درجہ حرارت میں ۳½ ڈگری کا فرق تھا اور اسکا بیشتر حصہ مقابلتاً پایاب ہی تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہاں کی برف والڈن کی برف سے پہلے پگھل جاتی ہے۔ اس زمانہ میں سب سے زیادہ پایاب حصہ میں جو برف تھی وہ بیچ کی برف سے کئی انچ پتلی تھی۔ وسط سرما میں تالاب کے بیچ کا حصہ سب سے زیادہ گرم ہوتا تھا اور وہاں کی برف سب سے زیادہ پتلی تھی۔ ہر اس شخص نے جو موسم گرما میں کسی تالاب میں اترا ہوگا یہ محسوس کیا ہوگا کہ کنارے کے قریب کا پانی جو تین یا چار انچ گہرا ہوتا ہے اُس پانی سے زیادہ گرم ہوتا ہے جو کنارے سے زیادہ دور ہوتا ہے اور گہرے پانی میں سطح کا پانی تہ کے پانی کی نسبت زیادہ گرم ہوتا ہے۔ موسم بہار میں سورج ہوا اور زمین کی حرارت میں اضافہ کرکے برف ہی کو متاثر نہیں کرتا بلکہ اپنی تمازت ایک فٹ یا اس سے زائد موٹی برف میں دوڑا دیتا ہے۔ اور پایاب پانی میں اس کی کرنیں تہ سے جھلکتی ہیں۔ وہ اس طرح جہاں وہ براہ راست طور پر برف کے بالائی حصے کو پگھلاتا ہے۔ وہاں برف سے نیچے کے پانی کو گرم کرکے برف کے زیریں حصہ کو پگھلاتا اور ناہموار بنا دیتا ہے۔ اس کے باعث برف میں ہوا کے جو بلبلے ہوتے ہیں اوپر نیچے پھیل جاتے ہیں جس سے برف کی صورت شہد کی مکھیوں کے چھتے کی مانند ہو جاتی۔ اور موسم بہار کی ایک ہی بارش میں غائب ہو جاتی ہے۔ لکڑی کی طرح برف میں بھی ریشے ہوتے ہیں۔ جب ایک ٹکڑا گلنے لگتا ہے یا اس میں دندانے پڑنے لگتے ہیں یعنی وہ شہد کی مکھیوں کے چھتے جیسی ہونے لگتی ہے، تو وہ جہاں کہیں ہوتی ہے اس کے ہوائی خانے پانی کی سطح سے ہمیشہ زاویہ قائمہ بناتے ہیں۔ جہاں کہیں کوئی چٹان یا شہتیر سطح کے قریب ہوتا ہے۔ اس کے اوپر کی برف بہت پتلی ہوتی ہے۔

اور اکثر ان سے منعکس ہونے والی حرارت کی وجہ سے جلد پگھل جاتی ہے۔ مجھے بتایا گیا ہے
کہ کیمبرج میں ایک پایاب چوبی تالاب میں برف بننے کا تجربہ کیا گیا تھا۔ اگرچہ ٹھنڈی ہوا اس کے
نیچے سے برابر گزر رہی تھی اور اس طرح دونوں سروں پر یکساں طور سے اثر انداز ہو رہی تھی۔
لیکن تہہ میں سورج کا جو عکس پڑتا تھا اس نے ان تدابیر کو بے اثر بنا دیا۔ جب موسم گرما کے
وسط میں بارش والطوفان کی آسمانی برف کو پگھلا دیتی اور بیچ میں سخت تاریک یا شفاف برف رہ
جاتی ہے تو کنارے کے قریب ایک ... یا اس سے کچھ زیادہ چوڑی خراب ... ہوتی
اور برف ... برف کا ایک ... دیتا ہے۔ یہ وہ برف ہوتی ہے جو اس منعکس ہونے والی تمازت
سے بنتی ہے۔ علاوہ ازیں جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں برف کے اندر ذرّات التیر نیچے کا
کام دیتے ہیں اور نیچے کی برف پگھلا دیتے ہیں۔

سال بھر کے یہ طریقے تالاب کا ہر روز ... چھوٹے پیمانہ پر جاری رہتے ہیں۔ عام
طور سے ہر روز صبح کو پایاب پانی گہرے پانی کی نسبت زیادہ گرم نہیں ہوتا۔ اور ہر شام سے صبح تک
زیادہ تیزی کے ساتھ ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ دن چھوٹے پیمانہ پر سال کی نمائندگی کرتا ہے۔ رات
موسم سرما ہے اور صبح و شام بہار و خزاں ... اور دوپہر موسم گرما۔ برف کا چٹخنا اور تڑکنا حرارت
کا تبدیلی ... ظاہر کرتا ہے۔ ایک ٹھنڈی رات کے بعد ۲۴ فروری ۱۸۵۰ء کی صبح کو جب
میں فلنٹ تالاب پر دن گزارنے کے لئے گیا تو مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ جب میں نے برف
پر کلہاڑی کی الٹی طرف سے ضرب لگائی تو کئی گز تک ایک گونج جیسی آواز پیدا ہوئی
گویا میں نے ایک بہت ہی کسے ہوئے ڈھول پر تھاپ لگائی ہو۔ سورج نکلنے کے ایک گھنٹہ
بعد جب اس کی ترچھی کرنیں پہاڑی کو پار کر کے برف پر گرنے لگیں تو تالاب میں ایک آواز پیدا
ہونے لگی۔ اس نے نیند سے بیدار ہونے والوں کی طرح جسم کو انگڑائی لی۔ اور یہ ہنگامہ
دھیرے دھیرے بڑھتا گیا اور تین چار گھنٹے تک جاری رہا۔ دوپہر کو اس نے آنکھ جھپکی اور پھر
جب سورج اپنے اثرات لئے ہوئے رخصت ہو رہا تھا۔ رات کے قریب پھر ایک ... کر ہوا۔

موسم کی ایک خاص منزل پر تالاب ہر شام کو بڑی باقاعدگی سے توپیں داغتا ہے۔
لیکن دن کے وسط میں برف جگہ جگہ سے چٹخ جاتی ہے۔ اور چونکہ ہوا میں لچک کم ہوتی
ہے اس لئے وہ گونج کھو بیٹھتی ہے اور اگر ہم اس کی سطح پر ضرب لگائیں
تو اس کی گونج سے غالباً مچھلیاں اور چھچھوندریں بے حس نہ ہوں گی۔ ماہی گیروں کا
کہنا ہے کہ تالاب کا گرجنا مچھلیوں کو خوفزدہ کر دیتا ہے اور اس لئے وہ چارے پر
منہ نہیں مارتیں۔ تالاب ہر شام کو نہیں گرجتا اور میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ
اس کی گرج کب تک متوقع ہوتی ہے۔ لیکن اگرچہ میں موسم میں کوئی تبدیلی نہیں دیکھتا
لیکن وہ گرجتا ضرور ہے۔ کسی کو یہ خیال آسکتا تھا کہ اتنی ٹھنڈی اور موٹی جلد والی
چیز بھی اتنی ذکی الحس ہوگی؟ پھر بھی اس کے لئے کچھ قواعد اور قوانین ہیں اور وہ گرج
کر ان کی اسی طرح پابندی کرتے ہیں جس طرح کلیاں بہار میں چٹک کر۔ ساری زمین زندہ
اور حساسوں سے بھری ہے۔ بڑے سے بڑا تالاب بھی اپنے ماحول سے اسی
طرح متاثر ہوتا ہے جس طرح تھرمامیٹر کی نلی میں پارہ۔

جنگل میں رہنے کی ایک کشش یہ بھی تھی کہ مجھے لمحاتِ فرصت میسر آئیں گے اور بہار کی
آمد کا نظارہ دیکھنے کا موقع ملے گا۔ تالاب کی برف میں آخر کار چھتے بننے لگتے ہیں۔ اور میں سیر
کے دوران میں اپنی ایڑی سے ان کو کچل سکتا ہوں۔ کہرا، بارش اور تمتماتا ہوا سورج
برف کو دھیرے دھیرے پگھلا دیتے ہیں۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دن بڑے ہو رہے
ہیں اور مجھے اندازہ ہونے لگتا ہے کہ اب لکڑی کے ٹال میں اضافہ کئے بغیر موسم سرما
کٹ جائے گا کیونکہ اب الاؤ جلانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ میں بہار کی پہلی علامات
کے خیر مقدم کے لئے یوں تیار بیٹھا ہوں کہ شاید کوئی آنے والی چڑیا کہیں چہک اٹھے
یا کوئی دھاری دار گلہری اپنے ذخیرے کے خالی ہو جانے پر چیں چیں کرتی سنائی دے یا کوئی جنگلی
گلہری اپنی موسم سرما کی اقامت گاہ سے باہر نکل آئے۔ ۱۳ مارچ کو جب میں نے نیل کنٹھ، گوریا

سرخ پروں والے پرندے کو چہچہاتے ہوئے سن چکا اس وقت ایک فٹ موٹی برف باقی تھی۔ اگرچہ موسم آہستہ آہستہ گرم ہوتا چلا گیا تھا۔ لیکن اس پر پانی کا اثر نہیں تھا۔ نہ برف ٹکڑے ٹکڑے ہوئی تھی۔ اور نہ جیسا کہ دریاؤں میں ہوتا ہے وہ کہیں بہہ کر تیرتی گئی تھی۔ اگرچہ وہ ایک جریب کے لگ بھگ چوڑائی میں کنارے پر پگھل گئی تھی پھر بھی اس کے وسط میں چھتے بن گئے تھے اور وہ پانی سے اس طرح تر تھی کہ چھ انچ موٹی برف پر اگر آپ پاؤں رکھتے تو وہ اس برف کے آر پار ہو جاتا لیکن دوسرے دن شام تک خاص طور سے جب کہرے کے بعد گرم بارش ہوتی تو وہ کہرے کے ساتھ ساتھ بالکل غائب ہو جاتی تھی غالباً کہرا اسے بھگا کر لے جاتا تھا ایک سال میں برف کے غائب ہونے سے پانچ دن پہلے تالاب پر گیا تھا ۱۸۴۵ء میں والڈن یکم اپریل کو پوری طرح کھل گیا تھا اسی طرح وہ ۲۵ر مارچ ۱۸۴۶ء کو ۸ر اپریل ۱۸۴۷ء کو، ۲۰ر مارچ ۱۸۵۱ء کو ۔ ۲۸ر اپریل ۱۸۵۲ء کو اور ۲۳ر مارچ ۱۸۵۳ء کو اور ۷ر اپریل ۱۸۵۴ء کے قریب کھلا تھا۔

ہم لوگ جو آب و ہوا کی ان انتہاؤں میں رہتے ہیں اُن کے لئے ہر وہ واقعہ جو دریاؤں اور تالابوں کے برف کے پگھلنے اور موسم کے پرسکون ہونے سے تعلق رکھتا ہے بہت دلچسپ ہوتا ہے۔ جب دن نسبتاً زیادہ گرم ہونے لگتے ہیں تو وہ لوگ جو دریا کے قریب رہتے ہیں برف کو رات میں ایک گرج کے ساتھ ٹوٹتے ہوئے سنتے ہیں جیسے توپیں داغی جا رہی ہوں اور دریا اپنی برفانی بیڑیاں چھن چھنا کر ایک سرے سے دوسرے سرے تک توڑ دیتا ہے۔ پھر چند ہی دنوں میں برف تیزی سے غائب ہو جاتی ہے۔ اور مگرمچھ زمین کے پھٹنے پر کیچڑ سے باہر آ جاتا ہے۔ ایک بوڑھے نے جو قدرت کا بہت ہی قریب سے مطالعہ کر چکا تھا۔ اور اس کی تمام حرکات سے واقف تھا جیسے وہ اس کے لڑکپن میں لکڑی کے ڈھانچے پر رکھ دی گئی تھی۔ اور جس نے اس کے بنانے میں مدد دی تھی۔ اور جو اب سن رسیدہ ہو چکا تھا۔ اسے قدرت کے بارے میں اتنی کہانیاں معلوم تھیں کہ اگر وہ میتھو سیلا کی عمر بھی پاتا تو ان

کہانیوں میں اضافہ نہ ہوتا۔ اُس نے مجھے وہ کہانیاں سُنائیں اور مجھے اُن کو سُن کر تعجب ہُوا کہ وہ اب بھی قدرت کے کارناموں کا قائل تھا۔ میرے خیال میں قدرت اور اُس کے درمیان کوئی راز باقی نہیں رہ گیا تھا۔ وہ موسمِ بہار کے ایک دن بندوق لئے ہوئے کشتی میں یہ سوچ کر بیٹھ گیا کہ چلو چل کر کچھ بطخیں ہی مار لائیں۔ اگرچہ بیرونی کناروں میں ابھی تک برف موجود تھی لیکن وہ دریا سے غائب ہو چکی تھی۔ اس لئے وہ سڈبری سے جہاں وہ رہتا تھا فیرہیون تالاب تک کسی قسم کی روک ٹوک کے بغیر کشتی میں چلا گیا مگر وہاں تالاب کو اُس نے خلافِ توقع اکثر حصّوں میں ٹھوس برف سے ڈھکا پایا۔ دن گرم تھا۔ اس لئے اُسے اتنی زیادہ برف دیکھ کر حیرت ہوئی۔ اُسے کوئی بطخ دکھائی نہ دی لہٰذا اُس نے اپنی کشتی تالاب میں ایک جزیرے کے پیچھے شمال کی جانب چھوڑ دی۔ اور خود بطخوں کے انتظار میں جنوبی جھاڑیوں میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ کنارے سے تین چار جریب کے فاصلے تک برف پگھل چکی تھی اور وہاں پانی صاف اور گرم تھا۔ اور اس کی تہہ میں ایسا کیچڑ تھا جو بطخوں کو عزیز ہوتا ہے۔ اُس کا خیال تھا کہ چند بطخیں وہاں ضرور آئیں گی۔ وہاں تقریباً ایک گھنٹہ تک خاموشی سے لیٹے رہنے کے بعد اُس نے ایک ہلکی اور بظاہر دُور سے آنے والی آواز سُنی۔ لیکن یہ آواز عجیب و غریب طور پر بہت ہی دلآویز اور پُرتاثیر اور ایسی تھی جو اس نے اپنی زندگی میں پہلے کبھی نہیں سُنی تھی۔ یہ آواز دھیرے دھیرے بلند ہونے لگی اور اس طرح بڑھنے لگی جیسے اس کا انجام آفاقی اور یادگار ہوگا۔ پھر وہ اس طرح کی ایک اچانک گرج دار سرسراہٹ پر ختم ہوئی جس سے اب محسوس ہونے لگا کہ پرندوں کا ایک بہت بڑا جھنڈ یہ پھڑپھڑاتا ہوا وہاں اتر پڑا ہے۔ اس نے اپنی بندوق اُٹھالی اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ تیزی سے اُدھر لپکا۔ لیکن اُسے یہ دیکھ کر تعجب ہُوا کہ تالاب کی ساری برف اپنی جگہ سے بہہ کر کنارے پر آ گئی تھی۔ اُس نے جو آواز سُنی تو وہ ساحل سے برف کے ٹکرانے کی تھی۔ پہلے پہل تو ساحل نے اُسے دھیرے دھیرے کترا اور پھر اُس کے کنارے

دیتی ہیں یا آپ کو انگشتِ مرجان، پنجۂ شیر، پرندوں کے پَر، جھینگوں، آنتوں اور مختلف اقسام کی فصلوں کی یاد دلاتی ہے۔ یہ حقیقتاً آدھی شیر اور آدھی پیڑ نباتات جس کی شکل اور جس کے رنگ کی نقالی کی جاتی ہے۔ ایک طرح کی عمارتی نقاشی سے جو کاسنی، پتیاں اور انگور کی بیل یا دیگر نقوش سے بھی قدیم اور حسبِ حال ہے۔ یہ بعض حالتوں میں مستقبل کے ماہرِ ارضیات کے لئے غالباً ایک معمہ بن جائے گی۔ مجھے پورا نالہ اس طرح متاثر کر رہا تھا۔ جیسے وہ ایک ایسا کھلا اور روشن غار ہو جس میں کار لوبنیٹ آف لائم رچونے کا کوئلہ کی تہ نشین قسمیں لٹکی ہوئی ہوں۔ ریت کے مختلف رنگ خاص طور سے گہرے اور اچھے نظر آتے ہیں۔ اور وہ لوہے کے مختلف رنگوں جیسے ہوتے ہیں۔ بھورے، نیلے، زردی مائل اور سرخی مائل۔ جب اس بہتی ہوئی ریت کا انبار اس نالی تک پہنچتا ہے جو پشتے کی تہہ میں واقع ہے تو وہ چپٹا ہو کر مختلف پٹیوں میں تقسیم ہو جاتا ہے یہ پٹیاں اپنی بیلیں نما شکلیں چھوڑ دیتی ہیں۔ اور دھیرے دھیرے زیادہ سے زیادہ چپٹی اور چوڑی ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اور جتنی نم آلود ہوتی ہیں اتنی ہی آسانی سے ایک دوسری میں گھل مل جاتی ہیں یہاں تک کہ وہ تقریباً چپٹی ریت کا ایک قطعہ بن جاتی ہیں۔ جس میں ابھی تک مختلف رنگ موجود ہوتے ہیں اور ابتدائی نباتاتی اشکال کے نشانات ملتے ہیں آخر وہ پانی میں پہنچ کر ریت کے اس طرح کے کناروں میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ جیسے دریاؤں کے دہانے پر پائے جاتے ہیں۔ اور نباتات کی اشکال کی تہہ میں جو نشانات ہوتے ہیں۔ ان میں مدغم ہو جاتی ہیں۔

بعض اوقات سارا ساحل جو بیس سے چالیس فٹ تک اونچا ہوتا ہے۔ وہ اس طرح کی نباتات یا ریت کی پھول پتیوں سے ایک یا دونوں جانب ایک چوتھائی میل تک ڈھک جاتا ہے۔ اور یہ سب کچھ بہار کے ایک دن کا کرشمہ ہوتا ہے؟ اس ریتلی نباتات کے بارے میں قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ وہ اسی طرح یک بیک نمودار ہو جاتی ہے جب میں

کنارے کے ایک بے جان رخ کی طرف دیکھتا ہوں۔ اس لئے کہ سورج پہلے ایک ہی رخ پر
جلوہ افروز ہوتا ہے اور جب میں دوسرے رخ پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں
اس صناع کی تجربہ گاہ میں کھڑا ہوں جس نے ساری دنیا کو اور مجھے بنایا ہے اور میں اس مقام پر
آ گیا ہوں جہاں وہ اب بھی اپنے تخلیقی کام میں مصروف ہے۔ وہ اس کنارے سے کھیل رہا ہے
اور اپنی قوتِ عمل کے باعث اس نے اپنے نئے نئے نقشے اور خاکے ادھر ادھر بکھیر دیئے ہیں
میں محسوس کرتا ہوں جیسے میں کرۂ ارض کی حقیقی قوتِ حیات سے بہت ہی قریب ہوں
کیونکہ ریت کا یہ سیلاب زدہ برگ نما ابھار حیوانی اجسام کے مراکزِ حیات سے ملتا جلتا
ہے۔ اس طرح آپ کو ریت ہی میں نباتات کی پتی کا امکان مل جاتا ہے۔ یہ بات تعجب خیز
نہیں ہے کہ زمین کے اندرونی خیالات کا پیچ وتاب خارجی طور پر ان ہی پتیوں کے
نقش ونگار سے ظاہر ہوتا ہے۔ ایٹموں نے تو یہ قانون پہلے تو سیکھ رکھا ہے بلکہ
وہ تو ان کے پیٹ میں ہے۔ درختوں پر لٹکی ہوئی پتیاں یہاں اپنا اولین نقش دیکھتی
ہیں۔ اندرونی حیثیت سے یہ مادہ کسی حیوانی جسم میں ہو یا زمین میں ایک بھیگی موٹی لو کی
شکل میں ہوتا ہے۔ یہ ایسا لوتھڑا ہے جو خاص طور پر جگر، پھیپھڑوں اور چربی کی پتیوں
پر لاگو ہوتا ہے۔ اور خارجی طور پر ایک سوکھی پتی مٹی جیسا دکھائی دیتا ہے۔ پرندوں
کے بال و پر اس سے بھی زیادہ سوکھی پتیاں ہیں۔ زمین کے اندر کھل روپ سے لے کر
ہوا میں اڑنے والی تتلی کی یہی حالت ہے۔ خود کرۂ ارض ہمہ وقت مرتفع اور منتقل ہوتا
رہتا ہے اور اپنے مدار پر پروانہ لگا رہتا ہے۔ برف کی ابتدا ہی نازک بلوری پتیوں سے
ہوتی ہے گویا وہ پہاڑ کی سطح پر پہنچ گئی ہے جو آبی پودوں کی پتیوں نے آبی
آئینے پر کندہ کر دیئے ہیں۔ پورا درخت ایک پتی ہی تو ہے۔ اور دریا زیادہ بڑی
پتیاں ہیں جن کے گودے زمین میں پیوست ہیں اور قصبے اور شہر ان کیڑوں کے
انڈے ہیں جو شاخوں اور پتیوں کے زاویوں میں رہتے ہیں۔

جب سورج غروب ہو جاتا ہے تو ریت کھسکنا بند ہو جاتا ہے لیکن صبح کو یہ چشمہ پھر جاری و ساری ہو جاتا ہے اور لاکھوں شاخوں کے اندر شاخیں بناتا ہوا چلتا ہے۔ آپ غالباً یہیں یہ دیکھ سکتے ہیں کہ شریانیں کیونکر وجود میں آتی ہیں۔ اگر آپ غور سے دیکھیں گے تو آپ کو نظر آئے گا کہ پگھلنے والے ڈھیر سے پیلے نرم ریت کا ایک تیکھا دھارا بالکل اسی طرح جس طرح انگلی کے نیچے گوشت کی گدی ہوتی ہے دھیرے دھیرے نیچے کی طرف راستہ ٹٹولتا ہوا جاتا ہے۔ اور جوں جوں سورج اوپر اٹھتا ہے گرمی اور نمی بڑھتی ہے اور زیادہ حیال حصہ اس قانون کے مطابق جس کی پابندی سب سے زیادہ بے جان شے پر عائد ہوتی ہے۔ مؤخرالذکر سے الگ ہو جاتا ہے۔ اور اپنے لئے ایک علیحدہ آزادی ترچھی نہر بلکہ اس کے اندر ایک نالی سی بنا لیتا ہے۔ اس میں ایک نقرئی چشمہ اُس بھری پتیوں اور شاخوں کی مختلف منزلوں کے درمیان بجلی کی طرح چمکتا ہے۔ اور کبھی یہاں اور کبھی وہاں ریت میں غائب ہو جاتا ہے مگر ریت حیرت انگیز طور پر بہت جلد مکمل حیثیت سے بہتے بہتے اپنے آپ کو منظم کر لیتی ہے۔ اور اس سلسلہ میں وہ اپنے مواد سے کام لیتے ہوئے ایسی نہر کے دھارے والے کنارے بنا لیتی ہے۔ یہ ہیں دریاؤں کے سرچشمے۔ کیونکہ اس مرکب مادہ میں جو پانی میں تہ نشین ہو جاتا ہے غالباً ہڈیوں کا ڈھانچہ بنتا ہے اور اس سے بہتر مٹی اور نامیاتی مواد میں گوشت کے ریشے یا خلیے دار جلد ملتی ہے۔ آدمی پگھلتی ہوئی مٹی کے ایک ڈھیر کے سوا اور کیا ہے؟ انسان کی انگلی کے نیچے کی گدی ایک منجمد قطرے کے سوا اور کیا ہے؟ انگلیاں اور انگوٹھے جسم کے پگھلتے ہوئے ڈھیر سے اپنی حدود تک بہے ہوئے ہیں۔ کون جانتا ہے کہ زیادہ اچھے ماحول میں انسانی جسم کیونکر اور کہاں تک بڑھ سکتا ہے؟ کیا ہاتھ نباتات کے درخت کی پھیلی ہوئی پتی نہیں ہے۔ جس میں لویں بھی شامل ہوتی ہیں اور رگیں بھی؟ آپ تخیل سے کام لے کر کان کو وہ کائی کہہ سکتے ہیں جس کا لمبا جبڑا قطرہ سر کے دونوں طرف موجود ہے۔ لب یا لوبے جو منہ کے غار سے لٹک رہے ہیں۔ ناک واضح طور پر ایک منجمد قطرہ ہے یا کارلونیٹ آف لائم کی قسم ہے

ٹھوڑی ایک نہایت بڑا منجمد قطرہ ہے یا پورے چہرے کا نقطۂ عروج ہے۔ گال وہ ڈھلانیں ہیں جو ابروؤں کی پہاڑی سے چہرے کی وادی تک چلی گئی ہے۔ ان کے نشیب و فراز کو چہرے کی ہڈیاں نمایاں کرتی ہیں۔ ترکاریوں کی پتیوں میں جو گول لویں ہیں خواہ بڑی ہوں یا چھوٹی جھٹکے ہوئے قطرے ہیں۔ لویں پتیوں کی انگلیاں ہیں اور جتنی لویں ہوں گی وہ آتی ہی اطراف میں بڑھیں گی۔ اور زیادہ حرارت یا دوسرے مناسب اثرات اس کے مزید آگے بڑھنے کا سبب بن سکتے ہیں۔

پس اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہی پہاڑی زمین قدرت کے تمام طریقہ ہائے کار کے اصول کی مثال پیش کرتی ہے۔ اس زمین کے خالق نے صرف ایک پتی کو پیٹنٹ کرایا ہے۔ کون جمبولین ہمارے لئے اس کی مری عبادت کو پڑھے گا تاکہ ہم آخر کار ایک نئے باب کے اوراق الٹ سکیں؟ قدرت کی یہ صناعیاں میرے لئے آ…کہ بیلوں کی زرخیزی اور فراوانی سے بہت… زیادہ کیف افزا ہیں۔ یہ سچ ہے کہ کردار کے اعتبار سے یہ کسی حد تک فیفٹ جیسی ہیں اور کلیجی اور آنتوں کا کوئی کمی نہیں ہے جیسے اس کرۂ ارض نے اپنا سارا غلط اندرونی حصہ باہر نکال کر رکھ دیا ہو۔ مگر اس سے کم سے کم یہ پتہ تو چل جاتا ہے کہ قدرت بھی پیٹ اور آنتیں رکھتی ہے۔ اسی لئے وہ انسانیت کی ماں ہے۔ زمین کے اندر سے یہ کہرا نکل رہا ہے۔ یہ بہار یہ کہرا غنچہ و گل والی بہار سے پہلے اس طرح آ جاتا ہے جس طرح دیو مالائیں باضابطہ شعر و شاعری سے پہلے وجود میں آتی تھیں۔ موسم سرما کے ریاح اور بدہضمی کو دور کرنے کے لئے میں اس سے بہتر کوئی مسہل نہیں جانتا۔ مجھے اس کا یقین ہو جاتا ہے کہ زمین ابھی تک پوتڑوں میں لپٹی ہوئی ہے اور اپنی ننھی ننھی انگلیاں ہر طرف بڑھاتی رہتی ہے۔ اور صفا چٹ ابروؤں میں نئے نئے خمیدہ بال نکل رہے ہیں۔ کوئی چیز غیر نامی نہیں ہے۔ ساحل کے پاس یہ پتی جیسا ڈھیر اسی طرح پڑا ملتا ہے جس طرح بھٹی کے پاس دھات کا میل۔ اور یہ ظاہر کرتا ہے کہ قدرت بھی اندر ہی اندر بڑے زور شور سے اپنا کام کر رہی ہے۔ زمین

مردہ تاریخ کا کوئی حصّہ نہیں ہے جسے ماہرین ارضیات اور ماہرین [illegible] کتاب کے اوراق کی طرح مطالعہ کریں بلکہ یہ زندہ شاعری ہے۔ درختوں کے اُن سبز پتّوں کی طرح پھلوں اور پھولوں سے پہلے نکل آتے ہیں۔ یہ پھپھوندی لگی اور پتھر میں تبدیل شدہ زمین نہیں ہے بلکہ ایک زندہ زمین ہے جس کی عظیم مرکزی حیات کے مقابلہ میں سارے حیوانات اور نباتات کی زندگی محض طفیلی ہے اس کا خلفشار قبروں سے ہماری لاشیں کھینچ کر باہر نکال دے گا۔ آپ اپنی دھاتوں کو پگھلا کر بہترین سانچوں میں ڈھال لیجئے لیکن وہ مجھ پر اس طرح اثر انداز نہیں ہوں گی جس طرح اس پگھلی ہوئی زمین سے بنی ہوئی اشکال مجھے متاثر کرتی ہیں۔ نہ صرف یہ زمین بلکہ وہ تمام ادارے جو اسی زمین پر قائم ہیں سب اس کوزہ گر کے ہاتھوں میں چکنی مٹی کی طرح نرم پڑ جاتے ہیں۔

زیادہ دور [illegible] میں نے پایا کہ نہ صرف ان کناروں بلکہ ہر پہاڑی اور میدان پر اور ہر نشیب میں [illegible] سے اس طرح نکلتا ہے جس طرح خفتہ وحشی چوپائے اپنے بھٹ سے نکل پڑتے ہیں اور کہرا گنگناتا ہوا سمندر کی کھوج میں چل پڑتا ہے۔ یا ابر بن کر دوسرے [illegible] ہونے کے لئے اڑ جاتا ہے۔ منجمد چیزوں کا پگھلنا اپنی نرمی کے باوجود تھور اور اس کے ہتھوڑے سے زیادہ طاقتور ہے۔ ایک پگھلاتا ہے اور دوسرا توڑ توڑ کر ٹکڑے اڑا دیتا ہے۔

جب زمین پر برف باقی نہیں رہی تھی اور چند گرم دنوں نے اس کی سطح کو بھی کسی حد تک خشک کر دیا تھا تو نوخیز سال کے نرم نرم آثار کا (جنہوں نے ابھی ابھی اپنی آنکھیں کھولی تھیں) [illegible] سارے پر وقار سوکھے برگ و بار سے (جیسے موسم سرما کاٹ کر لے گیا تھا) موازنہ کرنے میں بڑا مزہ آتا تھا۔ سدا بہار، گولڈن روڈ، پنی ویڈ اور خوبصورت جنگلی گھاس [illegible] اس وقت موسم گرما کی نسبت بھی زیادہ نکلی ہوئی اور زیادہ دلکش تھی گویا ان کا حسن اس وقت تک پختہ نہیں ہوا تھا۔ کاٹن گراس، کیٹ ٹیلس، مولینس، جانسورٹ، ہارڈ ہیک، میڈو سویٹ اور دوسرے مضبوط تنوں والے پودے۔

کبھی ختم نہ ہونے والے اناج گدریاں جو سب سے پہلا پرندوں کی خاطر مدارات کرتے ہیں۔ یہ وہ شریفانہ سادہ لباس ہے جو ہوبہو فطرت پہنتی ہے۔ مجھے اُونی گھاس کے خوشنما محرابی سروں میں بہت دلکشی محسوس ہوتی ہے۔ وہ موسم سرما میں موسم گرما کی یادیں تازہ کرتی ہے اور ان چند اشکال میں سے ہے جن کی نقلیں اتارنا مصوّر کو بہت مرغوب ہے۔ اور جن کا دُنیائے نباتات سے وہی تعلق ہے جو انسانی دماغ میں موجود نمونوں سے علم نجوم کو ہے۔ وہ بہت سی پرانا اسلوب ہے ماورینا یونانی اور مصریوں سے بھی زیادہ پرانا ہے۔ موسم سرما کے بہت سے مظاہر ایک ناقابلِ بیان نرمی اور لطافت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ہم یہ سننے کے عادی ہو چکے ہیں کہ یہ وقت بڑا ہی ظالم اور سنگدل ہے۔ لیکن ایک عاشق کی سی نرمی سے موسم گرما کی زلفیں سنوارتا ہے۔

موسم بہار کی آمد پر سُرخ گلہریاں میرے مکان کے نیچے ٹھیک میرے قدموں تلے بیک وقت دو دو کر کے چلی آتی تھیں اور جب میں لکھ رہا پڑھ رہا ہوتا تھا تو وہ عجیب قسم کی ہنسی اور چہچہاہٹ سے کام لیتی اور ترنم ریز آوازیں بولتی تھیں اور مجھے اس طرح کی غوغاہٹ سنائی دیتی تھی جو پہلے کبھی سنائی نہیں دی تھی۔ جب میں پاؤں پٹختا تو وہ اور بھی زور سے بولنے لگتیں جیسے وہ اپنی ان مجنونانہ حرکات میں کسی سے ڈرتی نہ ہوں اور نہ کسی کی عزت کرتی ہوں۔ بلکہ ساری انسانیت کے سامنے خم ٹھونک کہتی ہوں کہ دیکھیں ہمیں کون روکتا ہے نہیں آپ مجھے نہیں روک سکتے۔ چکاری۔ چکاری!! وہ للکارتیں اور میری بات کی طرف سے بالکل بہری بن جاتیں۔ وہ انہیں بے جان سمجھتی تھیں اور اس طرح لعنت ملامت کرنے لگتی تھیں کہ ان کا جواب ہی نہیں بن پڑتا تھا۔

بہار کی پہلی چڑیا یہ سال پہلے سے زیادہ خوش امید کے ساتھ شروع ہوا۔ نیل کنٹھ، گاتی گوریا اور سُرخ پر والے پرندے کی ہلکی لذت بھری چہک جو حسرت سے طور پر برف سے خالی اور

نم آلود کھیتوں پر سے ہوتی ہوئی ہم تک پہنچتی ہے بالکل ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے موسم
سرما کی آخری برف ٹوٹ کر گرتی ہوئی گر رہی ہے۔ ایسے مواقع پر تار، پکھول، چڑیاں،
روایتوں اور دیگر تحریری اشتقاقات کی حقیقت ہی کیا ہے جنہیں بہار کو نغمہ نشاط اور
مسرت انگیز گیت سناتے ہیں۔ دلدلی تکرے نے سبزہ زار پر نیچے اُترتے ہوئے کیچڑ میں سب
سے پہلے پیدا ہونیوالے کیڑے ڈھونڈنے شروع کر دیئے ہیں۔ پگھلتی ہوئی برف کے
ڈوبنے کی آواز تمام وادیوں میں سنائی دیتی ہے۔ اور تالاب میں منجمد برف تیزی سے
پگھلنے لگتی ہے۔ پہاڑیوں پر گھاس، بہار کی آگ کی طرح لپک اٹھتی ہے۔ گویا پیدا ہوتے ہوئے
سورج کے خیر مقدم کے لئے زمین اپنی اندرونی حرارت بھیجتی ہے۔ جس کے شعلہ کا رنگ زرد
نہیں بلکہ سبز ہوتا ہے۔ مستقل زندگی کی علامت گھاس کی پتی ایک لمبے ہرے فیتہ کی طرح مٹی سے
اٹھتی ہوئی موسم گرما کی طرف بڑھتی ہے۔ پھر اسے راستہ میں کہیں روک لیتا ہے لیکن وہ تھوڑے
تھوڑے وقفہ کے بعد پژمردہ خاک میں جوش مارتی ہوئی نئی زندگی سے قوت نمو پاتی ہے۔
اور گزشتہ سال کی خشک گھاس کو تروتازہ کر کے اُسے ایک نیزے کی طرح تھام لیتی ہے
اور آگے بڑھ جاتی ہے وہ اس طرح برابر آگے بڑھتی رہتی ہے۔ جس طرح زمین سے
رسنے والا چشمہ آگے بڑھتا ہے۔ یہ دونوں تقریباً ایک جیسے ہوتے ہیں۔ کیونکہ جوشِ نمو والے
ماہ جون میں جب چشمے خشک ہو جاتے ہیں۔ تو گھاس کی پتیاں نالیاں بن جاتی ہیں۔ اور
ہر سال جانوروں کا ریوڑ اس بارہ مہینے سرسبز رہنے والے چشمے پر پانی پیتا ہے اور
گھاس کاٹنے والا موسم سرما کے لئے اس سے پانی نکالتا ہے۔ اسی طرح ہماری انسانی زندگی
کو جڑوں تک موت آتی ہے اور اس کے باوجود اس کی پتیاں نکل کر ابد میں پہنچ جاتی ہیں۔
والڈن تیزی سے پگھل رہا ہے۔ شمالی اور مغربی اطراف میں دو جریب چوڑی
نہر بن گئی ہے۔ مشرقی جانب یہ زیادہ چوڑی ہے۔ اصل تالاب سے برف کا ایک بڑا
قطعہ ٹوٹ کر الگ ہو گیا ہے۔ میں ایک چڑیا کو ساحل کی جھاڑیوں سے گاتے ہوئے

سُن رہا ہوں یہ اولت، اولت، اولت — چیپ چیپ چیپ — چی چرر — چی — وِس۔
وِس — وِس! یہ پرندہ بھی برف کے ٹوٹنے میں مدد دے رہا ہے۔ برف کے
گوشے میں لمبے لمبے خمدار خط کتنے حسین ہیں! جیسے یہ کنارے کے بیچ و خم سے
کسی حد تک ملتے جلتے ہیں۔ لیکن اُن سے کم کٹے پھٹے۔ وقتی سردی کے باعث برف
غیر معمولی طور پر سخت ہے۔ اور وہ محل کے ایسے فرش کی مانند ہے جس پر خوب چھڑکاؤ
کیا گیا ہو اور لہریں بنا دی گئی ہوں۔ لیکن ہوا اس کی سطح پر بے سود پھسلتی ہوئی
مشرق کی طرف چلتی ہوئی اُس پار کی اسی قسم کی سطح تک پہنچ جاتی ہے جس میں
زندگی کے آثار ہوتے ہیں۔ پانی کے اس فیتے کو دھوپ میں چمکتے ہوئے دیکھ
کر بڑی راحت ہوتی ہے۔ تالاب کے بے نقاب چہرے پر مسرت اور شباب
کی چھب ہوتی ہے۔ جیسے وہ اپنے اندر کی مچھلیوں اور ساحل کی ریت
کے ذرّوں کی وکالت کر رہا ہو اور ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے اُن کے
سفید سینوں سے ایک نقرئی چمک پھوٹ رہی ہو اور جیسے سارا تالاب
صرف ایک ہی مچھلی ہو۔ یہ ہے موسم سرما اور موسم بہار میں فرق! والڈن
مردہ تھا لیکن پھر زندہ ہو گیا ہے اور جیسا میں کہہ چکا ہوں اس موسم
بہار میں اس کی برف رفتہ رفتہ پگھلی۔

موسم سرما اور طوفان کی پُر سکون اور نرم موسم میں تبدیلی ہونا اور تاریک اور
سست رفتار لمحات کا روشن اور لچکدار اوقات میں بدل جانا ایک قابل
فراموش واقعہ ہے جس کا اعلان ہر شے کرتی ہے۔ آخر میں یہ تبدیلی فوراً دکھائی
دے جاتی ہے۔ دفعتہً میرے گھر میں روشنی آ گئی۔ حالانکہ شام ہونے والی تھی
موسم سرما کے ابر ابھی تک چھائے ہوئے تھے۔ اور بید کے درختوں سے بارش
کے قطرے ابھی تک ٹپک رہے تھے۔ میں نے کھڑکی سے باہر نظر ڈالی تو

دیکھا کہ کل جہاں سرد سلیٹی رنگ کی برف تھی وہاں آج شفاف تالاب اسی طرح
پرسکون اور باہمت طور پر جھلک رہا ہے جس طرح وہ موسم گرما کی شام کو جھلکتا
ہے۔ اگرچہ سر پر اس طرح کا آسمان کہیں بھی نہیں تھا۔ پھر بھی اس کے صاف
سینے پر موسم گرما کی شام کا عکس پڑ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تالاب نے
کسی دور افتادہ افق سے ساز باز کر لیا تھا۔ میں نے دور ایک رابن کو بولتے
ہوئے سنا اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں نے یہ آواز ہزاروں برس میں پہلی
بار سنی ہے اور میں اس کی یہ مہک آنے والے ہزاروں برس تک نہیں بھولوں
گا۔ یہ اتنی ہی اچھی اور میٹھی اور شیریں تھی جتنی پہلے ہوا کرتی تھی۔ نیو انگلینڈ کے
موسم گرما کے دن کے خاتمہ پر شام کو بولنے والے رابن کا کیا ہی کہنا۔ کاش
مجھے وہ ٹہنی مل سکتی جس پر وہ بیٹھتا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ مجھے وہی رابن
مل جاتا اور وہی ٹہنی مل جاتی۔ یعنی چڑیا موسم کی تبدیلی کے باعث کم سے
کم اپنا مقام تو نہیں بدلتی۔ میرے گھر کے آس پاس کالے صنوبر اور جھاڑ دار
شاہ بلوط جو ایک مدت تک سرنگوں اور پژمردہ رہے تھے وہ دفعتاً اپنی
پہلی شکل اختیار کر چکے تھے بلکہ پہلے سے زیادہ سرسبز اور شاداب تھے اور
زیادہ تنے ہوئے اور زندہ و شاداب معلوم ہوتے تھے جیسے بارش نے ان کو
اچھی طرح دھو کر صاف کر دیا ہو اور انہیں از سر نو قوت بخش دی ہو۔ میں جانتا
تھا کہ اب بارش نہیں ہوگی آپ جنگل میں کسی ٹہنی بلکہ خود اپنے لکڑی کے
ٹال پر نظر ڈال کر بتا سکتے ہیں کہ موسم سرما گزر گیا ہے یا نہیں۔ جب تاریکی ذرا
اور پھیل گئی تو بطخوں کے جھنڈ کو نیچے اڑتے اور بولتے ہوئے سن کر مجھے حیرت
ہوئی وہ جنوبی جھیلوں سے تاخیر کے ساتھ آنے والے تھکے مسافروں کی طرح
ایک دوسری کی بے تحاشا شکایتیں اور آپس میں تسلی سے اظہار خیال ہی کیا کرتا

تھیں۔ میں اپنے دروازے پر کھڑے ہو کر ان کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سن سکتا تھا۔ میرے گھر کی طرف آتے ہوئے انہوں نے میرے گھر کی روشنی دیکھ لی اور ہراس زدہ ہو کر تیزی سے دوسری طرف مڑیں اور تالاب میں جا گریں۔ پس میں نے اندر آکر گھر کا دروازہ بند کر لیا۔ میں نے اس طرح جنگل میں موسم بہار کی پہلی رات بسر کی۔

میں صبح کو اپنے دروازے سے بطخوں کو تالاب کے وسط میں تیرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ وہ کہرے میں پچاس جریب کے فاصلہ پر بہت ہی بڑی بڑی نظر آرہی تھیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ والڈن ایک مصنوعی تالاب ہے جو ان ہی کی تفریح کے لئے بنایا گیا ہے۔ لیکن جب میں ساحل پر جا کر کھڑا ہو گیا تو وہ اپنے قائد کی ایک ہی آواز پر بڑے زور کے ساتھ پھڑپھڑا کر بلندی پر پہنچ گئیں۔ ان کی تعداد انتیس تھی۔ انہوں نے قطار باندھ کر میرے سر کے اوپر ایک چکر لگایا اور اپنے قائد کی قیں قیں پر سیدھا کینیڈا کا رخ کر لیا۔ انہیں یقین تھا کہ وہ اپنا ناشتہ کسی زیادہ گدلے تالاب میں جا کر کریں گی۔ اسی وقت بطخوں کا ایک جھنڈ بلند ہوا اور اسی شمالی راستہ پر ہو لیا جس پر ان کے شور مچاتے ہوئے چچیرے بھائی گئے تھے۔

میں ایک ہفتہ تک قریباً دو صبحوں کو ایک تنہا قاز کے چکر لگانے اور قیں قیں کر کے اپنے ساتھی کو ڈھونڈنے کی آوازیں سنتا رہا۔ اس کی وجہ سے جنگل اس بڑے جھنڈ کی آواز سے گونجتا رہا جو اس میں سما نہیں سکتا تھا۔ اپریل میں کبوتر پھر چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں تیز تیز اڑتے دکھائی دیئے اور وقت آنے پر میں اپنی زمین کے صاف کئے ہوئے حصہ میں ابابیلوں کو چہچہاتا ہوا سننے لگا۔ حالانکہ ان کے متعلق میری یہ رائے تھی کہ یہ قصبہ میں اتنی نہیں ہیں کہ میرے ہاں اتنی زیادہ تعداد میں آسکیں اور میں نے یہ فرض کر لیا تھا کہ وہ خاص طور پر اس قدیم نسل سے تعلق رکھتی ہیں جو گورے لوگوں کے آنے سے پہلے کھوکھلے درختوں میں رہا کرتی تھیں۔ تقریباً

ہر ملک میں کچھوے اور مینڈک اس موسم کے پیش رووں اور پیغامبروں میں سے ہوتے ہیں۔ پرندے دلفریب کلغیاں لگائے چہچہاتے ہوئے اڑتے ہیں۔ اور پودے نکلتے ہیں اور پھیلتے پھولتے ہیں۔ قطبوں کی ہلکی جنبش کو درست کرتے اور قدرت کا توازن برقرار رکھنے کے لئے تیز ہوائیں چلتی ہیں۔

جس طرح اپنی باری باری پر ہمیں ہر موسم بہترین لگتا ہے اسی طرح بہار کی آمد گویا خلائے بیکراں سے کائنات کے وجود میں آنے کے مترادف اور ایک عہد زریں کی بشارت ہے۔

"مشرق کی ہوا سحر کی دیوی اور عربوں کی سلطنت اور ایران کی حکومت کے ہاں چلی گئی اور چٹانوں کو صبح کے سورج کی کرنوں میں چھوڑ گئی۔"

....

"انسان پیدا ہوا۔ اور نہ جانے اس خلاق عالم نے جو بہتر دنیا کا سرچشمہ ہے انسان کو مقدس بیج سے پیدا کیا — یا اس زمین نے جو حال ہی میں بلند مقام اثیر سے توڑکر الگ کی گئی ہے اپنی رشتہ دار جنت کے کچھ بیج بچا کر رکھے ہوئے تھے —"

ایک ہلکی سی بارش گھاس کو کئی گنا سبز کر دیتی ہے۔ اسی طرح زیادہ اچھے خیالات کی آمد سے ہمارا مستقبل بہترین بن جاتا ہے۔ اگر ہم ہمیشہ زمانہ حال میں رہیں اور اس گھاس کی طرح جو ہلکی سے ہلکی شبنم سے متاثر ہو جاتی ہے۔ ہم اپنے اوپر گزرنے والے ہر حادثہ سے فائدہ اٹھائیں اور اپنا وقت کھوئے ہوئے مواقع کی تلافی کرنے میں جسے ہم اپنے فرض کے نام سے منسوب کرتے ہیں۔

ضائع نہ کریں تو ہم پر یقیناً خدا کی رحمتیں نازل ہوں گی۔ بہار آجاتی ہے لیکن ہم موسم سرما ہی میں رہتے ہوئے چہل قدمی کرتے ہیں۔ بہار کی ایک خوشگوار صبح میں انسان کے سارے گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔ ایسے دن میں برائیوں سے عارضی صلح ہوجاتی ہے۔ جب تک اس طرح کا سورج تابندہ رہتا ہے۔ بڑے سے بڑے گناہگاروں کو راہِ راست پر واپس آجانے کا موقع ملتا ہے۔ اور وہ اپنی دوبارہ حاصل کی ہوئی معصومیت محسوس کرنے لگتے ہیں۔ ممکن ہے آپ نے کل تک اپنے پڑوسی کو ایک چور، ایک شرابی، ایک عیاش کی حیثیت سے جانا ہو اور اس کی حالت پر ترس کھایا ہو یا اس سے نفرت کی ہو اور ساری دنیا کی طرف سے مایوس ہوگئے ہوں۔ لیکن سورج چمکتا ہے اور بہار کی اس پہلی صبح کا آغاز دیتا ہے۔ اور دنیا کو نیا جنم عطا کرتا ہے اور آپ اپنے پڑوسی کو کوئی سنجیدہ کام کرتے ہوئے پاتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ عیاشی سے اس کی خراب و خستہ رگیں مسرت سے پھول رہی ہیں اور اس نئے دن کو دعا دے رہی ہیں اور بہار کے تاثرات کو بچوں کی سی معصومیت کے ساتھ محسوس کر رہی ہیں۔ آپ اس کے سارے قصور بھلا دیتے ہیں۔ اس کے گرد صرف خیرسگالی کا ماحول ہی نہیں ہوتا بلکہ اس میں تقدیس کی چاشنی بھی ہوتی ہے جو ظاہر ہونے کا راستہ ٹٹولتی ہے۔ غالباً اندھوں کی طرح اور بے اثر طریقہ سے اور ایک نومولود کی جبلت کی طرح تھوڑی دیر کے لئے جنوبی پہاڑیوں سے گالی گلوچ کی گونج سنائی نہیں دیتی۔ آپ خوبصورت اور کھولی جانی کونپلوں کو اپنی گانٹھ دار چھال سے باہر نکلنے کے لئے آمادہ دیکھتے ہیں۔ جیسے یہ ایک سال تک زندگی کا تجربہ کرنا چاہتی ہیں۔ وہ صبح اپنے خالق کی خوشی میں شریک ہے۔ آخر اس دن جیلر اپنے قید خانے کے پھاٹک کیوں نہیں کھول دیتا جج مقدمہ خارج کیوں نہیں کر دیتا اور پادری نمازیوں کی جماعت کو رخصت

کیوں نہیں کر دیتا؟ اس کا سبب یہ ہے کہ یہ سب خدائی اشاروں کی اطاعت نہیں کرتے اور نہ اس معافی پر یقین رکھتے ہیں جو خدا آزادانہ طور پر ہر آدمی کو دیتا ہے۔

"صبح کی پُرسکون اور مفید ہوا ہر روز نیکی کی طرف واپسی نیکی سے محبت اور بدی سے نفرت کے سلسلے میں ایسی کیفیت پیدا کر دیتی ہے جو ابتدائی انسان کی فطرت میں پائی جاتی تھی بالکل اسی طرح جس طرح کاٹے ہوئے جنگل کی کرنیں اصل درخت کو پھر زندہ کر دیتی ہیں۔ اسی طرح ایک انسان ایک دن میں جو بُرائیاں کرتا ہے وہ نیکیوں کے بیجوں کو جو پھر سے اُگ رہے تھے بڑھنے سے روکتی ہیں اور انہیں نیست و نابود کر دیتی ہیں۔"

"جب نیکیوں کے بیج اس طرح کئی دفعہ بڑھنے سے روک دیئے جاتے ہیں تو شام کی مفید ہوا ان کو محفوظ رکھنے کے لئے کافی نہیں ہوتی اور جوں ہی شام کی ہوا اس کے تحفظ کے لئے کافی ثابت نہیں ہوتی۔ انسان کی فطرت اور درندے کی فطرت میں کوئی زیادہ فرق نہیں رہ جاتا۔ جب لوگ اس انسان کی فطرت کو درندہ صفت پاتے ہیں تو وہ سوچتے ہیں کہ اس انسان میں عقل کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ کیا یہی انسان کی حقیقی اور قدرتی جذبات ہیں؟"

"سب سے پہلے سنہری زمانہ تخلیق کیا گیا جس میں نہ کوئی انتقام لینے والا تھا اور نہ کوئی قانون تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس زمانہ میں ایمانداری اور وفاداری پر عمل ہوتا تھا۔

اس زمانہ میں نہ تو سزا تھی اور نہ کوئی خوف تھا اور نہ تہدید آمیز الفاظ تھے جو پیتل پر کندہ کر کے لٹکائے جاتے تھے اور نہ کسی فریادی مجمع کو کسی جج کے حکم کا خوف تھا بلکہ وہ بدلہ لینے والے کے بغیر محفوظ تھے۔

اور نہ ہی صنوبر کا درخت پہاڑ پر اس لئے کاٹ کر گرایا جاتا تھا کہ اُسے نیچے لاکر سیال لہروں پر چھوڑ دیا جائے گا تاکہ وہ پردیسی دنیا دیکھ سکے۔ اور فانی مخلوق کو اپنے ساحل کے سوا دوسرے ساحلوں کا علم نہ تھا۔

....

وہاں ابدی بہار تھی۔ اور نرم و گرم ہوائیں اُن پھولوں کو سہلاتی تھیں جو بیجوں کے بغیر اُگتے تھے۔"

جب میں ۲۹ اپریل کو "ٹائن ایگلڈ ردیارچ" کے قریب دریا کے کنارے لہراتی ہوئی گھاس اور بید کی جڑوں پر (جہاں چھوندریں پوشیدہ ہوتی ہیں) مچھلیاں پکڑ رہا تھا میں نے ایک عجیب قسم کی کھڑکھڑاہٹ سُنی جو اِن لکڑیوں کی آواز سے مشابہ تھی جن کو لڑکے انگلیوں میں پھنسا کر بجاتے ہیں۔ جب میں نے آنکھ اوپر اٹھائی تو میں نے دُبلا پتلا شاہین دیکھا جو رات کے شہباز سے ملتا جلتا تھا۔ وہ کبھی ہوا میں ایک موج کی طرح بلند ہوتا اور کبھی قلابازیاں لگاتا ہوا ایک جریب نیچے چلا جاتا۔ اور اپنے بال و پر کا نچلا حصہ دکھاتا جو سورج کی روشنی میں فیتے یا سیپی کے اندرونی حصے یا موتی کی مانند چمک رہے ہوتے تھے۔ اس نظارے نے مجھے شاہین بازی یاد دلادی اور ساری شرافت اور شاعری بھی جو اس سے متعلق ہے۔ میرے نزدیک اس پرندے کو باز کہا جا سکتا تھا۔ لیکن میں ناموں کی زیادہ پروا نہیں کرتا۔ میں نے ایسی لطیف اُڑان کبھی نہیں دیکھی۔ وہ نہ تو ایک تتلی کی طرح ڈگمگاتا ہوا اُڑتا تھا۔ اور نہ بڑے بڑے لشکروں کی طرح برق رفتاری سے بلندی پر پہنچ جاتا تھا بلکہ ہوا کی وسعتوں میں بڑے اطمینان سے کھیل رہا تھا۔ وہ بار بار عجیب انداز سے بلند ہوتا اور اپنی بے جھجک، خوبصورت اور پتنگ جیسی قلابازیوں کو دوہراتا اور خود کو نیچے گرنے سے اس صفائی کے ساتھ بچاتا جیسے اُس نے کبھی زمین پر پاؤں نہ رکھا ہو۔ وہ اس

طرح وہاں اکیلا کھیل رہا تھا جیسے دُنیا میں اس کا کوئی ساتھی نہ تھا اور نہ اُسے صُبح اور ایتھر کے سوا (جن کے ساتھ وہ کھیل رہا تھا) کسی ساتھی کی ضرورت نہ تھی۔ وہ خود تنہائی محسوس نہیں کر رہا تھا بلکہ اپنے نیچے کی ساری زمین کو تنہائی محسوس کرنے پر مجبور کر رہا تھا۔ وہ والدین کہاں تھے جنہوں نے اُسے جنم دیا تھا۔ اس کے خویش واقارب کہاں تھے اور اس کا آسمانی باپ کہاں تھا؟ ہوا کے اس باشندے کو زمین سے صرف اتنا ہی رشتہ تھا کہ وہ کسی ایسے انڈے سے نکلا تھا جو کسی چٹان کے شگاف میں سیا گیا تھا یا یوں سمجھ لیجیے کہ اس کا پیدائشی گھونسلا کسی ابر کے کونے میں دھنک یا غروب آفتاب کی جھالروں سے بنا ہوا تھا جس میں زمین کے وسطِ گرما کے نرم اور ہلکے بخارات کی استرکاری کر دی گئی تھی اور اب کوئی بلند اور کوہ آسا ابر اُس کا نشیمن تھا۔

مجھے اس کے علاوہ طلائی، نقرئی اور چمکتی ہوئی کھپرے دار مچھلیوں کا ایک نادرالوجود مجموعہ ملا۔ یہ مچھلیاں موتیوں کی لڑی معلوم ہوتی تھیں اکثر بہار کی پہلی صبح کو میں اس طرح کے سبزہ زاروں میں جا پہنچا ہوں بیلوں اور پھولوں کے ایک جھوبلے سے دوسرے جھولے میں۔ اور بید کے درخت کی ایک جڑ سے دوسری جڑ پر کودتا رہا ہوں۔ اس وقت جنگل کی دریائی وادی میں نہیں بلکہ پورا جنگل ایسی صاف اور چمکدار روشنی میں نہایا ہوتا ہے اور جیسا کہ خیال ہے کہ اس سے قبروں میں سوئے مردے بھی جاگ اُٹھتے ہیں۔ ابدی زندگی کا اس سے زیادہ واضح ثبوت درکار نہیں ہے۔ ایسی روشنی میں تو ہر چیز زندہ ہی رہے گی۔ اے موت تیرا ڈنک کہاں تھا؟ اے قبر اس وقت تیری فتح کہاں تھی؟

اگر ہمارے ارد گرد نا دریافت شدہ جنگلات اور چراگاہیں نہ ہوتیں تو ہماری دیہی زندگی میں جمود پیدا ہو جاتا۔ ہمیں جنگل کے مقویات کی ضرورت ہے تاکہ بعض اوقات

ہم ایسی دلدلوں میں اتر جائیں جہاں بگلے اور گیا سنہانی مرغیاں چھپی ہوئی ہوتی ہیں اور
چہے کی پاٹ دار آوازیں سنیں اور ایسی سرسراتی ہوئی سوان کی نکہتوں سے بہرہ مند
ہوں جن میں صرف زیادہ وحشی اور تنہائی پسند پرندے اپنا گھونسلا بناتے ہیں اور
آبی نیولا زمین سے تقریباً چپکا ہوا رینگتا ہے - جہاں ہم ہر چیز کی تحقیق کرکے اس کا
مکمل علم حاصل کرنا چاہتے ہوں وہاں ہماری یہ بھی خواہش ہو کہ ہر چیز مبہم اور پُراسرار
رہے اور زمین اور سمندر اس حد تک حیرتناک رہیں کہ ہم اُن کی پیمائش کر سکیں اور
نہ ان کی انتھاہ پا سکیں کیونکہ دراصل ان کا تہہ تک پہنچنا ناممکن ہے - ہم کبھی قدرت
سے سیر نہیں ہو سکتے - ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم لامحدود قوت کے نظارے
سے تازہ دم اور شگفتہ ہوں - یہ وسیع اور عظیم الشان مناظر سمندروں کے
ساحل اور پر شکستہ جہازوں کے ٹکڑے یہ سرسبز شاداب اور خشک درختوں سے
بھرے جنگل ، یہ چمکتے اور گرجتے ہوئے بادل ، یہ تین تین ہفتے تک نہ تھمنے والی بارش
جس سے چشمے اور ندی نالے بہہ نکلتے ہیں - ہمیں چاہیئے کہ ہم دیکھیں کہ دوسرے
کیسے ہماری سرحدوں کو پار کر لیتے ہیں اور وہ کون سے جاندار ہیں جہاں ہمارے
قدم نہیں پہنچ سکتے - جب ہم گدھوں کو ایسی لاشیں کھاتے اور اس غذا سے قوت و
صحت حاصل کرتے دیکھتے ہیں جن کا نظارہ ہمارے دل میں کراہت اور افسردگی پیدا
کر دیتا ہے تو ہم کو خوشی ہوتی ہے جس ڈھلوان سے گزر کر میرے گھر کو راستہ جاتا
تھا اس میں ایک مردہ گھوڑا پڑا تھا - اس کی وجہ سے مجھے اپنے راستہ سے ہٹ
کر چلنا پڑتا تھا خاص طور سے اُن راتوں میں جب ہوا اس کی بُو سے لدی ہوتی تھی لیکن
اس سے فطرت کی قوتِ ہاضمہ اور توانائی صحت کا ثبوت ملتا تھا اور وہ میرے
لئے اس زحمت کا نعم البدل بن جاتا تھا - میں یہ دیکھ کر بہت خوش ہوتا ہوں کہ قدرت
کس قدر زندگی سے بھرپور ہے کہ ہزاروں جانیں قربان کی جاسکتی ہیں اور وہ

ایک دوسرے کو اپنا شکار بنا سکتی ہیں۔ اور نرم و نازک زندگیاں بڑے اطمینان کے ساتھ کاغذ کی طرح کچلی جا سکتی ہیں مثلاً وہ چھوٹے مینڈک جن کو سارس نگل جاتے ہیں۔ اور وہ کچھوے اور بھدے مینڈک جو سڑک پر آجانے سے کچلے جا سکتے ہیں۔ بعض اوقات تو گوشت اور خون کی بارش بھی ہوتی ہے۔ اگر حادثات کے امکانات کو ذہن میں رکھا جائے تو ایسے واقعات کو شمار نہیں کیا جا سکتا۔ ان ساری باتوں کا ایک عقلمند شخص پر جو اثر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ساری دنیا بے قصور ہے۔ نہ کوئی زہر زہریلا ہوتا ہے اور نہ کوئی زخم مہلک ہوتا ہے۔ رحم کا جذبہ کبھی استدلال پرستی نہیں ہے۔ وہ صرف کسی خاص موقع و محل کے لئے موزوں ہوتا ہے۔ اس کی التجاؤں کی بار بار شنوائی نہیں ہو سکتی۔

شاہ بلوط، ہکوری، چیل اور دوسرے درخت جو ماہ مئی کے اوائل میں تالاب کے گرد صنوبر کے جنگل میں نکل رہے تھے خاص طور سے ابر آلود ایام میں منظر کو دھوپ کی سی چمک بخش دیتے تھے۔ ایسا دکھائی دیتا تھا جیسے سورج کہرے میں سے نکل رہا ہے اور پہاڑیوں پر یہاں وہاں چمک رہا ہے۔ تیسری یا چوتھی مئی کو میں نے تالاب میں ایک پن ڈبی دیکھی اور میں نے اس مہینے کے پہلے ہفتے میں ابابیل اور کھوری تھریشر، ویری، ٹوڈی، وسی چی وِنک اور دوسرے پرندوں کو چہچہاتے سنا۔ تھرش کی آواز تو پہلے ہی سنائی دے چکی تھی۔ فی بی ایک بار لوٹ کر میرے دروازے اور کھڑکی میں جھانک کر دیکھ گئی تھی کہ میرا گھر اس کے لئے کافی غار نما ہے یا نہیں۔ میرے گھر کا معائنہ کرنے کے لئے وہ مسلسل اپنے بھنبھناتے ہوئے پروں پر دیر تک رکی رہی اور اپنے ٹیڑھے ناخنوں کو سمیٹے رہی تیلیے رنگ کے زیرے نے جلد ہی تالاب اور کنارے کے پتھروں اور کیلی لکڑیوں کو اتنا ڈھک دیا کہ اگر آپ چاہتے تو اُس رنگ کا پیپا بھر سکتے تھے۔ یہ وہی گندھک جیسی بارش ہے

جس کا ہم ذکر سنتے آئے ہیں۔ کالیداس کے ناٹک "شکنتلا" میں ہم ان چشموں کا حال پڑھتے ہیں جنہیں "کنول کے سنہرے زیرے نے زرد بنا دیا تھا" موسم کروٹیں بدلتے بدلتے موسم گرما تک اس طرح پہنچ جاتا ہے جس طرح ہم ٹہلتے ٹہلتے بلند سے بلند تر گھاس میں جا نکلتے ہیں۔

پس اس طرح جنگلوں میں میرے پہلے سال کی زندگی پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ دوسرا سال بھی پہلے سال کی طرح بیت گیا۔ میں آخر کار ماہ ستمبر ۱۸۴۷ء کو والڈن سے چلا آیا۔
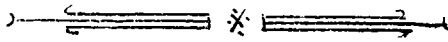
ڈاکٹر عقلمندی سے کام لیتے ہوئے بیماروں کو آب و ہوا اور مناظر کی تبدیلی کا مشورہ دیتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ یہاں ساری دُنیا موجود نہیں ہے۔ نیو انگلینڈ میں "بک آئی" نہیں اُگتا۔ اور موکنگ برڈ کی آواز یہاں شاذونادر ہی سنائی دیتی ہے۔ جنگلی ہنس تو ہم سے بھی زیادہ ہرجائی ہوتا ہے۔ کینیڈا میں ناشتہ کرتا ہے۔ اوہیو میں دوپہر کا کھانا کھاتا ہے اور جنوبی دریا کی دلدل میں رات گزارتا ہے۔ کسی حد تک ارنا بھینسا بھی موسموں کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ وہ کولوراڈو کے سبزہ زاروں میں اُس وقت تک گھاس چرتا رہتا ہے جب تک یلوسٹون میں اس کے لئے اس سے بھی زیادہ ہری اور میٹھی گھاس تیار نہیں ہو جاتی۔ پھر بھی ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ریل کے جنگلے اکھاڑ دیئے جائیں اور ان کی جگہ ہمارے کھیتوں کے گرد پتھر کی دیواریں کھڑی کر دی جائیں۔ تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہماری زندگیوں کو محدود اور ہماری تقدیروں کا فیصلہ کر دیا گیا ہے۔ اگر آپ کو خدا کی طرف سے شہر کا کلرک بنا دیا جائے تو آپ اس دفعہ موسم گرما میں یقینی طور پر ٹیرا ڈیل فیوگو نہیں جا سکتے۔ لیکن اس عہدے کے باوجود آپ تاریہ جہنم میں ضرور جا سکتے ہیں۔ ہم نے کائنات کے

فرینکلن ہی وہ تنہا شخص ہے جو اس طرح گم ہوگیا ہے کہ اس کی بیوی اس کی تلاش
میں سرگرمی سے سرگرداں رہے؟ کیا مسٹر گرینل جانتا ہے کہ وہ خود کہاں ہے؟ آپ
اپنے چشموں اور سمندروں کے خود ہی منگو پارک، لیوس، کلارک اور فاربشر بن
جائیے۔ اپنی ہی بلندیاں دریافت کیجئے اور اگر ضرورت پڑے تو اس کام کے لئے
اپنے ساتھ جہاز کے جہاز بھر کر محفوظ رکھا ہوا گوشت لے جائیے۔ اور اپنی نشانی
کے طور پر خالی ڈبوں کا آسمان تک اونچا ڈھیر لگا دیجئے۔ کیا گوشت کو محفوظ رکھنے
کی ایجاد اس لئے نہیں ہوئی کہ اس سے اپنا گوشت محفوظ رکھا جائے؟ نہیں
بلکہ ایک کولمبس اور اپنے اندر کے نئے نئے براعظم اور نئی نئی دنیائیں دریافت
کیجیے۔ نئے نئے راستے نکالیے لیکن تجارت کے لئے نہیں بلکہ غور و فکر کے لئے۔
ہر شخص ایک ایسی سلطنت کا حکمران ہے جس کے مقابلے میں زار کی ارضی بادشاہت
ایک چھوٹی سی ریاست اور برف کا ایک تودہ ہے۔ بعض لوگ جن میں خودداری
نہیں ہوتی وطن پرست بن جاتے ہیں۔ اور اعلیٰ کو ادنیٰ پر بھینٹ چڑھا
دیتے ہیں۔ وہ اس مٹی سے تو محبت کرتے ہیں جس میں ان کی قبر بننے والی
ہے لیکن انھیں روح سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا جو ابھی ان کی خاک
میں جان ڈالے ہوئے ہے۔ ان کے دماغ میں حب الوطنی کا کیڑا ہوتا ہے۔
یہ جو اتنا خرچ کر کے اور اتنے ترک و احتشام سے سمندروں کی دریافت کے
لئے بحری بیڑا بھیجا گیا تھا۔ اس کا مطلب صرف اس کے سوا اور کیا تھا کہ ہم
گھما پھرا کر یہ مان لیتے ہیں کہ اخلاقیات کی دنیا میں ایسے براعظم موجود ہیں۔
جن کی ہر انسان ایک آبنائے یا خاکنائے ہے لیکن اسے دریافت نہیں کیا گیا ہے۔
ایک سرکاری جہاز میں پانچ سو آدمیوں اور ملاحوں کے ساتھ ہزاروں میل تک سردی،
طوفان اور آدم خوروں کے درمیان سفر کرنا زیادہ آسان ہے، بجائے اس کے

کہ ہم خود اپنے نجی سمندر یعنی اپنے بحر اوقیانوس اور اپنے بحر الکاہل کا تنہا کھوج لگائیں۔

"ان کو آوارہ گھومنے دیجئے اور آسٹریلیا کے وحشی باشندوں
کا نظارہ کرنے دیجئے ——
مجھے خدا کا زیادہ خیال ہے اور ان کو اپنی سڑک کا۔"

یہ دوڑ دھوپ بے سود ہے کہ دنیا کا چکر لگا کر زنجبار میں وہاں کی بلیاں شمار کی جائیں۔ خیر جب تک کوئی اس سے بہتر کام نہیں ملتا۔ تب تک یہی کام کئے جائیے۔ شاید آپ کو "سیم" کا سوراخ مل جائے جس سے آپ آخرکار اس کے اندر چلے جائیں۔ انگلستان اور فرانس اسپین اور پرتگال گولڈ کوسٹ اور سلیو کوسٹ سبھی اس نجی سمندر کے سامنے ہیں لیکن ان میں سے کسی ملک سے بھی اس سمندر کی گہرائیوں میں کوئی کشتی نہیں بھیجی گئی ہے۔ حالانکہ بلاشک یہی ہندوستان تک پہنچنے کا سیدھا راستہ ہے۔ اگر آپ ساری زبانیں بولنا سیکھنا چاہتے ہیں۔ ہر ملک کی رسوم کی پابندی کرنا چاہتے ہیں۔ اور آپ تمام سیاحوں کی نسبت زیادہ سیاحت کرنا چاہتے ہیں تو ہر ملک کے باشندے بن جائیے۔ اور ابوالہول کو اپنا سر پتھر سے ٹکرانے پر مجبور کر دیجئے اور پرانے فلسفی کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے خود اپنا کھوج لگائیے۔ اس تلاش کے لئے آنکھیں بھی چاہئیں اور ایک مضبوط دل بھی۔ صرف شکست خوردہ اور مفرور ہی جنگ پر جاتے ہیں یعنی وہ بزدل جو بھاگ کھڑے ہوتے ہیں اور فوج میں بھرتی ہو جاتے ہیں۔ ابھی سے دور دراز مغربی راستہ پر روانہ ہو جائیے جو نہ مسی سی پی پر رکتا ہے نہ بحر الکاہل میں اور نہ ہی فرسودہ چین یا جاپان کی طرف جاتا ہے بلکہ موسم سرما ہو یا موسم گرما دن ہو یا رات غروب آفتاب کا وقت ہو یا غروب ماہتاب کا سیدھا اس کرہ ارض سے آگے نکل جاتا ہے۔

کہا جاتا ہے "میرابو" نے یہ جاننے کے لئے رہزنی کا پیشہ اختیار کیا تھا کہ سماج کے انتہائی مقدس قوانین کی باضابطہ مخالفت کرنے کے لئے کتنی ہمت کی ضرورت ہے۔

اس نے اعلان کیا "وہ ایک سپاہی جو میدان میں لڑتا ہے اُسے ڈاکو کے مقابلہ میں نصف سے بھی کم ہمت کی ضرورت پڑتی ہے" اور یہ کہ "وقار اور سنجیدگی کسی سوچے سمجھے اور مضبوط ارادے کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتے" جہاں تک اس دنیا کے رواج کا تعلق ہے یہ ایک مردانہ اعتراف تھا پھر بھی اگر اسے اُمید شکن نہ مانا جائے تو یہ قول بیہودہ ضرور ہے۔ ایک عقلمند آدمی مقدس ترین قوانین کی پیروی کر کے اکثر اپنے آپ کو سماج کے مفروضہ مقدس قوانین کا باضابطہ حریف پا سکتا ہے اور اپنے عمل کو کسی غیر معمولی آزمائش کے بغیر بھی جانچ کر سکتا ہے۔ کسی شخص کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ سماج کے بارے میں اس طرح کا طرزِ عمل اختیار کرے بلکہ صرف اس کی ضرورت ہے کہ وہ اپنی خودی کے قوانین کی پابندی کرتا رہے اور اُس پر قائم رہے۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو کسی عادل حکومت سے اس کا تصادم نہیں ہوگا بشرطیکہ اُسے اتفاقاً کوئی عادل حکومت مل سکے۔

میں نے جنگل ویسے ہی معقول اسباب کی بنا پر چھوڑا جیسے معقول اسباب کی بنا پر وہاں گیا تھا۔ مجھے شاید یہ محسوس ہوتا تھا کہ مجھے ابھی کئی اور زندگیاں بسر کرنی ہیں اور میں جنگل کی زندگی کے لئے اتنا وقت نہیں دے سکتا۔ یہ عجیب بات ہے کہ ہم بہت ہی آسانی سے غیر محسوس طریقہ سے ایک خاص ڈھرے پر چل پڑتے ہیں اور اپنے لئے ایک منجھا ہوا راستہ بنا لیتے ہیں۔ جنگل میں میرے قیام کو ابھی ایک ہفتہ بھی نہیں گزرا تھا کہ میرے قدموں نے میرے دروازے سے تالاب کے کنارے تک ایک راستہ بنا دیا تھا اور اگرچہ مجھے اس راستہ پر چلے ہوئے پانچ چھ برس بیت چکے ہیں لیکن وہ مجھے اب بھی صاف صاف دکھائی دیتا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں دوسرے بھی اُس راستہ پر نہ چلنے لگے ہوں اور انہوں نے اُسے صاف رکھنے میں مدد دی ہو۔ زمین کی سطح نرم ہوتی ہے اور اس پر انسان کے نقوش بآسانی سے اُبھر آتے ہیں۔ یہی حالت

اُن راستوں کی بھی ہے جن پر دماغ چلتا ہے۔ دُنیا کی شاہراہیں کتنی پامال اور خاک آلود ہیں اور روایت اور رسُوم کے ڈھرے کس قدر گہرے ہیں۔ مَیں اپنا سفر جہاز کی کوٹھڑی کا مسافر بن کر نہیں طے کرنا چاہتا تھا بلکہ مَیں مستول کے مقابلہ میں دُنیا کے عرشہ پر کھڑا رہنا چاہتا تھا تاکہ مَیں وہاں سے بہتر انداز میں پہاڑیوں میں سے جھانکتی ہوئی چاندنی دیکھ سکوں مَیں اب اس عرشہ سے نیچے نہیں اُترنا چاہتا۔

میرے تجربہ نے مجھے کم سے کم یہ سکھا دیا کہ اگر کوئی پورے اعتماد کے ساتھ اپنے خوابوں کی منزل کی طرف بڑھتا ہے اور ایسی زندگی بسر کرنے کی کوشش کرتا ہے جس کا اس نے خواب دیکھا ہے تو اسے غیرمعمولی اور غیرمتوقع کامیابی حاصل ہوتی ہیں۔ وہ بعض چیزیں پیچھے چھوڑ کر ایک غیرمرئی سرحد پار کر جائے گا۔ نئے آفاقی اور آزاد تر قوانین اس کے گرد اور اس کے اندر قائم ہونے شروع ہو جائیں گے۔ یا پُرانے قوانین میں وسعت پیدا ہو جائے گی اور ان کو مفید معانی کا جامہ پہنا دیا جائے گا۔ اور وہ ایسی آزادی سے زندگی بسر کرے گا جس کا حق صرف اعلیٰ مخلوق کو بخشا گیا ہے۔ وہ اپنی زندگی کو جس تناسب سے سادہ بنائے گا اُسی تناسب سے اُس کو قدرت کے قوانین میں کم سے کم پیچیدگی نظر آئے گی۔ اس کے لئے نہ تنہائی تنہائی رہے گی نہ افلاس افلاس رہے گا، نہ کمزوری کمزوری رہے گی۔ اگر آپ نے ہوائی قلعے بنائے ہیں تو یہ ضروری نہیں ہے کہ آپ کی محنت ضائع چلی جائے۔ اُن کا وہی مقام ہے۔ بس اب اُن کے نیچے کی بنیادیں قائم کیجئے۔

انگلستان اور امریکہ کا یہ مطالبہ بہت مضحکہ خیز ہے کہ اس طرح باتیں کیجئے کہ دوسرے ان کو سمجھ سکیں۔ اس طرح نہ انسان کا ارتقاء ہوتا ہے اور نہ ککرمُتے کا۔ ان کا یہ مطالبہ جیسے بڑی اہمیت رکھتا ہے اور جیسے اُن کے علاوہ دُنیا میں آپ کو سمجھنے والے کافی تعداد میں موجود نہیں ہیں جیسے قدرت بس ایک ہی طرح کی فہم و ذکا کی معاونت کر سکتی ہو جیسے وہ پرندوں، چوپایوں، اڑنے والے اور رینگنے والے جانداروں کی ایک ساتھ

پرورش نہ کرتی ہو جیسے "ہش"۔ اور۔ "وہوا"۔ جو صرف مسٹر برائٹ ہی سمجھ سکتے ہیں اصل میں بہترین انگریزی ہے۔ اور جیسے صرف حماقت ہی میں جان کی سلامتی ہے۔ مجھے جس بات کا خدشہ ہے وہ یہ ہے کہ میری تحریر میں زیادہ مبالغہ نہیں ہے اور میرے الفاظ روزانہ کے تجربات تک ہی محدود ہیں اور۔ اُس حقیقت کو نمایاں کرنے سے قاصر ہیں جس پر مجھے کُلّی یقین ہے۔ رہا حدود سے تجاوز کرنے کا سوال۔ تو اس کا انحصار اِس بات پر ہے کہ آپ کا دالان کتنا بڑا ہے۔ جگہ جگہ گھومنے والا بھینسا جو ایک سبزہ زار سے دوسرے سبزہ زار کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہے اُس گائے کی طرح اپنی حدوں سے باہر نہیں نکل جاتا جو دودھ دینے کے وقت بالٹی کو لات مار کر اور جنگلہ پھاند کر بھاگ جاتی ہے اور اپنے بچھڑے کے پیچھے پیچھے دوڑنے لگتی ہے۔ اُس انسان کی طرح جو ابھی ابھی خوابِ غفلت سے بیدار ہُوا ہو اور اُن لوگوں سے گفتگو کر رہا ہو جو خود بھی ابھی ابھی جاگے ہوں میں حدوں سے آگے بڑھ کر باتیں کرنا چاہتا ہوں مجھے یقین ہے کہ میں اتنی مبالغہ آمیزی پر قدرت نہیں رکھتا کہ اس پر سچے جُملے کی بنیاد رکھی جا سکے۔ کون ایسا ہے جو موسیقی کی ایک دُھن سُننے کے بعد اپنے دِل میں یہ جھجک محسوس کرے گا کہ وہ کبھی اپنی گفتگو میں کسی مبالغے سے کام نہ لے مستقبل یا امکانات کے پیشِ نظر ہمیں بالکل سُست اور غیر محدود زندگی اس طرح کُھل کر بسر کرنی چاہیئے کہ ان کے بارے میں ہمارے خاکے دُھندلے اور مبہم رہیں کیونکہ ہمارے سائے اُس عرق ریزی کو ظاہر کر رہے ہیں جو سُورج کی تاب لانے میں پیش آتی ہے۔ ہمارے الفاظ میں صداقت کی ایسی قوت ہونی چاہیئے کہ اُس سے یہ بات ہمیشہ ظاہر ہوتی رہے کہ ہماری بقیہ بات چیت ناکافی ہے۔ سچائی فوراً منتقل ہو جاتی ہے اور اس کی صرف لفظی یادگار باقی رہ جاتی ہے وہ الفاظ جس سے ہمارا اعتقاد اور ہماری پاکیزگی ظاہر ہوتی ہے محدود نہیں ہیں پھر بھی وہ بلند کردار والے اشخاص کے لیئے بالکل نمایاں اور بخور کی طرح خوشبودار ہوتے ہیں۔

ہم ہمیشہ اپنے بے کیف ترین احساس کی سطح پر کیوں اتر آتے ہیں۔ اور اُسے عام سمجھ بوجھ گردان کر اس کی تعریف کیوں کرتے ہیں؟ یہ عام سمجھ بوجھ تو خوابیدہ لوگوں کی سمجھ بوجھ ہے جسے وہ خراٹوں سے ظاہر کرتے ہیں۔ بعض اوقات ہم ڈیڑھ گن ذہین لوگوں کو نیم عقل کے مالک لوگوں کے زمرے میں رکھ دیتے ہیں اور یہ محض اس لئے کہ ان کی ذہانت کی باتوں کا تیسرا حصّہ ہی ہماری سمجھ میں آتا ہے۔ بعض لوگ تو صبح کی لالی پر اعتراض کر بیٹھتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ بہت سویرے بیدار ہو سکیں۔ جیسا کہ میں نے سُنا ہے "یہ حیلہ کرتے ہیں کہ کبیر کے دوہوں کے چار مختلف مفہوم ہوتے ہیں۔ کنایہ، جذبہ، ذہانت اور ویدوں کی ظاہری تعلیم" لیکن دُنیا کے اس حصّہ میں اگر کسی شخص کی تحریر کے ایک سے زائد معانی بتائے جا سکیں تو یہ بات شکایت سمجھی جائے گی۔ حالانکہ پورا انگلستان آلو کو کیڑوں سے بچانے کی دوائیں تیار کرنے میں مشغول ہے۔ پھر کیا ایک بھی ایسا آدمی موجود نہیں ہے جو اس ذہنی بیماری کا مداوا تلاش کرنے کی کوشش کرے جو آلو کی بیماری سے بھی زیادہ عام اور مہلک ہے؟

میں یہ تسلیم نہیں کرتا کہ میں نے الہام کا رتبہ حاصل کر لیا ہے۔ لیکن اگر میری تحریروں پر اس سے زیادہ اعتراض نہ کیا جائے جتنا والڈن کی برف پر کیا جا چکا ہے تو میں اسے اپنے لئے ایک قابلِ فخر بات سمجھوں گا۔ جنوب کے خریداروں نے اس برف کے اس نیلگوں رنگ پر اعتراض کیا تھا جو اس کے پاک و صاف کرنے کا ثبوت ہے۔ اُن کے نزدیک اس کے رنگ میں کیچڑ شامل تھا۔ اور انہوں نے کیمبرج کی برف کو اس پر ترجیح دی تھی۔ جو سفید تو ضرور ہے لیکن اس کا مزا آبی گھاس جیسا ہے۔ آدمی جس پاکیزگی کو پسند کرتا ہے وہ اس کُہرے کی مانند ہے جو کرۂ ارض کو گھیرے ہوئے ہے۔ وہ اس آسمانی ایتھر کی طرح نہیں ہے جو کرۂ ہوا سے بھی آگے ہے۔
بعض لوگ ہمارے کانوں میں مچھر کی طرح یہ گھُوں گھُوں کرتے ہیں کہ ہم امریکی ہیں

اَور عام طور سے جدید خیالات رکھنے والے ہیں مگر قدماؔ ہے کہ ان یہ کے عہد کے لوگوں کے مقابلہ میں بہت کم دانشور ہیں۔ اس بات کا آخر مقصد ہی کیا ہے؟ ایک زندہ کتا ایک مرے ہوئے شیر سے بہتر ہوتا ہے۔ کیا ایک شخص کو محض اس لئے اپنے آپ کو پھانسی دے دینی چاہیئے کہ وہ بونوں کی نسل سے ہے؟ کیا اُسے یہ کوشش نہیں کرنی چاہیئے کہ وہ بونوں میں سب سے بڑا بونا بن جائے۔ ہر شخص کو اپنے کام سے واسطہ رکھنا چاہیئے اَور اُسے یہی کوشش کرنی چاہیئے کہ وہ ویسا ہی رہے جیسا بنایا گیا ہے۔

آخر ہمیں کامیاب ہونے کی اتنی جلدی کیوں ہے اَور وہ بھی اس طرح کی خطرناک مہمات میں؟ اگر کوئی شخص اپنے ساتھیوں سے قدم ملاکر نہیں چلتا تو شائد اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ وہ کسی دوسری ڈھولک کی آواز سُن رہا ہے۔ آپ اُسے اُسی موسیقی سے قدم ملانے دیجئے جسے وہ سُن رہا ہے۔ چاہے وہ کتنی ہی سُست اور دُور کیوں نہ ہو۔ یہ بات کوئی اہمیت نہیں رکھتی کہ وہ اس قدر جلد پختہ ہوجائے جتنی جلدی سیب یا شاہ بلوط کا درخت پختہ ہوتا ہے۔ کیا وہ اپنی بہار کو گرمی میں تبدیل کردے؟ اگر وہ حالات پیدا نہیں ہوئے جن کے لئے ہمیں تخلیق کیا گیا ہے تو ہم ان کی جگہ کونسی حقیقت لاکر رکھ سکتے ہیں؟ ہمیں چاہیئے کہ ہم اپنے جہاز کو کسی بے سُود حقیقت کے پتھریلے ساحل سے ٹکراکر غرق نہ ہونے دیں۔ کیا ہم خوب مشقت کرکے نیلے شیشوں کا آسمان اپنے سروں پہ تان لیں جیسے آسمان واقعی موجود نہ ہو۔ اَور جب یہ شامیانہ تن جائے تو ہم حقیقی غیر مرئی آسمان کو تکتے رہیں؟

شہر کورو میں ایک فن کار رہتا تھا جو اپنے فن کو درجۂ کمال تک پہنچانے کی کوشش کرتا تھا۔ ایک دن اُس کے جی میں آیا کہ وہ ایک عصا بنائے۔ اس نے یہ غور کرنے کے بعد کہ کسی کام میں نقص رہ جانے میں وقت کو بڑا دخل ہوتا ہے لیکن ایک مکمل کام میں وقت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔ اپنے آپ سے کہا "یہ فن پارہ

ہر لحاظ سے مکمل ہوگا چاہے میں اس کام کے سوا اپنی زندگی میں اور کوئی کام نہ کروں"
یہ طے کرنے کے بعد کہ عصا کسی نا موزوں لکڑی کا نہیں ہونا چاہیئے۔ وہ لکڑی کی تلاش
میں فوراً جنگل میں نکل گیا۔ وہ جب لکڑی کی تلاش کر رہا تھا اور ایک کے بعد ایک ڈنڈا
رد کئے جا رہا تھا اُس کے دوست دھیرے دھیرے اس کو چھوڑ کر چلے گئے۔ کیونکہ
وہ اپنے کاموں میں بوڑھے ہو کر مر گئے تھے۔ لیکن وہ ایک لمحہ کے لئے بھی بوڑھا نہ ہوا
اس کے عزم اور مقصد کی یک جہتی اور اس کی پاکیزگی نفس نے اُس کے علم کے بغیر اُسے
لازوال شباب بخش دیا۔ چونکہ وہ وقت کو خاطر میں نہ لایا اس لئے وقت اُس کے راستہ
سے ہٹ گیا اور دُور بیٹھا سرد آہیں بھرتا اور افسوس کرتا رہا کہ وہ اس فنکار پہ فتح نہ پا سکا
قبل اس کے کہ ہر اعتبار سے اسے موزوں ڈنڈا مل سکے۔ کورو کا شہر کھنڈرات میں تبدیل
ہوگیا اور وہ اس کے ایک تودہ خاک پہ بیٹھ کر ڈنڈا تراشنے لگا۔ قبل اس کے کہ وہ اپنی
پسند کا عصا بنا سکتا کہ گندھار شاہی خاندان کا خاتمہ ہو گیا اور اُس نے اپنے عصا کی نوک
سے اُس خاندان کے آخری بادشاہ کا نام ریت پہ لکھ دیا اور پھر اپنے کام میں مصروف
ہو گیا۔ جتنے دنوں میں اُس نے عصا کو چکنا کر کے چمکایا۔ کلپ قطبی ستارہ نہ رہا اور
قبل اس کے کہ وہ عصا میں بیش بہا جواہرات جڑتا اور اُس کی موٹھ لگاتا۔ برہما کئی بار
سویا اور جاگا۔ لیکن ان تفاصیل کو بیان کرنے میں وقت ضائع کرنے سے کیا فائدہ؟ جب
اس کے کام میں آخری نفاست پیدا کرنے کا وقت آگیا۔ تو وہ عصا فنکار کی حیران نگاہوں
کے سامنے پھیلنے لگا۔ اور برہما کی حسین ترین تخلیق میں تبدیل ہو گیا اُس نے عصا بنانے
کا ایک نیا نظام قائم کیا یعنی ایک ایسی دُنیا جس میں ہر چیز کا تناسب درست ہوتا ہے۔ جس میں
اگرچہ پرانے شہر اور خاندان مٹ جاتے ہیں لیکن اُن سے بہتر شہر اور خاندان قائم
ہو جاتے ہیں۔ اب اُس نے اپنے پیروں کے پاس لکڑی کے تازہ چھلکوں کے ڈھیر کو
محسوس کیا۔ اس کے لئے اُس کام میں وقت کا گزرنا محض ایک واہمہ تھا۔ اُسے

بس اتنی دیر ہوئی جتنی بر سہا کے دماغ کی بجلی کو کسی خاندانی کی سوکھی لکڑی تک پہنچنے اور اس کو آگ لگانے میں ہوئی تھی۔ اس کا مواد بھی خالص تھا اور اس کا فن بھی اس لئے نتیجہ حیرت انگیز نہ ہوتا تو اور کیا ہوتا ؟

ہم کسی معاملہ کو چاہے کیسی ہی شکل کیوں نہ دیں۔ وہ آخر کار ہمارے اتنا کام نہیں آئے گا جتنا سچ آئے گا۔ سچ نہ تو استعمال سے گھستا ہے اور نہ ٹوٹتا ہے ہم زیادہ تر اس جگہ نہیں ہوتے جہاں ہم ہوتے ہیں بلکہ ایک غلط جگہ پر ہوتے ہیں۔ ہم اپنی فطرتوں کی کمزوری کے باعث صورتِ حال کو صرف فرض کر لیتے ہیں۔ اور اس میں اپنے آپ کو اُلجھا دیتے ہیں۔ اور اس طرح بیک وقت دو پھندوں میں پھنس جاتے ہیں۔ ان سے گلو خلاصی ہمارے لئے دُگنی مشکل ہو جاتی ہے۔ جس وقت ہم ہوتے ہیں ہوتے ہیں تو حقیقت پر نظر رکھتے ہیں یعنی جو صورتِ حال ہمیں نظر ہوتی ہے۔ آپ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں وہی کہیئے۔ اور وہ بات نہ کہیئے جو آپ سے دوسرے کہلوانا چاہتے ہیں۔ ہر صداقت ہر ظاہر داری کے ڈھونگ سے بہتر ہے۔ ٹام ہائیڈ پھیری والے کٹھیرے سے پھانسی کے تختہ پر پوچھا گیا کہ کیا وہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔ اس نے کہا " درزیوں سے یہ کہہ دیجئے کہ وہ پہلا ٹانکا لگانے سے پہلے اپنے دھاگے میں گرہ دینا نہ بھول جایا کریں " اس کے ساتھی کی فریاد کسی کو یاد نہیں۔

آپ کی زندگی کتنی ہی پست کیوں نہ ہو اس کا مقابلہ کیجئے۔ اور اسے بسر کیجئے اس سے بھاگیئے نہیں اور نہ اُسے گالیاں دیجئے۔ وہ اتنی بری نہیں ہے جتنے آپ برے ہیں۔ وہ اس وقت بہت نادار دکھائی دیتی ہے جس وقت آپ دولتمند ہوتے ہیں۔ عیب جُو تو جنت میں بھی عیب نکالے گا۔ زندگی کیسی ہی حقیر کیوں نہ ہو اُس سے محبت کیجئے۔ آپ کو خیرات خانہ میں بھی غالباً چند پُر مسرت ، پُر نشاط اور درخشندہ اوقات میسر آجائیں گے۔ ڈھلتے ہوئے سورج کی روشنی خیرات خانہ

کی کھڑکی پر بھی اسی طرح پڑتی ہے جس طرح کسی امیر کے محل پر۔ موسم بہار میں دونوں کے دروازوں پر برف تیزی سے پگھلتی ہے۔ مجھے ایسا نظر آتا ہے کہ ایک پرسکون دماغ وہاں بھی اسی طرح قانع رہ سکتا ہے جس طرح ایک محل میں۔ میری نظر میں قصبے کے غریب لوگ اکثر سب سے زیادہ آزاد زندگی بسر کرتے ہیں۔ غالباً وہ اتنے عظیم المرتبت ہیں۔ کہ انہیں جو کچھ ملتا ہے۔ اُسے لینے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے۔ اکثر لوگوں کی رائے ہے کہ غریب لوگ اس بات سے قطعی بے نیاز ہیں کہ قصبہ اُن کا خرچہ برداشت کرے۔ مگر وہ اس سے بالاتر نہیں کہ اپنی روزی بے ایمانی سے حاصل نہ کریں۔ اس سے تو اور بھی بدنامی ہوتی ہے۔ باغ کی جڑی بوٹی کی طرح افلاس کی پرورش کیجئے۔ نئی چیزیں حاصل کرنے کی زحمت گوارا نہ کیجئے چاہے وہ کپڑے ہوں یا دوست۔ پرانوں کو پلٹ دو۔ اور ان کی طرف لوٹ آؤ۔ چیزیں نہیں بدلتی ہیں۔ اپنے کپڑے فروخت کر دیجئے لیکن اپنے خیالات اپنے پاس اندر رکھیئے۔ خدا اس بات کا خیال رکھے گا کہ آپ کو احباب کا قحط محسوس نہ ہو۔ اگر میں کسی چھوٹی سی تاریک کوٹھڑی میں ایک مکڑی کی طرح بند کر دیا جاؤں تو جب تک میرے خیالات میرے ساتھ ہونگے میری دنیا اتنی ہی بڑی رہے گی۔ ایک فلسفی نے کہا ہے کہ "اگر آپ تین ڈویژنوں پر مشتمل ایک بڑی فوج کے جرنیل کو اس سے الگ کر دیں گے تو فوج میں افراتفری پھیل جائے گی۔ لیکن ذلیل سے ذلیل تر انسان سے بھی آپ اس کے خیالات نہیں چھین سکتے۔" آپ اس کوشش میں ہرگز منہمک نہ ہوں۔ آپ کا ارتقا تیزی سے عمل میں آنا چاہیئے۔ آپ اس مقصد کے لئے بہت سے اثرات سے متاثر نہ ہوں۔ یہ کلی طور پر انتشار اور تضیع اوقات ہے۔ تاریکی کی طرح انکسار بھی آسمانی روشنیوں کو نمایاں کر دیتا ہے۔ افلاس اور کردار کی پستی کی پرچھائیاں ہمارے گرد

جمع ہوجاتی ہیں اور اچانک "دنیا ہماری نظروں میں وسیع تر ہوجاتی ہے۔" ہمیں اکثر
یہ بات یاد دلائی جاتی ہے کہ اگر ہمیں قارون کا خزانہ بھی دے دیا جائے تو ہمارے مقاصد
وہی رہیں گے اور ہمارے ذرائع بھی نہیں بدلیں گے۔ اس کے علاوہ اگر آپ اپنے
حلقہ میں افلاس کی وجہ سے محدود ہوجاتے ہیں مثلاً اگر آپ کتابیں یا اخبار نہیں
خرید سکتے ہیں تو آپ کا علم بھی سب سے زیادہ نمایاں اور اہم عناصر تک محدود
ہوجاتا ہے اور آپ مجبوراً ایسے مواد سے کام لیتے ہیں جو آپ کے لئے سب سے
زیادہ نفع بخش ہے۔ ہڈیوں کے قریب ترین حصوں میں زندگی شیریں ہوتی
ہے۔ آپ بیکار وقت ضائع کرنے سے بچ جاتے ہیں۔ اگر کوئی شخص اعلےٰ سطح
پر سخاوت سے کام لیتا ہے تو وہ ادنےٰ سطح پر کچھ بھی نہیں کھوتا۔ ضرورت
سے زیادہ دولت صرف بے ضرورت چیزیں ہی خریدتی ہے۔ جس چیز کی روح کو
ضرورت ہوتی ہے وہ دولت سے نہیں خریدی جاسکتی۔

مَیں سیسے کی دیوار کے ایسے گوشہ میں رہتا ہوں جس میں گھنٹے بنانے
والی دھات کا کھوٹ بھی ہے۔ دوپہر کو سستانے کے وقت اکثر باہر کی ٹن ٹن بھی
میرے کانوں تک پہنچتی ہے۔ یہ میرے ہمعصروں کا شور ہے۔ میرے پڑوسی
ان واقعات کا ذکر کرتے ہیں۔ جو انہیں مشہور مردوں یا خواتین کے ساتھ پیش
آئے یا یہ کہ رات کے کھانے کی میز پر کن کن بڑی شخصیتوں سے ملاقات ہوئی۔
لیکن جس طرح مجھے روزنامہ "ٹائمس" کی خبروں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اسی
طرح ان کی گفتگو سے بھی نہیں ہے۔ اُن کی ساری بات چیت اور دلچسپی لباس اور اخلاق
کے بارے میں ہوتی ہے لیکن ہنس تو ہنس ہی رہے گا چاہے آپ اُسے کیسا ہی لباس
کیوں نہ پہنادیں۔ وہ مجھے کیلے فورنیا، ٹیکساس، انگلستان، انڈیز، جارجیا یا میسے
چیو یٹس کے سرفلاں کے ہنگامی اور وقتی قصے سناتے ہیں اور مَیں اس قدر

اُکتا جاتا ہوں کہ جی چاہتا ہے مملوک بلے کی طرح اِن کے دالان سے کود کر بھاگ جاؤں۔ مَیں اپنی ہی ڈگر پر واپس آکر خوش ہوتا ہوں۔ مَیں کسی شاندار جلوس میں کسی متانہ جگہ پر چلنا پسند نہیں کرتا ہوں۔ بلکہ اگر ممکن ہو تو مَیں اس خالقِ دوجہاں کے ساتھ چلنا پسند کرتا ہوں۔ مَیں اس بے قرار، پریشان اور ہنگامے سے لبریز اُنیسویں صدی میں نہیں رہنا چاہتا بلکہ یہ پسند کرتا ہوں کہ مَیں کھڑا یا بیٹھا سوچتا رہوں اور یہ صدی گزر جائے۔ لوگ کیا تقریب منا رہے ہیں؟ ہم سب کے سب کسی نہ کسی انتظامیہ کمیٹی کے ممبر ہیں اور ہر گھڑی کسی نہ کسی کی تقریر کے منتظر رہتے ہیں۔ خدا اُس دن کے لئے جلسہ کا صدر ہوتا ہے مگر اُس کی جانب سے تقریر کرے گا ویبسٹر۔ مجھے تُلنا، طے کرنا اور اس کی طرف جانا مرغوب ہے جو مجھے زیادہ سچائی اور قوت سے اپنی طرف کھینچتا ہے۔ مَیں ترازو کی ڈنڈی سے لٹک کر کم تُلنا نہیں چاہتا۔ میں کوئی فرضی معاملہ نہیں اُٹھاتا ہوں اس معاملہ کو نپٹانا چاہتا ہوں جن پر چلنا میرے حیطۂ امکان میں ہے۔ اور جس سے مجھے کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔ مجھے اس بات پر کوئی مسرت نہیں ہوتی کہ میں بنیاد کو مضبوط بنائے بغیر جلدی سے محراب بنانے لگوں۔ ہمیں پتلی اور لچکیلی برف پر دوڑنے کا کھیل نہیں کھیلنا چاہیئے۔ ہر جگہ کی تہہ ٹھوس ہوتی ہے۔ ہم نے وہ قصّہ پڑھ رکھا ہے۔ جس میں ایک مسافر نے ایک لڑکے سے پوچھا "سامنے والی دلدل کا تہہ سخت ہے کہ نہیں؟" لڑکے نے جواب دیا "ہاں ٹھوس ہے" لیکن جب اُس میں قدم رکھتے ہی مسافر کا گھوڑا کمر تک دلدل میں دھنس گیا تو مسافر نے پوچھا "تم نے تو کہا تھا کہ اس دلدل کی تہہ ٹھوس ہے" لڑکے نے جواب دیا "ہاں اس کی تہہ ٹھوس ہے لیکن آپ ابھی آدھی دور تک نہیں پہنچے" بس یہی حال سماج کی دلدل کا ہے۔ لیکن یہ بات کوئی تجربہ کار ہی جانتا ہے۔ وہی خیال، قول یا عمل نیک ہوتا ہے۔ جو خاص خاص

اوقات اور جگہوں میں ظہور میں آتا ہے ۔ میں اُن لوگوں میں شمار نہیں ہونا چاہتا جو اپنی حماقت سے صرف لکڑی کی پٹی اور پلستر میں کیل ٹھونکتے ہیں۔ ایسی حرکت تو مجھے رات بھر بیدار رکھے گی آپ مجھے ایک ہتھوڑا اور اصل تختہ ڈھونڈنے کی اجازت دے دیجئے۔ آپ پوٹین پر بھروسہ نہ کیجئے۔ کیل اچھی طرح ٹھونکئے اور اسے مضبوطی سے جوڑ دیجئے تاکہ اگر آپ رات کو سوتے میں جاگ جائیں تو اپنا کام یاد کر کے اطمینان محسوس کریں ۔ یہ ایسا کام ہوگا کہ اگر آپ اس کی مدح میں کوئی قصیدہ کہہ دیں گے تو شرم محسوس نہیں کریں گے ۔ خدا آپ کی مدد اس صورت میں کرے گا اور صرف اسی ایک صورت میں ۔ ہر کیل جو اس طرح جڑ دی جائے گی وہ دُنیا کی مشین کی ایک کیل بن جائے گی ۔ اور آپ اس مشین کو چلانے والے ہوں گے ۔

مجھے محبت ، دولت اور شہرت نہ دیجئے ۔ صرف سچ دے دیجئے ۔ مَیں ایک ایسی میز پر بیٹھا تھا جس پر اچھی خوراک اور شراب کی افراط تھی ۔ اور کھانا کھلانے والے ملازم مؤدب اور باتمیز تھے ۔ لیکن خلوص اور سچائی کا اس میز پر نام و نشان تک نہ تھا ۔ اس لئے میں اس نامہربان نوانہ میز پر سے بھوکا ہی اُٹھ آیا ۔ اُن کی میزبانی برف کی طرح ٹھنڈی تھی ۔ مَیں نے سوچا ان لوگوں کو منجمد کرنے کے لئے کسی برف کی ضرورت نہیں ۔ وہ مجھ سے پیش کی جانے والی شراب کی عمر اور اُس کی شہرت کے متعلق بات چیت کرتے رہے لیکن مَیں اس قدیم ترین ، جدید ترین اور خالص ترین بادۂ انگور کے بارے میں سوچتا رہا جو اُن کے ہاں موجود نہیں تھی ۔ اور جو اُنہیں کسی قیمت پر مل بھی نہیں سکتی تھی ۔ میری نظر میں فیشن ، مکان ، لان ، باغ اور ضیافتوں کی کوئی وقعت نہیں ۔ مَیں بادشاہ سے ملنے گیا ۔ لیکن اُس نے ڈیوڑھی پر مجھے انتظار کرایا اور اس طرح پیش آیا جیسے اُس میں میزبانی کی صلاحیت ہی نہیں تھی ۔ میرے پڑوس میں ایک شخص تھا جو ایک درخت کی کھوہ میں مقیم تھا لیکن اس کا اخلاق شاہانہ تھا ۔

اگر بادشاہ کی بجائے میں اُس شخص سے ملنے گیا ہوتا تو بہتر ہوتا۔

ہم کب تک اپنی برساتیوں میں بیٹھے بیکار اور کرم خوردہ نیکیاں کرتے رہیں گے۔
جنہیں ہر قسم کا عمل بیسود ثابت کر سکتا ہے؟ یہ تو ایسا ہی ہے کہ ایک آدمی صبح اٹھ کر
اپنے آپ کو جسمانی اذیت پہنچائے اور خود اپنے آلو کے کھیت گوڈنے کے لئے مزدور
کرائے پر رکھے اور پھر سہ پہر کو سوچی سمجھی نیکیوں کی بنا پر مسیحی انکسار اور فراخدلی
کی مشق جاری رکھنے کے لئے گھر سے باہر نکلے۔ ذرا انسان کا یہ چینی مٹی کا بنا
ہُوا غرور اور یہ غلیظ خود پسندی تو دیکھئے! یہ نسل اپنے آپ کو اس امر پہ
تھوڑی بہت مبارکباد دیتی ہے کہ وہ عظیم الشان ماضی کی آخری کڑی ہے۔
اور بوسٹن، لنڈن، پیرس اور روم میں اپنی طویل وراثت پہ ناز کر کے فنونِ
لطیفہ اور سائنس اور ادب میں اپنی ترقیوں کا حال فخر سے بیان کرتی ہے۔
فلسفہ سے متعلق انجمنوں کی رپورٹیں اور "عظیم انسانوں" کی قصیدہ خوانیاں
میری اس بات کا ثبوت ہیں۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے جیسے آدمی اپنے نیک اعمال
کو دیکھ کر جھوم رہا ہو۔ "ہاں ہم نے عظیم کار[illegible] سرانجام دیئے ہیں۔ اور ہم
نے مقدس گیت گا لئے ہیں۔ جو کبھی فنا نہیں ہوں گے۔" یعنی اس وقت تک جبتک
ہم انہیں یاد رکھتے ہیں۔ اسیریا کی دانشمندانہ انجمنیں اور عظیم انسان کہاں ہیں؟ ہم
کس قدر ناپختہ فلسفی اور محقق ہیں۔ میرے قارئین میں ایک بھی ایسا شخص نہیں ہے
جس نے انسان کی مکمل زندگی بسر کی ہو۔ ممکن ہے انسانی نسل کی زندگی میں یہ
زمانہ چند روزہ موسمِ بہار ہو۔ اگر کنکارڈ میں ہم نے سات برس رہنے والی کھجلی
دیکھی ہے تو ہم نے کنکارڈ میں وہ ٹڈی دل نہیں دیکھا جو تیرہ برس تک رہتا
ہے ہم جس کرۂ ارض پر رہتے ہیں ابھی ہم نے اس کی صرف جھلک ہی دیکھی ہے۔
بیشتر لوگوں نے اس کی سطح سے چھ فٹ نیچے تک غوطہ نہیں لگایا۔ اور نہ ہم میں

سے بیشتر لوگ اتنی ہی بلندی تک اُچھلے ہیں۔ ہم نہیں جانتے کہ ہم کہاں ہیں۔ اس کے علاوہ ہم زندگی کے تقریباً نصف حصہ میں غافل پڑے سوتے رہے ہیں۔ پھر بھی ہم اپنے آپ کو عقلمند سمجھتے ہیں۔ اور ہم نے سطحی طور پہ ایک نظام بھی قائم کر رکھا ہے۔ یقیناً ہم بڑے مفکر اور باہمت لوگ ہیں! جب میں جنگل کی زمین پر صنوبر کے کانٹوں میں ایک کیڑے کو رینگتا ہُوا دیکھتا ہوں۔ اور وہ یہ کوشش کرتا ہے کہ میری نظروں سے غائب ہو جائے تو میں سوچنے لگتا ہوں کہ یہ اس قدر منکسر المزاج کیوں ہے اور اپنے آپ کو مجھ سے پوشیدہ کیوں رکھنا چاہتا ہے؟ ممکن ہے کہ میں اس کا محسن ثابت ہوں۔ اور اس کی نسل کے لئے کوئی حوصلہ افزا پیغام دوں۔ ایسے وقت میں مجھے وہ محسن اعظم اور عظیم دانش در یاد آجاتا ہے جو مجھ جیسے انسانی کیڑے پر سایہ فگن ہے۔

دنیا میں مسلسل نئی چیزیں آتی رہتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ہم ناقابل یقین حد تک بے کیفی برداشت کئے چلے جاتے ہیں۔ میں اس بات کی طرف اشارہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتا کہ اس دُنیا میں ابھی تک کیسے کیسے وعظ انتہائی روشن خیال ملکوں میں سُنے جاتے ہیں۔ غم و مسرت کے الفاظ ضرور موجود ہیں۔ لیکن وہ صرف ایسے بھجنوں کا موضوع بن گئے ہیں جو ناک میں منمنا کر گائے جاتے ہیں۔ اب ہمارا اعتقاد صرف معمولی اور پست چیزوں پہ ہی رہ گیا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم صرف اپنے کپڑے تبدیل کر سکتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ سلطنتِ برطانیہ بہت ہی وسیع اور وقیع ہے اور یہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ اوّل درجہ کی طاقت ہے ہم اس پہ یقین نہیں رکھتے کہ اگر کوئی شخص دل میں یہ ٹھان لے تو وہ اس سلطنتِ برطانیہ کو ایک تنکے کی طرح جوار بھاٹا میں بہا سکتا ہے جو ہر انسان کے پیچھے اُٹھتا رہتا ہے۔ کون جانتا ہے کہ اب کے زمین سے سترہ برس تک منڈلانے والی کیسی ٹڈیاں برآمد ہوں گی۔

میں جس دنیا میں رہتا ہوں اُس کا نظام حکومت برطانیہ کے نظام حکومت کی طرح رات کے کھانے کے بعد شراب نوشی کے دوران میں تیار نہیں کیا گیا ہے۔

ہمارے اندر زندگی اس طرح ہے جس طرح دریا میں پانی ہوتا ہے ممکن ہے کہ اس پر میں پانی اتنا چڑھ جائے جتنا انسانی علم میں پہلے کبھی نہیں چڑھا تھا اور ساری پیاسی بلندیوں کو طغیانی میں ڈبو دے۔ ممکن ہے کہ یہی وہ حوادث سے بھرپور سال ہو جس میں ہماری ساری آبی چھچھوندریں غرق ہونے والی ہوں۔ ہم جہاں رہتے ہیں وہاں ہمیشہ خشک زمین نہ تھی۔ مجھے تو اس خشکی میں دور تک ایسے مقامات دکھائی دیتے ہیں جو کسی قدیم چشمے کے ساحل تھے۔ اور وہ چشمہ اتنا قدیم تھا کہ سائنس کی کتابوں میں بھی اس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ آپ نے وہ قصہ سن رکھا ہوگا جس سے نیو انگلینڈ کا بچہ بچہ واقف ہے۔ ایک کسان کی ساٹھ برس پرانی میز سے ایک تندرست اور خوبصورت کیڑا نکلا۔ یہ کیڑا ایک سوکھے سیب کی لکڑی سے بنی ہوئی میز کے ایک گوشے سے سوکھے کواڑ سے برآمد ہوا تھا۔ یہ میز پہلے کنکٹی کٹ اور پھر میسے چیوسٹس میں ایک کسان کے باورچی خانہ میں پڑی رہی تھی۔ یہ کیڑا جس جگہ سے نکلا تھا وہاں لکڑی کی بہت سی تہیں تھیں۔ ان کو دیکھنے سے پتہ چلا کہ یہ کیڑا ایک ایسے انڈے سے برآمد ہوا تھا جو سرسبز درخت میں اُس کے کاٹے جانے سے کئی سال پہلے کسی کیڑے نے دیا تھا۔ اس انڈے کو انگیٹھی کی گرمی نے سینہ دیا تھا اور انڈے میں سے یہ کیڑا نکل کر کئی ہفتہ تک لکڑی کو کاٹتا ہوا نکل آیا۔ کون ایسا شخص ہے جس کے عقیدے کو اس قصہ سے تقویت نہیں ملے گی کہ روز حشر مردے جی اٹھیں گے۔ اور زندگی لافانی ہے؟ کون جانتا ہے کہ ہمارے مردہ اور خشک سماج کی چوبی تہوں میں کسی خوبصورت اور ملکوتی زندگی کا انڈا موجود نہیں ہے۔ جو ان میں اس وقت دیا گیا ہو جب وہ سرسبز و شاداب پیڑ تھا اور اب دھیرے دھیرے ایک پختہ قبر کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ اس

انڈے میں سے جو کیڑا نکلنے والا ہے عین ممکن ہے اُس کی آواز انسان کی منتخب نسل کئی برسوں سے ضیافتی میز پر بیٹھی سنتی چلی آرہی ہو۔ اور یہ کیڑا غیر متوقع طور پر سماج کے از نئے ترین اور خود ساختہ۔ فرنیچر میں سے آخر کار موسم گرما کی بھرپور زندگی سے لطف اندوز ہونے کے لئے نکل آئے۔

میں یہ نہیں جانتا (ہر زید یا بکر) یہ ساری باتیں تسلیم کرے گا یا نہیں لیکن آنے والے کل کی یہی نوعیت ہے اور وہ کل محض وقت کے گزر جانے سے طلوع نہیں ہوگا۔ وہ روشنی جو ہمیں اندھا کردے ہمارے لئے تاریکی ہوتی ہے۔ ہمارے لئے دن وہی ہوتا ہے جس دن ہم جاگتے ہیں۔ ابھی بہت سے دن نکلیں گے۔ سورج تو صرف صبح کا ستارہ ہے۔